ڈاکٹر جاوید اقبال

زندہ رُود

زندہ رُود

علامہ اقبال کی مکمل سوانح حیات

از

ڈاکٹر جاوید اقبال

(حصہ دوم)

☆

باب: ۱۵

عملی سیاست کا خارزار

اقبال گو فکری اعتبار سے سیاسیات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے لیکن ۱۹۲۶ء سے پیشتر انہوں نے عملی سیاست میں حصہ نہ لیا تھا۔ اُن کی اپنی تحریر کے مطابق وہ شاید پہلی شخصیت تھے جس نے ہندوستان میں قومیت متحدہ کا خواب دیکھا تھا، مگر اس زمانے میں بھی جب وہ اشتراکِ اغراض کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے، انہوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار نہ کی بلکہ برصغیر کو مختلف اقوام کا وطن ہی تصور کیا، مسلم قومیت کا خیال بھی کم از کم ۱۹۰۰ء سے اُن کی قومی شاعری میں موجود تھا۔ قیام انگلستان کے دوران میں وہ ایک ایسے ذہنی اور قلبی انقلاب سے گزرے جس نے ان کا رُخ حتمی طور پر اسلام کی طرف موڑ دیا۔ لندن میں پان اسلامک سوسائٹی یا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی سے ان کی وابستگی سرسری نوعیت کی تھی۔ لاہور واپسی پر مسلم لیگ کی صوبائی شاخ سے ان کا تعلق بھی ابتداً فکری بنیادوں پر قائم ہوا۔ کانگرس لیگ سمجھوتا یا میثاقِ لکھنؤ پر پنجاب کی طرف سے سر فضل حسین نے دستخط کیے تھے۔ اقبال میثاق لکھنؤ کے حق میں نہ تھے۔ بعد میں جب خلافت کانفرنس وجود میں آئی اور مسلم سیاسی رہنما ہندوؤں کے ساتھ عدم تعاون یا ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہو گئے تو اقبال نے اختلافات کے سبب ان سے کنارہ کشی اختیار کی۔ یہ دور اقبال کی ذہنی اور قلبی تنہائی کا دور تھا کیونکہ عدم تعاون کے حامی اور تعاون پسند دونوں قسم کے مسلم قائدین کے گروہ ان کے زاویہ نگاہ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

اقبال برصغیر میں مسلمانوں کی عملی سیاست کو ایک بیکار مشق، وقتی شور و شغب یا تحصیل جاہ کے لیے ذریعہ سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عملی سیاست

میں حصہ لینے کے متعلق ان کی ذاتی رائے یہ تھی:

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز
حصولِ جاہ ہے وابستۂ مذاقِ تلاش!
ہزار شکر، طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر، نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سر سبز
جہاں میں ہوں میں مثالِ سحابِ دریا پاش
یہ عقد ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ بات یہ ہے کہ قیام انگلستان کے دوران میں جب وہ انقلاب سے گزرے اور انہی ایام میں برصغیر میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کرلیا گیا، تو اقبال، سرسید احمد خان کے سیاسی مکتبۂ فکر کو درست خیال کرتے ہوئے، ذہنی و قلبی طور پر اس سے وابستہ ہو گئے۔ سرسید کے سیاسی مکتبۂ فکر کی منطق یہ تھی کہ برصغیر میں ہندو اکثریت کے جور و استبداد کے خوف سے مسلم اقلیت نے مدافعانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ سو جمہوریت کے ذریعے متحدہ قومیت کی بنیاد تب ہی رکھی جا سکتی تھی جب ہندو اور مسلمان مرکزی حکومت میں برابر کے حصے دار ہوں، لیکن فرقہ وارانہ منافرت کے سبب ہندو ایسی کسی صورت کو قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ اس بنا پر برصغیر میں متحدہ قومیت کا تصور ایک خیال خام تھا[۲]۔ اقبال کے ہاں اس منطق نے ایک عقیدے کی شکل اختیار کر لی اور ۱۹۰۹ء میں وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھنا چاہیے[۳]۔ اسی

عقیدے کے پیشِ نظر اقبال اپنی تحریروں کے ذریعے مسلم قومیت کے اُصول اجاگر کرتے رہے۔ تحریکِ خلافت یا تحریکِ ترکِ موالات کے دوران میں انہیں احساس ہوا کہ دنیائے اسلام کے تمام ممالک پر تو علاقائی قومیت کا بھوت سوار ہے اور برصغیر میں مسلمانوں کے بیشتر سیاسی رہنما یا تو ہندو مسلم اتحاد کے سراب میں بھٹک رہے ہیں یا انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے ہی کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ اس مرحلے پر اقبال مسلم قائدین سے کٹ گئے۔ بہر حال اُن کا تعلق پنجاب یا ایک مسلم اکثریتی صوبے سے تھا، اس لیے فطرتاً وہ سیاست میں جارحانہ روّیہ رکھتے تھے، مدافعانہ روّیے کے قائل نہ تھے، پس انہوں نے عملی سیاست کے خارزار میں اترنے کا قصد اس لیے کیا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اپنے مطالبات منوانے کے لیے قومی سطح پر منظم کر کے ہندو اکثریت اور انگریزی حکومت دونوں کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے۔

منٹو مورلے اصلاحات کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں جو ایکٹ منظور ہوا، گو اس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا، صوبائی کونسلوں میں منتخب نمائندوں کی تعداد محدود تھی، مگر اس کے بعد کئی حوادث کے سبب برصغیر کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، جنگ طرابلس و بلقان، سانحۂ کانپور، پہلی جنگ عظیم میں ترکی کا مرکزی قوتوں کے ساتھ مل کر شریک جنگ ہونا، رولٹ ایکٹ، سانحہ جلیانوالہ باغ، خلافت، عدم تعاون یا ترکِ موالات کی تحریکیں، شدھی اور سنگھٹن کے سبب فرقہ وارانہ تعصب کا فروغ اور ہندو مسلم فسادات کا لامتناہی سلسلہ۔۔۔ انہی مخدوش حالات کے پیشِ نظر مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ پر مزید دستوری اصلاحات کی صورت میں ۱۹۱۹ء کا ایکٹ نافذ ہوا۔ اُس میں صوبوں کی کونسلوں میں نشستوں کی تعداد بڑھا دی گئی اور یوں نیا دوعملی نظام رائج ہوا۔ نئے دستور کے تحت پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء کے صوبائی انتخابات میں اقبال پر لاہور

سے کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑا ہونے کے بارے میں زور دیا گیا، لیکن چونکہ اُسی حلقے سے اُن کے دوست میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی امیدواری کا اعلان ہو چکا تھا، وہ اُن کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوئے۔

۱۹۲۶ء تک ہندو مسلم تعلقات میں ایک بہت وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی۔ ترکِ موالات کی تحریک کے خاتمے پر کانگرس اور خلافت کانفرنس دونوں سیاسی تنظیموں کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ سیاسیات کا میدان اب ہندو مہا سبھا یا سوراج پارٹی کے ہاتھوں میں تھا جو مسلمانوں کے کسی بھی مطالبے پر غور کرنے کو تیار نہ تھیں۔ مسلم لیگ تنظیم نو کے مراحل سے گزر کر ان مطالبات کو بار بار دہراتی، مگر فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات کے ماحول میں کسی قسم کی ہندو مسلم مفاہمت کا امکان نہ تھا۔

پنجاب کا سیاسی نقشہ بھی عجیب و غریب تھا۔ شہروں میں کچھ پڑھے لکھے اور درمیانے طبقے کے لوگ آباد تھے، لیکن صوبہ کی بیشتر آبادی دیہات میں تھی، اس لیے دیہاتی شہری کا امتیاز اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ سارے کا سارا صوبہ مختلف قسم کی برادریوں یعنی جاٹوں، راجپوتوں، پٹھانوں، اعوانوں، گکھڑوں، گوجروں، مغلوں وغیرہ میں بٹا ہوا تھا۔ شہروں میں بھی یہی حال تھا۔ لاہور شہر میں ارائیں، کشمیری، ککے زئی وغیرہ برادریوں نے الگ الگ ٹولیاں بنا رکھی تھیں اور کوئی شخص اپنی برادری کی حمایت کے بغیر کسی قسم کی عوامی مقبولیت حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اقبال نے غالباً اسی سبب سے اپنے قیام لاہور کے ابتدائی ایام میں انجمن کشمیری مسلمانان سے وابستگی پیدا کی اور کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لیے انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جب انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمان اخوت کے نصب العین کو پسِ پشت ڈال کر برادریوں کے فریب میں مبتلا ہیں اور ان کی اس فریب خوردگی سے ملّی سیاست کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے تو انھوں نے ایسے مخصوص اداروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی[۴]۔ بہر حال اس

زمانے میں صوبے میں کوئی بھی ایسی فعال سیاسی جماعت نہ تھی جو مسلمانوں کو ان کے قبائلی تعصبات اور فرقہ پرستی سے نجات دلا کر ملّی سطح پر منظم کر سکتی۔ جو سیاسی تنظیمیں موجود تھیں، ان کا اثر بہت محدود تھا۔

عاشق حسین بٹالوی کی رائے میں مائیکل اڈوائر پہلا شخص تھا جس نے حد درجہ چالاکی سے پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کو شہری مسلمانوں کا حریف بنا کر اس صوبے میں مسلمانوں کی قومی وحدت کو شدید نقصان پہنچایا، بالآخر اسی مصنوعی اور غیر حقیقی تقسیم نے پنجاب کی سیاسیات میں ۱۹۲۳ء میں یونینسٹ پارٹی کو جنم دیا، جس کے بانی سر فضل حسین تھے۔ سر فضل حسین کے اثر و رسوخ کے سبب پنجاب قانون ساز کونسل میں یونینسٹ پارٹی نے مضبوط پوزیشن حاصل کر لی، لیکن پارٹی کی ریشہ دوانیوں سے قبائلی تعصب کا زہر مزید پھیلا اور مسلمانوں کے درمیان شہری دیہاتی کی دیوار کھڑی ہو گئی ۵۔

۱۹۲۶ء کے ابتدائی مہینوں میں اقبال معمول کے مطابق وکالت کے شغل میں مصروف رہے۔ اب وہ موٹر کار میں عدالت عالیہ جایا کرتے تھے، جسے فیروز نامی ایک شوفر چلاتا تھا۔ انہی ایام میں وہ ''زبورِ عجم'' لکھ رہے تھے اور مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات کے لیے پرچے بھی بناتے یا دیکھتے تھے۔ احباب کی محفلیں بھی جمتیں جن میں عالمی، ملکی یا صوبائی سیاسیات پر گفتگو ہوتی یا علمی، ادبی اور فلسفیانہ موضوعات زیرِ بحث آتے۔

اسی سال اقبال کے اصرار پر چوہدری محمد حسین نے پنجاب سول سیکرٹریٹ میں ملازمت کر لی۔ وہ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے، اقبال ابتدا ہی سے چوہدری محمد حسین پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور انہیں ایک مخلص مسلمان اور اپنا مخلص دوست سمجھتے تھے۔ چوہدری محمد حسین بھی نہ صرف اقبال کے باعمل نیازمند تھے بلکہ ان کی ذات سے بے پناہ محبت کرتے

تھے، ملازمت اختیار کرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد انہیں صوبے کی انگریزی حکومت نے ڈیوٹی سونپی کہ اقبال یا ان کے ملاقاتیوں کے ساتھ گفتگو کی خفیہ رپورٹ حکومت تک پہنچاتے رہیں۔ چوہدری محمد حسین سخت شش و پنج میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے نوکری چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا، لیکن چونکہ وہ اقبال ہی کے اصرار پر ملازم ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے اقبال کے استفسار پر انہیں ساری حقیقت بیان کردی۔ اقبال نے انہیں ملازمت جاری رکھنے اور حکومت کی سونپی ہوئی ڈیوٹی بجالانے پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چوہدری محمد حسین نے ملازمت ترک نہ کی۔ حکومت کے لیے خفیہ رپورٹ وہ اور اقبال دونوں ہی اکٹھے بیٹھ کر مرتب کیا کرتے اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک یونہی جاری رہا[۶]۔

انہی ایام میں چوہدری محمد حسین نے اقبال کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی یاد داشت بھی لکھنا شروع کی۔ اس یادداشت میں دینی، علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ بعض اندراجات بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی خاتون اقبال پر فریفتہ ہوگئیں، ان سے خط و کتابت کرنے لگیں اور انہیں لکھا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ اقبال نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے اپنی طرف سے کسی شخص کو اقبال سے رشتہ طے کرنے کی غرض سے بھیجا۔ جب وہ شخص آیا تو چوہدری محمد حسین بھی وہیں موجود تھے۔ اس زمانے میں چوہدری محمد حسین کے سب احباب انہیں غیر شادی شدہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اقبال کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور صاحبِ اولاد ہیں۔ اقبال نے اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس وقت چوہدری محمد حسین دور کھڑے الماری میں کوئی کتاب ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں ڈاکٹر اقبال سے ملنا چاہتا ہوں اور مجھے بتایا جائے کہ آپ دونوں میں وہ کون سے ہیں۔ اقبال نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر اقبال ہوں۔ اس پر اس شخص نے رازدارانہ لہجے میں انکشاف کیا کہ وہ اُن کے رشتے کی غرض سے

فلاں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اقبال نے معذرت کی اور کہا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور انہیں مزید شادی کی فی الحال ضرورت نہیں۔ جب وہ مایوس ہو کر جا چکا تو اقبال نے سارا قصہ چوہدری محمد حسین کو کہہ سنایا۔ چوہدری محمد حسین بولے: واہ! آپ کو چاہیے تھا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں۔ اگر آپ نے خود بیاہ نہ کرنا تھا تو کم از کم میرا بندوبست تو ہو جاتا۔

میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ میں راقم کی پیدائش کے فوراً بعد اقبال نے اپنے سارے کبوتر احباب میں بانٹ دیئے اور کبوتر بازی کے شغل کو اس لیے ترک کر دیا کہ کہیں راقم بھی بڑا ہو کر ان کی دیکھا دیکھی کبوتر اُڑانے کی عادت نہ ڈال لے۔ گھر کی حالت خستہ تھی، لیکن ماحول نہایت پُرسکون تھا۔ کوٹھی کے بالمقابل میدان تھا جس کی ایک طرف قانون کی کتب سے بھرا منشی خانہ، اس کے ساتھ مہمان خانہ، برآمدہ، گیراج اور نوکروں کے چند کوارٹر تھے، اس مختصر سی عمارت کی بغل میں ایک قبرستان تھا، جس کا اب نام و نشان مٹ چکا ہے۔ کوٹھی کے سامنے برآمدے کے ستونوں میں لکڑی کے تختے جڑے تھے اور ایک چھوٹا سا سیمنٹ کا تھڑا تھا جس پر کرسیاں رکھی جاتی تھیں اور اقبال اور اُن کے احباب سردیوں میں دن کے وقت دھوپ میں یہیں بیٹھتے تھے، یا گرمیوں میں رات کو اقبال کا بستر لگایا جاتا تھا۔ برآمدے سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس مین قالین پر صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک طرف سیمنٹ عرصے سے اُکھڑا ہوا تھا جسے چھپانے کی خاطر ملکہ وکٹوریہ کی بڑی تصویر آویزاں کی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی دائیں جانب دروازہ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں کھلتا تھا جو اقبال کی خواب گاہ تھا۔ اس کمرے میں لوہے کی اسپرنگ والی چارپائی پر وہ سردیوں میں سویا کرتے تھے۔ ساتھ ان کے استعمال کے لیے غسل خانہ بھی تھا۔ ڈرائنگ روم کی سامنے والی دیوار میں دروازہ ایک اور بڑے کمرے میں کھلتا تھا جس میں اقبال مع

اہل وعیال عموماً گرمیوں میں دوپہر کو آرام کیا کرتے۔ باہر کے برآمدے میں دوسرا دروازہ زنانخانے کی طرف جانے کا راستہ تھا جو ایک ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا اندر کے برآمدے تک جاتا تھا۔ اندر کے برآمدے کے سامنے ایک بڑا دالان تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور سامنے اونچی دیوار تھی جو کوٹھی کی حدِ فاصل تھی اور اُسے دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ سے علیحدہ کرتی تھی۔ اندر کے برآمدے سے ایک دروازہ دو وسیع کوٹھریوں میں کھلتا تھا جن کے ساتھ ایک غسل خانہ ملحق تھا۔

گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا سردار بیگم خود پکاتی تھیں۔ اُن کی مدد کے لیے موچی دروازے کی ایک ادھیڑ عمر کی کشمیری خاتون رحمت بی بھی تھیں، جنہیں ہر چھوٹا بڑا اماں وڈی، (بڑی اماں) کہہ کر بلاتا تھا۔ رحمت بی ۱۹۱۴ء میں سردار بیگم کے ساتھ آئی تھیں اور انہوں نے علی بخش کی طرح اپنی تمام عمر اقبال کے خاندان کی خدمت کرتے گزار دی۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں وفات سے چند ماہ قبل اپنی بیٹی کے گھر گئیں اور وہیں غالباً ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئیں۔ کوٹھی کی پشت پر مُصلّیوں (نومسلم) کا محلّہ تھا جن کی لڑکیاں سردار بیگم سے قرآن مجید پڑھنے آتیں، اقبال کی بھتیجیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم سے معمولی اردو پڑھنا لکھنا یا سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں۔ ان میں سے بعض کی شادیاں بھی سردار بیگم ہی نے کروائی تھیں۔ کبھی کبھار اقبال کی بہنوں زینت بی یا کریم بی میں سے کوئی ایک بھی آجاتیں اور یہیں ٹھہرتیں۔ اسی طرح اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے لاہور آتے تو اقبال ہی کے پاس قیام کرتے، لیکن چونکہ اقبال کے والد شیخ نور محمد اب بہت ضعیف ہو چکے تھے، اس لیے اقبال انہیں ملنے کی غرض سے گرمیوں کی تعطیلات میں مع اہل وعیال سیالکوٹ چلے جایا کرتے۔ باہر منشی خانے میں تو منشی طاہر الدین یا موکل بیٹھا کرتے اور مہمان خانے میں اقبال کے بھتیجے مختار احمد مقیم تھے جو اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد سول سیکرٹریٹ میں ملازم

ہوئے۔ اس دور میں راقم نے اقبال کے ہاں رشتے داروں کے علاوہ صرف دو مہمان مختار احمد والے مہمان خانے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھے۔ ان میں سے ایک تو جنوبی ہند کے کوئی سر اور ڈاڑھی منڈے سوامی جی تھے جو کبھی کبھار لاہور آتے اور یہیں ٹھہرتے۔ وہ ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے اور ہلکے کیسری رنگ کا کھدر کا چولا پہنتے جس کے اندر چمڑے کی ایک پیٹی میں اپنی رقم محفوظ رکھتے تھے۔ دوسرا مہمان ایک جرمن تھا جو جغرافیائی نقشہ جات بنانے میں ماہر تھا اور جس نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کی فرمائش پر انہیں برصغیر کی اس وقت کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ہندو مسلم آبادی کے تناسب سے، ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کے نقشے تیار کر کے دیئے۔ راقم نے اپنے بچپن میں یہ نقشے گھر میں بکھرے ہوئے دیکھے ہیں، لیکن بعد میں ضائع ہو گئے۔ راقم کی یادداشت کے مطابق ان نقشوں میں آبادی نقطوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ ہندو اور مسلم آبادی کی شناخت کے لیے یہ نقطے کیسری اور سبز رنگوں کی روشنائی سے بنائے گئے تھے۔

علی بخش کی امداد کے لیے اب ایک اور ملازم رحماں بھی رکھ لیا گیا تھا، جو علی بخش ہی کے گاؤں اٹل گڑھ ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ ایک ہندو بیوہ اور اس کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اقبال نہ صرف کوٹھی کا کرایہ زیادہ ادا کرتے بلکہ انہوں نے کبھی مرمت کا بھی تقاضا نہ کیا۸۔

۱۹۲۶ء میں دوسری مرتبہ پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات ہونے تھے۔ اس مرتبہ احباب نے پھر اصرار کیا کہ اقبال لاہور کے مسلم حلقے سے انتخابات میں حصہ لیں۔ اسی دوران میں جب میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اقبال کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوں گے بلکہ ان کی امداد کریں گے تو اقبال اپریل ۱۹۲۶ء میں انتخابات میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو گئے۹۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر کا اقبال کے حق میں دستبرداری کا اعلان ۱۵ جولائی ۱۹۲۶ء کے ''زمیندار'' میں

شائع ہوا۔ اس کے بعد ۲۰/ جولائی ۱۹۲۶ء کے ''زمیندار'' میں اقبال کی طرف سے امیدواری کا باقاعدہ اعلان چھپا۔ انہوں نے میاں عبدالعزیز بیرسٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اس لیے کہ لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا، لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کر دوں۔ شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گزرے ہیں ۱۰۔

گو لاہور کے مسلم اخباروں نے بارہا تحریر کیا کہ اقبال جیسی شخصیت کو بلا مقابلہ کونسل کا رکن منتخب کیا جانا چاہیے، لیکن لاہور میں 'برادری نوازی' کی وبا کی موجودگی کے سبب دو اور حضرات مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ بہر حال ان میں سے ملک محمد حسین صدر بلدیہ لاہور نے اقبال کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور اقبال نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

میں اُن کے اس جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اتحاد المسلمین کے مقصدِ عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس قسم کی درد مندی اور ایثار کی توفیق دے ۱۱۔

مگر ملک محمد دین مقابلے میں ڈٹے رہے، اس لیے اقبال کو انتخابی جنگ کے میدان میں اترنا پڑا۔ لاہور میں اُن کی حمایت میں تقریباً بیس جلسے منعقد ہوئے جن میں بعض سے اقبال نے خطاب کیا۔ ہر محلے سے جلوس نکالے گئے۔ شہر کی کئی برادریوں نے اُن کی حمایت میں اشتہار شائع کیے اور اقبال کو انتخابی مہم میں اپنی جیب سے بہت کم خرچ کرنا پڑا ۱۲۔

انتخابی مہم میں ملک محمد دین، اقبال پر مختلف سمتوں سے حملہ آور ہوئے۔ اُن کا ایک زاویہ یہ تھا کہ اقبال کے عقاید قابلِ اعتراض ہیں۔ یعنی وہ وہابی العقیدہ ہیں، جب کہ ملک محمد دین اہلِ سنت والجماعت ہیں۔ یہ پہلو اس لیے فائدہ مند تھا کہ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں حافظ شیرازی پر تنقید کر کے بعض مشائخ سے ''دشمن تصوف'' کا خطاب پایا تھا، نیز سلطان ابن سعود کے حق میں بیان دے کر علما کے ایک طبقے سے انہوں نے کفر کا فتویٰ بھی حاصل کر رکھا تھا۔ ملک محمد دین کا دوسرا زاویہ یہ تھا کہ اقبال کشمیری برادری سے تعلق رکھتے ہیں مگر چونکہ ملک محمد دین ارائیں ہیں اس لیے ارائیں برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ارائیں ہی کو اپنا نمایندہ چننا چاہیے۔ ان کا تیسرا زاویہ اشتہارات کے ذریعے اقبال کے ذاتی کردار پر کیچڑ اچھالنا یا ان کی کردار کشی کرنا تھا۔ ملک محمد دین کی انتخابی مہم کا یہ پہلو نہایت افسوس ناک تھا۔ اس قسم کے چودہ اشتہار سوالات کی شکل میں دیواروں پر چسپاں کیے گئے اور اُن کا اسلوب الزام تراشی یا بہتان طرازی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اقبال کی طرف سے ان اشتہارات کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اُن کے جلسوں میں اسلامی اتحاد و اتفاق برقرار رکھنے کی تلقین کی گئی، ذات برادری کے غیر اسلامی قیود کے خاتمے کی ترغیب دی گئی اور اختلافات عقاید سے احتراز کیا گیا۔ کسی جلسے میں کسی کے خلاف کچھ نہ کہا گیا اور اگر کسی کے منہ سے جوش میں آ کر کوئی نازیبا کلمہ نکل بھی گیا تو اسے روک دیا گیا[۱۳]۔

مدیر ''زمیندار'' نے اقبال کی حمایت میں ملک محمد دین کی انتخابی مہم پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

کیا یہ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی اور نامرادی کی دلیل نہیں کہ انہوں نے ایسی محترم شخصیت کو بھی پنجاب کونسل ممبری جیسے حقیر منصب کے لیے بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے دیا؟ جب مسلمانوں کی بے حسی اور بے غیرتی کی حالت یہ ہے تو پھر اُن کی یہ شکایت

کہاں تک حق بجانب قرار دی جا سکتی ہے کہ مخلص خادمانِ قوم نہیں ملتے اور حقیقی رہنماؤں کا قحط پڑ رہا ہے۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا اور ملک محمد حسین صاحب صدر بلدیہ لاہور نے علامہ اقبال کے حق میں کونسل کی امیدواری سے دستبردار ہو کر اپنی دانشمندی اور ضرورت شناسی ملت کا ثبوت دیا اور مسلمان تہِ دل سے اُن کے شکر گزار ہیں، لیکن اب علامہ اقبال کے مقابلے میں لاہور کے ایک غیر معروف بیرسٹر ملک محمد دین صاحب کھڑے ہوئے ہیں جن کے نام سے بھی عامتہ المسلمین اب تک ناواقف تھے۔۔۔ ملک محمد دین نے اپنے انتخاب کے سلسلے میں جو اعلان شائع کیا ہے اس میں جا بجا اس امر پر زور دیا ہے کہ میں اہلِ سنت والجماعت میں سے ہوں۔ میں نے بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کی ہے اور میں صرف اہلِ سنت کے ووٹ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا کونسل کی ممبری کے لیے آئندہ اہلِ سنت اور غیر اہل سنت معیار معتبر سمجھا جائے گا؟۔۔۔۔ جو شخص امیدواری کی حالت میں اس قدر فرقہ پرست ہے وہ کونسل کی ممبری حاصل کر لینے کے بعد تمام مسلمانوں کا نمائندہ کیوں کر کہلا سکتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شیعہ اور اہل حدیث کونسل میں اپنے لیے الگ نشستوں کا مطالعہ شروع کر دیں؟ ایک طرف علامہ اقبال پُکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میں تمام کلمہ گویوں کا نمائندہ بننا چاہتا ہوں اور برادریوں اور فرقوں کے بُت کو پاش پاش کر دینا میرا مقصد ہے اور دوسری طرف ایک شخص حنفیت کو پیش کر رہا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کو تفرق کی ضرورت نہیں بلکہ اتحاد کی ضرورت ہے۔۔۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ملک محمد دین کو ارائیوں کی برادری کے ووٹوں پر زیادہ تر اعتماد ہے اور کسی ایک برادری کے ووٹوں پر تکیہ کرنا بھی ان کی تفرق پسندی کی نہایت روشن دلیل ہے۔ عامتہ المسلمین سے ان کو کوئی مطلب نہیں۔ لیکن ہم ان کو بتانا چاہتے ہیں کہ ارائیں برادری کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد بھی اس قدر کور سواد اور عقل کے اندھے

نہیں ہیں کہ علامہ اقبال اور ملک محمد دین میں تمیز نہ کر سکیں ۔۔۔ وہ کبھی برادری کے مقاصد کو اسلام کی اغراض پر ترجیح نہ دیں گے ۔۔۔ یہ حالت تو ملک محمد دین کی ہے اور علامہ اقبال بارہا لاہور کے جلسوں میں باآواز بلند فرما چکے ہیں کہ جو شخص مجھے کشمیری ہونے کی وجہ سے ووٹ دینا چاہتا ہے، وہ مجھے ایسے ووٹ سے معاف رکھے ۔ میں صرف اسلام کے نام پر اپیل کرتا ہوں اور مجھے صرف مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت ہے ۔۔۔ ایک لالہ لاجپت رائے جس حلقے سے چاہتا ہے ایک شخص کو نامزد کر کے بلا مقابلہ منتخب کرا دیتا ہے، اور کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرأت نہیں ہوتی ۔ ہندوؤں نے شدید باہمی مخالفت کے باوجود پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت مالویہ کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے جس حلقے سے پنڈت مالویہ کھڑے ہو رہے ہیں اس میں لاکھوں کانگرسی موجود ہیں اور جس حلقے سے پنڈت موتی لعل نہرو امیدوار ہیں، اُس میں لاکھوں سنگٹھنی موجود ہیں، لیکن قومی اتحاد کی یہ حالت ہے کہ ان اکابر مملکت کے مقابلے میں کوئی شخص کھڑا نہیں ہو سکتا اور مسلمان ہیں جو علامہ اقبال کی جلیل القدر اور عظیم الشان شخصیت کے ساتھ عقیدت کا یہ منظر بھی پیش نہیں کر سکتے[14]۔

حاجی دین محمد خوشنویس کے بیان کے مطابق، جو انتخابات میں اقبال کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور جنہوں نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، ملک محمد دین کو سر شادی لعل نے اقبال کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ ملک محمد دین کی طرف سے ایک بہت بڑا اشتہار دیواروں پر چسپاں کیا گیا۔ مزنگ میں اقبال کے حامیوں کا جلسہ ہونے والا تھا۔ ملک لال دین قیصر نے خواہش ظاہر کی کہ ہماری طرف سے بھی ایسا ہی قد آدم اشتہار چھپنا چاہیے۔ سب کی نگاہ حاجی دین محمد پر پڑی، کیونکہ وہ جلی یا نمایاں خوش نویسی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فوراً اشتہار کی کتابت کی، کاغذ فراہم کیا،

پریس میں پہنچے، پروف نکلوا کر پڑھا، شائع کرایا، مزنگ کی دیواروں اور جلسہ گاہ کے باہر چسپاں کیا اور جلسہ گاہ میں آ کر چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب جلسہ شروع ہونے لگا تو ملک لال دین قیصر نے ان سے پوچھا۔ حاجی صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں، اشتہار کہاں ہے؟ وہ مسکرائے اور ایک طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: وہ رہا آپ کا اشتہار۔ لوگ بڑے متعجب ہوئے کہ اتنی قلیل مدت میں اتنا بڑا اشتہار کیوں کر تیار ہو گیا۔ جب اقبال کو پتا چلا تو انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور فرمایا: حاجی صاحب تو "کاتبِ کُن فیکون" ہیں۔ انہوں نے اشتہار سے کہا "کُن" اور وہ اسی وقت "فیکون" ہو گیا ۱۵۔

ملک لال دین قیصر بھی اقبال کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ پنجابی کے معروف شاعر تھے اور اقبال کے ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا غلام مرشد اسلامی اتحاد کی ضرورت پر تقریریں کرتے اور ملک لال دین قیصر اپنے پنجابی اشعار سنا کر سامعین کو محظوظ کرتے۔ اس زمانے میں ملک لال دین قیصر کے پنجابی اشعار: "آ گئی فوج اقبالی، کر دیو رستہ خالی" (الخ) کارکنان کی زبان پر رہتے۔ جلوسوں میں اسلامیہ کالج کے طلبہ اور شہر کے دیگر نوجوان یہی اشعار پڑھتے یا اقبال کے اس شعر کا ورد ہوتا:

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

چوہٹہ مفتی باقر میں کسی انتخابی جلسے کے تقریباً تین چار ہزار کے مجمع میں اقبال بھی موجود تھے۔ اس جلسے میں مولوی محرم علی چشتی کو، جو ملک محمد دین کے حمایتی تھے ملک لال دین قیصر اپنے ساتھ کھینچ لائے اور حاضرین سے ان کا تعارف کراتے ہوئے یہ طنزیہ پنجابی اشعار پڑھے:

جیبی پور ۱۶ اک پنڈ سنی دا، اوتھوں دا پٹواری اے

اسی تے اُوسنوں کجھ نہیں کہنا، اوہدے منہ تے داہڑی اے

کل جو کسے یار نے جا کے اوسنوں بولی ماری اے

حضرت تہاڈی طاقت کتھے ، اودھر خلقت ساری اے

کہن لگا اوہ بے وقوفا ، مت تری گئی ماری اے

شہر لاہور اقبال دے وَلّے ، ساڈا زور اتاری اے

اقبال کے حامیوں میں لاہور شہر کی کئی معروف ہستیاں تھیں ۔ میاں نظام الدین ، میاں امیر الدین ، میاں حسام الدین بیرسٹر ، میاں ایم اسلم ، محمد دین تاثیر ، خلیفہ شجاع الدین ، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ، مولوی سید ممتاز علی ، غلام رسول مہر ، عبدالمجید سالک ، خواجہ فیروز دین ، خواجہ دل محمد ، پہلوان چنن دین ، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ، مولوی احمد دین ایڈووکیٹ ، حفیظ جالندھری ، سید محسن شاہ ایڈووکیٹ ، سید مراتب علی ، شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ ، شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ ، عبدالرحمٰن چغتائی ، عبداللہ چغتائی ، نواب محمد علی خان قزلباش ، سید افضال علی حسنی ، مرزا جلال الدین بیرسٹر ، سردار حبیب اللہ ، ملک میراں بخش ، مولانا ظفر علی خان ، شیخ محمد نقی ، مولوی محبوب عالم ، میاں شاہ نواز ، حکیم محمد یوسف حسن کے علاوہ سیکڑوں شخصیتوں کے نام محمد حنیف شاہد نے اپنی تصنیف ”اقبال اور پنجاب کونسل“ میں درج کیے ہیں ۔ مختلف علاقوں کی انجمنوں یا وارڈوں کے مکینوں نے اقبال کی حمایت میں اعلان جاری کیے ۔ شہر میں کشمیریوں کی تعداد ارائیوں سے کم تھی ، لیکن کئی دیگر برادریوں مثلاً زرگروں ، خوجوں ، قصابوں ، گوجروں اور لوہاروں نے اقبال کے حق میں متفقہ فیصلے کیے ۔ ککے زئی برادری نے عملی حیثیت سے اقبال کی امداد کی ۔ مذہبی حلقوں میں شیعہ رہنما سید علی حائری ، خواجگانِ نارووال ، احمدیان قادیان اور احمدیان لاہور نے بھی اقبال کی تائید اور حمایت میں اعلان جاری کیے ۔ انجمن اسلامیہ میاں میر اور اہل حدیث بھی اقبال کے ساتھ تھے ۔ سیاسی جماعتوں میں مجلس خلافت نے اقبال کو

بہترین امیدوار قرار دیتے ہوئے ان کی اعانت کی۔ اقبال نے مجلسِ خلافت کے اُصول سے اتفاق کیا تھا اور اس کے مندرجہ ذیل منشور پر دستخط کیے تھے:

۱۔ ہمیشہ قومی مفاد کو ذاتی اغراض اور حکومت کی خوشنودی پر ترجیح دینا۔

۲۔ مسلمانوں کے تمام حقوق کی حفاظت کے علاوہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا نصب العین پیشِ نظر رکھنا اور مجلسِ خلافت جب تک اس نصب العین کو سامنے رکھ کر کام کررہی ہے، اس کی مخالفت کونسل کے اندر یا باہر نہ کرنا۔

۳۔ عام اسلامی مفاد کی حفاظت کے علاوہ جب تک ہندوستان کے حالات بدل نہ جائیں اس وقت تک مسلمانوں کے فرقہ وارانہ نیابت کی جدوجہد کو جاری رکھنا۔

۴۔ کونسل کے اندر اس جماعت کی ہمنوائی کرنا جو مندرجہ بالا اصولوں پر کاربند ہو۔

کشمیریوں کے دو اخبار ''سیاست'' اور ''نشتر'' اقبال کو جھوٹا، کذاب، وہابی، نجدی ، اسلام دشمن وغیرہ کے خطابات سے نوازکر ان کی شدید مخالف کرتے رہے، لیکن لاہور کے باقی تمام مسلم اخبار اقبال کی حمایت میں لکھتے تھے۱۷۔

جلسوں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ ان جلسوں میں مولانا غلام مرشد اور ملک لال دین قیصر کے علاوہ جو معروف شخصیتیں تقریریں کرتی یا نظمیں پڑھتی تھیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد بخش مسلم، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان ، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مظہر علی اظہر۔ بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے۔ جن میں اقبال شامل ہوتے۔ مختلف وارڈوں کے رضا کاروں کی ٹولیاں انتخابی اعلانات کی جھنڈیاں بلند کیے اقبال کی تعریف میں اشعار پڑھتے ہوئے آگے آگے روانہ ہوتیں ۔ ہر ٹولی کا امتیازی نشان مختلف ہوتا۔ کسی جماعت کے سروں پر کاسنی رنگ کی پگڑیاں ہوتیں کہیں ملگجی رنگ کی پگڑیاں دیکھائی دیتیں۔ کہیں سرخ ترکی ٹوپیوں والے نوجوان ہوتے جن کی ٹوپیوں پر اقبال کا لفظ کھریا مٹی سے لکھا ہوا نظر آتا۔ ان

ٹولیوں کے پیچھے معززین شہر کی جماعت ہوتی جن میں رؤسا، کاروباری لوگ، کالجوں کے پروفیسر اور دیگر اہلِ علم شامل ہوتے۔ اس جماعت نے اقبال کو گھیرے میں لیا ہوتا۔ وہ چند قدم چلنے نہ پاتے کہ پھولوں کے ہاروں سے لاد دیے جاتے۔ رستے میں ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہوتی۔ کارکن اور رضا کار اقبال کے ان اشعار کو خاص طور پر گاتے جن میں اسلامی اتحاد کا پیغام دیا گیا تھا کیونکہ اقبال نے لاہور میں انتخابات کے موقع پر برادری اور فرقہ بندی کی لعنتوں کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جلوس لاہور کے بازاروں سے گزرتے اور جلوس کے دوران میں اگر نماز کا وقت آ جاتا تو کسی بڑی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد جلوس پھر مرتب کیا جاتا اور اسی شان و شوکت سے مختلف بازاروں سے گزرتا ہوا لاہور شہر کے کسی نہ کسی دروازے پر اختتام پذیر ہوتا جہاں اقبال تقریر کرتے اور مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دیتے ۱۸۔

ایسے انتخابی جلسوں یا جلوسوں میں کی گئی اقبال کی کچھ تقریریں جو ''زمیندار'' میں شائع ہوئیں، اب تک محفوظ ہیں۔ مثلاً ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

میں انگریزی، اردو، فارسی میں برنگِ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، لہٰذا میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقش قدم پر چلانے اور نا امیدی بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اب اُن کی بطرزِ خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں اسلامیانِ ہند پر عجب دور گزر رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلسِ تحقیقاتِ اصلاحات جسے رائل کمیشن کہتے ہیں، یہ تحقیق کرے گی کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے

یا نہیں۔ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس باب میں پوری توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصدِ قوم پر قربان کردے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوں گا اور ربّ العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق بخشے کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔میں اغراض ملّی کے مقابلے میں ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں ۱۹۔

۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے میں انہوں نے اعلان کیا کہ اگر قوم متفقہ طور پر مجھے دستبردار ہونے کا حکم دے تو میں حکم کی تعمیل کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانا بدترین گناہ سمجھتا ہوں۔میں عنقریب نوجوانوں کا ایک جیش تیار کروں گا جو مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کی موجودہ لعنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گا۔۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ مذہب جیسی مقدس چیز کو الیکشن کی آڑ نہ بنایا جائے اور باہمی اتفاق سے کام لیا جائے اور یہ کہ ہم کو پھر ابراہیمی کام کرنا ہے اور ذات پات کے بُت کو پاش پاش کرنا ہے۔میں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک سوشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے میں انہوں نے جمہوریت، اسلام اور پنجاب کونسل کے موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ دیا ۲۰۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ کو کٹڑا ولی شاہ کا جلسہ اندرون شہر میں غالباً آخری جلسہ تھا۔اقبال ساڑھے آٹھ بجے شب جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔جلسہ گاہ سے باہر بازار دور تک آراستہ تھا اور ہر سمت لوگوں کا ہجوم تھا۔حاضرین کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔اقبال کے داخل ہوتے ہی انہیں ہار پہنائے گئے اور جلسہ پر جوش نعروں سے گونج اٹھا۔ملک لال دین قیصر، آس اور ثمر کی نظموں کے بعد شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ، شمس الدین حسن

ایڈیٹر، خواجہ فیروز دین اور مولانا محمد بخش مسلم نے تقریریں کیں۔ آخر میں اقبال کھڑے ہوئے اور فرمایا:

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور و فکر میں گزاریں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کار بند ہو کر عرب حضورؐ سرورِ کائنات کی محبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کاش ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے۔ اس لیے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے، اسلوبِ فکر مختلف ہے۔ لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہیے جس طرح ہمارے آبا و اجداد نے اُسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آ جاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری دل بستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، اُن میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ لیکن "لیظهره علی الدین کله" کے وعدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے۔ کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب و فائز ہوں گی۔ لا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین [21]

۔

انتخابی مہم کے دوران میں بعض لطیفے بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً حفیظ جالندھری کے بیان کے مطابق ایک روز کسی جلسے کو خطاب کرنے کے بعد اقبال ان کے ساتھ

اندرونِ شہر کی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے پیدل واپس آ رہے تھے۔ چونکہ امیدوار تھے اس لیے رستے میں جو کوئی بھی ملتا اسے سلام کرتے۔ ایک شخص کو سلام کیا، لیکن وہ شاید ملک محمد دین کا حمایتی تھا، اس نے جواب میں اپنی دھوتی اٹھا دی اور ننگا ہو گیا۔ اقبال جب موٹر کار میں بیٹھے تھکے ہارے گھر جا رہے تھے تو نہایت بجھے ہوئے لہجے میں حفیظ جالندھری سے کہنے لگے: اس قوم کے مصائب کے سبب میری راتوں کی نیند اچاٹ ہے، لیکن اس کے افراد اخلاق اور مروت کی دولت سے کیوں محروم ہیں؟ حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص انداز میں اقبال کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا: ڈاکٹر صاحب! قوم کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس نے آپ کو دکھلا دیا۔ اس میں مغموم ہونے کی کیا بات ہے۔ اس پر اقبال کھلکھلا کر ہنس دیے اور ساری کدورت دور ہو گئی ۲۲۔

۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو پولنگ کے آنکھوں دیکھے حال کی تفصیل ان ایام کے ''زمیندار'' اخبار کے حوالوں سے محمد حنیف شاہد کی تصنیف ''اقبال اور پنجاب کونسل'' میں پڑھی جا سکتی ہے ۲۳۔ ۲۳ نومبر کو لاہور شہر کے مسلم حلقے میں اور ۲۴ نومبر کو لاہور چھاؤنی کے حلقے میں ووٹنگ ہوئی۔ ہر پولنگ اسٹیشن پر دن کے ابتدائی گھنٹوں میں ووٹ ڈالنے کا بہت زور رہا اور آخری گھنٹوں میں رفتار سست ہو گئی۔ اکبری دروازے کے پولنگ اسٹیشن پر چپقلش بھی رونما ہوئی۔ مختلف مراکز پر ملک محمد دین کے حامیوں نے جعلی ووٹ درج کرانے کی کوشش کی لیکن بہت سے جعلی ووٹ مسترد کر دیے گئے۔ دس کے قریب گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ بہت سے پڑھے لکھے ارائیوں نے جو اپنے آپ کو برادری کے سوال سے بالا خیال کرتے تھے اقبال کے حق میں ووٹ ڈالے۔ موچی دروازے کے انتخابی مرکز پر فریقین کے حامیوں کے درمیان ہنگامہ ہو گیا اور ایک شخص نے اپنے مدِ مقابل کو چاقو سے زخمی کر دیا۔ پولنگ کے اختتام پر ہجوم نے اقبال کو گھیر لیا اور شہر کے اندر لے گئے۔ چنانچہ خود

بجو دایک جلوس مرتب ہو گیا جو اللہ اکبر اور اقبال زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا کشمیری بازار اور ڈبی بازار سے گزرا۔

۲۴ر نومبر کو لاہور چھاؤنی کے انتخابات کے دوران میں ملک محمد دین کے چار آدمی جعلی پرچیاں ڈالنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے جن میں ان کا چھوٹا بھائی نذیر احمد بھی شامل تھا، لیکن بعد میں وہ ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ ملک محمد دین کے ایک حامی نے اس شخص کی طرف سے جعلی پرچی ڈالنا چاہی جو اقبال کی طرف سے رائے دہندوں کی شناخت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ فی الفور پہچان لیا گیا کہ وہ جعلی پرچی ڈالنا چاہتا تھا۔ دولت علی نامی ایک ٹمٹم والے کی ٹمٹم اس بنا پر غائب کر دی گئی کہ اس نے ملک محمد دین کے ایک جعلی ووٹر کو شناخت کیا تھا۔ بعد میں وہ ٹمٹم ملک محمد دین کے چار آدمیوں کے قبضے سے برآمد کی گئی جن میں سے دو گرفتار ہوئے اور دو فرار ہو گئے۔ اس معاملے کی تفتیش کے لیے چوہدری علی گوہر حوالدار پولیس تھانہ لاہور چھاؤنی متعین کیے گئے۔

۶ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتخابات کونسل کے نتائج کا سرکاری اعلان ضلع کچہری میں ہوا۔ اُس زمانے میں حلقے کے کل ووٹروں کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی جن میں سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار ووٹ ڈالے گئے۔ اقبال کو پانچ ہزار چھ سو پچھتر ووٹ ملے اور ملک محمد دین کو دو ہزار چھ سو اٹھانوے ۲۴۔ سو اقبال تقریباً تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دیے گئے۔ بعد ازاں جب اقبال کے حامی مختلف ٹولیوں میں میونسپل مارکیٹ کے چوک میں پہنچے تو وہاں اقبال انہیں مل گئے۔ چنانچہ لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور ایک جلوس مرتب ہو گیا۔ نوجوان بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ محمد دین تاثیر بھی جنہوں نے میاں صلاح الدین کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا، بھنگڑے میں شامل تھے۔ یہ جلوس تقریباً تین بجے دوپہر انارکلی اور لوہاری دروازے سے گزرتا ہوا سرشام بھاٹی دروازے پہنچا اور یہاں اونچی مسجد میں نماز مغرب ادا کی

گئی۔ پھر جلوس ہیرا منڈی اور سید مٹھا بازار سے ہوتا ہوا چوک جھنڈا میں پہنچا، جہاں کسی نے اقبال کے سر پر پگڑی باندھی۔ اس کے بعد جلوس موری دروازے پہنچا اور اقبال کو فٹن میں سوار کرایا گیا۔ پھر جلوس پانی والے تالاب اور ڈبی بازار سے ہوتا ہوا کشمیری بازار پہنچا جہاں ملکوں کی دکان پر اقبال کی خدمت میں ایک مشہدی لنگی ہدیۃً پیش کی گئی۔ ازاں بعد جلوس پرانی کوتوالی سے ہوتا ہوا کچھ دیر چوہٹہ مفتی باقر میں ٹھہرا جہاں استاد گام نے پنجابی نظم پڑھی۔ رات ساڑھے دس بجے اقبال نے اہلِ جلوس کا شکریہ ادا کیا اور یہ جلوس منتشر ہوا[۲۵]۔

ملک محمد دین کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے ''زمیندار'' نے ادارتی نوٹ میں تحریر کیا کہ جن مسلمانوں نے ملک محمد دین کے حق میں اپنے ووٹ دیے ان میں دو ہزار تو وہ ناخواندہ ارائیں تھے جو اقبال کی علمی قابلیت سے ناواقف محض تھے۔ باقی چار پانچ سو پرچیاں غالباً ان حضرات نے ڈالیں جنہیں ''بریلوی حنفیت'' کا ہیضہ تھا اور جو ایک ضال و مضل مقامی اخبار اور حزب الاحناف کے اسلام فرد شانہ پراپیگنڈے سے متاثر ہو گئے[۲۶]۔

ملک محمد دین کے ایک عزیز ملک ظہور الدین کے خلاف، جنہوں نے اقبال کے حق میں ووٹ ڈالا تھا، ارائیں برادری کے چند ارکان نے طوفانِ بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی وضاحت کے لیے مدیر ''زمیندار'' کے نام ایک خط شائع کروانا پڑا جس میں تحریر کیا۔

مجھ پر عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے پنجاب کونسل میں ملک محمد دین کی امداد کیوں نہ کی اور برادری اور رشتے داروں کے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

اوّل: جب کہ برادری کے ایک اعلیٰ رکن عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا جیسے قابل شخص نے ڈاکٹر محمد اقبال کے حق میں دستبردار ہو کر اور امداد کا وعدہ فرما کر برادری پر ثابت کر دیا

کہ ڈاکٹر اقبال اس قدر قابل ہستی ہیں کہ ان کے مقابلے میں کھڑا ہونا درست نہیں تو ہم پر فرض تھا کہ ہم میاں عبدالعزیز کی تائید کے لیے ڈاکٹر صاحب کی مدد کرتے اور برادری کے نام کو روشن کرتے۔

دوم: میرے محترم بزرگ ملک محمد دین کو شاید اس بات کا علم نہ ہوگا کہ ان کو ڈاکٹر اقبال کے مقابلے میں کھڑا ہونے پر آمادہ کرنے والے اشخاص (یہ اشارہ سر شادی لعل کی طرف تھا) کی ارائیں برادری کے ساتھ کس قدر دیرینہ عداوت چلی آتی تھی (یعنی سر محمد شفیع کی میاں فیملی سے) اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر برادری سے انتقام لیا ہے اور ارائیں برادری کو دنیا بھر میں ذلیل کروا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔ عنقریب جب کہ سب حالات برادری پر روشن ہوں گے تو اس وقت برادری اپنی غلطی پر پچھتائے گی۔

سوم: ملک محمد دین نے برادری کے ناتعلیم یافتہ آدمیوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے جس کو اب وہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ برادری کے تعلیم یافتہ اصحاب نے پچاس فیصدی ڈاکٹر اقبال کے حق میں رائے دی اور باقی پچاس فیصدی جو ملک محمد دین کے ساتھ مجبوراً رہے اُن میں سے بھی زیادہ نے اندر جا کر ڈاکٹر صاحب کو ووٹ دیا ۲۷۔

اقبال کی کامیابی پر انہیں صوبے بھر سے مبارک باد کی اطلاعات موصول ہوئیں اور لاہور کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں کے زعماء نے انہیں دعوتوں میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ لاہور شہر میں اقبال نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو کشمیری بازار میں حاجی دین محمد خوشنویس کی پر تکلف دعوت میں شرکت کی۔ اسی طرح ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو شہر کی ککے زئی برادری نے ان کے اعزاز میں ایک پُر تکلف دعوت طعام دی جس میں ملک برکت علی نے اقبال کو کامیاب کرانے کے لیے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں اقبال نے بھی ایک مؤثر تقریر کی جس میں مسلم ارکانِ کونسل سے پُر

زور استدعا کی کہ وہ دیہاتی اور غیر دیہاتی کے امتیازات سے یکسر کنارہ کش ہو کر متحدہ طور پر اسلام اور وطن کی خدمت انجام دیں۔ اسی طرح میاں تصدق حسین خالد کی دعوت قبول کرتے ہوئے معززین فیروزپور کے استقبالیہ میں شریک ہونے کے لیے فیروزپور گئے ۲۸۔

پس ۱۹۲۶ء کا تقریباً سارا سال اقبال نے انتخابات کے ہنگاموں میں صرف کیا۔ ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کو پنجاب قانون ساز کونسل کا افتتاحی اجلاس سہ پہر کے وقت منعقد ہوا۔ جہاں اراکین نے یکے بعد دیگرے حلف اٹھایا۔ اخبارات میں خبریں شائع ہو رہی تھیں کہ بعض ذی اثر ارکان کونسل میں آزاد گروپ ترتیب دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور ممکن ہے کہ اقبال اس گروپ کے قائد بنا دیے جائیں۔ توقع تھی کہ آزاد گروپ کسی جماعت کی مخالفت نہ کرے گا، بلکہ صوبے کے تمام طبقات آبادی کے جائز حقوق کے تحفظ کا اہتمام کرے گا اور اس کے نزدیک زمیندار اور غیر زمیندار، مزدور یا غیر مزدور، نیز دیہاتی اور شہری کا امتیاز نہ ہوگا ۲۹۔ لیکن ایسا گروپ وجود میں نہ آسکا۔ کونسل میں سر فضل حسین کے اثر و رسوخ کے سبب یونینسٹ پارٹی کی اکثریت تھی اور اقبال نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کونسل کی اکثریتی پارٹی میں شریک ہو کر ممکن ہے بہتر خدمات انجام دے سکیں، مگر جب اقبال نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا تو وہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی دونوں سے منحرف ہو گئے۔

عظیم حسین اپنے والد سر فضل حسین کی سیاسی بائیوگرافی میں شکایتاً تحریر کرتے ہیں:

چونکہ فضل حسین پر تنقید کی زیادہ تر ذمہ داری ڈاکٹر اقبال پر عائد ہوتی ہے، اس لیے یہاں اُن کے کیریر کا خصوصی طور پر ذکر کرنا مناسب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فضل حسین ہمیشہ ڈاکٹر اقبال کی اعانت کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر ڈاکٹر اقبال

ایسے موقعوں سے، جو اُن کو فراہم کیے گئے، فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے۔ ۱۹۲۴ء میں فضل حسین نے سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) کو ترغیب دی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو عدالت عالیہ کی ججی کا عہدہ دیں، لیکن یہ امر ابھی زیرِ غور تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے حکومت پر بے لگام تنقید لکھ کر سرکاری افسران کی ہمدردیاں کھو دیں۔ پھر ۱۹۲۷ء میں ایک تجویز یہ تھی کہ آنے والی سیاسی اصلاحات کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات وزیر ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک مسلم وفد انگلستان روانہ کیا جائے۔ فضل حسین نے ڈاکٹر اقبال سے اس وفد کی قیادت کرنے کے لیے کہا اور اس غرض کے لیے تین ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ یہ چیز ڈاکٹر اقبال کے لیے درجۂ اوّل کی سیاسی زندگی کو یقینی بنا دیتی، لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا کیوں کہ مزید چند ہزار روپیوں کا خرچ لاحق ہوتا تھا۔ ان کے بجائے چوہدری ظفر اللہ خان جانے کے لیے راضی ہو گئے اور انہوں نے اپنے لیے روشن مستقبل متعین کر لیا۔ ان باتوں سے قطع نظر فضل حسین نے پھر ڈاکٹر اقبال کی مدد کرنا چاہی اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ بحیثیت صدر کونسل چوہدری شہاب الدین کی میعاد پوری ہونے پر یونینسٹ پارٹی کی حمایت سے ڈاکٹر اقبال کو صدر کونسل منتخب کیا جائے، مگر ڈاکٹر اقبال نے یونینسٹ پارٹی کی تمام ہمدردیاں اس کی پالیسی پر اعتراضات کر کے اور اس کے اراکین پر پریس میں شدید تنقید کر کے گنوا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی کی اکثریت نے انہیں اپنا امیدوار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور چوہدری شہاب الدین کو دوبارہ صدر کونسل منتخب کیا گیا۔[۳۰]

عظیم حسین کا گلہ شاید اپنی جگہ درست ہو مگر جس قسم کا سیاسی مستقبل اقبال کے لیے سر فضل حسین تجویز کرتے رہے وہ انہیں زیادہ سے زیادہ ایک اور سر فضل حسین یا سر ظفر اللہ خان بنا دیتا۔ ایسی صورت میں وہ اقبال ہرگز نہ رہتے۔ اسی سبب اقبال سر فضل حسین کے معیار پر پورے نہ اترے اور انہیں ہر مرحلے پر اپنے بارے میں

مایوس اور نا امید کرتے رہے۔ عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں:

اقبال ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب قانون ساز کونسل کے رکن رہے۔ یہ تین سال انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا۔ شہری دیہاتی چپقلش قانون ساز کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی اور پھر اس چپقلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اقبال سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال ایسے بلند پایہ مفکر، فلسفی اور شاعر کو صوبے کی قانون ساز کونسل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے، لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر اقبال کونسل کے اندر بیٹھ کر یونینسٹ پارٹی کے طرزِ عمل کو بچشمِ خود ملاحظہ نہ کرتے تو شاید ان کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پا سکتا جو قدرت نے ان کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ان کے لیے مقدر کر رکھا تھا[۳۱]۔

سو اقبال نے پنجاب قانون ساز کونسل میں ساری مدت ایک تنہا رکن کی حیثیت ہی سے گزاری۔ انہیں کونسل میں کسی جماعت کی تائید یا حمایت حاصل نہ تھی ۔اس لیے صوبے کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کونسل میں اُن کی تقریریں بحیثیت مجموعی واویلا ثابت ہوئیں یا نقار خانہ میں طوطی کی آواز۔ البتہ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے سبب وہ اسی سال پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری بن گئے ۔ یوں انہیں برصغیر کے مسلمانوں کی قومی سیاسیات میں بھرپور حصہ لینے کا موقع مل گیا اور یہی ان کی سیاسی زندگی کا اہم ترین پہلو تھا۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس دور کے فسادات کا ایک بڑا سبب شُدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں تھیں جن سے مسلمانوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ سوامی شردھا نند راجپوتانے میں شُدھی کی تحریک (یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے) میں بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں عبدالرشید نامی ایک شخص نے انہیں قتل کر

دیا۔اس واقعے کے دوسرے ہی دن دہلی میں فساد ہوا۔جس میں ہندوؤں نے چھ مسلمان شہید کر دیے ۳۲۔ بعد ازاں پنجاب کے چند آریہ سماجی اخبارات مثلاً "پرتاپ" اور "ملاپ" اور بعض ہندو سیاسی رہنماؤں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت دل آزار پراپیگنڈا مہم شروع کر دی۔اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مسلمانانِ لاہور کے دو عام جلسے اقبال کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ پہلا جلسہ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۷ء کو باغ بیرونِ موچی دروازہ میں ہوا اور دوسرا جلسہ اسی مقام پر ۳۰ر جنوری ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوا۔اقبال نے اس جلسے کے اختتام پر فرمایا:

ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں ہر جگہ ہماری رسوائی کے چرچے ہو رہے ہیں۔ہمارے باہمی تنازعات نہایت افسوس ناک ہیں۔ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہماری اس کشمکش کے نتائج ایشیا کے دیگر ممالک کے حق میں کیا ہوں گے۔ میرے تصور میں صداقت ایک ایسا تراشا ہوا ہیرا ہے جس کے کئی پہلو ہیں اور اس کے ہر پہلو سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی رنگ کی شعاع کو اختیار کر لیتا ہے اور اپنے نقطۂ نگاہ سے صداقت کو دیکھتا ہے۔۔۔۔رواداری کا اصول یہی ہے کہ مثالِ بالا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی کو یہ نہ کہا جائے کہ تم باطل پر ہو۔۔۔۔اختلافات کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپس میں سر پھٹول ہو۔۔۔۔اسلام نے بھی اُسی صداقت کی تعلیم دی ہے، جو زمانۂ قدیم کے بعض رشیوں نے دی (آپ نے اس موقع پر سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھ کر سنایا جس کا مفہوم قرآن کریم کی ان آیات کے مطابق تھا: کل شیء ھالک الا وجھہ ، نحن اقرب الیہ من حبل الورید) میں تم سے صداقت کے نام سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے حقایق کی طرف دیکھو اور آپس میں مت لڑو۔ ہندوستان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی اغراض کے لیے تمہارے درمیان

پھوٹ ڈالنے کی مساعی میں رہتے ہیں۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہو گی۔ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی ۳۳۔

شدھی اور سنگھٹن کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی متخالف تحریکیں جاری کر رکھی تھیں۔ غلام بھیک نیرنگ انجمن تبلیغ اسلام کے معتمد تھے اور ایک ایسی تبلیغی کانفرنس کرنا چاہتے تھے جس میں نو مسلم یورپین بھی شریک ہوں۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۲۴ رجنوری ۱۹۲۷ء میں کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس کے انتظامات میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا ۳۴۔ انہوں نے غلام بھیک نیرنگ کی تحریک کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہوتا ہے، تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہب اسلام کے لیے خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہرحال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اُس کا اجر حضور سرور کائنات ؐ ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ہو گا، آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں ۳۵۔

جنوری ۱۹۲۷ء ہی میں اقبال پنجاب کونسل کی فنانس کمیٹی اور ایجوکیشن کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے ۳۶۔ ۱۳ رفروری ۱۹۲۷ء کو انہوں نے کونسل کے آئندہ

اجلاس میں دو قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ اول یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری اور بے روزگاری کے پیشِ نظر حکومت بیکار تعلیم یافتہ اشخاص کو قطعاتِ اراضی عطا کرے تاکہ وہ اس میں زراعت کر سکیں۔ دوم یہ کہ چونکہ حکومت ہند نے پنجاب کا سالانہ زرِ تعاون معاف کر دیا ہے اس لیے ٹیکسوں میں تخفیف کرنے کے لیے ایک مجلس تحقیقات مقرر کر دی جائے تاکہ تخفیف سب محصول گزاروں پر مساوی طور پر تقسیم ہو سکے ۳۷۔

۴ر مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ایک جلسہ اقبال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں مرزا بشیر الدین محمود نے مذہب اور سائنس کے موضوع پر تقریر کی تقریر کے خاتمہ پر اقبال نے مختصر الفاظ میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم وفنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیوں کہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی ۔ ۔ ۔ سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کے ہر صفحے پر انسان کو مشاہدے اور تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منتہائے نظر، یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے ۳۸۔

۵ر مارچ ۱۹۲۷ء کو اقبال نے بحیثیت رکن فنانس کمیٹی پنجاب کونسل میں اس

سال کے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے دو تجاویز پیش کیں۔ اول یہ کہ چونکہ صوبے کی مالی حالت اطمینان بخش ہے اور ترقی کے کاموں کے لیے وافر رقومات موجود ہیں اس لیے دیہات میں صفائی کے بہتر انتظامات اور عورتوں کی طبی امداد بہم پہنچانے کی خاطر رقم کا ایک خاص حصہ محفوظ کر دیا جائے۔ دوم یہ کہ محاصل یعنی لگان میں کمی کی جائے۔ طریقۂ محصول اندازی میں جو نا انصافی ہے اسے دور کیا جائے۔ محصول آمدنی کو عائد کرتے وقت تو اس اصول کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر شخص پر اس کی محصول ادا کرنے کی استطاعت کے لحاظ سے محصول عائد کیا جائے لیکن لگان کے سلسلے میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ۱۰ر مارچ ۱۹۲۷ء کو انہوں نے بحیثیت رکن ایجوکیشن کمیٹی حکومت پنجاب کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ابتدائی تعلیم کے جبری نفاذ پر زور دیا ۳۹۔

۱۹۲۷ء میں سری نواس آئنگر کو کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے۔ دونوں مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے اور اس حیثیت سے ان کا آپس میں برصغیر کے سیاسی حالات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ سری نواس آئنگر کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تدبیر سوچی جائے جس سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی ہو سکے اور ہندوؤں کی یہ شکایت بھی رفع کر دی جائے کہ جداگانہ انتخاب فساد کی اصل جڑ ہے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے بعض قائدین کا ایک اجلاس ۲۰ر مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں طلب کیا۔ پنجاب سے سر محمد شفیع بحیثیت صدر صوبائی مسلم لیگ اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، سر محمد یعقوب وغیرہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ ان قائدین نے سوچ بچار کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز منظور کیں۔ جنہیں ''تجاویز دہلی'' کا نام دیا گیا:

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نئی دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۳۔ پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں مسلم اکثریت بحال کی جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندوں کی تعداد جملہ نمائندوں کے تناسب سے ایک تہائی ہو۔

۵۔ اگر مندرجہ بالا تجاویز قابلِ قبول ہوں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط طریقۂ انتخاب قبول کر لیں گے اور جداگانہ حقِ نیابت سے دستبردار ہو جائیں گے۔

۶۔ جو رعایت ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کو دی جائے گی وہی رعایت سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندو اقلیت کو دی جائے گی۔

۷۔ یہ تجاویز غیر منفک ہیں اور انہیں بحیثیت کلی بیک وقت قبول کیا جائے اور یہ نہ ہو کہ چند تجاویز کو قبول کر لیا جائے اور دیگر کو رد کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہ ہوں گے[۴۰]۔

ان تجاویز کی وضاحت کے سلسلے میں محمد علی جناح نے اپنے ایک اخباری بیان مورخہ ۲۹ رمارچ ۱۹۲۷ء میں فرمایا:

جہاں تک طریقہ انتخاب کا تعلق ہے وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہے۔ انتخاب جداگانہ رہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی کے تحفظ و بقا کا پورا یقین ہو جانا چاہیے اور انہیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر ان کے حقوق پامال نہیں کر سکے گی اور اس بات کا بھی یقین ہو جائے کہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ قومی حکومت قائم ہونے تک کا جو درمیانی وقفہ ہے اس میں وہ اکثریت کے جور و استبداد سے بالکل محفوظ رہیں گے۔ اس لیے اس سارے قضیئے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کے تحفظ و بقا کا کیونکر اطمینان دلایا جائے۔ مذکورہ بالا تجاویز مرتب

کرتے وقت یہی نقطہ ہمارے پیش نظر تھا[۴۱]۔

''تجاویزِ دہلی'' کا سیاسی فلسفہ یہ تھا کہ ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کا تحفظ اور مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندو اقلیت کا تحفظ ہو اور یوں دونوں قوموں کے درمیان ایک طرح کا توازنِ قوت پیدا کر دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسری کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس زمانے میں صوبہ سرحد، جو ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے علیحدہ کیا گیا، دستوری اصلاحات سے محروم تھا۔ اسی طرح بلوچستان میں بھی دستوری اصلاحات کا نفاذ نہ ہوا تھا، سندھ صوبہ بمبئی کا علاقہ تھا۔ الگ صوبہ نہ تھا۔ سندھ کا الحاق ۱۸۴۷ء میں ہوا اور اسے انگریزی حکومت نے صوبہ بمبئی میں شامل کر دیا، حالانکہ سندھ کے لوگ مذہب، زبان اور نسل کے اعتبار سے صوبہ بمبئی کے لوگوں سے مختلف تھے، اس کے علاوہ سندھ کا علاقہ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے درمیان میں ہونے کے سبب صوبہ بمبئی سے بالکل الگ تھلگ تھا، یہاں تک کہ سندھ اور بمبئی کے مابین کوئی براہ راست تعلق ریل کا بھی نہ تھا۔ پنجاب اور بنگال صرف دو ایسے مسلم اکثریتی صوبے تھے جہاں کونسلیں موجود تھیں اور ان کے لیے انتخابات بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان کونسلوں میں مسلمانوں کی اکثریت برائے نام تھی، کیونکہ انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی حاصل تھی۔ ''تجاویز دہلی'' کے ذریعے مسلم لیگی قائدین دو کی بجائے پانچ مسلم اکثریتی صوبے بنانا چاہتے تھے تاکہ سات ہندو اکثریتی صوبوں کے ساتھ توازن قائم ہو جائے۔

بہر حال جب سر محمد شفیع واپس لاہور پہنچے تو پنجاب کے دیگر مسلم لیڈروں نے، جن میں اقبال پیش پیش تھے، جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کی مخالفت کی۔ اُن کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ پنجاب، بنگال اور سندھ میں ہندوؤں کی اقتصادی برتری ہے اس لیے اگر مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو گئے تو ہندو ایسے مسلم امیدواروں کو انتخابات میں کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے جو خالصتاً مسلم مفادات

کا تحفظ کر سکیں۔

۱۶؍ اپریل ۱۹۲۷ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے روحِ تمدن اسلامی کے موضوع پر انگریزی میں ایک فاضلانہ خطبہ دیا۔ خطبہ اتنا طویل تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک صرف اس کا ابتدائی حصہ ختم ہو سکا۔ خطبے میں جو نکات پیش کیے گئے، ان میں سے بعض یہ تھے کہ: آنحضورؐ ختم الرسل ہیں اور عروج عقل کی ابتدا اس روز سے ہوئی جب ختم الرسلؐ مبعوث ہوئے۔ اس دن سے تقلید جامد کی جگہ علم و ادراک نے لی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا شخص نہیں آ سکتا۔ جس کی باتوں کو تم تنقید کے بغیر تسلیم کرو۔ یہ کہ یورپ میں ترقی اس وقت شروع ہوئی جب اہلِ مغرب نے فلسفۂ یونان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس سلسلے میں یورپ میں پہلا قدم اٹھانے والا شخص بیکن تھا جس نے استقرائی منطق پر زور دیا، مگر استقرائی منطق کا موجدِ اوّل یعقوب کندی تھا، بیکن نہ تھا۔ بیکن نے جو عربی پڑھا ہوا تھا، اندلس کے عرب منطقیوں کی تصانیف سے استفادہ کیا اور انہی کے خیالات کا ترجمہ کیا۔ یہ کہ ہندی اور یونانی حکماء کے نزدیک کائنات کا نظام مکمل تھا، لیکن غزالی اور ابن تیمیہ نے اس واہمے کا قلع قمع کیا، قرآن مجید کی روشنی میں کائنات کی عدمِ تکمیل کا دعویٰ کیا اور ثابت کیا کہ وہ ابھی منازلِ ارتقاء طے کر رہی ہے۔ یہ کہ فلسفۂ یونان کے خلاف بغاوت کرنے کا طریقہ یورپ کے اربابِ فکر نے مسلم حکماء سے سیکھا۔ یہ کہ ذوالنون مصری صرف صوفی ہی نہ تھے بلکہ کیمیا دان بھی تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ پانی جوہر بسیط نہیں بلکہ ایک مرکب شے ہے اور یہ کہ دانتے نے اپنی مشہور نظم میں بہشت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تمام و کمال ابن عربی کی تصنیف ''فتوحات مکیہ'' سے ماخوذ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کے فلسفے پر ہی نہیں بلکہ ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اقبال نے اردو میں خطبے کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

ہر انسان کے دل میں مشاہدہ حقیقت کی ہوس ہے ۔۔۔۔ مشاہدہ حقیقت کے حصول کے دو طریق ہیں سمع و بصر اور قلوب یا بہ اصطلاح قرآن حکیم، افندہ ۔ یہ ضروری ہے کہ ان دو طریقوں سے بقدر ضرورت کام لیا جائے ۔ یورپ نے اپنی ساری کوششیں صرف سمع اور بصر تک محدود کر دیں اور افندہ کو ترک کر دیا ۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات افندہ پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا ۔۔۔۔ مشاہدے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اس میں اپنے آپ کو فنا کر دے ۔ اسلام جس مشاہدے کا معلم ہے وہ اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، یعنی اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی ہے ۔ ایک شاعر نے حضور سرور کائنات ؐ کی نعت میں یہ نکتہ بڑے اچھے طریق پر واضح کیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ نعت میں اس سے بہتر شعر نہیں لکھا گیا:

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمے

یہ اسلامی آئیڈیل ہے ۔ اسلامی نقطۂ خیال سے معراج یہی ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے، لیکن سرکشی اور تمرّد کے لیے نہیں بلکہ خدمت و عبودیت کے لیے ۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیے گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو[۴۲] ۔

مئی ۱۹۲۷ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ اور کانگرس کمیٹی نے اپنے بمبئی کے اجلاسوں میں ''تجاویز دہلی'' منظور کر لیں ۔ بعد میں کانگرس کے اجلاس عام بمقام مدراس میں بھی ان تجاویز کو منظور کر لیا گیا، لیکن ہندو مہا سبھا نے تجاویز دہلی کی شدید مخالفت شروع کر دی ۔ یہ مخالفت اس لیے کی گئی کہ مہا سبھائی قائدین کے نزدیک اگر پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلم اکثریت بحال ہو گئی اور اسی طرح اگر سندھ (پچھتر فی صد مسلم) کو الگ صوبہ بنا دیا گیا اور صوبہ سرحد و بلوچستان (نوے فی صد مسلم) میں دستوری اصلاحات نافذ ہو گئیں تو برصغیر کے شمال مغرب میں چار مسلم اکثریتی صوبوں کا ایک بلاک قائم ہو جانے کا امکان تھا اور یہ صورت

ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی[۴۳]۔

یکم مئی ۱۹۲۷ء کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس برکت علی محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا۔ سر محمد شفیع نے تجاویز دہلی کے خلاف اور ہندو مہا سبھا کے جواب میں ایک جامع تقریر کی۔ اسی جلسے میں اقبال نے جداگانہ انتخاب قائم رکھنے کے حق میں اور مخلوط و مشترک انتخاب کے خلاف قرارداد پیش کی۔ قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ میں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں جس نے اتحاد ہندو مسلم کی اہمیت و ضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ یہ اتحاد مستقل صورت اختیار کرے، لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں نہیں ہیں اور ہمارے صدر (سر محمد شفیع) نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبۂ صدارت میں دیئے ہیں اُن سے ہندوؤں کی افسوناک ذہنیت آشکار ہوتی ہے۔۔۔ میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں، اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں، تعلیم میں پس ماندہ ہیں۔ ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حکومت انہیں آسانی سے چکنی چپڑی باتیں کر کے پھسلا لیتی ہے، ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے اور اگر کوئی اور وجہ نہ بھی ہوتی تو میں کہتا کہ تنہا اسی وجہ سے حلقہ ہائے انتخاب الگ رکھے جائیں۔ آخر میں میں مسلمانوں سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں اُن کے خلاف ہو رہی ہیں دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں

اور مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کریں[۴۴]۔

اس مرحلے پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال ''تجاویز دہلی'' کے صرف اُس حصے سے اختلاف کرتے تھے جس میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کے ارادے کا اظہار کیا گیا تھا، گویہ پیش کش مشروط تھی۔ اقبال کسی صورت میں جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونا نہ چاہتے تھے، کیونکہ مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لینے سے قومیت متحدہ کی تشکیل ہوتی تھی، جو ان کے عقیدے کے مطابق مسلم قومیت کے اصول کے منافی تھی[۴۵]۔ اس کے علاوہ ہندو ذہنیت کے متعلق ان کی بصیرت نے انہیں ہر قسم کی ہندو مسلم مفاہمت کے امکان کے بارے میں مایوس اور ناامید کر رکھا تھا۔ غالباً اسی جذبے کا اظہار انہوں نے حکیم محمد حسن قرشی سے کیا، جب انہیں کہا گیا کہ کانگرس اپنے اجلاس عام میں ''تجاویز دہلی'' کو منظور کر لے گی۔ اقبال نے جواب دیا:

مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتے پر رضامند ہو سکیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر مسلمان زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلا شرط مفاہمت کی پیش کش کریں، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے[۴۶]۔

پنجاب میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا خاصی سنگین تھی۔ ۳ رمئی ۱۹۲۷ء کو ہندوؤں اور سکھوں کی کثیر تعداد باولی صاحب ڈبی بازار میں جمع ہوئی، جہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کسی مسلمان نے ایک سکھ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ مشتعل ہجوم حویلی کابلی مل میں داخل ہوا اور اس نے مسلمانوں پر کرپانوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ اس واقعے سے دکانیں بند ہو گئیں، کاروبار معطل ہو گیا اور سارے شہر میں فساد شروع ہو گیا۔ اقبال فساد کے دوران حویلی کابلی مل پہنچے اور انہوں نے لاہور کے مختلف مقامات کے دورے کر کے مسلمانوں کو صبر کی تلقین کی، مظلومین کی امداد کی اور مصالحت کی کوشش کی۔ مسلمان اپنے شہدا کا

جلوس نکالنا چاہتے تھے اور چونکہ ڈر تھا کہ احتجاجی جلوس مزید اشتعال کا باعث ہوگا۔ اس لیے اقبال دیگر معززین کے ساتھ جلوس میں شریک ہوئے اور مسلمانوں کے جذبات کو انہوں نے بے قابو نہ ہونے دیا[۴۷]۔ اسی سلسلے میں اخبار ''ٹریبیون'' کے نامہ نگار خصوصی سے ملاقات کے دوران انہوں نے بتایا:

۴ مئی کو میں ڈبی بازار میں تقریر کر رہا تھا کہ حاضرین میں سے کسی نے مداخلت کی اور کہا کہ سکھوں کے پاس تو کرپانیں ہیں مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، وہ بھلا اپنی حفاظت کس چیز سے کریں۔ مسلمانوں کے رہنماؤں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ اگر اپنی حفاظت اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے لیے مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ ملے تو کونسل کے تمام مسلمان علی العموم (اور میں علی الخصوص) اس کے لیے سعیِ بلیغ کریں گے[۴۸]۔

۱۳ مئی ۱۹۲۷ء کو ہندو مسلم اور سکھ اکابرینِ شہر نے ایک اعلان جاری کیا کہ دیسی اخبار فرقہ وارانہ کشیدگی کا موجب بنتے ہیں، اس لیے حکومت کو ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ اقبال نے اس بیان کا خیر مقدم کیا اور ''مسلم آوٹ لُک'' کے نامہ نگار سے انٹرویو مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۲۷ء کے دوران میں کہا کہ اگر اخبار سنسنی پھیلانے والے عنوان لکھنا چھوڑ دیں، تقریروں وغیرہ کے رپورٹ کرنے کے لیے بہتر آدمی رکھیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کریں تو ان کی تعلیمی قدر و قیمت بہت بڑھ سکتی ہے۔ پس اعلان کا مقصد اخبارات کے لب و لہجے کی اصلاح ہے، ان کی آزادی کو سلب کرنا نہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:

ہمیں لاہور کے فسادات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف یہ حقیقت کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے برطانوی تحفظ کی ضرورت ہے، یہ ظاہر کر رہی ہے کہ ہم کس منزل پر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت نے مجھے اپنے سیاسی

خیالات اور سیاسی عقائد پر ازسرنو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں، خاص طور پر دیہاتی مسلمانوں میں، جو ہماری قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں، جہالت عام ہے اور کسی قسم کی سیاسی یا اقتصادی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ قوم کی قوتوں کو فرقہ بندی اور ذاتوں کی تقسیم نے علیحدہ منتشر کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سراسر غیر منظم کے غیر منظم ہیں۔ اب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں ۴۹۔

جون ۱۹۲۷ء میں ''زبور عجم'' شائع ہوئی۔ گو اس کی کتابت کا کام اسی سال کے ابتدائی مہینوں میں ختم ہو چکا تھا، لیکن غالباً اقبال اپنی مصروفیات کے سبب اسے جلد چھپوا نہ سکے۔ اپنے ایک خط بنام گرامی محررہ ۳۱ر جنوری ۱۹۲۷ء میں کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری کتاب ''زبور عجم'' ختم ہو گئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔ اس کے چار حصے ہیں پہلے حصے میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ دوسرے حصے میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق طرز دونوں کی غزلیات کے موافق یعنی الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہیں۔ تیسرے حصے میں مثنوی 'گلشن راز' (محمود شبستری) کے سوالوں کے جواب ہیں اس کا نام میں نے ''مثنوی گلشن راز جدید'' تجویز کیا ہے۔ چوتھے حصے میں ایک مثنوی ہے، جس کا نام میں نے ''بندگی نامہ'' تجویز کیا ہے۔ مثنوی کا مضمون یہ ہے کہ غلامی کا اثر فنون لطیفہ مثلاً موسیقی و مصوری وغیرہ پر کیا ہوتا ہے ۵۰۔

لاہور کے ایک ہندو راجپال نے اپنی کتاب ''رنگیلا رسولؐ'' میں آنحضورؐ کی شانِ مبارک میں گستاخی کی تھی اور اس پر دو ڈھائی سال تک مقدمہ چلتا رہا، لیکن جون ۱۹۲۷ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کے حق میں

فیصلہ دے دیا۔ اس فیصلے کے خلاف مسلمانوں میں شدید ردعمل ہوا۔ مسلم اکابرین لاہور کے ایک وفد نے جس میں اقبال بھی شامل تھے، گورنر سے مطالبہ کیا کہ ایسی دلآزار تحریروں کی اشاعت ممنوع قرار دینے کے لیے ایک فرمان فوراً جاری کیا جائے، چونکہ لاہور میں فسادات برپا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ مجلس خلافت نے اس دفعہ کے نفاذ کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک سے پیدا ہونے والی صورت حالات پر غور کرنے کے لیے ۸ر جولائی ۱۹۲۷ء کو معززینِ لاہور کا ایک اجلاس سر عبدالقادر کی زیرِ صدارت برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں اقبال نے قابلِ اعتراض کتاب کی مذمت کرتے ہوئے ارکانِ مجلس خلافت سے درخواست کی کہ موجودہ حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیں۔ بعد ازاں اسی سلسلے میں مسلمانانِ لاہور کا ایک جلسۂ عام ۱۰ر جولائی ۱۹۲۷ء کو شاہی مسجد میں منعقد ہوا۔ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہو سکتی جو اس وقت درپیش ہے۔ راجپال کی تصنیف نے، جس کا نام لینا میں پسند نہیں کرتا، مسلمانوں کے قلب کے نازک ترین حصے کو چوٹ لگائی ہے [۵۱]۔

اس کے ساتھ ہی اقبال نے واضح کیا کہ سول نافرمانی کی تحریک اس مرحلے پر کیونکر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ وہ توہین انبیاء و بزرگانِ دین کے واقعات کا ہمیشہ کے لیے سدِ باب کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے پنجاب کونسل میں قرارداد بھی پیش کی۔ آخر کار تقریباً دو سال بعد لاہور کے ایک نوجوان علم الدین نے راجپال کو قتل کر دیا، جس پر اقبال کے منہ سے بے اختیار نکلا:

اسی گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا [۵۲]۔

علم الدین کے خلاف مقدمہ چلا اور جب اسے سزائے موت دی گئی تو

مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیلا۔ حکومت اس کی نعش مسلمانوں کے حوالے کرنے سے ہچکچاتی تھی کہ مبادا فسادات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس پر اقبال سمیت مسلم رہنماؤں کا ایک وفد گورنر سے ملا اور امن قائم رکھنے کی ضمانت پر نعش وصول کی گئی۔ ایک لاکھ کے قریب مسلمانوں نے علم الدین شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی اور پھر خاموشی سے منتشر ہو گئے۔

۱۸ر جولائی ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل کے اجلاس میں مزید پولیس کے مصارف کے لیے رقم کے مطالبے پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے اقبال نے اراکین کی توجہ پولیس کے بے رحمانہ رویے اور انتظامیہ کی کذب گوئی کی طرف مبذول کرائی۔ بات یہ تھی کہ لاہور میں مشہور عالمِ دین مولانا محمد عرفان کو پولیس نے بری طرح پیٹا تھا۔ معاملے کی تحقیقات کے سلسلے میں اقبال نے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی، لیکن اس نے کہہ دیا کہ اُن کی اطلاع درست نہیں۔ بعد میں اقبال مولانا محمد عرفان سے ملنے گئے اور ان کی ضربات کا بچشم خود معائنہ کیا تو ظاہر ہوا کہ انہیں نہایت بے رحمی سے پیٹا گیا تھا اور جو کچھ ڈپٹی کمشنر نے انہیں بتایا وہ سراسر جھوٹ تھا[۵۳]۔ اسی روز اقبال نے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب پیدا ہونے والی منافرت کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا اور فرمایا:

میں سوچتا ہوں کہ اراکین کو اس امر کا احساس ہے بھی کہ در حقیقت ہم خانہ جنگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس خانہ جنگی کو دبانے کے لیے اگر سخت اقدام نہ اٹھائے گئے تو سارے صوبے کی فضا مسموم ہو جائے گی ـــ یہ فرقہ وارانہ منافرت اگر یونہی پھیلتی رہی تو ملک کے دیگر حصے اور گاؤں میں رہنے والے لوگ بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹنا شروع کر دیں گے پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہو[۵۴]۔

۱۹ جولائی ۱۹۲۷ء کو سردار اجل سنگھ نے کونسل میں قرارداد پیش کی کہ مستقبل

میں تمام سرکاری اسامیاں کھلے مقابلے کے امتحان سے پُر کی جائیں اور جہاں ایسا نہ ہو سکے وہاں بلا تمیز مذہب بہترین تعلیمی اوصاف رکھنے والے امیدواروں کا تقرر کیا جائے۔ یہ قرارداد غالباً اس لیے پیش کی گئی کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تھے اور کھلے مقابلے کے امتحان میں ان کی کامیابی کا امکان نسبتاً کم تھا۔ اقبال اصولی طور پر مقابلے کے امتحان کے خلاف نہ تھے، لیکن مسلمانوں کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایسا نظام چاہتے تھے، جس میں مقابلے کے امتحان کے ساتھ ساتھ انتخاب یا نامزدگی کی بھی گنجائش ہوتا کہ پسماندہ طبقے انتظامیہ سے بے دخل نہ ہوسکیں۔ قرارداد پر بحث کے دوران کسی غیر مسلم ممبر نے یہ بھی کہا کہ یوں متحدہ قومیت کی نشونما میں مدد ملے گی۔ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

میرے دوست پنڈت نانک چند بدقسمتی سے یہاں نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ حکومت نے رنگ کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے۔ اس لیے وہ عہدے جن پر پہلے برطانوی افراد کا تقرر ہوا کرتا تھا، اب ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملنے لگیں گے، لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے بڑی سخت غلطی کی ہے۔ اگر زیادہ برطانوی عہدے دار ہوتے تو میں ان کا خیر مقدم کرتا (آوازیں: نہیں، نہیں) میں اپنی ذمے داری کا پورا احساس رکھتے ہوئے یہ کہہ رہا ہوں اور نہیں نہیں کی آوازوں کی معنویت کو بھی بخوبی سمجھتا ہوں۔ میں اس جھوٹی اور کھوکھلی قوم پرستی سے مسحور نہیں ہوں (ڈاکٹر شیخ محمد عالم: ہر شخص ایسا نہیں ہے) یہ ہوسکتا ہے لیکن متحدہ قومیت کا نعرہ از کار رفتہ ہے اور شاید ایک عرصہ دراز تک از کار رفتہ ہی رہے گا۔ یہ لفظ اس ملک کے لوگوں کی زبان پر گذشتہ پچاس سال سے ہے، مگر وہ اس کُڑک مرغی کی ککڑوں کوں ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہو۔ بہر حال آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ہمارے لیے ناممکن ہے کہ کھلے مقابلے کے امتحان کے سیدھے سادے اُصول کو رائج کریں ۔۔۔ میں نہیں جانتا ایک قوم بننا اچھی بات ہے یا نہیں۔ یہ

ایک ایسی چیز ہے جسے رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال فرض کیجیے کہ ایک قوم بننا اچھی بات ہے، تو میں کہوں گا کہ اس سے پہلے اس ملک کے مختلف فرقوں میں باہمی اعتماد پیدا ہو۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ فرقے ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ جب ہم آپس میں ملتے ہیں تو قومیت کی بات کرتے ہیں اور نوعِ انسان سے محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے میرے ایک دوست نے دو ہندو شرفاء کی گفتگو سنی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: اب ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے؛ دوسرے نے کہا: زبان پر قوم پرستی کے الفاظ ہوں لیکن اصل میں اپنے فرقے کے حقوق پر نگاہ رکھی جائے ۵۵۔

۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء کو اقبال نے کونسل میں کئی قراردادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا، جن میں چند یہ تھیں کہ: حکومت پنجاب نے نیلی بار ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکٹر رقبہ زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کیا، اُس اراضی کا نصف حصہ مزارعین کے لیے مخصوص کر دیا جائے یہ کہ توہینِ انبیاء و بزرگانِ دین کے انسداد کے لیے قانون نافذ کیا جائے (یہ قانون ۱۹۲۷ء ہی میں نافذ کر دیا گیا)، یہ کہ پنجاب میں انسدادِ شراب نوشی کے لیے قانون بنایا جائے اور تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ چنانچہ اقبال کی کوششوں سے تلوار نو اضلاع یعنی میانوالی، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، جھنگ، گڑ گاؤں، حصار، انبالہ، شملہ اور کانگڑہ میں قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دے دی گئی ۵۶۔

۴ر ستمبر ۱۹۲۷ء کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے تقریباً دس ہزار افراد کشمیری بازار کے متصل محلّہ کوٹھی داراں میں جمع ہوئے۔ اقبال صدرِ جلسہ تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو معاشی میانہ روی کے فوائد سے آگاہ کیا۔ فضول مصارف ترک کرنے کی تلقین کی، اور ''الکاسب حبیب اللہ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر مسلمان کو ضرور کچھ نہ کچھ کمانا چاہیے اور آپس میں اعتماد کی فضا پیدا کر کے تجارت و صنعت کی توسیع کے لیے کمپنیاں کھولنا چاہییں ۵۷۔

۸ر نومبر ۱۹۲۷ء کو حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا اس کمیشن کے تمام ارکان انگریز تھے اور اس کا کام حالات کے پس منظر میں شہادتیں لینا اور مختلف تجاویز اکٹھی کرنے کے بعد ہندوستان کے لیے آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھا۔ چونکہ اس میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کیا گیا تھا، اس لیے برصغیر کے سیاسی لیڈروں میں سے اکثریت کمیشن کی تشکیل پر معترض تھی، مگر اقبال کی رائے ان سے مختلف تھی، انہوں نے ۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو کمیشن کی تشکیل کے متعلق اپنے بیان میں کہا کہ بلاشبہ اس میں کسی ہندوستانی کا نہ لیا جانا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے، لیکن اس حملے کی وجہ وہ بے اعتمادی اور بدظنی ہے جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے ۵۸۔

کانگرس نے سائمن کمیشن کے مقاطعے کا اعلان کیا، مگر اس بارے میں مسلم قائدین میں اختلاف رونما ہو گیا۔ ایک گروہ مقاطعے کا حامی تھا اور دوسرا تعاون کرنا چاہتا تھا۔ مقاطعے کے حامیوں میں مولانا محمد علی اور محمد علی جناح پیش پیش تھے جب کہ تعاون کے حامی سر محمد شفیع، اقبال اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ مولانا محمد علی کے اثر و رسوخ کے سبب خلافت کانفرنس نے مقاطعے کا اعلان کر دیا اور چونکہ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے، اس لیے یہی گمان کیا گیا کہ لیگ نے بھی مقاطعہ کیا ہے۔ ان ایام میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری اقبال تھے۔ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو سر محمد شفیع کی کوٹھی میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں قرارداد منظور کی گئی کہ کمیشن کا مقاطعہ مسلمانوں کے مفاد کے لیے نقصان رساں ہو گا۔ اس لیے اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اس اجلاس کے بعد اقبال نے بحیثیت سیکرٹری پنجاب صوبائی مسلم لیگ اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا جس میں واضح کیا کہ

پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و خوض کے بعد ایک قرارداد منظور کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ کمیشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے علی الخصوص نقصان رساں ہوگا۔ میرے خیال میں یہ قرارداد پنجابی مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ ہے۔۔۔ اس ملک کی قلیل التعداد جماعتوں کو رائل کمیشن کی آمد سے بڑھ کر اپنے اندیشے اپنی امیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اور کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ میری رائے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی تہذیبوں کے مطابق نشو و ارتقاء حاصل کریں۔ یہ مقصد حاصل ہونا چاہیے خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعے سے جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے ۵۹۔

مولانا محمد علی کو اقبال کا یہ اعلان تعاون پسند نہ آیا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

سر محمد شفیع سے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں۔ انہوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے۔ یہ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سر محمد اقبال جیسے لیڈر سر محمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزاد خیالی کی سطح تک نہ ابھار کر لا سکے بلکہ برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر اتر آئے ہیں۔ چنانچہ کمیشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان اس کے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چاپلوسی کا ہے۔ پنجاب حقیقتاً اچھے لوگوں کا خطہ ہے مگر ان کی راہنمائی صحیح طور پر نہیں کی جاتی ۶۰۔

بالآخر دسمبر ۱۹۲۷ء میں محمد علی جناح نے بعض دیگر لیڈروں کے ساتھ مل کر ایک بیان میں کمیشن کی تشکیل پر اعتراض کرتے ہوئے مسلمانوں سے اس کے مقاطعے کی اپیل کی، لیکن اقبال نے بعض مسلم رہنماؤں کے ہمراہ ۸/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ایک بیان میں واضح کیا:

چند روز ہوئے مسٹر جناح اور چند ایک دیگر سر بر آوردہ اشخاص نے ایک اعلان شائع کیا تھا جو ملک کے موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے پریشان کر دینے والی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔اس اعلان میں اس حقیقت عظمیٰ کو نظر انداز کر دیا گیا کہ رائل کمیشن موجودہ تاسف زار حالات ہی کی پیدائش ہے ۔۔۔۔ ہم نہایت عاجزی سے اپنے اہل وطن کو بالعموم اور مسلمان بھائیوں کو بالخصوص متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاطعے کی لا حاصل روش اختیار کرنے سے، جیسا کہ مسٹر جناح اور اُن کے ہم خیالوں نے تجویز کی ہے، افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا ۔۔۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے ان حقوق کا تحفظ کر لیں جو ہندو ہمیں دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ جن مسلمانوں نے مسٹر جناح کے اعلان پر دستخط کیے ہیں، ان میں سے بعض تو ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔اُن کی روش پنجاب اور بنگال ایسے صوبوں کے مسلمانوں کی حکمت عملی کو تبدیل یا وضع نہیں کر سکتی ۔۔۔ ہمارا صاف اور غیر مبہم روّیہ اس خیال پر قائم ہے کہ ملک کی اکثریت سے اپنے منصفانہ حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ کر ہم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایسا قیمتی وقت ضائع کرنا ہمارے اہم مفاد کے منافی ہوگا۔ہندوؤں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہم باہمی اختلافات کے تصفیے کے معاملے کو مزید التوا میں ڈالنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے ۔۔۔ ملک کی اکثریت کو چاہیے کہ ابھی ہمارے ساتھ دیانت دارانہ مفاہمت کر کے مسلمانوں کے دل میں اپنا اعتماد پیدا کریں۔مسلمانوں کو محض اعمال ہی قائل کر سکتے ہیں، اقوال اور بلند بانگ دعوؤں سے کچھ نہ بنے گا، کیونکہ مسلمان بیش بہا تجارب کے بعد قدرے سوچ بچار کے عادی ہو گئے ہیں۔ہم نہایت جرأت اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کرائے کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمیشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ہم اس کے برعکس یہ کہتے

ہیں کہ فرقہ وار جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جاسکتیں۔تدبر کا اقتضایہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں۶۱۔

سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے بارے میں مسلم قائدین کا اختلاف نمایاں ہوتا چلا گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ، اس کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح سے اختلاف کیا تھا۔ پہلا موقع یکم مئی ۱۹۲۷ء کو ''تجاویز دہلی'' میں جداگانہ حق نیابت سے دستبرداری کی مخالفت کے دوران میں پیدا ہوا تھا۔ ''تجاویز دہلی'' کو مسلم لیگ نے ابھی تک حسب ضابطہ منظور نہ کیا تھا، اس سے سوال پیدا ہوا کہ آئندہ مسلم لیگ کا اجلاس کہاں منعقد کیا جائے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر کچلو مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے، اور محمد علی جناح و ڈاکٹر کچلو کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ اپنے سالانہ اجلاس میں تجاویز دہلی منظور کرلے تاکہ میثاق لکھنؤ کی طرح ایک اور ہندو مسلم سمجھوتا وجود میں آجائے، لیکن ڈاکٹر کچلو لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرنے کے مخالف تھے، کیونکہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ نے جداگانہ حق نیابت کی دستبرداری کے خلاف آواز بلند کی تھی اور انہیں یقین تھا کہ وہاں تجاویز دہلی مسترد کردی جائیں گی اور جداگانہ حق نیابت قائم رکھنے پر زور دیا جائے گا۔

اس لیے انہوں نے طے کیا کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور کی بجائے کلکتے میں زیر صدارت سر محمد یعقوب منعقد ہو۔ اقبال نے اس فیصلے کو غیر دستوری قرار دیتے ہوئے ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو سر فیروز خان نون کی معیت میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا:

کلکتے میں اجلاس منعقد کرنے کے وجوہ کچھ اور رہی ہیں اور وہ نہیں جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جارہے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتے میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲۰ر مارچ کی منظور کردہ تجاویز دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ

نسبت بہت زیادہ ہے کیونکہ مسلمانان پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں ۶۲۔

چنانچہ اس مرحلے پر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک جناح لیگ کہلائی اور دوسری شفیع لیگ۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو اقبال نے نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہمراہ محمد علی جناح کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں واضح کیا:

ہم نے پہلے بھی وضاحت کر دی ہے کہ مختلف اقوام باہمی خونریزی کے ہولناک مظاہروں میں مصروف ہیں جس سے ہندوستان کی خودداری خاک میں مل گئی ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے رفقاء نے بدقسمتی سے قومی زندگی کی ایسی حالت کا تصور کر رکھا ہے جو حقیقت میں مفقود ہے ۔۔۔ مسٹر جناح کو بخوبی معلوم ہے کہ تقرر کمیشن کا اعلان ہونے سے پہلے مسلمانوں نے متعدد مرتبہ اکثریت سے درخواست کی کہ باہمی اختلافات کا تصفیہ کرائیں پھر موتمر اتحاد شملہ میں مسلمانوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے شکوے کی آواز بلند کی اور اب اس موقع پر پھر مسلمان ان کو صلح کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تماشے میں مسٹر جناح چیف ایکٹر رہے ہیں۔ کیا وہ ہم کو بتلا سکتے ہیں کہ ان کو کبھی ہندوؤں کی جانب سے سوائے سخت ہٹ دھرمی کے اور کوئی جواب ملا ہے ۔۔۔ ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دولت، رسوخ، سیاسی قیادت اور تعداد کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے جب تک ہم ہندوؤں اور انگریزی حکومت دونوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ مستعدی اور سرگرمی سے نہ کریں، ہماری سیاسی موت مسلمہ امر ہے، جیسا کہ بعض مسلمان ہم سے کہتے ہیں کہ ہم اکثریت کی ہوائی فیاضی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اب قیاسات اور جذبات کی گنجائش نہیں۔ ہمیں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے دوست ہم کو اپنے مفاد کے لیے موردِ طعن و تشنیع بنائیں، ہم اس بات کو زمانۂ مستقبل پر چھوڑتے ہیں۔ جو ہمارے اس استقلال کا انصاف کرے گا، جو ہم نے فرقہ وار مفاد

کو مستحکم بنیاد پر رکھنے میں دکھلایا ہے[۶۳]۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے اعلان کیا:

اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو مسائل پیش ہیں۔ایک حصول سوراج کا معاملہ اور دوسرا فرقہ وار نیابت کے قیام کا معاملہ۔۔۔بد قسمتی سے ملک کی اکثریت کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو حصولِ سوراج کے مسئلے کی طرف سے بددل کر رکھا ہے۔ اب انہیں اپنے حقوق ملّی کے تحفظ کی فکر لاحق ہو رہی ہے اور مسلمانانِ ہند کی ترقی کا انحصار اس مسئلے پر ہے[۶۴]۔

بہر حال لیگ دو حصوں میں منقسم رہی۔ جناح لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس کلکتے میں سر محمد یعقوب کی زیر صدارت منعقد کیا۔ جہاں تجاویز دہلی منظور کر لی گئیں، لیکن شفیع لیگ نے اپنا اجلاس زیر صدارت سر محمد شفیع ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو لاہور میں منعقد کیا۔ جس میں جداگانہ حق نیابت قائم رکھنے پر اصرار کیا گیا اور اقبال کی پیش کردہ مندرجہ ذیل قرارداد منظور ہوئی:

موجودہ نظام میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو مجلسِ وضع قوانین میں اکثریت کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس کے خلاف پُر زور احتجاج کرتا ہے اور اسے اصول جمہوریت کے منافی بتاتا ہے۔ لیگ، حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی تھی اسے دور کیا جائے[۶۵]۔

جنوری ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی اس غرض سے لاہور تشریف لائے کہ اقبال کو اپنا ہمنوا بنائیں اور سائمن کمیشن سے انہیں تعاون کرنے سے باز رکھیں، لیکن اقبال نے شرط یہ لگا دی کہ اگر ہندو قائدین مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر کے ان سے حقیقی مفاہمت کر لیں تو نہ صرف وہ خود کمیشن سے تعاون نہ کریں گے بلکہ سر محمد شفیع کو

بھی اس کے مقاطعے کے لیے مجبور کریں گے۔ مگر چونکہ ایسا ہو سکنا ممکن نہ تھا، اس لیے مولانا محمد علی، اقبال کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے ۶۶۔ فروری ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے ممبر لاہور آئے اور شفیع لیگ کے سوا ملک کی تقریباً ساری سیاسی جماعتوں نے ان کا بائیکاٹ کیا۔

۷ر فروری ۱۹۲۸ء کو اقبال نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس میں یہ قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ گذشتہ سال ہنگامۂ فسادات لاہور میں جن اشخاص کو سزائیں دی گئیں، انہیں معاف کر کے رہا کر دیا جائے ۶۷۔ ۲۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو کونسل میں طب اور آیورویدک طریق علاج پر بحث کے دوران انہوں نے فرمایا:

حکومت ایک طرف تو مغربی طب کی حمایت اور دوسری طرف ملکی طب کی عدم حمایت اس لیے کر رہی ہے کہ اس کے پیش نظر تجارتی اغراض ہیں ۔۔۔ طب یونانی کے متعلق بہت سی کتابیں بالخصوص نجیب الدین سمرقندی کی تصانیف اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔ یورپ کے کتب خانوں میں بہت سی ایسی کتابیں موجود ہیں۔ جن کے شائع ہونے سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی جو طب مغربی کی برتری کے فخریہ طور پر قائل ہیں ۔۔۔ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کے باشندے قیمتی دواؤں کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایسے نظام کو جو سستا ہو رواج دینا ضروری ہے۔ اس نکتے کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ یونانی اور آیورویدک طبی نظام ہمارے لیے زیادہ مناسب ہے ۶۸۔

۲۳ر فروری ۱۹۲۸ء کو انہوں نے کونسل میں انکم ٹیکس کے اصولوں کو محاصل اراضی پر عائد کرنے کی بحث میں شرکت کی اور اپنی دلچسپ تقریر میں واضح کیا کہ حکومت لگان وصول کرنا اپنا حق اس لیے سمجھتی ہے کہ وہی زمین کی مالک ہے، لیکن یہ نظریہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا:

پہلا یورپی مصنف جس نے ۱۷۷۷ء میں اس نظریے کی تردید کی وہ ایک فرانسیسی

پیرون نامی تھا۔ اس کے بعد ۱۸۳۰ء میں برگز نے ریاست کے حقِ ملکیتِ زمین کے تصور اور ہندوستان میں اس سے متعلق قانون اور رسوم و رواجات پر وسیع تحقیق کی۔ اس نے اپنی کتاب میں منو کے قوانین، اسلامی شریعت اور ان رسوم کا جو ہندوستان کے مختلف اقطاع، بنگال، مالوہ، پنجاب وغیرہ میں رائج تھیں، مفصل تذکرہ کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تاریخ ہند کے کسی زمانے میں بھی ریاست نے زمین پر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں یہ نظریہ ضرور پیش کیا گیا تھا، مگر محصول کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نظریے کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے ۔۔۔ اگر کوئی شخص زمیندار ہو، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، تو اس کو لگان لازماً ادا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص زمین کے علاوہ اور ذرائع سے دو ہزار سالانہ سے کم آمدنی پیدا کرے تو آپ اس پر ٹیکس عائد نہیں کرتے ۔۔۔ اس صوبے میں منفعت بخش اراضی دس یا گیارہ بیگھے ہے اور پانچ بیگھے اس قسم کی ملکیت کا نصف ہے۔ میری رائے میں اسی اصول پر پانچ بیگھے تک زمین کا لگان معاف کر دینے میں صوبے کی آمدنی میں کوئی خاص کمی نہ ہوگی ۔۔۔ اس سلسلے میں کسی معزز ممبر نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کو روس بھیجنے کی تجویز بھی پیش کی ہے ۔۔۔ میرے معزز دوست کو شاید ان اسباب کا علم نہیں جو انقلابِ روس کا پیش خیمہ تھے۔ ان اسباب کو یہاں تفصیل کے ساتھ پیش کرنا بھی ضروری نہیں ۔۔۔ اس وقت پنجاب کا زمیندار اپنی مالکانہ حیثیت کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس ملک میں ایسے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ہیں جن کی ملکیت دو بیگھے یا دو کنال ہے۔ اگرچہ ان کی حیثیت مزارعین کی سی ہے تاہم وہ انفرادی ملکیت کے حقوق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں لہٰذا میری گزارش ہے کہ حکومت کو قرارداد کے مطالبے پر غور کرنا چاہیے تاکہ چھوٹے زمینداروں کے لیے جن کی زمینی پیداوار ان کے خاندانوں کی پرورش کے لیے بھی قطعی طور پر ناکافی ہے، کوئی بہتری کی صورت نکل آئے ۶۹۔

۸ / اپریل ۱۹۲۸ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے فلسفۂ اسلام کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔ انہی ایام میں وہ الٰہیاتِ اسلامیہ سے متعلق مقالوں کا ایک سلسلہ تحریر کر رہے تھے اور یہ خطبہ اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۷

۔

اس مرحلے پر ان سوالات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے کہ جناح لیگ نے جو تجاویزِ دہلی کی بنا پر ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی اور جس نے سائمن کمیشن کا مقاطعہ کر رکھا تھا کیا حاصل کیا؟ اسی طرح شفیع لیگ نے، جو جداگانہ حقِ نیابت سے دستبردار ہونے کے خلاف تھی اور سائمن کمیشن سے تعاون کرنا چاہتی تھی، کیا پایا؟

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، کانگرس نے اپنے دسمبر ۱۹۲۷ء کے سالانہ اجلاس بمقام مدراس میں تجاویزِ دہلی منظور کر لی تھیں، گو ہندو مہاسبھا ان کی سخت مخالف تھی۔ مارچ ۱۹۲۸ء میں کانگرس کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح جناح لیگ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان کے آئندہ دستور کی ترتیب کے لیے فرقہ وارانہ تناسب کا مسئلہ طے کرنا تھا، لیکن کانفرنس کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ بعد میں بھی چند اجلاس ہوئے مگر ملتوی کر دیے گئے۔ اسی دوران میں برطانیہ کے وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے چیلنج دیا کہ ہندوستانی خود کوئی متحدہ دستوری سکیم تیار کر کے دکھائیں۔ چنانچہ ۱۹ / مئی ۱۹۲۸ء کو ایک کمیٹی پنڈت موتی لعل نہرو کی قیادت میں بنی، جسے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ اگست ۱۹۲۸ء میں پیش کی، اِسے نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے۔ اس رپورٹ کے نمایاں پہلو یہ تھے: سب اختیارات صوبوں سے لے کر مرکز کو دیے گئے اور یوں وفاقی طرز حکومت کی بجائے وحدانی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ سندھ کی علیحدگی کو اس

وقت تک ملتوی کر دیا گیا جب تک کہ صوبہ مالی حیثیت سے خود کفیل ہو۔ نشست کی تعین کے بغیر مخلوط انتخابات پر زور دیا گیا اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کا ایک تہائی کا مطالبہ ردّ کر کے انہیں تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستوں کا حق دیا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے یا صوبہ سرحد و بلوچستان میں دستوری اصلاحات نافذ کرنے کا ذکر تک بھی نہ کیا گیا۔ مختصراً وہی تجاویز دہلی جنہیں کانگرس کے اجلاسِ عام منعقدہ مدراس میں پنڈت موتی لعل نہرو منظور کرانے میں پیش پیش تھے، پنڈت موتی لعل نہرو ہی کی زیر قیادت کمیٹی کی رپورٹ کے ذریعے ختم کر دی گئیں۔ بہرحال جناح لیگ کو اب بھی توقع تھی کہ رپورٹ مناسب ترمیمات کے ساتھ قبول کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو ترمیمات محمد علی جناح نے پیش کیں وہ یہ تھیں: باقی اختیارات صوبوں کو دیے جائیں، مرکز میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی نشستیں رکھیں جائیں اور پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے لیے یا تو بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات ہوں یا کونسلوں میں مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب میں محفوظ کر دی جائیں۔ لیکن محمد علی جناح کی ترمیمات رد کر دی گئیں اور نہرو رپورٹ ہندو مہاسبھا کی مرضی کے مطابق بغیر کسی ردوبدل کے منظور کر لی گئی۔ پس تجاویز دہلی کو "نہرو رپورٹ" میں ترمیمات کے ذریعے داخل کرانے یا ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں محمد علی جناح کی آخری کوشش ناکام رہی اور بقول محمد احمد خان اقبال کی پیش گوئی کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتے پر رضامند ہو سکیں۔ پتھر کی لکیر ثابت ہوئی ا؎۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتے میں یہ الٹی میٹم بھی دیا گیا کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ نے ایک سال کے اندر نہرو رپورٹ کو منظور نہ کیا تو کانگرس عدم تعاون اور عدمِ ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دے گی۔

دوسری طرف شفیع لیگ نے سائمن کمیشن کو پیش کرنے کے لیے مسلمانوں

کے مطالبات کی یادداشت کا مسودہ تیار کرنے کی غرض سے مئی ۱۹۲۸ء میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس میں اقبال بھی شامل تھے۔ اقبال نے کمیٹی کے پہلے اجلاس میں صوبجاتی خودمختاری کے مطالبے کی اہمیت کا ذکر کیا۔ مگر اسی دوران میں وہ دردِ گردہ میں مبتلا ہوئے اور انہیں حکیم نابینا (حکیم عبدالوہاب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری) سے علاج کی خاطر دہلی جانا پڑ گیا۔ اس لیے وہ شفیع لیگ کی یادداشت کے حتمی مسودے کی ترتیب میں شریک نہ ہو سکے[۴۲]۔ جب دہلی سے واپس لاہور آئے تو اخبارات میں یادداشت کی تفصیل پڑھ کر سخت برہم ہوئے کیونکہ اس میں مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ نہ کیا گیا تھا۔ اسی بناء پر انہوں نے ۲۴ رجون ۱۹۲۸ء کو شفیع لیگ کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا اور اس سلسلے میں اپنے اخباری بیان میں فرمایا:

میں اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں لیگ کی یادداشت کے جو حصے شائع ہوئے ہیں ان میں مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ ایسی وحدانی حکومت کی تجویز پیش کی گئی ہے جس میں قانون نظم وضبط اور عدلیہ گورنر کی براہِ راست نگرانی میں رہیں گے۔ مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ تجویز دوعملی کی ایک نقاب پوش صورت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دستوری ترقی ہی نہ ہو۔ چونکہ مجھے اب بھی اپنی اس رائے پر اصرار ہے جو میں نے مسودہ نگار کمیٹی کے پہلے اجلاس میں ظاہر کی تھی اور وہ یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو چاہیے کہ مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ کرے، اس لیے مجھے ان حالات میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری نہیں رہنا چاہیے۔ براہ مہربانی میرا استعفیٰ قبول کرلیا جائے[۴۳]۔

اقبال کے استعفیٰ کا اثر یہ ہوا کہ سر محمد شفیع کو لیگ کی یادداشت میں ترمیم کر کے مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ اس میں شامل کرنا پڑا اور اس کے بعد اقبال نے بھی یادداشت پر اپنے دستخط کر دیئے[۴۴]۔

۵ر نومبر ۱۹۲۸ء کو شفیع لیگ کے ایک وفد نے، جس میں اقبال بھی شامل تھے، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دی۔ بالآخر کمیشن نے کچھ حد تک مسلمانوں کے مطالبات قبول کر لینے کی سفارش کی۔ تاہم اقبال کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن نہ تھے۔ وسط ۱۹۳۰ء میں جب سائمن رپورٹ شائع ہوئی تو انھوں نے اپنے بیان مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۳۰ء میں اس پر کڑی تنقید کی ۷۵۔ بہر حال گول میز کانفرنس کے متعلق وائسرائے کے اعلان نے سائمن رپورٹ کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ لہٰذا یہ مشق بھی بارآور ثابت نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ کے کچھ حصے اخبارات میں شائع ہوئے تو اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار ایک بیان مورخہ ۲۰ر اگست ۱۹۲۸ء میں کیا۔ انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے بالغوں کو رائے دہی کے حقوق کے متعلق واضح کیا کہ بیس سال کے مسلم بالغوں کی تعداد کل بالغ مردوں کے مقابلے میں ۵۴ فیصد ہے، حالانکہ پنجاب میں کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب ۵۶ فیصد ہے۔ رپورٹ میں تجویز کردہ طریق انتخاب سے مسلمانوں کے دو فیصد خسارے سے ہندوؤں اور سکھوں کے تناسب آبادی میں دو فیصد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم بالغہ خواتین کو تمام صوبے کی بالغہ خواتین میں ۵۵ فیصد کی نسبت حاصل ہے، لیکن وہ غیر تعلیم یافتہ اور بے حد قدامت پسند ہیں۔ اس لیے کافی دیر تک ان کا پولنگ اسٹیشن پر ووٹ دینے کے لیے انتظار میں کھڑے رہنا محال ہے۔ غیر مسلم خواتین مقابلتاً زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ لہٰذا وہ زیادہ تعداد میں رائے دینے کے لیے جائیں گی۔ سو یوں بھی مسلمانوں کی نشستوں کی تعداد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ پھر ایک لاکھ آبادی کی طرف سے ایک نمائندہ مقرر کرنے سے پنجاب میں حلقہ جاتِ انتخابات کی از سرِ نو تقسیم کرنا پڑے گی۔ اس سے بھی مسلمانوں کی نیابت کو نقصان پہنچنے اور اکثریت سے اقلیت میں جانے کا

اندیشہ ہے ۷۶۔

اسی ماہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی نے مسلم نقطۂ نظر سے نہرو رپورٹ کی خامیاں دور کرنے کی کوشش کی اور غالباً مولانا حسرت موہانی نے اپنی تجویز کو دہرایا کہ شمال مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کو مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے، لیکن نہرو کمیٹی پہلے ہی اس تجویز کو اس بنا پر مسترد کر چکی تھی کہ یوں سارے شمال مغرب میں پھیلا ہوا ایک ایسا صوبہ وجود میں آجائے گا جس کا انتظام کرنا مشکل ہو جائے گا ۷۷، چنانچہ مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور مولانا شوکت علی نے بھی نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز کانفرنس کے خلاف اخبارات میں بیانات شائع کیے۔ اقبال نے ان بیانات کو پڑھ کر ۴ ستمبر ۱۹۲۸ء کو فری پریس کے نمائندے سے ملاقات کے دوران کہا:

مجھے ڈر ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے فیصلہ جات اور مولانا شوکت علی کے وہ حیرت انگیز انکشافات، جو انہوں نے اپنے ابتدائی بیان میں کیے ہیں، ہندوستان کی فرقہ وار صورتِ حال کو بد سے بدتر بنا دیں گے ۔۔۔ ہندوستان کا مسلمان اب اس جذبے کو از سرِ نو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور ہو جائے گا، جسے ہندی قومیت کے جذبے سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جونہی وہ اس امر پر غور کرے گا وہ اپنے آپ کو مولانا شوکت علی کی طرح پائے گا، جن کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں اور جو کمال رنج اور احساسِ درد کے ساتھ اپنے دل کو آزادی کے اس جوش اور جذبے سے خالی پاتے ہیں جس نے ان کی ہستی میں ایک قسم کی بجلی بھر رکھی تھی۔ تمام باتیں مسلمانوں کے احساسِ عدم اعتماد کو مستحکم و مضبوط کرنے کا موجب ہوں گی ۔۔۔ ذاتی طور پر میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا حامی ہوں۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو مسلمانانِ ہند اور خاص کر مسلمانانِ پنجاب کی موجودہ اقتصادی حالت

ہے، لیکن بڑی وجہ فرقہ وارامن و آتشی کے قیام کا احتمال ہے، جو میرے خیال میں صرف جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی سے متعین ہوسکتا ہے۷۸۔

۷رنومبر ۱۹۲۸ء کو اقبال نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس میں چند قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا۔جس کا مقصد صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے علیحدہ یونیورسٹیوں کے قیام کی خاطر حکومت ہند کی توجہ مبذول کرانا تھا اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں جن زمینداروں کی اراضیات دریاؤں یا نالوں میں سیلاب کے سبب برباد ہوگئی تھیں، انہیں نیلی بار منٹگمری کی نو آبادی میں مناسب اراضی دلوانا تھا ۷۹۔اسی ماہ انہوں نے اورینٹل کانفرنس لاہور کے اجلاس میں شرکت کی اور مسلم سائنسدانوں کے عمیق تر مطالعہ کی دعوت کے موضوع پر انگریزی میں ایک جامع مقالہ پڑھا۸۰۔

نہرو رپورٹ نے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کردی کہ کانگرسی لیڈروں کا وسیع النظر یا اعتدال پسند طبقہ بھی ہندو مہاسبھا کے زیر اثر ہے۔ چنانچہ کوشش کی جانے لگی کہ اس کے خلاف مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔اس تگ و دو کے نتیجے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس وجود میں آئی۔اقبال اس کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے اور انہوں نے کانفرنس کے لیے مسلمانوں کے مطالبات مرتب کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۸۱۔۲۹ردسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت آغا خان دہلی میں منعقد ہوا، جس میں جناح لیگ کے سوا تمام مسلم جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔اجلاس میں نہرو رپورٹ کی مذمت کی گئی اور بالآخر ایک قرارداد منظور کی گئی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہو اور باقی اختیارات صوبوں کو دیے جائیں۔

۲۔ مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

۳۔ مسلمانوں کو جداگانہ حقِ نیابت سے کسی صورت میں محروم نہ کیا جائے۔

۴۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ بروئے کار لائی جائے اور مسلم اقلیتی صوبوں میں انہیں جو نشستیں حاصل ہیں وہ برقرار رکھی جائیں۔

۵۔ کسی بھی مذہبی یا تمدنی مسئلے سے متعلق قانون منظور نہ کیا جائے اگر اس کی مخالفت اقلیت کے تین چوتھائی اراکین کریں۔

۶۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

۷۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۸۔ دستور اساسی میں مسلمانوں کے مذہب، تمدن، شخصی قانون، تعلیم اور زبان کا تحفظ کیا جائے۔

۹۔ مرکزی و صوبائی کابینہ میں مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دیا جائے۔

۱۰۔ دستور اساسی میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہ کی جائے جب تک وفاق کے تمام اجزا یعنی ریاستیں اور صوبے اس پر متفق نہ ہوں۸۲۔

اقبال نے قرارداد کی حمایت میں اپنی تقریر میں فرمایا:

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں۔ جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک

پولیٹکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۸۳۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس سے فراغت کے بعد اقبال دہلی سے ۲ر جنوری ۱۹۲۹ء کو چوہدری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی کی معیت میں جنوبی ہند کے دورے پر روانہ ہو گئے اور اس دورے کے دوران میں انہوں نے الٰہیات اسلامیہ کے موضوع پر مدراس، میسور، بنگلور اور حیدر آباد دکن میں خطبات دیے۔ جنوری ۱۹۲۹ء کے آخر میں وہ واپس لاہور پہنچے۔

اقبال افغانستان کے حالات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ وہ ایک مسلم ملک ہونے کے علاوہ برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کا ہمسایہ تھا۔ افغانستان کو تیسری افغان جنگ کے بعد امیر امان اللہ خان کے ہاتھوں مکمل آزادی نصیب ہوئی تھی، اس لیے اقبال کو امیر امان اللہ خان کی ذات سے نہ صرف عقیدت تھی، بلکہ ان سے انہیں بڑی توقعات بھی وابستہ تھیں۔ اسی بنا پر انہوں نے اپنی تصنیف ''پیام مشرق'' امیر امان اللہ خان کے نام معنون کی۔ لیکن امیر امان اللہ خان نے افغانستان میں چند ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جو سیکولر نوعیت کی اور اسلام کے منافی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء ان کے خلاف ہو گئے اور ۱۴ر نومبر ۱۹۲۸ء کو افغانستان میں بغاوت کی ابتداء ہوئی، ہندوستان کی انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے پیش نظر باغیوں کی امداد کی۔ بالآخر ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کو بچہ سقہ نامی ایک باغی نے کابل پر قبضہ کر لیا اور امیر امان اللہ خان کو ملک بدر کر دیا گیا۔ گو بچہ سقہ

نے کابل میں اپنی بادشاہت کا اعلان جاری کیا، مگر ملک بھر میں خانہ جنگی کی کیفیت طاری رہی۔ ۲۶؍ فروری ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ''ٹریبیون'' اخبار کے نمائندے نے افغانستان کے حالات کے متعلق اقبال کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے فرمایا:

معلوم ہوتا ہے کہ شہریار غازی کی ناکامی کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ انہوں نے اصلاحات نافذ کرنے میں عجلت اور فوج کی طرف توجہ کرنے میں غفلت سے کام لیا اور دنیا کے ملاؤں کے نظریے کے خلاف حقیقی ترقی میں گہری دلچسپی لی۔ اس سے بلاشبہ افغانستان کے چند علماء ناراض ہو گئے۔۔۔۔ اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پسند اسلام بغیر جدوجہد کے سر تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ ضروری چیزیں فی الحقیقت قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزل ارتقا طے کرتی ہے۔[۸۴]

بہرحال افغانستان کے حالات سرعت سے بدلتے چلے گئے۔ بچہ سقہ کی حکومت جو صرف کابل تک محدود تھی، دیرپا ثابت نہ ہو سکتی تھی، اس لیے کسی ایسی متبادل قیادت کی ضرورت تھی، جس پر افغان بحیثیت مجموعی اعتماد کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت برطانیہ نے پیرس میں مقیم افغان سفیر جنرل نادر خان سے رابطہ قائم کیا۔ جنرل نادر خان نے تیسری افغان جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا

اوٹل کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دی تھی ۔ چنانچہ جنرل نادر خان حکومت برطانیہ کی دعوت پر ہندوستان آئے ۔ اقبال انہیں جانتے تھے، اس لیے جب جنرل نادر خان لاہور پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں اقبال بھی لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے ۔ اقبال نے ان کی امداد کے لیے اپنی جیب سے پانچ سو روپے کی رقم پیش کی جو جنرل نادر خان نے انتہائی شکریے کے ساتھ انہیں لوٹا دی ۔ بالآخر جنرل نادر خان اور ان کے بھائیوں نے آزاد علاقے میں وزیری اور محسود قبائل پر مشتمل لشکر تیار کیا اور انگریزی حکومت کے فراہم کردہ ہتھیاروں کے ساتھ افغانستان میں داخل ہو گئے، لیکن جب تک وہ افغانستان کی جنگ میں مصروف رہے، اقبال نے کسی نہ کسی طریقے سے ان کی مدد جاری رکھی ۔ اس سلسلے میں اقبال کی خدمات کا اعتراف جنرل نادر خان نے اپنے ایک مکتوب محررہ ۲ / اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کیا، جس میں انہوں نے اقبال کو لکھا:

آپ نے اپنے ان عالی جذبات ہمدردانہ سے، جو آپ افغانستان کی موجودہ تباہ حالی کے متعلق رکھتے ہیں ۔ مجھے اور افغانستان کے عام بہی خواہوں اور فداکاروں کو ممنون و متشکر بنا دیا ہے ۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے، اس کی بے چارہ ملت کو بہت بڑے تہلکہ کا سامنا ہے ۔ افغانستان اپنے ہندی بھائیوں کی ہر قسم کی امداد و اعانت کا محتاج ہے ۔ آپ ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قدم اٹھا رہے ہیں، وہ ہمارے لیے ڈھارس کا موجب ہے خصوصاً مالی امداد کا مسئلہ جس کے متعلق میں اخبار ''اصلاح'' کے ذریعے سے اپنے ہندی بھائیوں کے لیے شائع کر چکا ہوں، بہت حوصلہ افزا ہے ۔ امید ہے کہ جناب فاضل محترم جو روحاً افغانستان کی موجودہ مصیبت میں شریک ہیں، اس موقع پر اپنی مساعی سے کام لے کر افغانستان کی رنج زدہ قوم کو ہمیشہ کے لیے ممنون و مشکور فرمائیں گے ۔

باحترامات لائقہ ۔ محمد نادر خان ۸۵ ۔

جنرل نادر خان کو وسیع مالی امداد فراہم کرنے کی خاطر سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے ایک جلسہ لاہور میں ۳؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں باہمی مشورے کے بعد اتفاق رائے سے قرار پایا کہ فی الفور نادر خان ہلال احمر فنڈ کے نام سے ایک فنڈ کھول دیا جائے۔ سرمائے کی فراہمی کے لیے ایک مجلس عاملہ قائم کی گئی، جس کے صدر اقبال منتخب ہوئے۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مسلمانانِ ہند کے نام ایک اپیل بھی شائع کی۔ جس میں کہا:

اس وقت اسلام کی ہزارہا مربع میل سرزمین اور لاکھوں فرزندانِ اسلام کی زندگی اور ہستی خطرے میں ہے اور ایک دردمند اور غیور ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند پر ہی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کو بادفنا کے آخری طمانچہ سے بچانے کی لیے جس قدر دلیرانہ کوشش بھی ممکن ہو کر گزریں ۸۶۔

غرض انہی ایام میں جنرل نادر خان اور ان کے لشکر نے کابل فتح کر لیا اور ۱۶؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو افغانستان میں محمد نادر شاہ کی بادشاہت قائم ہو گئی۔

۴؍مارچ ۱۹۲۹ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں خسارے کے صوبائی بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے یہ تجاویز پیش کیں: صوبائی حکومت کو چاہیے کہ حکومتِ ہند کو آمادہ کر کے انکم ٹیکس کو صوبجاتی بنائے۔ اموات پر ڈیوٹی لگائی جائے اور ایسے محصولات کی وصولی کے لیے ایک حد مقرر کی جائے۔ مثلاً ایسے لوگ جنہیں بیس یا تیس ہزار روپیہ کی مالیت کی جائداد ورثے میں مل رہی ہو، بڑی تنخواہیں کم کی جائیں اور مشینری ارزاں ترین منڈیوں سے خریدی جائے ۸۷"۔

نہرو رپورٹ میں جناح ترمیمات کی نامنظوری کے تلخ تجربے کے بعد محمد علی جناح کو یہ احساس ہو گیا کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتا ممکن نہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف مبذول کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر جو مطالبات آل پارٹیز مسلم

کانفرنس نے اپنی قرارداد میں شامل کر رکھے تھے، ان میں اضافہ کی گنجائش ہے اور یہ اضافی نکات انھوں نے مرتب بھی کر لیے، اس کے ساتھ ہی وہ چاہتے تھے کہ مسلم قائدین کا آپس میں اختلاف ختم ہو جائے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۹ء میں محمد علی جناح اور سر محمد شفیع کی ملاقات ہوئی اور یہ طے پایا کہ دونوں لیگوں کا اکٹھا اجلاس دہلی میں طلب کیا جائے، جس میں نہرو رپورٹ کی مذمت کی جائے اور مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کی ایک ایسی جامع قرارداد پیش کی جائے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اس پروگرام کے تحت شفیع لیگ کے ارکان، جن میں اقبال بھی شامل تھے، دہلی پہنچے۔ یہی وہ موقع تھا جب اقبال اور محمد علی جناح کے سیاسی افکار میں، دونوں کی زندگی میں، پہلی بار ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی جو آخری دم تک قائم رہی۔ اس کا اعتراف محمد علی جناح نے اپنے ایک خط بنام انعام اللہ خان محررہ ۱۶ ر مئی ۱۹۴۴ء میں کیا ہے فرماتے ہیں:

۱۹۲۹ء سے میرے اور سر محمد اقبال کے نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہ ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے۔ جنہوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور آخری دم تک میرے ساتھ مضبوطی سے کھڑے رہے ۸۸۔

تاہم بدقسمتی سے اس وقت دونوں لیگوں کا اتحاد نہ ہو سکا۔ جناح لیگ کے اجلاس مورخہ ۳۱ ر مارچ ۱۹۲۹ء میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروپ کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہنگامہ برپا ہو گیا اور محمد علی جناح کو غیر معینہ مدت کے لیے اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ اقبال نے جناح لیگ میں موجودہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروپ کی کارکردگی سے پردہ اٹھاتے ہوئے سر عبدالقادر اور سر فیروز خان نون کی معیت میں ۷ر اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک بیان میں واضح کیا کہ:

لاہور لیگ کے ارکان کی ایک بہت بڑی تعداد، جن میں کئی ایم۔ ایل۔ سی اور دیگر سرکردہ حضرات شامل تھے، محض اس مفاہمت کی بنا پر دہلی گئی کہ جناح لیگ اس

قرارداد کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے، جو آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی نے ہز ہائی نس آغا خان کی زیرِ صدارت مسلمانوں کے متحدہ مطالبے کے طور پر پاس کی تھی۔ ہمیں یہ معلوم کر کے سخت مایوسی ہوئی کہ اگرچہ مسٹر جناح متذکرہ تجویز کو منظور کرنے کے لیے ذاتی طور پر تیار تھے، کیونکہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے نقطۂ نگاہ کی نمائندگی کرتی تھی، جیسا کہ ان کی تیار کردہ قرارداد سے ظاہر ہے۔ تاہم ان کی لیگ میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو ہر حال میں نہرو رپورٹ کی تائید کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس نے اجلاس پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ناواجب کوششیں بھی کی تھیں۔۔۔۔ نہرو رپورٹ کی مختصر سی حامی ٹولی کا روّیہ دہلی لیگ میں بڑا ہی افسوسناک تھا۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ مسلمان قوم کو اس بات پر پریشان نہ ہونا چاہیے جس پر اس مختصر سے گروہ کی مساعی منتج ہوئی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ محض لیگ کے اجلاس کے التواہی میں ہماری فتح مضمر ہے۔ ہم نے مسٹر جناح کو ایک مکتوب لکھا تھا، جس میں یہی تجویز کی گئی تھی۔ یہ خط اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ جس مقصد کے لیے لیگ کے اجلاس کو مئی کی بجائے مارچ میں منعقد کیا گیا تھا، یعنی دونوں لیگوں کے درمیان اتحاد کرانے کی کوشش، اس مقصد کے پیشِ نظر اگر التوائے اجلاس ہمارے مکتوب کے باعث عمل میں آتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ خیر جس طرح بھی ہوا اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی عام رائے نہرو رپورٹ کے خلاف ہے [۸۹]۔

محمد علی جناح نے جناح لیگ میں موجود نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروہ سے بیزار ہو کر آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد کے دس مطالبات میں کچھ ترمیم (یعنی مرکز اور صوبے کی ہر وزارت میں ایک تہائی حصہ مسلمان ضرور ہوں) اور چار مطالبات کا اضافہ کر کے اپنا فارمولا، جو چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوا، اخباروں میں شائع کرا دیا۔ چار اضافی مطالبات حسبِ ذیل تھے:

۱۔ صوبوں کو کامل خودمختاری حاصل ہو گی اور تمام صوبے خودمختاری میں مساوی طور

پر شریک ہوں گے۔ یعنی تمام صوبوں کو یکساں اختیارات حاصل ہوں گے۔

۲۔ صوبوں کی سرحدات میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جائے گی، جس کا بُرا اثر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت پر پڑتا ہو۔

۳۔ تمام قوموں کو ضمیر کی پوری آزادی۔ عقیدہ، عبادات و رسوم، تعلیم و تبلیغ اور اجتماع و تنظیم کی کامل آزادی حاصل ہو گی۔

۴۔ حکومت اور دیگر خود مختار اداروں کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے پہلو بہ پہلو مناسب حصہ صلاحیت و کارکردگی کا لحاظ کرتے ہوئے دیا جائے گا۔۹۰

محمد علی جناح کے چودہ نکات کی اشاعت کے بعد جناح لیگ اور شفیع لیگ کے اختلافات ختم ہو گئے، لیکن دونوں لیگوں کا صحیح اتحاد ۲۸ رفروری ۱۹۳۰ء ہی کو عمل میں آیا، جب ڈاکٹر انصاری، چوہدری خلیق الزمان، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر کچلو اور ان کے ہمنوا جناح لیگ سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر کچلو اور ابوالکلام آزاد، نے تو کانگرس کا رُخ اختیار کیا، لیکن باقیوں نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی بنالی، جس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے اور سیکرٹری چوہدری خلیق الزمان۔۹۱ اب چودہ نکات مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں کے مشترکہ و متفقہ مطالبات قرار پائے لیکن چونکہ ماضی میں لیگ کے دولخت ہونے یا جناح لیگ میں موجودہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے عنصر کے سبب بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کی پوزیشن خاصی کمزور ہو گئی تھی، اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کو بھی مسلمانانِ ہند کے فعال سیاسی ادارے کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے۔

۱۴ر اپریل ۱۹۲۹ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے 'قرآن کا مطالعہ' کے موضوع پر ایک محققانہ اور فلسفیانہ خطبہ دیا اور یہ اجلاس دماغی اور روحانی روشنی کا بہتا ہوا چشمہ قرار دیا گیا۔۹۲

ستمبر ۱۹۲۹ء میں فلسطین میں حکومت برطانیہ کی یہودی نواز حکمت عملی کے سبب مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیلا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر حکومت برطانیہ نے اعلان بلفورڈ کے ذریعے عالمی صیہونی جماعت سے وعدہ کیا تھا کہ عربوں کے مفاد کو متاثر کیے بغیر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد دنیا کے مختلف ممالک سے یہودی دھڑا دھڑ فلسطین میں آباد ہونے لگے، جس پر مقامی عربوں نے احتجاج کیا۔ اسی دوران میں یہودی مسجد اقصیٰ کے ایک حصے پر قابض ہو گئے اور فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس میں فلسطینی عرب یہودیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے لگے۔ اس صورت حال سے برصغیر کے مسلمان سخت مشتعل ہوئے اور مختلف شہروں میں احتجاجی جلسے منعقد کیے گئے۔ ۷/ ستمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ایک عظیم الشان جلسہ جس میں ہر جماعت کے لوگ شامل تھے، بیرون دہلی دروازہ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اقبال نے اپنے خطبے میں فرمایا:

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ مسلمانوں کا ضمیر حُبِ وطن کے جذبات سے خالی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ حُبِ وطن کے علاوہ مسلمانوں کے دل میں دینیت و محبت اسلام کا جذبہ بھی برابر موجود رہتا ہے اور یہ وہی جذبہ ہے جو ملت کے پریشان اور منتشر افراد کو اکٹھا کر دیتا ہے، اور کر کے چھوڑے گا اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔۔۔۔ فلسطین میں مسلمان اور ان کے بیوی بچے شہید کیے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے، جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے جس پر قبضہ و تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں۔ قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا۔ ۱۹۱۴ء میں انگریز

مدبروں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے یہودیوں کو آلہ کار بنایا، صیہونی تحریک کو فروغ دیا اور اپنی غرض کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال کیے گئے ان میں سے ایک کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے یہودی مسجد اقصیٰ کے ایک حصے کے مالکانہ تصرف کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ انہوں نے آتشِ فساد مشتعل کر رکھی ہے۔ مسلمان، ان کی عورتیں اور بچے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں۔ فلسطین کے عربوں کی مجلس اعلیٰ نے اعلان کیا ہے کہ حکمدار حکومت نے یہودیوں کو مسلح کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اس قدر خون ریزی ہو رہی ہے۔ صیہونی تحریک مسلمانوں کے لیے کوئی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرے گی، بلکہ اس سے غیر معمولی فتنوں کے ظہور پذیر ہونے کا خطرہ ہے۔ اب حکومت برطانیہ نے فلسطین میں تحقیقاتِ حالات کے لیے ایک کمیشن بھیجنا منظور کیا ہے، مگر میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتماد نہیں ۹۳۔

اسی سال مرکزی اسمبلی میں شاردا بل پیش ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ چودہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں اور اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کی شادی ممنوع قرار دی جائے۔ اس کے خلاف علماء نے آواز بلند کی، لیکن قانون ازدواج صغرسنی کے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر متوازن تھا اور شریعت اسلامی کے مطابق انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اس قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام والدین کو صغرسنی کی شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن نابالغ لڑکیوں کے مائیں بن جانے کی برائی کو روکنے کے لیے حکم دیتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکی جب تک بالغ نہ ہو جائے خاوند کے گھر نہ بھیجی جائے۔ اس لیے ان کے خیال میں قانون یہ بنانا چاہیے تھا کہ شادی کے بعد جو والدین اپنی نابالغ بیٹی کو خاوند کے گھر بھیجیں گے وہ مستوجب سزا ہوں گے ۹۴۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء کے پہلے ہفتے میں جب راقم پانچ برس کی عمر کو پہنچا تو اسے لاہور کے سیکرڈ ہارٹ مشنری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ پہلے دن جب راقم اسکول گیا تو

سردار بیگم بہت فکرمند تھیں کہ اتنے گھنٹے گھر سے دور کیسے گزارے گا۔ اقبال انہیں دلاسا دیتے، لیکن ساتھ خود بھی پریشانی کے عالم میں علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کب واپس آئے گا۔ چھٹی ہونے پر جب راقم گھر پہنچا تو سردار بیگم برآمدے میں کھڑی اس کی راہ تک رہی تھیں۔ اقبال بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر زنانخانے میں آ گئے اور راقم سے اسکول کے متعلق پوچھتے رہے۔ غالباً انہی ایام میں مولانا محمد علی، اقبال سے ملاقات کے لیے آئے وہ متناسب جسم، میانہ قد اور باریش بزرگ تھے، نہایت خوش پوش، خوش باش اور خوش خوراک تھے۔ راقم کے لیے چاکلیٹ کا ڈبا بمبئی سے تحفے کے طور پر لائے تھے۔ اقبال سے بے تکلفی کے سبب وہ انہیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے اور یہ بات راقم کے لیے بڑے تعجب واستعجاب کی تھی۔ رات کا کھانا وہ عموماً اقبال کے ساتھ کھاتے تھے۔ ان کے قہقہے کوٹھی میں گونجتے اور سردار بیگم انواع و اقسام کے کھانے پکا کر ان کی تواضع کرتیں۔ راقم، اقبال اور سردار بیگم کے ہمراہ دو ایک مرتبہ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب شیخ نور محمد بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھے رہتے۔ جب راقم ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آنکھوں کو ہاتھ کا سایہ دے کر پوچھا کہ کون ہے؟ جب انہیں بتایا گیا کہ جاوید ہے تو ہنس پڑے۔ طاق میں پڑا ایک ٹین کا ڈبا اٹھایا اور اس میں سے برفی نکال کر راقم کو کھانے کے لیے دی۔

۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی آئندہ دستور سازی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے حکومت برطانیہ، برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کرے گی۔ کانگرس نے اس اعلان کی طرف توجہ نہ دی، کیونکہ نہرو رپورٹ کے منظور کیے جانے کے متعلق جو مدت دی گئی تھی اس کے گزر جانے پر وہ عدم تعاون کی تحریک کے لیے تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ اقبال نے چند سیاسی رفقا کے ساتھ اس اعلان کا خیر

مقدم کیا اور اپنے ایک بیان، مورخہ ۳ رنومبر ۱۹۲۹ء میں کہا کہ "مجوزہ کانفرنس کی کامیابی کے لیے دو شرطوں کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ ہندو مسلم اختلافات نمائندگان ہند کے اس تاریخی اجتماع میں جانے سے پہلے طے ہو جانے چاہئیں اور دوم یہ کہ جو نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوں، وہ تمام قوموں کے حقیقی نمائندے ہونے چاہئیں ۹۵۔

نومبر ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں اقبال علی گڑھ گئے اور وہاں مسلم یونیورسٹی میں مزید تین خطبات "الٰہیات اسلامیہ" کے موضوع پر دیے۔ ان ایام میں سر راس مسعود مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۲۹ رنومبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین نے انہیں ایک سپاسنامہ پیش کیا اور آنریری لائف ممبر شپ دی۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں پر نہیں، میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ، خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں، اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں۔ سب سے اوّل چیز انگریزی لٹریچر ہے۔ دوسری بات افکار کی عادت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ڈیماکریسی ہے۔ جس صورت میں یہ ڈیماکریسی آچکی ہے اور جو مقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھائی۔ ذاتی طور پر میں اس ڈیماکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ایک اور بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ

ماضی کو سمجھیں، چونکہ ہم جدید تہذیب اور شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقہ استقرائی کے نتائج وثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر میں ابھی تک یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کرے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۹۶۔

اقبال کی تمنا تھی کہ گول میز کانفرنس سے بیشتر مسلمانوں کا آپس میں مکمل اتحاد ہونا چاہیے اور بعد میں اگر ممکن ہو سکے تو ہندو مسلم اتحاد، تبھی گول میز کانفرنس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں برکت علی محمڈن ہال کے ایک جلسہ مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۹ء میں انہوں نے بڑی دردمندی سے فرمایا:

خدا کے لیے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لیے کچھ کرو۔ تمام اسٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ اسٹیج بناؤ اور آئندہ گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کر لو۔ ہندوؤں کو ایک موقع دو محض تمام حجت کے لیے، تاکہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو

ہو جائے، گو مجھے اس کا یقین نہیں۔ انگلستان متحد ہوگا اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

جنوری ۱۹۳۰ء سے ہندوؤں کی نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور تحریک تقریباً سارا سال جاری رہی نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروہ اور جمعیت العلماء دہلی گروپ کے سوا مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس تحریک میں حصہ نہ لیا۔

۷رمارچ ۱۹۳۰ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں بجٹ پر اپنی آخری تقریر کے دوران میں کہا کہ صوبہ پہلے ہی سے مقروض ہے۔ بیکاری کا مسئلہ روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ تجارت کا بُرا حال ہے۔ حکومت انتظامیہ پر تو بے انتہا خرچ کرتی ہے، لیکن صنعتوں کے فروغ کے لیے کچھ بھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ صوبے میں کپڑا بنانے اور جوتے بنانے کی صنعتوں کا اچھا مستقبل ہے، اس لیے ان صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، کیونکہ صنعتی ترقی ہی سے بیکاری کی لعنت دور کی جاسکتی ہے ۹۸۔

۱۳رجولائی ۱۹۳۰ء کو محمد علی جناح نے لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا تاکہ گول میز کانفرنس کے متعلق لیگ کی پالیسی وضع کی جاسکے اور اس میں شرکت کرنے والے مسلم نمائندگان اس پالیسی کے تحت متحد ہو کر مسلمانوں کے مطالبات پیش کریں۔ کونسل نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں لیگ کا اجلاسِ عام لکھنؤ میں، ۱۷راگست ۱۹۳۰ء کو منعقد کیا جائے۔ محمد علی جناح نے مجوزہ اجلاس کی صدارت کے لیے اقبال کا نام تجویز کیا، جسے کونسل نے اتفاق رائے سے قبول کر لیا۔ بعد ازاں محمد علی جناح نے اقبال سے رابطہ قائم کیا اور وہ بھی اجلاس کی صدارت کے لیے رضامند ہو گئے، مگر بقول سید شمس الحسن یہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا کیونکہ سر فضل حسین پنجاب سے اپنی مرضی کے نمائندے گول میز کانفرنس میں بھجوانا چاہتے تھے اور ان کی رہنمائی کے لیے خود ہی پالیسی مرتب کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ان کے حمایتی لیگ کا اجلاس

ملتوی کرانے کے درپے تھے، لیکن کونسل کے اراکین اجلاس ملتوی کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ انہوں نے سر فضل حسین پر الزام لگایا کہ اجلاس ملتوی کروانے کا اصل مقصد اقبال کے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے امکان کو روکنا تھا، کیونکہ اگر وہ لیگ کے اجلاس کی صدارت کر لیتے تو انہیں بحیثیت صدر مسلم لیگ گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینا پڑ جاتی۔ بہر حال اقبال نے خود ہی اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست کی جو لیگ کونسل نے منظور کر لی۔ بعد میں کوشش کی گئی کہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے انعقاد سے ایک آدھ ہفتہ قبل لکھنؤ میں منعقد کیا جائے، مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ پھر اجلاس کے لیے پہلے بنارس منتخب کیا گیا اور بعد میں اجمیر تجویز ہوا۔ بالآخر طے پایا کہ اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں منعقد کیا جائے ۹۹۔

۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو شیخ نور محمد کا سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔ اقبال ان کی تیمارداری کے لیے سیالکوٹ آتے جاتے رہتے تھے۔ تجہیز و تکفین کے لیے بھی سیالکوٹ گئے اور فراغت کے بعد واپس لاہور پہنچے۔ شیخ نور محمد فطرتاً بڑے دیندار، عالی ظرف، بردبار، ناحق ایذا پہنچانے والوں کو معاف کرنے والے، سادہ، نیک، شفیق، حلیم اور صلح کن تھے۔ عطا محمد اور اقبال کو ان کی چند ہی خوبیاں ورثے میں ملیں ۔ ورنہ باپ کے مقابلے میں دونوں بیٹوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شیخ نور محمد کی لوحِ مزار پر اقبال کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

پدر و مُرشدِ اقبال ازیں عالم رفت ۔۔۔ ما ہمہ راہرواں، منزل ما ملک ابد

ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل ۔۔۔ آمد آواز "اثر رحمت و آغوش لحد"

۱۳۴۹ھ

۳۱ اگست ۱۹۳۰ء کو میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ میں سردار بیگم کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جب انہیں (سردار بیگم) کو علم ہوا کہ نوزائیدہ بچہ لڑکی ہے تو شدید تذبذب

کے عالم میں فرمایا: ہائے اس کا کیا بنے گا، کیونکہ انہیں (یعنی اقبال کو) تو اس کے لیے کوئی بر پسند ہی نہیں آنے کا۔ اقبال نے ایک سال پیشتر اعجاز احمد کی پہلی بیٹی کی ولادت پر انہیں لڑکیوں کے لیے اپنے پسندیدہ ناموں کی فہرست اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی تھی، جو یہ ہے:

منیرہ بیگم، مُنیرہ شرقیہ، قرۃ العین، ارجمند بیگم، عاصمہ، فروغ عاصمہ، کوثری بیگم، انوری بیگم، اسماء، سلمیٰ، خجستہ بیگم ۱۰۰۔

ان ناموں میں سے اعجاز احمد نے اپنی بیٹی کے لیے عاصمہ منتخب کیا اور اقبال نے اپنی بیٹی کے لیے منیرہ بیگم پسند فرمایا۔

۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس شروع ہوئی، جس کا اختتام ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ اس کانفرنس میں کانگرس نے شرکت نہ کی اور لیگ کو سر فضل حسین نے کسی متفقہ پالیسی مرتب کرنے کا موقع نہ دیا تھا، اس لیے سولہ مسلم نمائندوں میں، جن میں محمد علی جناح، مولانا محمد علی، آغا خان، سر محمد شفیع اور فضل الحق (بنگال والے) شامل تھے، کوئی اتحاد نہ تھا، اقبال کو مسلم نمائندوں میں شریک نہ کیا گیا تھا۔ کانفرنس کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ بہر حال برطانیہ کے وزیر اعظم نے دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا اور اس میں کانگرس کی شرکت کے لیے راہ ہموار کر دی۔ مولانا محمد علی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں وفات پا گئے اور محمد علی جناح، حکومت برطانیہ، ہندوؤں اور ہندو یا انگریز دوست مسلم نمائندوں کی سازشوں سے اس قدر بیزار ہوئے کہ سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے لندن ہی میں مقیم ہو گئے۔ اور وکالت شروع کر دی۔ وہ تین سال بعد یعنی دسمبر ۱۹۳۳ء میں ہندوستان واپس آئے اور ان کے ہاتھوں ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کا احیا ہوا۔

کانفرنس کے شروع ہوتے ہی حکومت برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ نے کوشش کی کہ کسی طرح پنجاب اور بنگال کے مسلم نمائندوں کو مخلوط انتخاب قبول کرنے پر

رضامند کیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے سر محمد شفیع اور فضل الحق پر دباؤ ڈالا گیا۔ جب یہ خبر ہندوستان پہنچی تو اقبال سخت مضطرب ہوئے اور انہوں نے ۱۵ر نومبر ۱۹۳۰ء کو آغا خان کے نام اپنے تار میں فرمایا:

تازہ خبریں اضطراب انگیز آرہی ہیں۔ مسلمانانِ پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے اور ان میں ردّوبدل کو ناقابل برداشت خیال کرتی ہے۔ اگر کوئی ردّوبدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا۔ اگر ہندو، مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آئیں ۱۰۱۔

اس تار پر ہندو پریس نے اقبال کے خلاف انتہائی ناراضگی کا اظہار کیا۔ لاہور کے اخبار "ٹریبیون" نے لکھا کہ ہندو مسلم مفاہمت کی راہ میں دراصل اقبال ہی حائل ہیں ۱۰۲۔ لیکن اقبال اپنے خلاف اس پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوئے، کیونکہ پنجاب کے مسلم اخبار نہ صرف ان کے نقطۂ نظر کے حامی تھے بلکہ اقبال ہی کے ایماء پر تجویز پیش کر رہے تھے کہ ایسی مفاہمت کے خلاف عملی اقدام کے طور پر شمالی ہند یعنی پنجاب صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس فوراً بلائی جائے، جس میں دہلی کانفرنس کی تجاویز کی پُرزور حمایت کی جائے۔ اس سلسلے میں ۲۳ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اقبال نے 'مسلم آوٹ لک' کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

پنجاب اور دوسرے حصوں کے مسلمان جداگانہ انتخاب پر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے صدر (نواب محمد اسمٰعیل خان) نے اس باب میں مسلمانوں کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نیز یہ سمجھتے ہوئے کہ فرقہ وار مسائل کے متعلق بیان کردہ مفاہمت مسلمانانِ ہند کے مفاد کے لیے نقصان رساں ہوگی، ہز ہائی نس آغا خان کو تار دیا کہ مسلمان کسی حالت میں بھی جداگانہ انتخاب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پنجاب اور دوسرے صوبوں

سے بھی اسی مضمون کے برقی پیغامات آغا خان اور دوسرے مندوبین کے نام بھیجے جا چکے ہیں۔ میری رائے میں مسلمانوں کا خوف بالکل حق بجانب ہے۔ یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کر کے بیان کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پر زور طریقے پر اظہار کریں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کو بہ اعتبارِ آبادی اکثریت حاصل ہے، ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے[۱۰۳]۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اسی دن یعنی ۲۳؍نومبر ۱۹۳۰ء کو اقبال کی دعوت پر مسلم اکابرین کا ایک اجتماع برکت علی محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا، جس میں اقبال نے اجتماع کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

حالات حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے، جس میں صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب و سندھ کے نمائندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوشِ عمل پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں[۱۰۴]۔

اس اجتماع میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی ایک مجلس استقبالیہ قائم کی گئی، اور اقبال کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۴؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو مجلس استقبالیہ کا اجلاس اقبال کی میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ پر منعقد ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اقبال کی زیرِ صدارت دسمبر ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں ہونے والا ہے، اس لیے اپر انڈیا مسلم کانفرنس دسمبر ۱۹۳۰ء کی بجائے جنوری ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے میں لاہور میں منعقد کی جائے۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو اقبال اور دیگر ارکانِ مجلس استقبالیہ کی طرف سے صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی اہم مسلم شخصیات کے نام اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے متعلق ایک اپیل کی گئی جس کا مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ توجہ ہے:

اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان صوبہ جات کے مسلمانوں کو حالات حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمتِ عملی سے واقف کر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جن سے ملتِ مرحومہ دوچار ہے۔ اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کی اس اکثریت کو، جو ان صوبجات میں ہے، جن کو خدائے حکیم وعلیم وخبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے، جو ارباب دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے، یکجا رکھا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا جائے ۱۰۵۔

بہر حال اپر انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی سر دست ضرورت نہ پڑی، کیونکہ اقبال کے برقی پیغام کے جواب میں آغا خان نے ان کی تسلی کر دی تھی کہ مخلوط انتخاب قبول کر کے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کی خبریں بے بنیاد ہیں۔ اس کے علاوہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے سالانہ اجلاسِ مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اقبال کا انتخاب عمل میں آچکا تھا، اور وہ جو بات کہنا چاہتے تھے، وہاں کہہ سکتے تھے۔ نیز گول میز کانفرنسوں کے نتائج کا بھی انتظار ضروری تھا جو ۱۹۳۳ء تک جاری رہیں۔ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کی بعد میں بھی کبھی ضرورت پیش نہ آئی، تاہم اس کا خیال اقبال کے ذہن میں آخری دم تک رہا ۱۰۶۔

۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے نظام حیدر آباد دکن نے آنا تھا، لیکن انہوں نے بعض مجبوریوں کے باعث معذرت کر دی۔ اس پر نواب صادق علی خان والیِ ریاست بہاولپور نے جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور اقبال نے ان کی خدمت میں تہنیت نامہ پیش کیا ۱۰۷۔

اس سے اگلے روز وہ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے الٰہ آباد روانہ ہو گئے

۔

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال جیسے گوشہ نشین شاعر و مفکر نے عملی سیاست میں اُتر کر گلی کوچوں کی خاک اس لیے چھانی تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو صوبائی اور قومی سطح پر منظم کر کے انہیں اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہندو اکثریت اور انگریزی حکومت دونوں کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے۔ انہوں نے جو عہد اپنی انتخابی تقریروں میں کیا وہی انتخابات کے بعد مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے باب میں کونسل کے اندر اور باہر پورا کر دکھایا۔

پنجاب کونسل میں ان کی شخصیت کا ایک نیا پہلو ظاہر ہوا، اور وہ یہ کہ وہ ایک منجھے ہوئے پارلیمانی مقرر تھے، جس مسئلے پر بھی زبان کھولتے، پوری تیاری کر کے اظہار خیال کرتے۔ ان کی تقریریں عموماً گہری تحقیق، اعداد و شمار اور حقائق پر مبنی ہوتیں۔ بسا اوقات تقریروں کے دوران میں اشعار بھی استعمال کرتے اور ان کا فطری طنز و مزاح کا پہلو بھی نمایاں ہوتا۔ اس کے علاوہ چونکہ بنیادی طور پر وہ فلسفی تھے، اس لیے دیگر ارکان سے بہت آگے سوچتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے، مگر جلد ہی اس کے موقف سے بددل ہو گئے۔ سر فضل حسین سے ہر مرحلے پر اختلاف کیا اور اگر ایک آزاد رکن کی حیثیت اختیار کی تو اس آزادی کی قیمت بھی ادا کرنے سے گریز نہ کیا۔ یہ درست ہے کہ کونسل میں ان کی تقاریر نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہی رہیں، لیکن ان کی بعض تجاویز بڑی دور رس تھیں۔ مثلاً لگان کی وصولی اور انکم ٹیکس کی چھوٹ کے اصول پر جس سے چھوٹے مزارعین کو فائدہ پہنچ سکتا تھا، اموات پر ٹیکس کی وصولی اور انکم ٹیکس کی صوبوں کو سپردگی۔ کونسل میں اقبال کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

صوبے کی عام معاشی خوشحالی، غریبوں کی مالی امداد، بزرگان دین کی توہین کا انسداد، امتناعِ شراب نوشی، شمشیر کی آزادی، یونانی و آیورویدک طریقہ علاج کی ہمت افزائی، دیہات کی بہتر صفائی، عورتوں کی طبی امداد جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ، مسلم

تعلیمی اداروں کی بہتر مالی امداد، محصول فوتی نفاذ، محصول آمدنی کو صوبوں کے سپرد کرنے کی تجویز، اونچی تنخواہوں میں تخفیف، صوبے کی صنعتی ترقی کے مسائل، ان تمام امور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے زمانہ رکنیت کونسل میں وقتاً فوقتاً بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اظہار خیال کیا ہے، لیکن جن مسائل کو آپ نے بڑے زور وشور کے ساتھ پیش کیا وہ محاصل، خصوصاً لگان کی تخفیف اور مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور مسلم مدارس کے ساتھ ناانصافی کے مسائل تھے ۱۰۸۔

کونسل سے باہر بھی اس ہنگامی اور جذباتی دور میں جب لاہور میں آئے دن کسی نہ کسی مسئلے پر ہندو مسلم فسادات برپا ہوتے تھے، وہ ایک مقبولِ عام سیاسی رہنما کی طرح مظلومین کی امداد یا ہندو مسلم مفاہمت کی خاطر شہر کے گلی کوچوں میں گھومے، عوامی جلسوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور جلوسوں میں شریک ہو کر ان کے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ اقبال کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ برصغیر کے مسلمان متحد ہوں، قومی اور ملّی معاملات میں گہری دلچسپی لیں اور انہیں پوری طرح سمجھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ انہیں عالمِ اسلام کے مسائل سے بھی باخبر رکھنا چاہتے تھے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ہمسایہ ملک افغانستان میں کیا ہو رہا ہے، یا فلسطین میں مسلمانوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔

اس پانچ سالہ دور میں کُل ہند مسلم سیاست کے میدان میں اقبال کی کارکردگی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کے سیاسی فکر کا ارتقا صحیح معنوں میں اسی دور میں ہوا۔ وہ ابتدا ہی سے مسلم قومیت کے پرستار تھے۔ اس لیے جداگانہ انتخاب کا اصول ان کے عقیدے کے مطابق مسلمانوں کے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اشد ضروری تھا اور وہ کسی صورت میں بھی اس سے دست بردار ہونا نہ چاہتے تھے۔ یہی نقطہ ان کے تمام سیاسی فکر کا محور تھا اور اسی کے لیے وہ کانگرس سے لڑتے، محمد علی جناح اور مولانا محمد علی سے جھگڑتے یا سر محمد شفیع سے الجھتے رہے مگر اس اصول پر

مستقل مزاجی سے قائم رہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے عملی سیاست میں داخل ہونے کے بعد کب ان کے ذہن میں برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل مسلم ریاست کا خاکہ ابھرنا شروع ہوا؟ اس سلسلے میں ان کی چند تقریروں کے اقتباسات اور بعض واقعات تاریخ وار پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اقبال نے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنی تقریر میں ''تجاویز دہلی'' کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں جداگانہ انتخاب سے دست برداری کی پیشکش کی گئی تھی۔ ۲۸ رجون ۱۹۲۸ء کو اپنے اخباری بیان میں وفاق سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے مکمل صوبجاتی خود مختاری کے مطالبہ پر اصرار کیا۔ ۲۹ ردسمبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں تقریر کے دوران میں واضح کیا کہ ہندوستان کے بعض حصے ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں، اس لیے ان حالات میں مسلمانوں کو علیحدہ طور پر ایک سیاسی پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔

عبدالسلام خورشید کے بیان کے مطابق انہی ایام میں اخبار ''انقلاب'' میں مولانا مرتضٰی احمد خان (میکش) نے چار مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جن میں مسلمانوں کے لیے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے وطنوں کو آزاد کرانے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی بجائے اپنی تمام قوتیں انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے وقف کر دیں، ان مضامین پر ہندو اخبار ''پرتاب'' نے طنزاً لکھا کہ مسلمان اب اس کفرستان میں اسلامستان بنانا چاہتے ہیں۔ عبدالسلام خورشید تحریر کرتے ہیں:

پاکستان بننے کے بعد میں نے والد مرحوم مولانا عبدالمجید سالک سے پوچھا کہ یہ

مقالات مولانا مرتضیٰ احمد خان نے اپنے آپ لکھے یا کسی کے کہنے پر؟ انہوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کے ہاں ہمارا روز کا آنا جانا تھا اور ملاقاتوں میں سیاسی مسائل ہی بیشتر زیر بحث آتے تھے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب سائمن کمیشن کے مقاطعے اور نہرو رپورٹ کے چکر چل رہے تھے اور علامہ اس وقت بھی علیحدہ مسلم مملکت کے قیام ہی کو ہندو مسلم مسئلے کا حل سمجھتے تھے لیکن مسلم لیگ سے وابستگی کی بنا پر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس قسم کی تجویز پبلک طور پر خود پیش کرتے۔ اگر کرتے تو باقی مسلم قیادت سے ان کا رابطہ ٹوٹ جاتا۔ چونکہ ہم مدیران ''انقلاب'' (مہر و سالک) علامہ اقبال کی رہنمائی میں مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے، اس لیے ہم بھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس قسم کی انقلابی تجویز کو پیش کرتے پس باہمی مشورے سے فیصلہ ہوا کہ ہندوؤں کا ردِّ عمل معلوم کرنے کے لیے یہ تجویز مولانا مرتضیٰ احمد خان کی وساطت سے پیش کرائی جائے جو ''انقلاب'' میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، اور پالیسی کے ذمے دار نہیں تھے۔ علامہ نے مولانا موصوف کی متصل رہنمائی کی اور نتیجے میں یہ مقالات چھاپے گئے ۱۰۹۔

۱۹۲۹ء کے اوائل میں جغرافیائی نقشہ جات بنانے میں ماہر ایک جرمن مہمان سے اقبال نے اس وقت کی مردم شماری کی رپورٹ پر انحصار کرتے ہوئے ہندو مسلم تناسب سے ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کے نقشے تیار کرائے جن میں ہندو آبادی کیسری رنگ کے نقطوں سے اور مسلم آبادی سبز رنگ کے نقطوں سے ظاہر کی گئی۔ اقبال کے بھتیجے شیخ مختار احمد کے بیان کے مطابق جن کے کمرے میں جرمن ماہر مقیم تھا اور نقشے بنانے کے کام میں مصروف تھا، ان نقشوں میں بالخصوص پنجاب اور بنگال کے صوبوں کے مختلف اضلاع میں بھی ہندو مسلم آبادی کی تفصیل دی گئی۔ غالباً ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء میں اس جرمن کو اقبال کی اس خدمت پر خراج تحسین ادا کرنے کی صورت میں حکومت پاکستان نے سرکاری مہمان کی حیثیت سے پاکستان

کی سیر کے لیے بلوایا اور وہ راقم اور مختار احمد سے ملاقات کی خاطر لاہور بھی آیا تھا۔

۴؍مارچ ۱۹۲۹ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے انکم ٹیکس کو صوبہ جاتی بنانے کی جو تجویز پیش کی تھی۔ اس زمانے میں اسے ایک انوکھی تجویز سمجھا گیا، لیکن یہ اندازہ نہ لگایا جا سکا کہ ایسی تجویز اقبال نے کس ذہنی پس منظر کے ساتھ پیش کی ہے۔ اقبال کا موقف یہ تھا کہ مرکزی حکومت ہر صوبے سے صرف اپنا حصہ رسدی وصول کرے۔

۳۰؍دسمبر ۱۹۲۹ء کو خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور، جس میں دیگر اکابرین کے ساتھ اقبال بھی موجود تھے، نواب سر ذوالفقار علی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کو شمالی ہند میں ایسا علاقہ دے دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا انہیں مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی آبادی اسّی فیصد سے کم نہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح مشرقی ہند میں بنگال کی ایسی تقسیم کر دی جائے کہ مسلمانوں کی آبادی وہاں اسّی فیصد ہو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ حقوق کے بجائے علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں۔۱۱۰

نواب سر ذوالفقار علی خان، اقبال کے گہرے دوست تھے اور سیاسی اعتبار سے ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ جس طرح مولانا مرتضیٰ احمد خان سے انقلاب میں اسی موضوع پر مضامین لکھوائے گئے۔ اسی طرح ان کے منہ سے اقبال نے خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم پر یہ بیان دلوایا ہو۔

بعد ازاں نومبر ۱۹۳۰ء میں اقبال کے ایما پر مسلم اخبارات نے تجویز پیش کی کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس فوراً بلوائی جائے۔ عبدالسلام خورشید تحریر کرتے ہیں:

انہوں نے مدیرانِ ''انقلاب'' مہر و سالک، مدیر ''سیاست''، سید حبیب، اور مدیر ''مسلم آؤٹ لک'' مجید ملک کو بلا کر تبادلۂ خیال کیا اور انہی کے مشورے پر ''انقلاب''

نے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں یہ تجویز پیش کی کہ شمالی ہند کے مسلمان اپنے مخصوص مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کریں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی ایک علاقائی کانفرنس کرانے کا منصوبہ باندھا گیا، ورنہ اس سے پہلے کانفرنسیں صوبائی اور کُل ہند سطح پر ہوا کرتی تھیں [11]۔

۲۳ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اپر انڈیا مسلم کانفرنس قائم ہوئی اور اقبال اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ دوسرا اجلاس ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ جس میں اقبال اور دیگر ارکانِ مجلس استقبالیہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے ایک اپیل تیار کی گئی، جو بعد میں اخباروں میں چھپی۔ اس اپیل کے الفاظ میں بھی اقبال ہی کا فکر کارفرما تھا، مثلاً

مسلمانانِ ہند کی اس کثرت کو جو ان صوبہ جات میں ہے، جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے، جو ارباب دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی جاتی ہے، یکجا رکھا ہے۔

دوسرے اجلاس میں بعض اصحاب نے سوال اٹھائے کہ کیا کانفرنس کے انعقاد کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کو باقی ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں اور اگر بنگال بھی مسلم اکثریتی صوبہ ہے، تو کانفرنس سے وہاں کے مسلمانوں کو کیوں الگ رکھا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

حضرت علامہ کی طرف سے ''انقلاب'' نے پہلے سوال کا جواب یہ دیا کہ ساری مخالفت مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کے خلاف مرتکز ہے۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے، وہاں کے مسلمانون کو ویٹج یا پاسنگ (آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت) دینے پر نہ ہندوؤں نے کوئی خاص اعتراض کیا ہے، نہ حکومت ہند نے اور نہ سائمن کمیشن نے۔ ایسے میں مسلم اکثریتی خطوں کے رہنماؤں کے درمیان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مشاورت ضروری ہو جاتی ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بنگال کو محض اس لیے مدعو نہیں کیا گیا کہ فاصلے طویل

ہیں۔ بہر حال اگر وہاں کے مسلمان ایسی ہی کانفرنس منعقد کریں تو شمال مغربی خطے کے مسلمان ان کی ہر ممکن مدد کریں گے۱۱۲۔

اس ساری تفصیل سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ سیاسیات کے عملی میدان میں داخل ہوتے ہی اقبال کے ذہن میں برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ریاست کا خاکہ ابھرنے لگا تھا، جس کی جھلکیاں ان کی بعض تقاریر اور تجاویز میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنی ذمے داری پر کوئی ایسا انقلابی تصور پیش کرنے سے پیشتر اس کے لیے زمین ہموار کرنا چاہتے تھے اور اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے مسلم پریس کے ذریعے یا مسلم لیگ کے علاوہ کسی مسلم سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے اپنے دل کی بات کہلوائی تا کہ ہندوؤں کا ردعمل معلوم کیا جا سکے یا مسلم رائے عامہ کو ایسی تجویز کے حق میں تیار کیا جا سکے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ عملی سیاست کے ہنگامے میں وہ اسی مقصد کی تحصیل کے لیے پڑے ہوں، کیونکہ وہ اگر ذاتی منفعت یا شخصی مفاد پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتے تھے تو پھر وہ کون سی غرض تھی جس نے انہیں سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹا تھا؟

اب ایک اور سوال بھی غور طلب ہے۔ مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت کے لیے لیگ کونسل کے اجلاس مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۰ء میں محمد علی جناح نے اقبال کا نام کیوں تجویز کیا؟ محمد احمد خان کی رائے ہے کہ چونکہ اقبال کو کل ہند مسلم سیاسیات میں نہایت ہی نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہو چکا تھا اور ہندو پریس نے انہیں چوٹی کا فرقہ پرست لیڈر قرار دے دیا تھا، غالباً اس لیے انہیں اجلاس الہ آباد کے لیے لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۱۱۳، مگر راقم ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ اقبال اور محمد علی جناح کے سیاسی نظریات میں یگانگت اور ہم آہنگی کا دور مارچ ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا۔ اس مرحلے پر مسلمانانِ برصغیر کے مطالبات کی حتمی صورت یہ تھی کہ اگر وفاقی نظام قائم ہوتا ہے تو چودہ نکات کی بنیاد پر قائم کیا جائے، لیکن ہندو قائدین

چودہ نکات دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔ اس سے پیشتر نہرو رپورٹ میں جناح ترمیمات نامنظور ہو چکی تھیں اور مولانا حسرت موہانی کی وحدانی طرزِ حکومت کے اندر شمال مغرب کے چار صوبوں کے ادغام سے ایک مسلم اکثریتی صوبے کے قیام کی تجویز بھی نہرو کمیٹی نے ابتداء ہی میں مسترد کر دی تھی گویا جناح کے چودہ نکات یا حسرت موہانی کا ''انڈیا کے اندر مسلم انڈیا'' کے قیام کا تصور ہندوؤں کو ناقابلِ قبول تھا۔ اب اس کے بعد اگلا منطقی مطالبہ جو مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیا جا سکتا تھا وہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا جو اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں فی الواقعی پیش کیا۔ سو راقم کا خیال ہے کہ محمد علی جناح اور لیگ کونسل کے بعض ارکان کو معلوم تھا کہ اقبال کے خطبے کا مرکزی نکتہ کیا ہوگا۔ پس اسی سبب اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کے لیے انہیں منتخب کیا گیا۔ لیگ کونسل کے ارکان کا اصرار تھا کہ اجلاس گول میز کانفرنس شروع ہونے سے پہلے منعقد کیا جائے تاکہ کانفرنس کے متعلق لیگ کی پالیسی مرتب کی جا سکے اور اس میں شرکت کرنے والے مسلم مندوبین اس پالیسی کے تحت متحد ہو کر مسلمانوں کے مطالبات پیش کریں۔ یعنی اگر چودہ نکات کی بنیاد پر وفاقی نظام قائم نہ ہوا تو پھر مسلمان وہ سیاسی لائحہ عمل اختیار کریں گے، جس کی طرف لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں اشارہ کیا گیا، مگر اس کوشش کو سر فضل حسین نے ناکام بنا دیا اور جب اجلاسِ الٰہ آباد میں اقبال نے اپنا تاریخی خطبہ دیا تو بیشتر مسلم قائدین گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن جا چکے تھے۔ لہٰذا اقبال کے خطبے کے بعد اس کے مرکزی نکتے کے متعلق کوئی قرارداد منظور نہ کی گئی۔

۱۹۳۰ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسیات میں بڑا انتشار پیدا ہوا۔ مولانا محمد علی فوت ہو گئے اور محمد علی جناح نے لندن میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ ۱۹۳۱ء میں چند ماہ کے لیے سر محمد شفیع مسلم لیگ کے صدر رہے، لیکن انہوں نے وائسرائے کی کونسل کی رکنیت قبول کر لی اور بالآخر ۶ر فروری ۱۹۳۲ء کو انتقال کر گئے۔ بقول سید

شمس الحسن اس کے بعد سر فضل حسین کی کوشش یہ تھی کہ لیگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے دسمبر ۱۹۳۱ء میں دہلی میں اپنے حمایتیوں کی مدد سے سر ظفر اللہ خان کو لیگ کا صدر منتخب کروا دیا۔ اس پر دہلی کے مسلمانوں نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا، کیونکہ وہ سر ظفر اللہ خان کو احمدی ہونے کی وجہ سے غیر مسلم سمجھتے تھے۔ مزید مظاہروں کے خوف سے لیگ کا اجلاس فتح پوری اسکول ہال کی بجائے سید نواب علی نامی ایک ٹھیکے دار کے گھر میں منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں لیگ کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں مدغم کر کے کسی نئی سیاسی تنظیم کی شکل میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، لیکن خوش قسمتی سے سر ظفر اللہ خان جون ۱۹۳۲ء میں وائسرائے کی کونسل میں شامل کر لیے گئے اور انہوں نے لیگ کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ یوں لیگ اپنی موت سے بچ گئی۔ ان کی جگہ پشاور کے میاں عبدالعزیز لیگ کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے، مگر انہوں نے دھاندلی سے لیگ کو ایک گروہی جماعت کے طور پر چلانا چاہا اور سر محمد یعقوب کو سیکرٹری شپ سے علیحدہ کر دیا۔ ۱۹۳۳ء میں بڑی مشکل سے انہیں صدارت سے الگ کیا گیا۔ میاں عبدالعزیز کی جگہ حافظ ہدایت حسین لیگ کے صدر بنے، لیکن اس دوران میں اراکین میں نفاق کے سبب ہنگامہ ہو گیا۔ جس میں عثمان آزاد مدیر روزنامہ ''انجم'' کے چند دانت ٹوٹ گئے اور یوں لیگ مزید انتشار کا شکار ہوئی اور یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہی، جب دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں محمد علی جناح ہندوستان واپس آئے۔ آخر کار ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو محمد علی جناح لیگ کے صدر منتخب کیے گئے اور لیگ کا احیاء عمل میں آیا[۱۱۴]۔

۱۹۳۰ء میں پنجاب کونسل کی مدتِ رکنیت کے خاتمے کے بعد اقبال برصغیر کے مسلمانوں میں ایک اہم سیاسی شخصیت کے طور پر اُبھرے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے منتخب صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد میں اپنا معروف خطبہ دیا۔ بعد میں دو مرتبہ گول میز کانفرنسوں میں شمولیت کے لیے انگلستان گئے۔ آل پارٹیز مسلم

کانفرنس کے اجلاس لاہور کی صدارت کی اور آخری دم تک مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے سیاسی مستقبل میں گہری دلچسپی لیتے رہے، لیکن پھر کبھی صوبائی یا دیگر نوعیت کے انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوئے ۱۱۵۔

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کل ہند مسلم سیاسیات کے محقق کو تاریخی اہمیت کی حامل اگر کوئی تحریریں ملتی ہیں۔ تو ان میں اقبال کے دو خطبات بھی ہیں۔ ایک خطبہ الہ آباد اور دوسرا خطبہ صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور، مورخہ ۲۱/ مارچ ۱۹۳۲ء ان خطبات کا تجزیہ مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان خطبات کے ذریعے اقبال نے نظریاتی اساس پر مسلمانوں کی آئندہ سیاسی حکمت عملی کے لیے ایک رُخ، سمت، نصب العین یا منزل کا تعین کر دیا دراصل مسلمانانِ برصغیر کے لیے اقبال کی خدمات کے دو قابلِ ذکر پہلو اس عہد میں منکشف ہوئے۔ ایک خالصتاً عملی، جس کا تعلق سیاسیات سے تھا اور دوسرا خالصتاً فکری جس کا اظہار وہ شروع ہی سے اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں کرتے چلے آ رہے تھے، مگر اس دور میں انہوں نے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں یہ اظہار اپنے مقالات کے ذریعے کیا۔

مآخذ

باب: ۱۵

۱۔ ''خطوطِ اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحات ۱۶۵، ۱۶۶

۲۔ ''تشکیل پاکستان'' از رچرڈ سائمنڈز (انگریزی)، صفحہ ۳۱، سرسید کی تقریر کا اقتباس۔

۳۔ ''سفینۂ حیات'' مولفہ منشی غلام قادر فرخ، صفحات ۲۲، ۲۳، مکتوب اقبال محررہ ۲۸/مارچ ۱۹۰۹ء

۴۔ ''آئینۂ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۹۶، ۱۹۸ تا ۲۰۰، ۲۰۱

۵۔ ''اقبال کے آخری دو سال''، صفحات ۳۹، ۴۶، ۱۹۳،

۶۔ یہ بات راقم کو چوہدری محمد حسین نے اپنی زندگی میں بتائی تھی۔ اقبال کی شاعری کے متعلق ابتداء ہی سے انگریزی حکومت کی خفیہ رپورٹوں کا سلسلہ جاری تھا اور معائنے کی غرض سے ان کی نظموں، تصویرِ درد اور شمع و شاعر کے انگریزی ترجمے پریس برانچ اور خفیہ پولیس پنجاب کی ہدایات کے تحت ہوئے تھے۔ حکومت پنجاب کے اس خفیہ ریکارڈ کی تفصیل کے لیے دیکھیے مضمون ''علامہ اقبال کی شاعری حکومت کی خفیہ رپورٹوں کے آئینے میں'' از حفیظ رومانی، ''نوائے وقت'' اشاعت خصوصی بیاد اقبال شمارہ ۲۱/اپریل ۱۹۸۳ء

۷۔ چوہدری محمد حسین کی یادداشت کی کتاب ان کے بیٹے چوہدری نفیس احمد کی تحویل میں ہے۔

۸۔ کوٹھی کا کرایہ ایک سو تیس روپے ماہوار تھا جو اس زمانے کے حساب سے زیادہ تھا، دیکھیے ''ملفوظات'' مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۲۰۸۔

۹۔ ''زمیندار'' ۳۰ اپریل ۱۹۲۶ء

۱۰۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۴

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۹ بحوالہ ''زمیندار'' ۵/اکتوبر ۱۹۲۶ء

۱۲۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحہ ۷ کے بالمقابل تحریر اقبال کا عکس، نیز صفحہ ۷

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۷

۱۴۔ ''زمیندار'' ۲۴/اکتوبر ۱۹۲۶ء

۱۵۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۹، ۲۰

۱۶۔ زیب النساء عرف جیبی ایک طوائف تھی اور شہر میں عام مشہور تھا کہ مولوی محرم علی چشتی کا اس سے تعلق ہے۔ محمد حنیف شاہد نے دوسرا مصرع یوں لکھا ہے:
''جگہ کرائے تے گونہیں لبھدی بندا اُنج اعتباری اے'' ''اقبال اور پنجاب کونسل''، صفحہ ۱۸

۱۷۔ میاں امیر الدین کے بیان کے مطابق سر محمد شفیع اور ان کی تقریباً ساری ارائیں برادری ملک محمد دین کی حامی تھی۔ ارائیں برادری کے شاید ہی کسی فرد نے اقبال کو ووٹ دیا ہو۔ سوائے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کے، نواب سر ذوالفقار علی خاں بھی ملک محمد دین کے حامی تھے دیکھیے ''یادایام'' صفحہ ۴۹، ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۲۵ تا ۲۷، ۳۱ تا ۴۰، ۴۷ ''اقبال ایوان اسمبلی میں'' مرتبہ حق نواز، صفحہ ۲۰

۱۸۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۴۶ تا ۵۹

۱۹۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۶۔۱۷

۲۰۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۵۴، ۶۴ تا ۶۶

۲۱۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۸، ۱۹ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۶۶، ۶۷

۲۲۔ راقم کو یہ لطیفہ حفیظ جالندھری نے سنایا

۲۳۔ صفحات ۶۹ تا ۷۴

۲۴۔ ''روز گار فقیر'' سید وحید الدین جلد اوّل، صفحات ۱۰۳، ۱۰۴ ''سر گزشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۲۰۶

۲۵۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحہ ۷۵۔ اس جلوس میں میاں امیر الدین اور سید افضال علی حسنی اقبال کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

۲۶۔ ایضاً، صفحات ۷۵، ۷۶

۲۷۔ ایضاً، صفحات ۷۷، ۷۸

۲۸۔ ایضاً، صفحات ۷۸، ۷۹، ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحات ۱۳۴، ۱۳۵۔

۲۹۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحہ ۷۹

۳۰۔ فضل حسین (انگریزی)، صفحات ۳۱۸، ۳۱۹

۳۱۔ ''اقبال کے آخری دو سال''، صفحہ ۲۷

۳۲۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۱۵۴، ۱۵۵

۳۳۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۰ تا ۲۲

۳۴۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل، صفحات ۲۰۷، ۲۰۸

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۹

۳۶۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۸۰، ۸۱۔ اقبال ہر سال ان کمیٹیوں کے رکن مقرر ہوتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں انہیں لوکل سیلف گورنمنٹ کمیٹی اور کونسل آف اسٹیٹ (پنجاب) کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۰ میں میڈیکل بورڈ کے رکن مقرر ہوئے۔

۳۷۔ ایضاً، صفحہ ۸۱

۳۸۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۲، ۲۳

۳۹۔ ''اقبال اور پنجاب کونسل'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۸۲ تا ۸۶۔ انگریزی متن

کے لیے دیکھیے ”اقبال کی تقریریں اور بیانات“ مرتبہ اے آر طارق (انگریزی)، صفحات ۵۶ تا ۶۱

۴۰۔ ”اقبال کا سیاسی کارنامہ“ از محمد احمد خان، صفحات ۱۰۱ تا ۱۰۳

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۴

۴۲۔ ”اقبال اور انجمن حمایت اسلام“ از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۳

۴۳۔ ”انڈیا ۲۷۔۱۹۲۶ء“ از رش بروک ولیمز (انگریزی)، صفحات ۱۶ تا ۱۹، ۴۷، ”ہند میں نیشنلزم اور اصلاح“ از سمتھ (انگریزی)، صفحات ۳۳۶ تا ۳۴۶

۴۴۔ ”گفتار اقبال“ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۶ تا ۲۸

۴۵۔ ”اقبال کا سیاسی کارنامہ“ از محمد احمد خان، صفحات ۱۶۲۔۱۶۳

۴۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۶

۴۷۔ ایضاً، صفحات ۱۵۵، ۱۵۶

۴۸۔ ”گفتار اقبال“ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۳۲

۴۹۔ ایضاً، صفحہ ۳۷

۵۰۔ ”مکاتیب اقبال بنام گرامی“ مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۲۴۱۔۲۴۲

۵۱۔ ”گفتار اقبال“ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۳۹ تا ۴۶

۵۲۔ ”روزگار فقیر“ از فقیر سید وحید الدین جلد دوم، صفحہ ۳۰، ”سرگذشت اقبال“ از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۲۷۶۔ اہانت رسولؐ کا ایک اور واقعہ ۱۹۳۴ء میں کراچی میں بھی پیش آیا، جہاں نتھو رام، نامی ایک شخص نے اپنی کتاب میں رسول اکرمؐ کی شان اقدس میں گستاخی کی تھی۔ اسے ہزارہ کے ایک نوجوان عبدالقیوم نے قتل کیا۔ عبدالقیوم نے بھی علم الدین کی طرح پھانسی کی سزا پائی۔ جب بعض مسلمانوں نے عبدالقیوم کے لیے رحم کی اپیل کے سلسلے میں وائسرائے تک پہنچنا چاہا تو عبدالقیوم نے کہا کہ میں نے شہادت خریدی ہے، مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی

کوشش نہ کی جائے ،لہٰذا اسے پھانسی دے دی گئی ۔اقبال نے ان واقعات سے متاثر ہوکر ''ضرب کلیم'' میں شامل نظم ''لاہور اور کراچی'' تحریر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''روزگارِ فقیر'' از فقیر سید وحیدالدین جلد دوم، صفحات ۳۰ تا ۳۹

۵۳۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۴۶ تا ۴۸

۵۴۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔آر۔طارق (انگریزی)، صفحات ۶۲ تا ۶۴

۵۵۔ ایضاً ، صفحات ۶۵ تا ۶۹

۵۶۔ ''انقلاب'' ۲۵ر جولائی ۱۹۲۷ء

۵۷۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۴۸، ۴۹

۵۸۔ ایضاً ، صفحات ۴۹ تا ۵۱

۵۹۔ ایضاً ، صفحات ۵۲، ۵۳

۶۰۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۱۷۰

۶۱۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۵۳ تا ۵۶

۶۲۔ ایضاً ، صفحات ۵۷ تا ۶۰

۶۳۔ ایضاً ، صفحات ۶۱ تا ۶۴

۶۴۔ ایضاً ، صفحہ ۶۴

۶۵۔ ایضاً ، صفحہ ۶۵

۶۶۔ ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحہ ۱۳۹

۶۷۔ ''انقلاب'' ۹ر فروری ۱۹۲۸ء

۶۸۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔آر۔طارق (انگریزی)، صفحات ۷۰، ۷۱

۶۹۔ ایضاً ، صفحات ۷۲ تا ۷۸

۷۰۔ اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۵

۷۱۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۱۶۸

۷۲۔ ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحات ۱۴۰، ۱۴۱

۷۳۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۰۴، ۲۰۵

۷۴۔ یادداشت کے خلاصہ کے لیے ملاحظہ ہو ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۱۸۱، ۱۸۲

۷۵۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۹

۷۶۔ ایضاً، صفحات ۶۶ تا ۶۹

۷۷۔ ''نہرو رپورٹ'' باب ۳ (انگریزی)، صفحات ۳۷، ۳۸

۷۸۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۷۰، ۷۱

۷۹۔ ''انقلاب'' ۷ر نومبر ۱۹۲۸ء

۸۰۔ یہ مقالہ ''اسلامک کلچر'' حیدر آباد دکن شمارہ اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''خطباتِ اقبال'' مرتبہ شاہد حسین رزاقی (انگریزی)، صفحات ۱۰۳ تا ۱۱۳۔ اردو ترجمہ از داؤد رہبر کے لیے ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۲۴۷ تا ۲۶۷ ملاحظہ کیجئے۔

۸۱۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۱۹۷

۸۲۔ ایضاً، صفحات ۱۱۷، ۱۱۸

۸۳۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۳۷

۸۴۔ ایضاً، صفحات ۸۴ تا ۸۶

۸۵۔ ایضاً، صفحہ ۹۸

۸۶۔ ایضاً، صفحات ۹۹، ۱۰۰

۸۷۔ ’’اقبال کی تقریریں اور بیانات‘‘ مرتبہ اے۔آر۔طارق (انگریزی)
،صفحات ۷۹ تا ۸۲

۸۸۔یہ خط اخبار میں چھپ چکا ہے اور راقم کے پاس اس کا تراشہ موجود ہے لیکن اخبار
کے نام اور تاریخ اشاعت کا اندراج سہواً رہ گیا۔

۸۹۔ ’’گفتار اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل،صفحات ۸۷ تا ۹۱

۹۰۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان،صفحہ ۱۲۱

۹۱۔ ’’صاف گو مسٹر جناح‘‘ از سید شمس الحسن (انگریزی)،صفحات ۴۹،۵۰

۹۲۔ ’’اقبال اور انجمن حمایت اسلام‘‘ از محمد حنیف شاہد،صفحات ۱۱۵،۱۱۶

۹۳۔ ’’گفتار اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل،صفحات ۹۱ تا ۹۴

۹۴۔ ایضاً،صفحات ۹۴ تا ۹۷

۹۵۔ ایضاً،صفحات ۱۰۰ تا ۱۰۲

۹۶۔ ایضاً،صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۵

۹۷۔ ایضا،صفحات ۱۰۵،۱۰۶

۹۸۔ ’’اقبال کی تقریریں اور بیانات‘‘ مرتبہ اے۔آر طارق (انگریزی)صفحات ۸۳
تا ۸۷

۹۹۔ ’’صاف گو مسٹر جناح‘‘ از سید شمس الحسن (انگریزی)،صفحات ۵۰ تا ۵۳

۱۰۰۔ ’’روزگار فقیر‘‘ از فقیر سید وحیدالدین جلد اوّل،صفحہ ۱۲۲

۱۰۱۔ ’’گفتار اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل،صفحہ ۱۰۹

۱۰۲۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان،صفحہ ۲۰۶ بحوالہ ’’ٹریبیون‘‘ یکم جنوری
۱۹۳۱ء

۱۰۳۔ ’’گفتار اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل،صفحات ۱۱۰،۱۱۱

۱۰۴۔ ایضاً،صفحات ۱۱۲

۱۰۵۔ ایضاً، صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۶

۱۰۶۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۲۱۲ تا ۲۱۴

۱۰۷۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۲۱ تا ۱۲۴

۱۰۸۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحہ ۱۵۱

۱۰۹۔ ''سرگذشتِ اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحات ۲۸۹ تا ۲۹۲

۱۱۰۔ ''علیحدہ مسلم ریاست کا نظریہ'' (تقریر نواب سر ذوالفقار علی خان، اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۲۹ء) مرتبہ محمد رفیق افضل (انگریزی)، صفحہ ۶

۱۱۱۔ ''سرگذشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحات ۲۹۸، ۲۹۹ بحوالہ ''انقلاب'' ۲۱ر نومبر ۱۹۳۰ء

۱۱۲۔ ایضاً، صفحات ۳۰۱، ۳۰۲

۱۱۳۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۲۱۶

۱۱۴۔ ''صاف گو مسٹر جناح'' از سید شمس الحسن (انگریزی)، صفحات ۵۲ تا ۵۶

۱۱۵۔ رحیم بخش شاہین نے اقبال کے ایک مکتوب محررہ ۲۱ر جولائی ۱۹۳۰ء کے حوالے سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نئے صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کی خاطر انبالے کے کسی حلقے سے امیدوار کھڑا ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے، دیکھیے مضمون ''اقبال کا ایک نادر مکتوب''، ''اقبال ریویو''، جنوری ۱۹۸۲ء، صفحات ۵۴، ۵۵، لیکن عین ممکن ہے کہ اس خط کے ذریعے اقبال یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ پنجاب کونسل کے آئندہ انتخابات میں کس قسم کی ذہنیت رکھنے والے یا سیاسی مکتبہ فکر سے وابستہ شہری مسلم امیدواروں کی کامیابی کا امکان ہے۔

باب: ۱۶

دورۂ جنوبی ہند

اقبال کا سفرِ جنوبی ہند ایک خالصتہً علمی سفر تھا، لیکن حیاتِ اقبال میں اس کی اہمیت سے انکار کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ اس سفر کے دوران میں انہوں نے اپنے ''خطبات'' کے ذریعے اسلامی تمدن کی قدیم فکری روایات کو فکر جدید کی روشنی میں پیش کر کے عہد حاضر کے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ مستقبل میں ایک نیا اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کی کوشش کریں۔

اقبال کے عقیدے کے مطابق اسلام کا تصورِ حیات جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ لہٰذا وہ ابتدا ہی سے اجتہاد کے مسئلے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک انگریزی مقالہ بعنوانِ ''اسلام میں اجتہاد'' حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج، لاہور میں ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو پڑھا۔ مگر بعض قدامت پسند علماء اس میں پیش کردہ خیالات پر معترض ہوئے اور اقبال کو کافر گردانے لگے۔ اقبال کے لیے غالباً یہ پہلا ایسا تجربہ تھا، کیونکہ انہی ایام میں مولوی ابو محمد دیدار علی نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ اقبال نے اس کا بُرا منایا اور اپنے ردِّ عمل کا اظہار کرتے ہوئے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو تحریر کیا:

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا، مگر خلافت کمیٹی نے اپنے سیاسی فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا ان شاء اللہ شائع بھی ہو گا، مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔

یہ مضمون شائع نہ ہوا، البتہ اسے پڑھے جانے کا اعلان اخباروں میں چھپا اور ممکن ہے بعد میں سرسری تفصیل بھی شائع ہوئی ہو۔ یہی تفصیل جنوبی ہند کے سیٹھ جمال محمد کی نظر سے گذری سیٹھ جمال محمد مدراس کے ایک بہت بڑے تاجر تھے اور ان کی تجارت اُس زمانے میں ایک کروڑ روپے سالانہ کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے اپنے خرچ پر کئی خیراتی اداروں کے علاوہ ایک مسلم ایسوسی ایشن بھی قائم کر رکھی تھی، جس کا مقصد معروف مسلم علمی شخصیتوں کو مدراس میں مدعو کر کے ان سے اسلام سے متعلق موضوعات پر خطبات دلوانا تھا۔ سید سلیمان ندوی اس انجمن کی دعوت پر مدراس میں سیرت نبویؐ پر اور محمد مارماڈیوک پکتھال تمدنِ اسلام پر عالمانہ خطبے دے چکے تھے۔ سیٹھ جمال محمد نے مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے اوائل ۱۹۲۵ء میں اقبال کو مدراس آ کر اجتہاد ہی کے موضوع پر مقالات پڑھنے کی دعوت بھیجی اور تمام اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری بھی لی۔ اقبال نے دعوت قبول کر لی، لیکن خطبات کی تعداد یا سفرِ مدراس کی تاریخ کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا۔

ان کے نزدیک اس دعوت کو قبول کرنے کے دو اہم وجوہ تھے۔ اوّل یہ کہ جنوبی ہند کے سفر میں وہ سلطان ٹیپو شہید کی تُربت کی زیارت کرنا چاہتے تھے اور اس تجربے سے جو سوز و گداز کی کیفیت ان پر طاری ہو اسے نظم کر کے لافانی بنا دینے کا قصد تھا، دوم یہ کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ تمدنِ اسلام کے بعض نہایت اہم مسائل کے متعلق ہمعصری تقاضوں کی روشنی میں اپنی تحقیقات یا اُن پر مبنی اپنے نظریات یکجا کرنا چاہتے تھے، تا کہ انہیں کتاب کی صورت میں شائع کرا کے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے[۲]۔

اقبال مسلمانوں کی نئی نسل کے متعلق بہت فکر مند تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ نئی نسل فکری طور پر یورپ کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے اور انہیں خدشہ تھا کہ مبادا وہ یورپی نظریات کی ظاہری چمک سے خیرہ ہو کر صحیح راہ سے بھٹک جائے۔ اسی

اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا:

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے[۳]۔

ویسے ان کے خیال میں نئی نسل کے اس رجحان میں کوئی قباحت نہ تھی، کیونکہ یورپ کی جدید تہذیب، اسلامی تمدن ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی۔ مثلاً یورپ میں فکر کے میدان میں ڈے کارٹ کو اپنے اصول کی بنا پر جدید فلسفہ کا بانی سمجھا گیا اور اسی اصول پر نئے علوم کی بنیاد رکھی گئی، لیکن ڈے کارٹ کے اصول کا مقابلہ اگر غزالی کی ''احیائے علوم'' سے کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ڈے کارٹ سے کئی صدیاں قبل غزالی نے ''اصول'' کی وضاحت کر دی تھی۔ اسی طرح دانتے کی تصنیف ''ڈیوائن کامیڈی''، محی الدین ابن عربی کے تخیلات سے لبریز ہے۔ یورپی اہل علم یہ دعویٰ کرتے تھے کہ استقرائی منطق کا موجد بیکن ہے، مگر فلسفۂ اسلامی کی تاریخ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس سے بڑا جھوٹ یورپ میں کبھی نہیں بولا گیا۔ ارسطو کی منطق کی شکلِ اوّل پر سب سے پہلا معترض مسلم منطقی یعقوب کندی تھا اور جو اعتراض اس نے اٹھایا، بعینہٖ وہی اعتراض نہ صرف بیکن نے بلکہ جان اسٹوارٹ مل نے بھی اٹھایا۔ گویا مسلمانوں کا استقرائی طریق منطق بیکن سے مدتوں پہلے سارے یورپ کو معلوم تھا۔ نصیر الدین طوسی کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم ریاضی دان قرونِ وسطیٰ ہی میں ایسے نتائج پر پہنچ چکے تھے جن سے یورپ میں یونانی ریاضیات پر تبصرہ کرتے وقت استفادہ کیا گیا اور یوں جدید ریاضیات کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے علاوہ مسلم صوفیہ ایک مدت سے تعدد زمان و مکاں کے قائل تھے اور انہوں نے فکری طور پر اس امکان کا اظہار کر دیا تھا کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ

بھی ہو سکتے ہیں۔ یورپ میں اس نکتے کی طرف سب سے پہلے جرمن فلسفی کانٹ نے توجہ کی۔ جب کہ مسلم صوفیہ پانچ سو سال پیشتر اس نکتے سے آشنا تھے، سو یورپ میں مسلم مفکروں کے نتائج فکر کا چرچا تھا اور وہاں کے اہلِ علم، خواہ وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، عام طور پر اسلامی تخیلات سے آگاہ تھے[۴]۔ اقبال جدید فکر کی روشنی میں علوم اسلامیہ کے احیاء کے خواہشمند تھے، کیونکہ ان کے نزدیک اگر ایسا نہ کیا گیا تو یورپ کے ''معنوی استیلا'' کا خطرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علومِ اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے ''معنوی استیلا'' کا اندیشہ ہے جس کا سدِ باب ضروری ہے[۵]۔

اقبال کو یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان کے مسلمان سیاسی اعتبار سے دیگر ممالکِ اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، لیکن دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے تھے[۶]۔ ان کی رائے میں یورپ میں تجدیدِ دین مارٹن لوتھر کے ہاتھوں عمل میں آئی، مگر دنیائے اسلام میں کلیسا کی صورت میں ایسا کوئی بُت موجود نہ تھا جس کو توڑنے کے لیے کسی لوتھر کی ضرورت پیش آتی۔ پھر بھی احیائے علوم اسلامیہ کے بغیر چارہ نہ تھا، کیونکہ ایسے احیاء کے ذریعے ہی اسلام اور علومِ جدیدہ کی حیاتِ ذہنی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جوڑ کر مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی کرنے کی ترغیب دی جا سکتی تھی اور انہیں اس حقیقت کا احساس دلایا جا سکتا تھا کہ یورپی تمدن کے فکری اور سائنٹفک پہلوؤں کو قبول کرنے سے مراد کسی قسم کے غیر اسلامی علوم کی تحصیل یا تقلید نہیں بلکہ جو کچھ مسلمانوں نے اپنے عالم بیداری میں یورپ کو دیا اور جس پر یورپ نے ان کی خوابیدگی کے دوران میں اضافے کیے، اس

فکری تسلسل کو ترقی یافتہ شکل میں واپس لے کر مزید آگے بڑھانا ہے[7]۔ اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں کا نصب العین اگر صرف مسلمانوں کی سیاسی یا اقتصادی آزادی کا حصول ہے اور اسلام کی حفاظت ان کا مقصد نہیں تو وہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے[8]۔ مزید برآں وہ علوم اسلامیہ کے ساتھ دینی فکر کو بھی جدید انداز میں پیش کرنے کے آرزومند تھے اور علومِ دینیہ کو فلسفہ جدید کا ہمدوش بنانا چاہتے تھے۔ ان کی رائے میں قدیم اسلامی دینیات یا علم کلام کے، جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی فکر و حکمت تھا، تار و پود بکھر چکے تھے اور اس کی نئی شیرازہ بندی کی ضرورت تھی۔ ان کی نگاہ میں یورپ نے عقل و الہام کو ہم آہنگ بنانے کا طریقہ مسلمانوں سے سیکھا تھا، لہٰذا وہ اس طریق سے اپنی دینیات کو موجودہ فلسفے کی روشنی میں از سرِ نو تعمیر کرنے میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے، لیکن چونکہ اسلام، عیسائیت سے کہیں زیادہ سادہ اور عقلی مذہب ہے، اس لیے اس میں جدید دینیات یا علم کلام کی طرح ڈالنا نسبتاً آسان تھا[9]۔ ایسی کوشش اقبال سے پیشتر سرسید احمد خان نے بھی کی تھی، لیکن وہ اس لیے ناکام رہی کہ سرسید نے اپنے نظریات کی بنیاد معتزلہ کے نظامِ فکر پر استوار کی جو بجائے خود یونانی فکر و حکمت پر مبنی ہونے کے سبب فرسودہ تھا[10]۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اور اگرچہ مسلم اقوام اپنی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں الجھی ہوئی ہیں، لیکن ان مشکلات کے خاتمے پر ذہنی انقلاب کا آغاز یقینی ہے اور وہ توقع رکھتے تھے کہ اُس وقت تک ایسی شخصیات پیدا ہو جائیں گی جو اس انقلاب کی صحیح راہنمائی کر سکیں گی[11]، تاہم اس میدان میں اقبال کی تگ و دو کا مدعا اس آنے والے ذہنی انقلاب کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔

دوسرا اہم مسئلہ جس کی طرف ان کی توجہ شروع ہی سے مبذول رہی وہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ تھا۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ جو شخص دورِ حاضر میں قرآنی نقطۂ

نظر سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا [۱۲]۔ اس سلسلے میں انہوں نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا:

میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا، مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے [۱۳]۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، لیکن وہ بخوبی جانتے تھے کہ مغرب کہ نظریاتی اور سیاسی محکومی کے عالم میں مسلمان اجتہادِ فکر کی صلاحیت سے محروم ہیں اور ایسی غلامی کے دور میں بہتر یہی ہے کہ فقہ اسلامی کے تحفظ کی خاطر وہ صرف تقلید ہی کو اپنا شعار بنائیں۔ پھر بھی ہر لحظہ تغیر پذیر حالات میں یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے تو جاری نہ رکھا جا سکتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ اس سمت میں کوئی قدم اٹھایا جائے تاکہ مسلمانوں میں رفتہ رفتہ ایسے لوگ پیدا کیے جاسکیں جو خود اجتہادِ فکر پر قادر ہوں اور مستقبل میں آنے والے ذہنی انقلاب کے دور میں انہیں صحیح راہنمائی فراہم کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں [۱۴]۔ مگر دنیائے اسلام اور بالخصوص ہندوستان کے علماء کی روایتی قدامت پسندی کے پیشِ نظر یہ ایک نہایت نازک مسئلہ تھا اور اقبال کو اس سلسلے میں اپنے خیالات کے اظہار پر بعض لوگوں نے کافر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کے بارے میں اپنی تحقیق جاری رکھنا چاہتے تھے اور اس تحقیق پر مبنی اپنے نظریات کا برملا اظہار کرنے میں انہیں کوئی خوف یا ہچکچاہٹ نہ تھی۔

تیسرا اہم مسئلہ جس پر اقبال اظہارِ خیال کرنے کے خواہشمند تھے، مسلم ریاستوں کی طرزِ حکومت اور اتحاد اقوام اسلامیہ کا تھا۔ اس عہد میں خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ترکی میں مغربی جمہوریت کا دور دورہ تھا، لیکن بعض روایت کے پابند علماء خلافت کے احیاء پر مصر تھے اور ان کی سادگی یا سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومتِ برطانیہ کسی ایسی شخصیت کی تلاش میں تھی جو مسلمانانِ عالم کے لیے تو خلیفۃ المسلمین کا کردار ادا کرے مگر درحقیقت انگریزوں کی کٹھ پتلی ہو۔ ایسی حکمت عملی سے یقیناً ساری دنیائے اسلام کو آلۂ کار بنایا جا سکتا تھا۔ اقبال اس حکمتِ عملی کو سمجھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عصر حاضر میں خلافت کا احیاء مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور مسلم اقوام کے اتحاد کے لیے کوئی اور تدبیر سوچنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی طور پر وہ جمہوریت کے اتنے قائل نہ تھے، لیکن کسی مناسب نعم البدل کی عدم موجودگی میں اسے محض گوارا کرتے تھے ۱۵۔ جمہوریت کے متعلق ان کا اعتراض خالصتاً فلسفیانہ یا اخلاقی نوعیت کا تھا۔ کیونکہ اس نظام میں کسی شخص کا انتخاب صرف افراد کی تعداد کی بنیاد پر عمل میں آتا تھا اور یہ طریق بجائے خود اس بات کی ضمانت فراہم نہ کرتا تھا کہ منتخب کردہ شخص واقعی قیادت کا اہل ہے۔ بالفاظ دیگر اس طرزِ حکومت میں کسی اچھے اور اہلیت رکھنے والے امیدوار کا بُرے اور نا اہل امیدوار کے مقابلے میں انچاس پچاس کی گنتی میں منتخب نہ ہو سکنے کا امکان تھا جو اسلامی اور اخلاقی اعتبار سے ایک غلط بات تھی۔ اس کے علاوہ اقبال مغرب کے سرمایہ دارانہ یا کیپٹلسٹ جمہوری نظام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ اس نظام کی روح استعماری تھی اور وہ پسماندہ اقوام کے استحصال کا باعث تھا۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر روس میں مکمل دہریت کی بنیادوں پر اشتراکی انقلاب آ چکا تھا اور انہیں اندیشہ تھا کہ مغرب کی نقالی کرتے ہوئے اگر اسی قسم کا نظام دنیائے اسلام کی اقوام میں رائج ہوا تو وہ بھی کسی نہ کسی دن اشتراکی انقلاب کی زد میں آ کر روس کے

سوشل استعمار کا نشانہ بن جائیں گی۔

ان اہم مسائل کے علاوہ اقبال اسلام سے متعلق اپنی تحقیقات کی بنیاد پر خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے آفاقی تصور یا مقصودِ حیاتِ انسانی سے متعلق افکار کچھ حد تک ان کی نثری تحریروں یا شعری تخلیقات میں واضح کیے جا چکے تھے، لیکن اس دوران میں وہ عشق و عقل، خودی، تصوف، حیات بعد الموت، زمان و مکاں یا دیگر مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی اور تمدنی مسائل پر مزید غور و فکر کے ارتقائی مراحل سے گزر کر جن نتائج پر پہنچے ان کا بیان کرنا بھی ضروری تھا۔

اس مرحلے پر یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اقبال کو یورپی تمدن یا مغربی ادبیات و فلسفے پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اسی طرح وہ اسلامی تمدن، عربی و فارسی ادبیات اور مسلم فلاسفہ کے افکار سے بھی آشنا تھے، لیکن تفسیر، حدیث اور فقہ یا دینی علوم کے معاملے میں چونکہ ان کی تعلیم و تربیت روایتی ڈسپلن کے تحت نہ ہوئی تھی، اس لیے مروجہ اصطلاح کے مطابق انہیں "عالم" نہ کہا جا سکتا تھا۔ اقبال کو اپنی اس کمزوری کا پورا احساس تھا[16]۔ اس لیے خطبات تحریر کرتے وقت لاتعداد کتب کے مطالعے کے علاوہ علماء سے بھی رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے رجوع کیا گیا اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے جاننے والے بعض علماء سے خط و کتابت کی یا بحث و مباحثے کیے، مگر ایک مشکل یہ تھی کہ جس قسم کی رہنمائی اقبال کو مطلوب تھی، وہ انہیں صرف ایسے علماء ہی سے مل سکتی تھی جو دینی علوم اور اسلامی فلسفے میں پوری دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ مغربی تمدن، فلسفہ، قانون اور علوم جدیدہ پر بھی نگاہ رکھتے ہوں، لیکن ایسے علماء ہندوستان میں تو کیا ساری دنیائے اسلام میں نایاب تھے۔ بہر حال اس ضمن میں جو سوالات اقبال کے ذہن میں ابھرے اور بالخصوص جو سوالات انہوں نے وقتاً فوقتاً سید سلیمان ندوی سے پوچھے انہیں پیش نظر رکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان

سوالات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

قرآن کتابِ کامل ہے اور وہ خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ اس کا کمال عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاملات کے اصول پر، جو دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے۔ اس کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں؛

متکلمین میں سے بعض نے علمِ مناظر و مرایا کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھ سکنا ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی؟ رویتِ باری کے متعلق جو استفسار کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز "نظریۂ نور" پر کچھ روشنی پڑے، اس خیال کو ابن رُشد کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انہوں نے ابو المعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابو المعالی کا خیال آئن سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے، گو اوّل الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور مؤخر الذکر نے اس ریاضی کی رو سے ثابت کر دیا ہے۔

کیا اجماع امت، نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مثلاً مدتِ شیر خوارگی جو نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، یا حصصِ میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے؟ بعض حنفاء اور معتزلہ کے نزدیک اجماع امت یہ اختیار رکھتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ آپ نے ارشاد کیا ہے کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے۔ ایسی تخصیص یا تعمیم کی کوئی مثال؛ کیا ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہؓ ہی کر سکتا ہے یا علماء و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو آگاہ کیجیے۔ تخصیص یا تعمیم حکم سے کیا مراد ہے؟ اگر صحابہؓ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا۔ کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہؓ نے

نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو؟

حضور سرورِ کائناتؐ نے کسی دریافت کردہ مسئلے کا جو جواب وحی کی بنا پر دیا وہ تمام امت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن مجید میں داخل ہوگئی، لیکن جو جواب محض استدلال پر دیا گیا، جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام امت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟

نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، نبوت اور امامت، نبوت میں احکامِ قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور ﷺ کے استنباط داخل ہیں۔ اجتہاد کی بنا محض عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے، کیا یہ بھی وحی میں داخل ہے؟ اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟ وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتا رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟

حضور ﷺ نے اذان کے متعلق صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت آئے گا یا امامت کے تحت میں؟

آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے، صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

آیۂ وصیت کی وضاحت کیجیے۔

کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ملتوی کر دے اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے؟ اس اختیار کی بنا کون سی آیتِ قرآنی ہے؟

امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کی قائم مقام ہو سکتی ہے؟ ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک امام ہونا چاہیے؟ موخر الذکر صورت موجودہ فرقِ اسلامیہ کی موجودگی میں کیسے بروئے کار آ سکتی ہے؟

حضرت عمرؓ نے طلاق کے متعلق جو طریقہ اختیار کیا، اگر اس کا اختیار انہیں شرعاً حاصل تھا تو اس اختیار کی اساس کیا تھی؟ زمانۂ حال کی زبان میں آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی؟

فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے، اس مسئلے کی بنا کوئی آیت قرآنی ہے یا حدیث؟

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدہ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے؟

''شمس بازغہ'' یا ''صدرا'' میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے ''بخاری'' میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے، لاتسبوا الدھر الخ، کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟

قرون وسطی کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے، میمون نے قرطبہ میں مسلم یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، اس لیے کیا اس کا یہ مذہب بھی کسی مسلم حکیم کی خوشہ چینی ہے؟

مولانا شبلی نے ایک فقرہ شعائر دار تفاقات کے متعلق نقل کیا ہے: وہ شعائر الدین امر ظاہر تخصیص بہ و یمتاز صاحبہ بہ فی سائر الادیان کالختان و تعظیم المساجد و الاذان و الجمعۃ و الجماعات۔ کیا یہ شاہ ولی اللہ کی اپنی تشریح ہے؟ اسی طرح ارتفاقات میں شاہ ولی اللہ کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں، داخل ہیں، مثلاً

نکاح وطلاق کے احکام وغیرہ، اگر شاہ ولی اللہ کی یہ تشریح صحیح ہے تو سوسائٹی کا کوئی انتظام نہ رہے گا اور ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور و مراسم کی پابندی کریں گے؟ اس کی وضاحت کیجیے۔

''الکلام'' (یعنی علم کلام جدید) میں مولانا شبلی نے ''حجتہ اللہ البالغہ'' کے صفحہ ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے، جس کے مفہوم کا خلاصہ انہوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس کے آخری حصے کا ترجمہ یہ ہے:

اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعارِ تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے، اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔ اس فقرے میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے، اور اس کے تحت کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟ کیا ''حجتہ اللہ البالغہ'' میں کسی جگہ شعائر کی تشریح شاہ ولی اللہ نے کی ہے؟ شاہ ولی اللہ نے لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے۔ ان کا اصل مقصود کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں، ان چار قسموں میں تمدنی امور مثلاً نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آ جاتے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ محی الدین ابن عربی کی فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے؟

صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اُس کا حوالہ دیجیے متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آنِ سیال پر بحث کون سی کتاب میں ملے گی؟

ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں؟ ملا جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ ان کے اسماء اور تصانیف سے مطلع

فرمائیے۔

ہندی مسلم فلسفی ساکن پھلواروی مصنف ''تسویلاتِ فلسفہ'' کا نام کیا ہے؟ کتاب مذکور کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوگا؟

مولوی نورالاسلام کا عربی رسالہ بابت ''مکان'' جو رامپور میں ہے، کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ۔ مولوی نورالاسلام کا زمانہ کون سا ہے مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلمین نے کیے، وہ مسئلہ زمان کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں۔

مولوی سید برکات احمد نے دہر اور زمان میں امتیاز کرکے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالیے۔ اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟

جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے، یعنی زمان اور مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے خیال کے مطابق صحیح ہے؟ کیا انہوں نے مکان پر بھی بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟

میں نے زمان و مکان کے مسئلے کے متعلق مطالعہ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے مسلم فلسفیوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔

آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو عارضی طور پر منسوخ کر دے، بلکہ بعض فرائض کو بھی یونہی منسوخ کر سکتا ہے۔ اس کا حوالہ کہاں ملے گا؟

کیا یہ صحیح ہے کہ مُتعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروّج تھا اور حضرت عمرؓ نے اسے منسوخ کر دیا؟ کیا زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت

ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟

ان معاملات کی ایک فہرست دیجیے جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے۔

جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر قرآن شریف میں مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیونکر کوئی رائے دے سکتا ہے۔ تواترِ عمل کی ایک مثال آپ کے نزدیک نماز ہے۔ مالکیوں، حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف صورتِ نماز میں ہے، وہ کیوں کر ہوا؟

احکامِ منصوصہ میں توسیع اختیاراتِ امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے۔ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح کیجیے؟

زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ ''قاضی مبارک'' میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے وہ فتویٰ کیا ہے؟

اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ کیا یہ بات بھی امام کی رائے کے سپرد ہوگی؟

صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں، صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ لفظ نبی کے دو معنی ہیں: خبر دینے والا اور مقامِ بلند پر کھڑا ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی، ہمزے کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزے کے۔ اس ضمن میں راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے، یعنی آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزے کے ہوں قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزے کے ہیں؟ اگر قرآنی انبیاء یا آنحضورؐ نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا مروّجہ انگریزی ترجمہ ''پرافٹ''، جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں، کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

لفظ نار کا رُوٹ عربی زبان میں کیا ہے؟

لفظ نجات کا رُوٹ کیا ہے اور رُوٹ کی رُو سے کیا معنی ہیں ۱۷۔

سوالات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے موضوع پر خطبات تیار کرتے وقت اقبال کے سامنے کس قسم کے مسائل تھے۔ ان مقالات کو تحریر کرنے کے لیے پانچ برس لگے۔ وعدہ چھ مقالات لکھنے کا تھا لیکن جنوری ۱۹۲۹ء تک صرف تین صحیح طور پر لکھے جا سکے اور یہی تین جنوبی ہند کے دورے کے دوران میں مدراس، بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن میں پڑھے گئے۔ باقی تین خطبے ۱۹۲۹ء ہی میں مکمل ہوئے اور علی گڑھ میں نومبر ۱۹۲۹ء میں دیے گئے ۱۸۔

یہ پانچ سال کا عرصہ اقبال کی زندگی میں نہایت مصروفیت کا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ۱۹۲۵ء ہی میں انہوں نے خطبات کے سلسلے میں موضوعات کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی ضروری مواد اکٹھا کر کے کتب کے مطالعے کا کام بھی شروع کر دیا ہو۔ ان سالوں میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں تین مرتبہ انہوں نے "روحِ تمدنِ اسلامی"، فلسفۂ اسلام اور قرآن کا مطالعہ ایسے موضوعات پر انگریزی میں مقالے پڑھے جو غالباً اسی سلسلے کی کڑیاں تھے۔ ۱۹۲۶ء کا سارا سال انہوں نے پنجاب کونسل کے انتخابات کی گہما گہمی میں گزارا، ووٹ حاصل کرنے کے لیے لاہور کے گلی کوچوں کی خاک چھانی، انتخابی جلسوں سے خطاب کیا اور جلوسوں میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں کونسل کی مصروفیات شروع ہوئیں۔ کونسل میں وہ سخت محنت اور تحقیق کے بعد تقریریں کرتے تھے اور ایسی تقریروں کی تیاری کے لیے بھی وقت درکار ہوتا تھا۔ اسی طرح لاہور شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں ایک مقامی سیاسی لیڈر کی مانند گلیوں اور بازاروں کے دورے کرتے، مظلومین کی ڈھارس بندھاتے، مفاہمت کراتے، جو شیلے جلوسوں میں شریک ہو کر لوگوں کے جذبات قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے، یا پے در پے جلوسوں سے خطاب کرتے۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک کی مدت میں انہوں نے مسلمانوں کی کُل ہند

سیاسیات میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ کئی بار لاہور سے دہلی اور دہلی سے لاہور کے چکر کاٹے۔ مسلم لیگ کا دو حصوں میں تقسیم ہونا، سائمن کمیشن کا ورود، نہرو رپورٹ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد، افغانستان کی یورش، مسئلۂ فلسطین، چودہ نکات، لیگوں کا اتحاد، پہلی گول میز کانفرنس کا اعلان، اخباروں میں بیانات اور انٹرویو، غرضیکہ سب ذہنی پریشانیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا، مگر اسی کیفیت میں انہوں نے اپنی شعری تخلیق ''زبورِ عجم'' شائع کی۔ روزی کمانے کے لیے وکالت کا دھندا بھی جاری رکھا اور یونیورسٹیوں کے لیے پرچے بھی بناتے اور دیکھتے رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مختلف نوع کی مصروفیات کے دوران میں وہ کیونکر فلسفے ایسے مشکل میدان میں کام کرنے کے لیے وقت نکالنے کے قابل ہو سکے۔ یہ سب کچھ کس جذبے کی شدت کے تحت عمل میں آیا؟ ان کے ذہنی کیمیا کا تجزیہ تو ممکن نہیں، لیکن قوائے میں غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی نوعیت کیا تھی کہ ذہنی پریشانیوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں بھی انہوں نے ادق فلسفیانہ مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اظہار کے لیے انہیں مناسب الفاظ بھی ہاتھ نہ آتے تھے، مثلاً خود ہی تسلیم کرتے ہیں:

بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کو ادا کرنے کے لیے اور بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے ۱۹۔

جنوبی ہند کا سفر اوائل جنوری ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا۔ اقبال کے ہمراہ چودھری محمد حسین، عبداللہ چغتائی اور علی بخش بھی گئے تھے۔ خوش قسمتی سے عبداللہ چغتائی اس سفر کی روز بروز کی روداد تحریر کرکے ''انقلاب'' میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہے، اس لیے سفر کی کچھ تفصیلات محفوظ ہوگئیں ۲۰۔ اقبال نے دسمبر ۱۹۲۸ء ہی میں سیٹھ جمال محمد، صدر مسلم ایسوسی ایشن مدراس کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس سے فراغت کے بعد ۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح

ساڑھے آٹھ بجے بذریعہ فرنٹیئر میل ان کا چھوٹا سا قافلہ دہلی سے روانہ ہوا۔

۳/جنوری ۱۹۲۹ء کو دوپہر کے وقت وہ کولامبار (بمبئی) پہنچے۔ سیٹھ اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ ہاشم اسماعیل اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے، کیونکہ پہلے ہی سے یہ طے پایا تھا کہ بمبئی میں اقبال جتنا عرصہ ٹھہریں گے انہی کے مہمان ہوں گے۔ سب نے دوپہر کا کھانا سیٹھ ہاشم اسماعیل کے ہاں کھایا۔ سیٹھ ہاشم اسماعیل کی اہلیہ بمبئی کے ایک مشہور سوداگر حاجی یوسف سبحانی کی بیٹی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم جرمنی میں حاصل کی تھی۔ جب اقبال کھانے سے فارغ ہو چکے تو بیگم ہاشم اسماعیل نے گوئٹے کی تصنیف ''فاؤسٹ'' انہیں اس درخواست کے ساتھ بھجوائی کہ اس پر اپنے ہاتھ سے اپنا کوئی شعر لکھ دیں اقبال نے یہ شعر تحریر کیا:۔

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

اور ساتھ فرمایا: یہ وہ نتیجہ ہے جس پر فاؤسٹ کو پہنچنا چاہیے تھا، مگر وہ نہ پہنچ سکا۔ شام کو پانچ بجے سیٹھ ہاشم اسماعیل نے اقبال کے اعزاز میں گرینز ہوٹل (متصل تاج ہوٹل) میں ایک پُرتکلف چائے کی دعوت کا اہتمام کیا تھا، جس میں بمبئی کی اہم شخصیات شریک ہوئیں۔ اس کے بعد آٹھ بجے شب اقبال مسلم فیڈریشن بمبئی کے کھانے پر گئے۔ رات دس بجے وہ مدراس میل کے ذریعے مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے، وہ رات، اگلا دن اور اگلی رات گاڑی میں گزری۔

۵/جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح ساڑھے سات بجے گاڑی مدراس اسٹیشن پر رُکی۔ مدراس سے ایک اسٹیشن پہلے باسن برج کے مقام پر مدراس کے کسی معزز مسلم خاندان کی ایک ذوقِ ادب سے بہرہ ور لڑکی، جس نے اقبال کے انتظار میں لاہور ہی میں ان سے خط و کتابت کی تھی، اپنے والد کی معیت میں اقبال کے استقبال کے

لیے گاڑی میں آبیٹھی۔ مدراس اسٹیشن پر ایک ہجوم ان کے استقبال کے لیے موجود تھا جس میں بیشتر مسلمان تھے اور جنہوں نے ترکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ مدراس کے اکثر علماء و فضلا اور امراء و رؤساء بھی موجود تھے۔ اقبال کے لیے گاڑی سے اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ اتنے میں سیٹھ جمال محمد کے صاحبزادے اور ان کے سیکرٹری عبدالحمید حسن گاڑی کے اندر آ گئے اور انہوں نے اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ بڑی مشکل سے انہیں گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ عبدالحمید حسن نے لوگوں سے مخاطب ہو کر: باآواز بلند کہا کہ رستہ چھوڑ دیں تاکہ ہر شخص کو اقبال سے ملنے کا موقع مل سکے۔ پھر پلیٹ فارم پر عمائد و معززین کا تعارف اقبال سے کرایا گیا۔ بعد ازاں وہ سیٹھ جمال محمد کے ساتھ موٹر کار میں اپنی قیام گاہ بوسوتو ہوٹل پہنچے، جو سیٹھ جمال محمد ہی کی ملکیت تھا۔ ناشتا یہیں کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا سیٹھ جمال محمد کی عالی شان رہائش گاہ پر تھا۔ چار بجے شام مدرسہ جمالیہ میں دعوت چائے تھی۔ یہ مدرسہ یتیم اور غریب مسلم طلبہ کے لیے سیٹھ جمال محمد کے والد نے ایک وقف کی صورت میں قائم کیا تھا اور کئی عمارتوں پر مشتمل تھا، جن میں جمالیہ ہوٹل کی عمارت بھی شامل تھی۔ ہوٹل میں مدراس کے کالجوں کے مستحق مسلم طلبہ مفت اقامت گزیں تھے اور سکونت کے علاوہ انہیں کھانا بھی سیٹھ جمال محمد کی طرف سے ملتا تھا۔ مزید برآں ہر طالب علم کو سات روپے ماہوار کالج کی فیس کی ادائیگی کے لیے دے دیے جاتے تھے۔ ہال میں اسلامی کتب کی ایک بڑی لائبریری تھی۔ مدرسہ میں اسلامیات کے مضمون کے لیے ندوہ کے فارغ التحصیل مدرّس تھے اور انگریزی یا ریاضی وغیرہ ایسے مضامین پڑھانے کے لیے ہندو مدرّس بھی رکھے گئے تھے۔ اقبال اساتذہ اور طلبہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

پانچ بجے شام کو کھلے ہال میں اقبال کا پہلا خطبہ ''دینیاتِ اسلامیہ اور افکار حاضرہ'' کے موضوع پر تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں بیشتر مسلمان

تھے، لیکن ہندو بھی کم تعداد میں نہ تھے۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر سبرائن چیف منسٹر مدراس نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ اقبال نے ایک گھنٹے سے کچھ منٹ زیادہ اپنا مقالہ پڑھنے میں لیے۔ مقالے کے اختتام پر ڈاکٹر سبرائن نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

میرے لیے باعث عزت ہے کہ ہندو ہونے کے باوجود اسلامی فلسفے پر لکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا ہے۔ ہم ہندو ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ میں یہاں غیر برہمن کی حیثیت سے تقریر نہیں کر رہا اور نہ اس نقطۂ خیال سے ذات پات کے خلاف کہہ رہا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیل راہ بنانا ہے[۲۱]۔

جلسے کے اختتام پر عبدالحمید حسن نے پہلے سے تیار کردہ مقالے کے خلاصے کی نقول اخباری نمائندوں کو دیں۔ رات کو نہایت پُرتکلف دعوت عبدالحمید حسن کی طرف سے تھی اور اس میں جدت یہ تھی کہ اردو میں مطبوعہ نظامِ طعام کا کارڈ ہر مہمان کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ کارڈ پر یہ تحریر تھا۔

نظامِ طعام دعوتِ اقبال

شنبہ ۵ رجنوری ۱۹۲۹ء	مقام دوکوچہ دانیار
شیرازی شربت	ہندی مرغ و نان
مدراسی بریانی دلی بریانی	حلوہ گاجر
زعفرانی پیوسی	فواکہات
ہندوستانی قلفی	

المکلف عبدالحمید حسن

رات گئے ہوٹل واپسی پر سیٹھ جمال محمد، عبداللہ چغتائی سے اقبال کا مقالہ پڑھنے کی غرض سے لے گئے۔ اگلی صبح ناشتا کے بعد جب وہ ہوٹل آئے تو مقالہ واپس کر دیا۔اسی دوران میں اقبال بھی ناشتا سے فارغ ہو چکے تھے۔ سیٹھ جمال محمد نے مقالے کے حوالے سے ان سے چند امور کے متعلق استفسار کیے، جن کا اقبال نے تسلی بخش جواب دیا۔ سیٹھ جمال محمد صرف بین الاقوامی تاجر یا ہندوستان میں مسلمانوں کے برلا ہی نہ تھے، بلکہ اعلیٰ درجے کے علم وفضل کے مالک تھے۔ یورپ اور اکثر بلاد اسلامیہ کا سفر کر چکے تھے۔ حاجی بھی تھے، لیکن سادگی کا یہ عالم تھا کہ سر پر پگڑی باندھتے تھے۔تہمد کُرتا زیب تن کرتے اور ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اقبال ان سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کی بلند فہمی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص نے مقالہ پڑھ کر بعض ایسے امور کے متعلق سوال کیے جن کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا ۔پھر فرمایا:

اللہ اللہ یہ انسان ایک کروڑ سالانہ کی تجارت کرتا ہے۔تہمد کُرتا پہنتا ہے اور حقیقت روح و مادہ جیسے مسائل پر انگریزی اردو میں گفتگو کرتا ہے۔اس کو فکر دامنگیر ہے کہ مسلمانوں کی قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دنیا پر ظاہر ہو۔مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔جب تک یہ قسم پیدا نہ ہو گی، نصب العین تک رسائی محال ہے۔

اصل میں سیٹھ جمال محمد کی تمام مساعی مرکوز ہی اسی ایک نقطہ پر تھیں۔عبداللہ چغتائی ان کی شخصیت کے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں:

پرانی مذہبی تعلیم اور عہد حاضر کے علوم وفنون کی تعلیم کو کس طریق پر آمیزش دی جائے کہ مُلّا عہد حاضر کا تعلیم یافتہ بن جائے اور عہد حاضر کا تعلیم یافتہ مُلّا نہ سہی مسلمان بن کر دنیا میں رہے۔یہ آپ کی نیک سرگرمیوں کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔

آپ سائنس کے مسائل پر عالمانہ گفتگو کرتے ہیں۔ قرآنی آیات سے بعض ایسے مسائل کا استنباط نہایت خوبی سے کرتے ہیں۔ آپ شاکی ہیں کہ گذشتہ دو صدیوں بلکہ اس سے زیادہ عرصے سے حضرات علماء نے اپنے فرائض تبلیغ و تعلیم میں حالات شناسی سے کام نہیں لیا۔ تاہم وہ اس قدر مورد ملامت بھی نہیں۔ یہ صورت حالات ایک وجہ سے نہیں، بیسیوں وجوہ سے قوم کو دیکھنی پڑی ہیں۔ تاہم گذشتہ، گذشتہ تھا، اس پر واویلا مفید نہیں ہو سکتا۔ عہد حاضر کے علماء و زعما کو قدیم و نو اس طرح ترکیب دینا چاہیے کہ تمام گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے اور دنیا پھر اس ''مسلم'' کو دیکھ سکے جس کا دنیا میں پیدا کرنا قرآن کا مقصد، پیغمبر اسلام کا مقصد اور خدائے دو جہاں کا مقصد تھا۔

اقبال ۸ر جنوری ۱۹۲۹ء تک مدراس میں رہے اور یہ چار دن نہایت مصروفیت کے عالم میں گزرے۔ ۶ رجنوری ۱۹۲۹ء کو گوکھلے ہال میں انھوں نے دوسرا مقالہ ''مذہبی تجربات کے کشف و الہامات کا فلسفیانہ امتحان'' پڑھا۔ اسی دن صبح اخبار ''سوراجیہ'' کے خصوصی نمائندے کو انٹرویو بھی دیا، جس میں فرمایا کہ وہ مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتے ہیں اور انہیں ایسے سواراج سے کوئی واسطہ نہیں جو مذہب سے بے نیاز ہو، مگر اس کے ساتھ ایشیا کے لوگ یورپ کے خالص مادی رویّے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، اس لیے اُس کے سامنے اصل مسئلہ یہی ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا جمع کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک جدید ترک روحانیت اور مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ بہر حال وہ ان کی طرف سے مایوس نہیں ہیں، مگر ان کے عقیدے کے مطابق باشندگانِ ہندوستان اس کارِ عظیم کو انجام دے سکتے ہیں اور پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لیے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں نوجوانوں کی ایسی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیے، یورپ کی غلامانہ

تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، ترکوں کی ناکامی کی زبردست وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے یورپ کی نقالی شروع کر دی تھی۔ اگر وہ اس مسئلہ کا حل اسلام کی وساطت سے ڈھونڈتے تو معاملہ مختلف ہوتا، کیونکہ اسلام تخیل اور حقیقت یعنی روحانیت اور مادیت کے درمیان تطابق پیدا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کی خاطر دنیائے جدید میں داخل ہونا پڑے گا، لیکن اس داخلے کے وقت صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو عہد حاضر کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے پورے طور پر باخبر ہوں گے۔ پان اسلامزم سے متعلق سوال کے جواب میں ارشاد کیا کہ اس لفظ کے متعلق یورپ اور ایشیا میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اصطلاح ایک فرانسیسی اخبار نویس نے وضع کی تھی اور اس کا مقصد یورپ کو مسلم اقوام کے اتحاد کے خیالی اندیشہ سے متنبہ کرنا تھا۔ سو یہ لفظ بھی ''زرد خطرے'' کی طرح تھا جو ایسے ہی مقصد کے لیے گھڑا گیا تھا۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے پان اسلامزم کی کوئی تحریک موجود نہیں۔ کیمبرج کے پروفیسر براؤن بھی اس خیال کو بے بنیاد ثابت کر چکے ہیں۔ اگر اس لفظ کے کوئی معنی ہیں تو یہی کہ اخوتِ اسلام کا دوسرا نام پان اسلامزم ہے۔ لفظ پان اسلامی لغت میں موجود نہیں کیونکہ اسلام اس تجربے کا نام ہے جو نسل، رنگ، زبان، قوم اور ملک سے بالا ہو کر انسان کو یکجا کرنے کے لیے کیا گیا۔

۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال نے گوکھلے ہال میں اپنا تیسرا مقالہ پڑھا۔ تینوں لیکچروں میں عظیم الشان اجتماع دیکھنے میں آیا اور مدراس کے اکثر و بیشتر انگریزی اخباروں میں لکچروں کے اقتباسات شائع ہوتے رہے۔ اسی دن انہیں انجمن خواتین اسلام مدراس نے اپنے اجلاس منعقدہ ٹا کراس گارڈن میں مدعو کر رکھا تھا۔ اس جلسے کی روح رواں مسز عبدالسلام تھیں جو وہاں کے پوسٹ ماسٹر جنرل کی اہلیہ تھیں۔ اقبال کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔ عبداللہ چغتائی کے بیان

کے مطابق تمام مستورات پردہ میں تھیں اور اقبال پردے کے باہر بیٹھے تھے۔ سپاسنامہ میں اقبال کی دینی، علمی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا۔ مگر مندرجہ ذیل حصہ غالباً ان کی خصوصی توجہ اور جواب کے لیے شامل کیا گیا تھا:

آپ سے یہ عاجزانہ التماس کرنا غیر موزوں اور نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ہم اسیرانِ قفس کے لیے بھی اپنے قیمتی اوقات سے کچھ تھوڑا سا وقت وقف فرمائیں اور طبقۂ نسوانِ اسلام کی شرعی آزادی کے لیے نغمہ سنجی فرمائیں۔ ہم اسیرانِ قفس کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اس کے انسداد کے لیے کوئی ایک پُر جوش نظم لکھ کر سوتے ہوئے جذبات کو بھڑکائیے۔ مولانا حالی کے ہم مرہونِ منت ہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ان کے کلام نے طبقۂ نسواں کا رتبہ بلند کر دیا۔ ان کی "چپ کی داد" نے ہماری عزت بڑھا دی۔ ان کے اشعار نے اسلامی گھروں میں آزادیٔ نسواں کی جھلک بتا دی، لیکن اب بھی بہت سے گھرانے موجود ہیں، جہاں آزادی کا نام نہیں ہے، حالانکہ دنیا میں مرد عورت کے توقعات ایک دوسرے سے یکساں ہوتے ہیں اور اسلام نے مساوات کی تعلیم دی ہے۔ ہم بہت رنج سے دیکھتی ہیں کہ مردوں کی جانب سے عورتوں کے حقوق کے متعلق سخت بے پروائی برتی جاتی ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ آپ اس کی اصل وجوہ پر مفصل روشنی ڈالیں۔ ہم یہ کہنا نہیں چاہتے کہ ہمارے بھائی جو ہماری ہی ماں سے پیدا ہوتے ہیں۔ سخت ظالم و سفاک ہوتے ہیں، ہرگز ہرگز نہیں۔ لیکن ہم کو اس بات کا رنج ہے کہ فرقۂ اناث کے ساتھ بے انصافی کرنے اور ان کے حق تلفی کرنے کی بنیاد خود والدین کے گھروں میں ہی ڈالی جاتی ہے۔ ماں باپ دونوں فریق میں افراط و تفریط و فرق کو ہمارے ساتھ ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں کھانے پینے کے علاوہ تقسیمِ املاک میں بھی اس کو محروم کر دیتے ہیں۔ لڑکی اگر بدقسمتی سے بیوہ ہو جاتی ہے تو ظالم ماں باپ اپنی خاندانی عزت و عظمت بچانے کے لیے اس کی شادی

نہیں کر دیتے۔ ان کو بھائیوں اور چچاؤں کے دست نگر بنا کے تباہ کر دیتے ہیں۔ اب عصر جدید میں ہر جگہ طبقۂ نسواں کی آزادی کی چیخ و پکار ہے۔ نئی تعلیم و روشنی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی طبقۂ نسواں میں ان کے شرعی اور جائز حقوق آزادی اور مساوات ان کو حاصل ہوں۔ اسلام کی سچی اور زندہ روح اسلامی مستورات میں ہی ہے اور اسلامی صنفِ نازک نے زندہ آگ میں جل جل کر بھسم ہو ہو کر اپنے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ خاتمہ پر آپ کی تضیع اوقات کی معافی چاہتے ہیں اور امید قوی رکھتے ہیں کہ آپ زمانہ قریب میں طبقۂ نسواں کی بہبودی و آزادی کی ترانہ سنجی فرمائیں گے اور فرقۂ اناث اس کارخیر کی ہمیشہ ممنون وشکر گزار رہے گی ۲۲۔

اقبال نے سپاسنامہ کے جواب میں جو تقریر کی وہ اتفاق سے محفوظ ہے۔ آپ نے فرمایا ۲۳:

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی، مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا، لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو یا بہنوں کی محبت اس کے دل پر اپنا نشان نہ چھوڑتی ہو، وہ خوش نصیب شوہر جن کو نیک بیویاں ملی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقاء میں کس حد تک اس کی ممد و معاون ہے۔ مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے، وہ مشہور ہے، الرجال قوامون علی النساء عربی گرامر کی رو سے قائم کا صلہ جب اعلیٰ پر آئے تو معنی محافظت کے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے فرمایا: ھن لباس لکم وانتم لباس لھن لباس بھی محافظت

کے لیے ہوتا ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہے۔ دیگر کئی لحاظ سے بھی مرد و عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں، قرونِ اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔ خلافت اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب میں ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلام تمام معاملات میں اعتدال کو مدنظر رکھتا ہے۔ عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیٰحدہ علیٰحدہ فرائض ہیں۔ ان فرایض میں اختلاف ہے، مگر اس سے نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ اسلام نے عورت کو کسی طرح مرد سے ادنیٰ درجہ پر نہیں رکھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ ماں بچوں کی وراثت کا حق رکھتی ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں میں اب تک آپ کی بہنوں کو علیٰحدہ جائداد کا حق حاصل نہیں۔ اولاد کی ولایت کا حق انگریز ماں کو اِس وقت تک بھی نہیں۔ اسلام میں یہ حق ہمیشہ سے موجود ہے۔ ان تمام امور میں یورپین قومیں یا تو اسلام کا تتبع کر رہی ہیں یا خود فطرت نے اب انہیں اس طرف توجہ دلا دی ہے۔ یورپ میں طلاق حاصل کر لینا مشکل تھا۔ مسلمانوں میں یہ شکایت کبھی خاص طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مرد کی طرح طلاق دینے کا حق نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے علماء نے کبھی اس بات کی توضیح ہی نہیں کی کہ نکاح کے وقت عورت کہہ سکتی ہے کہ جو حق اسلام نے طلاق کا تم کو (مرد کو) دیا ہے، وہی اس وقت مجھے (عورت کو) دے دو تو پھر نکاح ہو گیا یا یہ حق میرے کسی قریبی تعلق رکھنے والے کو دے دیا جائے۔ آپ نے اپنے لیے ایڈریس

میں اسیران قفس، کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس سے مجھے مغربی عورتوں کی اس تحریک کا خیال ہوا جسے ترکی میں یا اور جگہ یورپ میں ایمنسی پیشن (مردوں کے غلبہ سے آزادی) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں۔پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں۔"غض بصر" کا حکم ہے اور وہ اس لیے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے۔خاص اس وقت کے لیے یہ حکم ہے، دیگر حالات کے لیے اور احکام ہیں۔پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔پھر اسلام میں تعددِ ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا، محض اجازت ہے۔یہ سچ ہے کہ مسلمان مردوں نے اس اجازت سے بے جا فائدہ اٹھایا۔اس میں اصول وقوانین کا کیا قصور؟ جب جنگ میں کسی قوم کے مردوں کی تعداد میں خاص کمی واقع ہو جائے تو آئندہ ملکی حفاظت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک مرد ایک سے زاید بیویاں کرے۔قرآن پاک نے انہی مصالح کو ملحوظ رکھ کر اس قسم کی اجازت دی ہے اس لیے فقہ میں "فرض" اور "رخصت "میں فرق کیا گیا ہے۔رخصت ترک کی جاسکتی ہے۔فرض ہرگز نہیں۔اگر نکاح کے وقت عورت مرد سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس رخصت کو اپنے حق میں ترک قرار دو، جو تعددِ ازدواج کے متعلق ازروئے قرآن تمہیں حاصل ہے،تو وہ اس مطالبے کا حق رکھتی ہے۔اس سلسلے میں ایک الزام میں لڑکیوں کے باپوں کو بھی دوں گا کہ وہ نکاح کے وقت عورتوں کے حقوق پر نگاہ نہیں رکھتے۔مگر ایک الزام خود عورتوں کو بھی دیے بغیر نہیں رہ سکتا،وہ یہ کہ کیوں بوقت ضرورت عورتیں مردوں سے قانونی ذریعے سے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتیں؟ کیوں بھائیوں سے جائداد کا حصہ طلب نہیں کرتیں؟ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کی عدالتیں قائم نہیں، تاکہ یہ معاملے شریعت اسلامی کے ذریعے طے ہوں۔گذشتہ پانچ یا چھ سو سال سے شریعت

اسلامیہ جامد رہی ہے۔ انگریزی قانون والے شریعت اسلامی کو نہیں سمجھ سکتے۔ چند فقہ کی کتابیں مشہور ہیں جو آج سے پانچ چھ سو سال قبل لکھی گئی تھیں۔ اس وقت جو فتوے دیے گئے وہ ان حالات کے مطابق تھے۔ آج حالات اور ہیں۔ اب ان حالات کو ملحوظ رکھ کر شرعی مسائل پر غور کرنا چاہیے۔ اگر عورتیں اپنے حقوق کی حفاظت پر پورے طور پر آمادہ ہو جائیں اور وہ حق جو شریعت اسلامی نے عورتوں کو دے رکھے ہیں، آپ مردوں سے لے کر رہیں، تو میں سچ کہتا ہوں کہ مردوں کی زندگی تلخ ہو جائے۔ عورتیں بچوں کو دودھ پلانے کی اجرت طلب کر سکتی ہیں۔ کھانا پکانے کی اجرت بذریعہ عدالت حاصل کر سکتی ہیں مردوں کو آپ الزام دیتی ہیں، مگر آپ خود الزام سے بری نہیں ہیں۔ آپ کو اپنے حقوق پر شدت کے ساتھ اصرار کرنا چاہیے۔ وہ حق جس کا عورت انصاف وعقل کے ساتھ کبھی مطالبہ کر سکتی ہے، وہ قرآن پاک نے دے دیا ہے۔ ہاں مادر پدر آزادی کی شریعت نے کبھی اجازت نہیں دی، نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کر دینی چاہیے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ زندگی میں عورت کے کون کون سے حقوق ہوں گے، اس وقت تک نکاح نہ پڑھا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں، اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔ آپ کو لفظ آزادی پر نہیں جانا چاہیے۔ آزادی کے صحیح مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ یورپ کی آزادی ہم خوب دیکھ چکے ہیں۔ یورپین تہذیب باہر ہی سے دیکھی جا رہی ہے۔ کبھی اندر سے دیکھی جائے تو رونگٹے کھڑے ہوں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قرآن پڑھیں۔ اس کی تعلیم پر غور کریں۔ پنجاب میں تو اچھی اچھی عدالتوں میں کہہ دیتے ہیں کہ ہم رواج کے پابند ہیں شریعت کے

پابند نہیں۔ محض اس لیے کہ بیٹیوں کو جائداد میں حصہ نہ دینا پڑے۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہم رواج کی قیود سے آزادی حاصل کریں۲۳۔

تقریر ختم ہونے پر خواتین نے اصرار کیا کہ اقبال اپنی کوئی نظم سنائیں، مگر اقبال نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اپنا کلام زبانی یاد نہیں اور یہ کہ وہ کوئی کتاب بھی ساتھ نہیں لائے۔ اس پر پردے میں سے بانگِ درا کے کئی نسخے باہر پھینک دیے گئے اور اقبال مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے ''بانگِ درا'' کا ایک نسخہ اُٹھا لیا اور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پڑھ کر سنائی۔

مدراس میں کئی اداروں اور سیٹھ جمال محمد کے حلقۂ احباب نے اپنے اپنے گھروں میں اقبال کے لیے دعوتوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ نیز عبدالحمید حسن نے بڑی فراخ دلی سے مختلف انجمنوں کی طرف سے دیے جانے والے سپاسناموں کے اجلاسوں کو اقبال کی طرف سے قبول بھی کر لیا تھا۔ اقبال بطیّب فاطر ہر دعوت اور جلسے میں شریک ہوئے تا کہ کسی کو بداخلاقی کی شکایت پیدا نہ ہو۔ انہیں مدراس میں اپنے قیام کے دوران میں مدرسۂ جمالیہ، انجمن ترقی اردو، ہندی پرچار سبھا، اردو سوسائٹی گورنمنٹ محمڈن کالج، انجمن ہلالِ احمر وغیرہ نے سپاسنامے پیش کیے اور اقبال نے ایسے سب مجمعوں سے خطاب بھی کیا۔ مدراس کی سیر کے لیے وقت کم تھا، لیکن اس کے باوجود سیٹھ جمال محمد نے انہیں فورٹ منرو، پریزیڈنسی اور کئی عالی شان عمارات کی سیر کرائی۔ انہوں نے غیر برہمنوں کے دراویدی فنِ تعمیرات کے مندر بھی دیکھے۔ پھر ساحل کی سیر کے لیے نکل گئے۔ ماہی گیروں کو مل کر مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیکھا اور وہاں کا ایکوریم (ماہی خانہ) ان کی خاص توجہ کا مرکز بنا۔ بعد ازاں مدراس کے علاقے اڈیار میں گئے، جہاں تھیوسوفسٹ فرقہ کے لوگ آباد تھے اور ان کی رہنما مسز اینی بسنت تھیں۔ اس مقام پر بڑ کا ایک قدیم اور عظیم الشان درخت تھا جس کی شاخیں وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ بجائے خود ایک قابل دید چیز تھی

-

۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کی رات کو مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے انہیں الوداعی دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں شہر کے روسا اور اہلِ علم شریک ہوئے۔ اقبال کے سفرِ مدراس پر علمی اعتبار سے تبصرہ کیا گیا اور بعض لوگوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مدراس آنے سے مسلمانوں میں خالص اسلامی تعلیم کے حصول اور فروغ کا ولولہ پیدا ہوا ہے۔ اس موقع پر عبدالحمید حسن اور سیٹھ جمال محمد نے مختصر تقاریر کیں۔ بقول عبداللہ چغتائی اقبال نے جواب میں جو تقریر کی وہ دل کو ہلا دینے والی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے ماضی میں علوم وفنون کی ترقی کا ذکر کیا گیا اور ان کی موجودہ حالت پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں انہوں نے سیٹھ جمال محمد کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مدراس کے مسلمانوں میں ایسے شخص کی موجودگی مغتنماتِ روزگار میں سے ہے۔

۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کی شام سے قبل سیٹھ جمال محمد بوسوٹو ہوٹل میں آئے اور اقبال کو خطبات کے اخراجات کے طور پر ایک چیک کے علاوہ نہایت نفیس کشمیری دُھسا بھی پیش کیا۔ اسی طرح چوہدری محمد حسین، عبداللہ چغتائی اور علی بخش کو پشمینہ کی اعلیٰ چادریں دی گئیں اور یوں ان کے عمل نے اسلامی ثقافت کی ایک قدیم روایت کو زندہ کر دیا۔ اسی شام بنگلور روانہ ہونے کی خاطر اقبال مدراس چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم انہیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا

-

۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح سوا چھ بجے گاڑی بنگلور چھاؤنی کے اسٹیشن پر رکی۔ مسلمانانِ بنگلور ہزاروں کی تعداد میں اقبال کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے اور انہوں نے پھولوں کے بڑے بڑے ہار، جو خاصے قیمتی تھے، ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ اسٹیشن کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر مجمع میں سب سے نمایاں

فخر التجار حاجی سر اسمٰعیل امین الملک وزیر اعظم ریاست میسور، حاجی سیٹھ عبدالغفور، کلیم الملک سید غوث محی الدین مدیر اخبار ''الکلام'' اور محمود خان محمود بنگلوری تھے، جنہوں نے آگے بڑھ کر اقبال کو ہار پہنائے[۲۴]۔ حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ، اقبال کے استقبال کے لیے مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر بھی پہنچے تھے، اور مدراس ہی میں انہوں نے اقبال کو بنگلور میں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی چنانچہ اقبال حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ اور حاجی سیٹھ عبدالغفور کے ساتھ موٹر کار میں سوار ہو کر ان کی رہائش گاہ الکس لاج کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ لوگوں نے موٹر کار کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا تھا اس لیے تقریباً نصف میل اسے نہایت آہستہ چلانا پڑا۔

حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ بنگلور کے ایک بہت بڑے رئیس تھے۔ بنگلور کا مشہور زنانہ ہسپتال جو گوشہ ہسپتال کے نام سے پکارا جاتا تھا، انہی کا قائم کردہ تھا۔ کئی مساجد تعمیر کرا چکے تھے۔ لاکھوں روپے مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ بین الاقوامی تاجر بھی تھے۔ تمام کاروبار انگریزوں کے ساتھ تھا۔ گھر میں انگریز خاتون ملازم رکھی ہوئی تھی جو تمام اہم امور کی نگرانی کرتی تھی۔ خود انگریزی بولتے تھے، لیکن انگریزی لکھنا نہ جانتے تھے۔ ایک موقع پر اقبال سے کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب میں انگریزی دان نہیں ہوں۔ اقبال نے جواب میں فرمایا کہ آپ انگریزی دان نہ سہی ''انگریز دان'' تو ضرور ہیں، اس لیے آپ کو انگریزی جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی اور کانوں سے قدرے بہرے تھے گھڑ دوڑ کا بے حد شوق تھا چنانچہ ان کی کوٹھی میں ایک کمرہ ایسا تھا جسے لاتعداد انعامات سے سجایا گیا تھا، جو ان کے گھوڑوں نے جیتے تھے، ان کا ایک لڑکا سیٹھ محمد انہی دنوں بیمار ہو کر لندن سے آیا تھا اور کوٹھی میں مقیم تھا۔ اقبال اور ان کے ہمسفروں کی رہائش کا انتظام اسی کوٹھی میں کیا گیا تھا۔ اقبال ناشتا سے فارغ ہو کر سیٹھ محمد کی عیادت کے لیے ان کے کمرے میں گئے اور ان کی یورپین اہلیہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

دس بجے صبح مسلم لائبریری معسکر بنگلور کے زیر اہتمام اقبال کے اعزاز میں مہاتما گاندھی روڈ پر واقع اپرا ہاؤس میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں انہیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت امین الملک سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم ریاست میسور نے کی۔ اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں پر روشنی ڈالی اور مسلم لائبریری کو ترقی دینے پر زور دیا اس کے بعد کتب خانہ میں کتابوں کا معائنہ فرمایا اور کتاب آراء میں تحریر کیا:

جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوان خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے، جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکین کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں ۲۵۔

اسی شام دوسرا جلسہ آرٹس اینڈ سائنس کالج کے میدان میں ہوا۔ یہ جلسہ عام محکمہ تعلیم میسور کی طرف سے منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت پروفیسر سبا راؤ نے کی۔ اس میں بنگلور کے ہزاروں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان جمع تھے۔ اس موقع پر اقبال نے ایک پُر مغز فلسفیانہ تقریر کی [۲۶]۔ رات کا کھانا بنگلور کے ایک اور مسلمان رئیس جمان محمد علی کے ہاں تھا۔ جس میں ہزار ہا معززین مدعو تھے دعوت کا انتظام میمن تاجروں کی روایات کے مطابق فرشی تھا۔ بنگلور میں مختصر قیام کے دوران میں اقبال کی ملاقات وہاں کے بیشتر شرفاء سے ہوئی اور حاجی اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی میں ملنے والوں کا ایک تانتا لگا رہا۔

اقبال کو اطلاع کر دی گئی تھی کہ اگلے روز بوقت دوپہر مہاراج میسور کی خاص موٹر کار انہیں لینے کے لیے آئے گی۔

چنانچہ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو تقریباً گیارہ بجے ریاست کے ایک رہنما افسر ایک بڑی موٹر کار لے کر وہاں پہنچ گئے۔ حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی پر موجود بنگلور کے سیکڑوں اہل علم نے اقبال کو الوداع کہی اور یوں اقبال اور ان کے ہمسفر موٹر کار میں سوار ہو کر میسور کی طرف روانہ ہوئے۔ دریائے کاویری کا پل عبور کر کے کسی سڑک کے موڑ سے گزر رہے تھے کہ چند آدمیوں نے موٹر کار رکوالی۔ ان میں ایک معمر شخص تھا۔ باقی افراد نے چائے سے بھری ہوئی چائے دانی اور پیالے اٹھا رکھے تھے۔ وہ لوگ اقبال سے بڑی عقیدت مندی سے ملے اور انہیں چائے پیش کی۔ بوڑھے شخص نے بتایا کہ اس نے لاہور کے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اقبال کو 'نالۂ یتیم' پڑھتے سنا تھا اور وہ منظر اب تک اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ سب کسی دور کے گاؤں کے رہنے والے تھے اور بوڑھے شخص کے ساتھ اقبال کی ملاقات کے لیے صبح ہی سے آئے ہوئے تھے۔ سفر پھر جاری ہوا۔ رستے میں سواسمدرم کے مقام پر ریاست میسور کا بجلی پیدا کرنے کا کارخانہ دیکھا اور بالآخر کوئی سوا چار بجے کے قریب میسور پہنچ گئے۔ میسور ایک نہایت صاف ستھرا اور پُر فضا شہر ہے۔ چونکہ یہی وقت مہاراج میسور سے ملاقات کا طے پا چکا تھا۔ اس لیے موٹر کار انہیں سیدھی ریاست کے مہمان خانے میں لے گئی۔ اقبال فوراً تیار ہو کر مہاراج میسور سے ملاقات کے لیے گئے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ گزارنے کے بعد واپس آ گئے۔

شام کو چھ بجے میسور یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام اقبال نے ایک لکچر یونیورسٹی ہال میں دینا تھا۔ اس جلسے کی صدارت چاندی، وائس چانسلر کر رہے تھے۔ جب اقبال وہاں پہنچے تو ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حاضرین میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کے علاوہ شہر کے کئی برہمن اور غیر برہمن شرفاء و فضلا بھی موجود تھے۔ اقبال نے مدراس میں پڑھے ہوئے تین مقالوں میں سے ایک مقالہ اس موقع پر پڑھا۔

۱۱/ جنوری ۱۹۲۹ء کو ریاست میسور کی طرف سے ان کے لیے سلطان ٹیپو کے قلعہ سرنگا پٹم جانے اور وہاں قریب ہی سلطان ٹیپو کے مزار وغیرہ کی زیارت کرنے کا پروگرام تھا۔ سو صبح تقریباً نو بجے سب موٹر کاروں میں سوار ہو گئے۔ اس قافلے کی ایک موٹر کار میں میسور کے مشہور و معروف درباری موسیقار علی جان اپنے سازندوں سمیت موجود تھے، جنہیں مہاراج میسور نے اقبال کی صحبت میں رہنے کے لیے خاص طور پر بھیجا تھا۔ اقبال بارہ بجے کے قریب سلطان ٹیپو کے مقبرے یعنی گنبد سلطانی پر پہنچے۔ مقبرے کے دروازے پر ریاست کی طرف سے ہر وقت نوبت بجتی رہتی ہے۔ روضہ سیاہ سنگ مرمر یا سنگ موسیٰ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اقبال نے مزار کے اندر داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی وہ آیت جو شہدا کے ضمن میں ہے (وہ جو اللہ کے راستے میں مارے گئے، انہیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں۔ مگر لوگوں کو شعور نہیں ہے) تلاوت فرمائی۔ گنبدِ سلطانی میں تین قبریں ہیں۔ سیاہ غلاف والی قبر حیدر علی والد سلطان ٹیپو کی ہے۔ اور دائیں طرف دو قبروں میں ایک سنہری قبر فاطمہ والدہ سلطان ٹیپو کی اور دوسری قبر جس پر سُرخ غلاف ہے، سلطان ٹیپو شہید کی ہے۔ سُرخ رنگ دراصل شہید کی نشانی ہے۔ سلطان ٹیپو نے خود اپنے والدین کو یہاں دفن کیا اور یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ مزار کے اندر کی فضا ایسی ہے کہ انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال نے جس عقیدے اور خلوص سے روضہ کے اندر فاتحہ خوانی کی، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ روضے کے اندر چاروں طرف دیواروں اور تعویذوں پر کئی فارسی اشعار شہدا کی شان میں کندہ ہیں۔ سلطان ٹیپو ۱۲۱۳ھ بمطابق ۱۷۹۹ء میں شہید ہوئے اور ان کی تاریخ شہادت ''شمشیر گم شد'' کے الفاظ سے برآمد ہوتی ہے۔ یہی تاریخ ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے بھی تحریر کی ہے۔ روضے سے باقی لوگ تو باہر چلے گئے، لیکن تنہا اقبال، سلطان شہید کی تربت کے قریب آنکھیں بند کیے دیر تک کھڑے رہے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ میں

نے جو منظر اقبال کا یہاں دیکھا اسے الفاظ میں تو ڈھالنا ممکن نہیں۔ پھر بھی اس پر ایک الگ مضمون بعنوان ''شمشیر گم شد'' لاہور واپس آ کر تحریر کیا جو ''نیرنگ خیال'' میں طبع ہوا۔

روضے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس کے باہر صحن میں سب لوگ جا کر بیٹھ گئے اور علی جان نے نہایت سوز کے عالم میں اقبال کا اردو اور فارسی کلام گانا شروع کر دیا۔ اقبال کے آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھمتا تھا اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی۔ علی جان یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور گاتے گاتے رک گئے۔ اقبال نے بڑے اضطراب کے عالم میں کہا: رک کیوں گئے جاری رکھو۔ سو علی جان گاتے رہے اور اقبال آنسو بہاتے رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوئے تو میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد ابا (عباس) نے، جو ان کے ساتھ تھے، پوچھا کہ سلطان شہید نے آپ کو کوئی پیغام دیا۔ اقبال نے جواب دیا کہ ان کی معیت میں میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گزرا۔ پھر فرمایا کہ ایک پیغام یہ ملا ہے:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

یہ شعر اُس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جب سلطان ٹیپو کو شہادت سے کچھ دیر قبل کسی مشیر نے رائے دی تھی کہ انگریزوں سے مصالحت کر لی جائے، اور انہوں نے فوراً جواب دیا تھا کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے[27]۔ بعد ازاں رستے میں چار اور شعر بھی موزوں ہو گئے، جو اقبال کے انتہائی ذاتی تاثرات پر مبنی تھے اور ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں:

آتشے در دل دگر بر کردہ ام　　داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام　　می کشم اورا بتدریج از نیام
نکتۂ گویم ز سلطانِ شہید　　زاں کہ ترسم تلخ گردد روز عید

پیشتر رفتم کہ بوسم خاک او　　تاشنیدم از مزارِ پاک او
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(یعنی میں دکن سے ایک داستان اپنے ساتھ لایا ہوں، جس نے میرے دل میں نئی حرارت پیدا کر دی ہے۔ میرے پہلو میں آئینے جیسا ایک چمکدار خنجر ہے جسے میں آہستہ آہستہ نیام سے باہر نکال رہا ہوں۔ سلطان شہید کی طرف سے مجھے ایک نکتہ ملا ہے۔ جسے بیان کیے دیتا ہوں، گو مجھے خوف ہے کہ اسے سن کر کہیں تیری عید کی خوشیوں میں تلخی کا رنگ نہ بھر جائے۔ میں جب ان کی خاک کو بوسہ دینے کی غرض سے وہاں تک پہنچا تو مزار پاک سے ندا آئی؛ اگر جہاں میں مردوں کی طرح زندہ رہنا ممکن نہ ہو تو مردانہ وار جان قربان کر دینے ہی میں زندگی ہے)

مزار سے سرنگا پٹم قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی ایک بجے کے قریب اقبال دولت باغ پہنچے جو قلعے کی نزدیک ہے۔ سرنگا پٹم دراصل ایک جزیرہ ہے جو دریائے کاویری کی دو شاخوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک حصے میں باغ اور قلعہ ہے جب کہ دوسرے حصے میں شہر آباد تھا، جس کی آبادی سلطان ٹیپو کی شہادت کے چار پانچ سال بعد بھی دو تین لاکھ سے کم نہ تھی، مگر اب یہ ایک ویرانہ ہے۔ مہاراج میسور کے مصاحب خاص صدیق الملک صادق زین العابدین شاہ، اقبال کے استقبال کے لیے دولت باغ میں منتظر تھے۔ دوپہر کی ضیافت طعام کا انتظام تھا۔ دولت باغ میں سلطان ٹیپو کے زمانے کے درخت ابھی تک موجود تھے۔ سلطان ٹیپو کو قلعے کی عمارت اور باغ سے خاص انس تھا۔ دولت باغ کے ایک طرف دریائے کاویری بہتا ہے اور اس کا منظر نہایت ہی دلفریب ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد اقبال سرنگا پٹم قلعے کی سیر کو نکل گئے وہاں انہوں نے قلعے کی مسجد اعلیٰ، وہ مقام جہاں سلطان ٹیپو کی شہادت واقع ہوئی، زندان، میر جعفر کی مفروضہ قبر، لنگڑے غلام

علی کا مقبرہ، وہ مندر جسے حیدر علی نے مرمت کر کے ہندوؤں کے لیے واگزار کیا تھا اور دیگر آثارِ سلطانی دیکھے محمود خان محمود بنگلوری ہر مقام کا تعارف کراتے اور تاریخی پس منظر بتاتے جاتے تھے۔ مسجد اعلیٰ کے بوڑھے امام سے اقبال کی ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ان کے دادا سلطان ٹیپو کے زمانے میں مسجد اعلیٰ کے امام تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی روایت سے اقبال کو بتایا کہ سلطان ٹیپو مسجد کی عقبی دیوار کے دروازے سے مسجد میں نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح دیوار پر سید غفار شہید، سپہ سالار افواج سلطانی کی جو سلطان ٹیپو سے کچھ لمحے پیشتر شہید ہوئے، تصویر دیکھ رہے تھے کہ کسی نے بتایا کہ رفیقِ سفر کلیم الملک سید غوث محی الدین مدیر اخبار ''الکلام'' ان کے پڑپوتے ہوتے ہیں، تو اقبال نے فرطِ عقیدت سے انہیں گلے سے لگا لیا سرنگا پٹم سے واپسی پر رستے میں سدِ کاویری (کاویری ڈیم) دیکھا۔ کاشتکاروں کو زراعت کے لیے وافر پانی فراہم کرنے کی خاطر اس بند کی بنیاد سلطان ٹیپو نے رکھی تھی، لیکن اس کی تکمیل ان کی شہادت کے بعد ہوئی اور اب اسے کرشنا راج ساگر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سلطان ٹیپو کا بنیادی پتھر جس پر فارسی زبان میں کتبہ کندہ تھا۔ اتفاق سے وہیں پتھروں میں پڑا مل گیا اور اسے مہاراج میسور کے حکم سے سد کے اوپر عام گزرگاہ کے قریب نصب کر دیا گیا۔ کتبے کا انگریزی ترجمہ بھی مرمر کے ایک ٹکڑے پر کندہ کر کے ساتھ نصب کیا گیا اور ساتھ ایک باغ بھی لگوایا گیا جس کے فوارے بجلی کے زور سے چھوٹتے تھے اور عجیب و غریب منظر پیدا کرتے تھے۔ اقبال عصر کے قریب واپس میسور پہنچے۔

مہمان خانے میں تھوڑا آرام کرنے کے بعد چھ بجے شام اقبال ٹاؤن ہال گئے، کیونکہ وہاں انہیں مسلمانان میسور کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا جانا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے منتظر تھے۔ اس جلسے کا اہتمام سیٹھ محمد ابا (عباس) نے کیا تھا۔ صدارت نواب غلام احمد کلامی نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآنِ مجید

سے ہوا۔ قاری مولانا ابوالمظفر تھے۔ بعدازاں علی جان نے اپنے تمام سازندوں کے ساتھ اقبال کی چند نعتیہ نظمیں نہایت رقت آمیز سُروں میں گائیں۔ پھر سیٹھ محمد ابا (عباس) نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اقبال نے جواب میں نہایت موثر تقریر کی۔ ان کے بعد میسور یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر واڈیا نے منتظمین کی طرف سے چند اختتامی کلمات کہے جس میں اقبال کے پچھلے دن کے لکچر کی خوب تعریف کی اور کہا کہ اقبال کو مسلمان ہزار اپنا کہیں مگر وہ سب کے ہیں، کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوؤں کو یہ فخر کچھ کم نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے۔

۱۲ رجنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کو اقبال میسور یونیورسٹی کا شعبۂ نفسیات عملی دیکھنے گئے۔ ڈاکٹر گوپال سوامی صدر شعبہ نے انہیں طلبہ سے ملوایا اور چند دلچسپ تجربے دکھلائے ان میں سے ایک تجربہ یہ تھا: ڈاکٹر گوپال سوامی نے اقبال کی نبض پر اپنے نفسیاتی آلہ کا تار باندھ دیا اور انہیں کہا کہ ایک سے دس تک کسی عدد کو اپنے ذہن میں رکھ لیں۔ اقبال نے چھ کا عدد اپنے ذہن میں چن لیا۔ ڈاکٹر گوپاک سوامی ایک دو گننے لگے۔ جب چھ پر پہنچے تو آلے کا کانٹا زور سے حرکت کرنے لگا۔ اس تجربے پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ مثنوی رومی کی پہلی حکایت میں طبیب الٰہی بھی نبض کی رفتار میں فرق آ جانے کے ذریعے کنیزک کے مرض کی نوعیت معلوم کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح بوعلی سینا نے بھی قابوس بن وشمگیر کے مرض کی تشخیص کی تھی۔ سو آج سے کئی صدیاں قبل حکماء اسی اصول سے کام لیتے تھے [29]۔ بعدازاں اقبال میسور کے چند پرانے محلات دیکھنے گئے۔ ایک مقام پر سلطان ٹیپو کی یاد میں پتھر میں تراشا ہوا شیر ان کی توجہ کا مرکز بنا۔ بجلی کی ٹرالی کے ذریعے ایک پرانے مزار پر پہنچے، کیونکہ سلطان ٹیپو اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ چڑیا گھر دیکھا جہاں شیر بالکل کھلے پھرتے تھے، لیکن انہیں علم نہ ہوا کہ درمیان میں ایک خندق حائل ہے جو دکھائی

نہیں دیتی۔

اسی روز دوپہر کے کھانے کے بعد اقبال اپنے ہمسفروں کے ساتھ بذریعہ موٹر کار واپس بنگلور روانہ ہوئے۔ رستے میں دو تین مقامات پر دیہاتیوں نے انہیں پھولوں کے ہار پیش کیے۔ سلطان ٹیپو کے مزار کے قریب سے گزرتے وقت انہوں نے موٹر کار سے اتر کر ایک بار پھر فاتحہ پڑھی۔ چاند پٹم میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے پیروں کے مزار تھے۔ وہاں بھی رکے اور فاتحہ کہی۔ شام پانچ بجے کے قریب بنگلور پہنچے۔ چائے سر مرزا اسمٰعیل کے ساتھ نوش فرمائی۔ ان کے گھر کا سارا ماحول ایرانی تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر سر اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ رات کا کھانا بنگلور کے کسی تاجر محمد علی کے ہاں تھا۔ تمام عمائد شہر وہاں مدعو تھے۔ رات گئے سر اسمٰعیل سیٹھ کی رہائش گاہ میں آ کر سوئے۔

۱۳ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اقبال بنگلور سے میٹر گیج ریل پر حیدر آباد روانہ ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے انہیں لکچروں کے لیے دعوت دے رکھی تھی جو قبول کر لی گئی تھی۔ سید غوث محی الدین مدیر ''الکلام'' بھی میسور سے ساتھ گئے۔ اگلے روز یعنی ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح جب گاڑی فلک نما سے گزر کر حیدر آباد کے اسٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سیکڑوں مسلمان بچے قطاروں میں کھڑے ''چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا'' خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری اور دیگر اصحاب یہیں سے ساتھ ہوئے۔ انہوں نے اقبال کو مطلع کیا کہ وہ حیدر آباد میں حکومتِ نظام کے مہمان ہوں گے، اس لیے انہیں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہو گا۔ اس سے پیشتر دلکشا میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چائے گاڑی ہی میں آ گئی۔ اگلے اسٹیشن سکندر آباد پر اترنا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، سید ابراہیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ دستور کے

مطابق اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اس کے بعد وہ سر اکبر حیدری کے ہمراہ بیلا وسٹا گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

اقبال نے ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء تک حیدر آباد میں قیام کیا۔ اپنی آمد کے پہلے ہی دن وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے ساتھ جا کر محل کی کتابِ حضوری میں اپنا نام لکھ آئے۔ اگلے روز یعنی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء کی شام کو باغِ عامہ کے ہال میں اقبال کا پہلا لکچر تھا۔ صدارت مہاراجہ سر کشن پرشاد نے کی اور حاضرین میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ شامل تھے۔ رات کو مہاراجہ سر کشن پرشاد کے ہاں ایک پر تکلف ضیافت اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا اور تمام مدعوئین کو ہدایت تھی کہ آصف شاہی دستار اور بگلس یعنی ریاست کا درباری لباس پہن کر آئیں۔ سو حیدر آباد کے تمام مشہور اردو اور فارسی کے شعرا اسی لباس میں آئے۔ طعام کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ حیدر یار جنگ طباطبائی، نواب ضیاء یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی، نظام شاہ لبیب تیموری، میر کاظم علی باغ اور دیگر شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اقبال کسی کو داد دیے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔ صرف مولوی مسعود علی محوی کے اس شعر:

نگاہ کردن دزدیدہ ام بہ بزم بہ دید
میاں چیدن گل باغباں گرفت مرا

پر اتنا ارشاد کیا کہ پھر پڑھیے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ داد کے طور پر مکرر پڑھنے کو کہا یا تنقیدی نقطۂ نگاہ سے۔ اقبال نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ کوئی شعر یا نظم اس دعوت میں نہ پڑھیں گے، لیکن مہمانوں اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے اصرار پر مندرجہ ذیل فارسی اشعار پڑھے:

زندگی انجمن آراء و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ رو

آں نگینے کہ تو با اہر مناں ساختہ
هم به جبریل امیں نتواں کرد گرو

ابھی اقبال دعوت سے لوٹے نہ تھے کہ رات نو بجے کے قریب سر امین جنگ پرائیویٹ سیکرٹری نظام نے گیسٹ ہاؤس میں ایک پیغام بھجوایا کہ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح گیارہ بجے نظام ان سے ملاقات کریں گے۔ جب وہ واپس آئے تو عبداللہ چغتائی اور چوہدری محمد حسین نے انہیں خط کے موصول ہونے کی اطلاع دی اور بتایا کہ اب ان کے لیے ۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء سے پہلے لاہور روانہ ہونا ممکن نہ ہو سکے گا۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۹ء کا دن گیسٹ ہاؤس ہی میں یونیورسٹی کے اساتذہ طلبہ اور دیگر ممتاز شخصیات سے ملاقاتوں میں گزرا۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح اقبال نے دوسرا لکچر زیر صدارت نواب اعظم جاہ ولی عہد سلطنت، باغ عامہ کے ہال میں دیا۔ دونوں مقالے وہی تھے جو مدراس میں پڑھے جا چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا سر اکبر حیدری کے ہاں تھا، جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ، محکمہ مالیات کے عہدے دار اور بعض اہم شہریوں نے شرکت کی۔ اسی رات سر امین جنگ نے اقبال کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح گیارہ بجے اقبال نظام سے ملے۔ نظر حیدرآبادی تحریر کرتے ہیں کہ نظام کے دربار میں جانے والوں کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف شاہی دستار اور بگلس لگائیں، لیکن اقبال پر یہ پابندی نہ لگائی گئی [۳۰]۔ اس ملاقات کے متعلق بعض غلط باتیں بھی مشہور ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ اقبال نے نظام کو اپنے فارسی اشعار سنائے اور ''رموزِ بے خودی'' ایک نسخہ پیش کیا۔ یا یہ کہ اقبال نے حکیم اجمل خان سے سُن رکھا تھا کہ نظام کے پاس ایک بیش بہا، نہایت چمکدار ہیرا ہے اور اقبال کے ہیرا دیکھنے کی خواہش پر نظام نے انہیں فوراً وہ ہیرا منگوا کر دکھایا۔ یا یہ کہ نظام نے انہیں شکایتاً کہا کہ ہم دہلی گئے ہوئے تھے، لاہور قریب ہی تھا، تم ہمیں

ملنے کیوں نہ آئے اور اقبال نے جواب دیا کہ میں ان دنوں بیمار تھا، اب اسی سہو کی تلافی کے لیے ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ اس پر نظام نے خوش ہو کر کہا کہ چلو ہم تمہیں ریاست کا وزیر قانون مقرر کرتے ہیں، لیکن اقبال نے جواب دیا کہ سرکار، اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہے[31]۔ درحقیقت نظام سے اقبال کی ملاقات محض ایک رسمی ملاقات تھی۔ اقبال نے ملاقات کے دوران میں نظام کو انجمن حمایت اسلام کے آئندہ سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے پنجاب آنے کی دعوت دی جو نظام نے قبول کر لی۔ بعد میں اس سلسلے میں اقبال کی نظام کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی، لیکن بالآخر نظام اپنی بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب پنجاب نہ آ سکے۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال، حیدر آباد سے لاہور روانہ ہوئے اور یوں جنوبی ہند کا یہ دلچسپ علمی دورہ اختتام پذیر ہوا۔

برصغیر کے مسلم علمی حلقوں میں اقبال کے خطباتِ مدراس کی خاصی تشہیر ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ نے خواہش ظاہر کی کہ وہی مقالات علی گڑھ میں بھی پڑھے جائیں، لیکن چونکہ اقبال نے تین مزید مقالات اسی سال مکمل کر لیے تھے، اس لیے سر راس مسعود کی درخواست پر، جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، اقبال نے چھ مقالات علی گڑھ میں پڑھنے منظور فرما لیے۔ چنانچہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال، عبداللہ چغتائی کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہوئے۔ جب علی گڑھ پہنچے تو سر راس مسعود کسی کام کے لیے بھوپال گئے ہوئے تھے۔ بہر حال ریلوے اسٹیشن پر اساتذہ اور طلبہ نے ان کا استقبال کیا اور وہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن، صدر شعبۂ فلسفہ کے ہاں جا کر مقیم ہو گئے۔ اگلے روز سر راس مسعود بھی بھوپال سے واپس آ گئے۔ علی گڑھ میں اقبال کا قیام ۳۰ر نومبر ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے چھ مقالات اسٹریچی ہال میں پڑھے۔ پہلے جلسے میں سر راس مسعود نے اقبال کا تعارف انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات کے ساتھ کرایا اور اپنی تقریر

کے دوران میں انکشاف کیا کہ ایک موقع پر جب وہ یورپ میں بیمار ہو کر ہسپتال پہنچے تو وہاں ان کی تسکین کا سامان اقبال کے وہ ایک ہزار شعر تھے جو انہیں زبانی یاد تھے[۳۲]۔

علی گڑھ میں اقبال کا بیشتر وقت علمی مجلسوں یا علمی صحبتوں میں گزرا۔ سر راس مسعود، ڈاکٹر سید ظفر الحسن، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ضیاء الدین، بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر عطا اللہ بٹ نے ان کے اعزاز میں دعوتیں دیں۔ اقبال صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی عیادت کے لیے گئے، جو ان ایام میں بعارضۂ فالج بیمار تھے۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کی بیمار پُرسی کے لیے بھی ان کے ہاں گئے۔

اقبال، اپنی تمام مصروفیات کے باوجود خطبات کو کتاب کی صورت میں مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خطبات کے عنوانات اور متن میں کچھ تبدیلیاں کیں اور بالآخر چھ خطبوں پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار وسط ۱۹۳۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی ۔ بعد ازاں اس میں ایک خطبہ بعنوان ''کیا مذہب ممکن ہے'' کا اضافہ کیا گیا۔ ساتواں مقالہ انگلستان کی ارسطاطلین سوسائٹی کی درخواست پر تحریر کیا گیا تھا، جو ۱۹۳۲ء میں وہیں پڑھا گیا۔ لہٰذا سات خطبات پر مشتمل یہ مجموعہ دوسری بار آکسفورڈ یونیورسٹی پریس انگلستان نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ اس طرح خطبات کا جو سلسلہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا تھا، ۱۹۳۲ء میں اختتام کو پہنچا۔ جرمنی کے مستشرق پروفیسر ہیل نے جب اس تصنیف کا مطالعہ کیا تو اس نے اقبال کو لکھا کہ کتاب عصر حاضر کے اہم ترین مظاہر میں سے ہے[۳۳]۔

اقبال کا خیال تھا کہ عام لوگ کتاب سے مستفید نہ ہو سکیں گے اور وہی اہل علم جنہوں نے مغربی اور اسلامی فلسفے کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، ان کا مقصد سمجھ سکیں گے[۳۴] لیکن اس کے باوجود انہوں نے سید نذیر نیازی کو اردو ترجمہ کرنے کی ترغیب دی۔ چوہدری محمد حسین خطبات کے اردو ترجمہ کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

مسلمانوں کو مسائل فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ویسے بھی یہ مسائل ضمنی تھے، اصولی نہ تھے۔ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اردو ترجمے سے خطبات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا نہ ہو جائیں یا پیدا کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ چونکہ خطبات کے مباحث خالصتاً فلسفیانہ نوعیت کے تھے، اس لیے امکان تھا کہ اقبال کے افکار کے متعلق کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دیا جائے۔ چوہدری محمد حسین کا اندیشہ بے بنیاد نہ تھا، کیونکہ خطبات کی اشاعت کے بعد قاہرہ میں مقیم کسی ہندی نژاد عالم نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کا فکر مغربی فلسفے سے دب گیا ہے اور اگر اس کی اشاعت اردو میں ہوئی تو علمائے ہندوستان کا فرض ہوگا کہ سرسید احمد خان کے نیچری فتنہ کی طرح اس کا بھی استیصال کریں ۳۵۔ مگر اقبال کی توقع کے برعکس مسلمانوں میں فلسفہ دان حضرات نے بھی تو خطبات کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

دراصل خطبات میں حضرت علامہ نے اساسی طور پر جو بحث اٹھائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مغربی فلسفہ اور علوم و معارف کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہو۔ محض فلسفہ یا علوم طبیعی یا تاریخ تہذیب و تمدن یا مذاہب، الٰہیات اور علوم دینیہ کا مطالعہ کافی نہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ ہماری نظر فکر انسانی کے ان تغیرات پر بھی ہونی چاہیے جو مشرق و مغرب، بالخصوص مغرب میں بڑی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں اور جن سے اس امر کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے کہ موجودہ تمدن کا رُخ آئندہ کس جانب ہوگا اور انسان کس قسم کے عالم کی تعمیر کا آرزومند ہے۔ لیکن نہ خطبات کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا گیا نہ ان کی اشاعت پر یہ توقع پوری ہو سکی کہ ارباب فن اقبال کا حقیقی مقصد سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا خطبات کا مطالعہ بہت کچھ سطحی رہا بلکہ ان پر بہت کم توجہ کی گئی ۳۶۔

چونکہ خطبات کا مطالعہ سطحی تھا، اس لیے بعض انگریز مستشرقین نے ڈکنسن (جو خود صرف انگریزی ادبیات کا ماہر تھا اور جس نے نہ تو اسلامی فلسفے کا مطالعہ کیا تھا اور نہ ہی یورپی فلسفہ ہی سے پوری طرح شناسا تھا) کی تقلید میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اقبال تو یورپی فلسفیوں بالخصوص نطشے اور برگساں کے نظریات سے متاثر تھے۔ علماء بحیثیت مجموعی خطبات کی طرف متوجہ نہ ہوئے، مگر جنہوں نے اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی، ان کے نزدیک بھی اقبال کا نظامِ فکر مغربی فلسفیوں کے تخیلات پر مبنی تھا، اس لیے ان کے افکار کفریات کے سوا کچھ نہ تھے۔ خطبات کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے اقبال کی زندگی ہی میں کر دیا تھا، بقول ان کے اس کا نام ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' اقبال ہی کا تجویز کردہ ہے[۳۷] لیکن ترجمے کی اشاعت اقبال کی وفات کے بیس سال بعد ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' ایک مشکل کتاب ہے، کیونکہ اس میں مشرق و مغرب کے ڈیڑھ سو سے زائد قدیم و جدید فلسفیوں، سائنس دانوں، عالموں اور فقیہوں کے اقوال و نظریات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اقبال قاری سے توقع رکھتے ہیں کہ خطبات کے مطالعے سے پیشتر وہ ان سب شخصیات کے زمانے، ماحول اور افکار سے شناسا ہوگا۔ ان شخصیات میں بعض تو معروف ہیں اور بعض غیر معروف۔ اس کے علاوہ خطبات کا انداز تحریر نہایت پیچیدہ ہے۔ بسا اوقات کسی مقام پر ایک ہی بحث میں کئی مسائل کو اٹھایا گیا ہے یا ایک مسئلے پر جاری بحث کو اچانک چھوڑ کر کسی اور مسئلے کا ذکر چھڑ جاتا ہے، اور اس پر اظہار خیال کی تکمیل کے بعد پھر چھوڑے ہوئے مسئلے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بعض نظریات کی وضاحت کی خاطر نئی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور ان میں الفاظ کی ترتیب مطالب کے فہم و تفہیم کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ کئی مقامات پر انگریزی زبان میں استدلال نا قابل فہم ہے اور اس کے بار بار تعاقب کرنے سے بھی معانی صاف نہیں ہوتے۔

خطبات کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال اپنے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ قرآن حکیم فکر کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے تمدن کے ابتدائی دور میں اس زاویۂ نگاہ کو ترقی دی اور علماء و صوفیہ نے دین و ایمان کی اساس باطنی وجدان پر رکھی، لیکن آج کا انسان جدید تعلیم کے زیر اثر، احوال باطن کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور علماء و صوفیہ چونکہ عصر حاضر کی نفسیات سے نا آشنا ہیں، اس لیے روحانیت کے میدان میں اسے مؤثر ہدایت دینے سے قاصر ہیں۔ ان کی ہدایت ایک ایسے زمانے کی نفسیات کے مطابق تھی جو گزر گیا۔ آج کے انسان کی نفسیات چونکہ مختلف ہیں، اس لیے پرانا اندازِ ذکر و فکر اس کے لیے جاذب توجہ نہیں رہا۔ پس ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ علم دین کو سائنٹیفک یا فلسفیانہ استدلال کے طور پر پیش کیا جائے، مگر ایسے انداز میں کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید انسانی افکار کی روشنی میں اس کی افادیت و اہمیت کو ثابت کیا جا سکے۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج سے فکر اسلامی ایک ایسی نئی صورت اختیار کر سکتا ہے جو آج کے بالخصوص مغرب زدہ مسلمان کے لیے یقین آفرین اور دل نشین ہو۔ سائنسی علوم کی ترقی نے طبیعیات کی پرانی بنیادوں کو منہدم کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں طبیعیات کی اپنی قائم کردہ مادے کی خصوصیات رفتہ رفتہ مفقود ہوتی چلی جا رہی ہیں اور وہ وقت دور نہیں کہ مذہب اور سائنس آپس میں ایسی ہم آہنگی محسوس کرنے لگیں جو گزشتہ زمانے میں روح اور مادے کی خیالی یا قیاسی دوئی کے سبب نگاہوں سے اوجھل تھی۔ آخر میں اقبال فرماتے ہیں:

باایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے راستے کُھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور شاید ان نظریوں سے جو خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکر انسانی کی

نشو ونما پر باحتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں ۳۸۔

پہلے مقالے کا موضوع ''علم اور مذہبی مشاہدات'' ہے۔ اس بحث کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انسان کن ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ذرائع تین ہیں: اوّل، حواس کی مدد سے مشاہدہ (محسوسات) دوم عقل (فہم یا ادراک) اور سوم، وجدان (عرفان)۔ علم کی تحصیل کے لیے تینوں ذرائع اپنی اپنی جگہ محدود ہیں یعنی ہر ذریعے سے حاصل کردہ معلومات میں کسی نہ کسی غلطی یا خامی کے دخل کا امکان ہے۔ لہٰذا ان کی صحت کی جانچ پڑتال کے لیے فکر انسانی نے طور طریقے وضع کر رکھے ہیں۔ اس مقالے میں بحث کا مرکزی نقطۂ یہ ہے کہ اگر حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کی صحت کی جانچ پڑتال عقل سے کی جاسکتی ہے اور منطقی استدلال میں خامی کا سراغ مشاہداتی تجربے کے ذریعے لگایا جاسکتا ہے تو وجدان کی وساطت سے حاصل کردہ معلومات یا مذہبی مشاہدات (جنھیں معرفت کا نام بھی دیا جاتا ہے) کی صحت کو پرکھنے کے لیے بھی دو ایسے معیار موجود ہیں جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ان دو معیاروں کو اقبال عقلی معیار اور عملی معیار کا نام دیتے ہیں۔ عقلی معیار سے مراد وہ ناقدانہ تعبیر ہے جو قطع نظر کسی انسانی تجربے کے پہلے سے قائم شدہ مفروضے کے، یہ ثابت کرتی ہے کہ وجدان سے حاصل کردہ معلومات یا مذہبی مشاہدات بعینہٖ اسی حقیقت تک پہنچاتے ہیں، جس کی طرف بالآخر انسان کی ناقدانہ تعبیر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر عملی معیار ایسی معلومات یا مشاہدات کی صحت کو ان کے نتائج کے حوالے سے جانچتا ہے۔ اقبال کی رائے میں اوّل الذکر طریقے سے فلسفی کام لیتا ہے اور موخر الذکر طریقے سے نبی۔

اقبال کا استدلال یہ ہے کہ جس زمانے میں بھی مذہب کا غلبہ رہا۔ اس زمانے کے اہل علم نے دین کو عقلیت کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔

مذہبی عقائد کے لیے عقلی ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ انسانی کردار کے لیے اگر ایمان کی بنیاد مضبوط نہ ہو تو عملی زندگی کے متزلزل ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پس ایمان کے اندر عقل اور علم کے عناصر موجود ہیں۔ قرآن حکیم بھی فواد یا قلب (وجدان) کے علاوہ انسان کو اپنی عقل اور سمع و بصر ایسے حواس کے ذریعے مشاہدہ کائنات سے اس کے خالق کو پہچاننے کی تلقین کرتا ہے۔ دین چونکہ انسان کے فکر، احساس اور عمل پر بیک وقت حاوی ہے اس لیے ضروری ہے کہ دینی عقائد و اقدار کو عقلیت کی بنیادوں پر استوار کر کے قابل فہم بنایا جائے۔ اقبال کے نزدیک عقل اور وجدان میں کوئی بنیادی تضاد موجود نہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ دونوں کا منبع و ماخذ ایک ہی ہے، فرق صرف رفتار کا ہے۔ عقل قدم بہ قدم سفر کرتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتی ہے، لیکن وجدان ایک ہی جست میں منزل پا لیتا ہے۔ پس عقل بھی متحرک ہے اور جس طرح بیج کے اندر پورے درخت کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی طرح عقل میں ایک باطنی کلّیت ہے یا اس کے اندر بھی علم کے تمام امکانات موجود ہیں گو وہ بتدریج ظاہر ہوتے ہیں۔ اس مرحلے پر اقبال برگساں سے اتفاق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وجدان، عقل ہی کی ایک بلند تر یا ترقی یافتہ صورت ہے۔

اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ گذشتہ پانچ سو برس سے علوم اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوتے تھے۔ مگر قرون وسطیٰ میں دینی علوم کی تکمیل کے بعد جب سے عالم اسلام بیہوشی کی نیند سو گیا، یورپ نے انہیں مسائل پر غور و فکر کیا جن میں کبھی مسلم فلسفی اور سائنس دان گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قرون وسطیٰ سے لے کر اب تک انسانی فکر اور تجربے میں غیر معمولی ترقی ہو چکی ہے۔ فطرت کی تسخیر اور اس پر غلبے نے انسان کے اندر ایک تازہ ولولہ اور نیا احساس برتری پیدا کر دیا ہے نئے نکتہ ہائے

نگاہ پیش کیے جا چکے ہیں اور قدیم مسائل کو جدید تجربات کی روشنی میں حل کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ سائنسی افکار کی ترقی کے سبب علم و ادراک کے متعلق انسانی تصورات بدلتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ کئی ایسے مسائل پر جو فلسفہ اور مذہب میں مشترک ہیں، نئے زاویہ ہائے نگاہ سے سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی نئی نسل یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان کے دینی عقائد کو تازگی اور شگفتگی کے ساتھ اجاگر کیا جائے۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

احیائے اسلام کے اس دور میں نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی آزادنہ تحقیق کی جائے کہ یورپ فکر کے میدان میں کن نتائج پر پہنچا ہے اور یہ نتائج کس حد تک علوم دینیہ کی نظر ثانی یا تشکیل نو کے لیے ہمیں مدد دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں وسط ایشیا (یعنی اشتراکی روس) کے خلاف مذہب اور بالخصوص خلافِ اسلام اس پراپیگنڈے سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے جو اب تک ہندوستان کی سرحد عبور کر چکا ہے[۳۹]۔

اقبال آیاتِ قرآنی کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ کائنات اس لیے وجود میں نہیں آئی کہ تخلیق کا عمل خدا کے لیے محض ایک کھیل ہے۔ دراصل وہ با مقصد ہے اور اس کی ترکیب بھی ایسے ہوئی کہ اس میں مزید اضافے کے ذریعے وسعت کی گنجائش ہے۔ پس کائنات نہ تو جامد ہے، نہ کوئی ایسی تخلیق ہے جس کی تکمیل ختم ہو چکی اور جو بے حس و حرکت اور ناقابل تغیر و تبدل ہے، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کے باطن میں کسی نئی آفرینش کا خواب پنہاں ہو۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، وہ اس ماحول میں اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود گردو پیش کی قوتوں کو جیسی چاہے شکل دے سکتا اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک تخلیقی فعلیت ہے اور اپنے گردو نواح کی قوتوں کی بہتری کی خاطر گہری سے گہری آرزوؤں میں

شریک ہو کر، کبھی ان قوتوں سے توافق پیدا کر کے اور کبھی ان کو اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال کر، اپنی اور ساتھ ہی کائنات کی تقدیر متشکل کر سکتا ہے اور اس بتدریج تغیر پذیر سلسلۂ عمل میں وہ خدا کا معاون بن سکتا ہے، بشرطیکہ ایسے انقلاب کی ابتدا انسان کی طرف سے ہو۔

اقبال کی نگاہ میں قرآن حکیم جگہ جگہ مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ موجودات پر اصرار کرتا ہے۔ اسی سبب مسلمانوں کی توجہ فطرت یا عالم موجودات کی طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے آگے چل کر طبیعی علوم کی بنیاد رکھی۔ اقبال فرماتے ہیں:

قرآن حکیم ہمیں تغیر ایسی زبردست حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کیونکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور قابو میں رکھنے ہی سے ایک زندہ اور پایدار تمدن کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ واقعاتی طور پر ایشیا اور دنیائے قدیم کے سارے تمدن اس لیے ناکام رہے کہ انہوں نے حقیقت کو پانے کے لیے خالصتاً باطن (تخیل یا قیاس) سے ظاہر (عالم موجودات) کا رستہ اختیار کیا۔ یوں انہوں نے مفروضے تو قائم کر لیے لیکن قوت سے محروم رہے اور ظاہر ہے صرف مفروضوں کی بناء پر کوئی پایدار تمدن قائم نہیں ہو سکتا ہے۔[۴۰]

دوسرے مقالے کا موضوع ''مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار'' ہے۔ اس بحث میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ عقل کے لیے کس حد تک مذہبی مشاہدات کی تائید ممکن ہے اور اس حد سے وہ کیوں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بحث کا آغاز خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ان تین عقلی دلیلوں سے ہوتا ہے جو عیسوی علم الکلام نے قائم کر رکھی ہے۔ یعنی کونی، غائی اور وجودی۔ تینوں دلیلوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقل انسانی نے ذاتِ مطلق کی جستجو کے لیے حقیقی طور پر تحریک کی لیکن منطقی اعتبار سے تینوں ناقص ہیں: گویا عقل نے ان کے لیے جو اساس قائم کی ہے وہ عقل ہی کے اوزاروں سے منہدم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن حکیم کی اس آیت کے حوالے سے کہ خدا اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی اور باطن بھی، اقبال محسوسات و مدرکات کے تین مراتب یعنی مادہ ،حیات اور شعور پر بحث کے لیے طبعیات، حیاتیات اور نفسیات ایسے علوم کے نتائج فکر پر تبصرہ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ سائنس کے ہاں حقیقت کا کوئی مبسوط نظریہ نہیں، صرف الگ الگ اجزا کے متعلق علیحدہ علیحدہ تصورات قائم کیے گئے ہیں اور ان تصورات میں بھی کوئی ایسا ربط نہیں کہ انہیں آپس میں جوڑ کر حقیقت کی شکل کا سراغ لگایا جا سکے۔ مذہب چونکہ کل حقیقت کا طلب گار رہے، اس لیے اسے جزئی نظریات سے کوئی خوف نہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق خدا، کائنات اور حیات متحرک ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں زمان کی ماہیت کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ آئن سٹائن نے اپنی تحقیق ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ اگر کائنات جامد یا ساکن ہوتی تو مکان کے لیے تین ابعاد کا وجود قابل فہم تھا، مگر چونکہ کائنات متحرک ہے، اس لیے مکان کے صحیح جائے وقوع کا تعین کرنے کے لیے پیائش زمان ضروری ہو جاتی ہے اور یوں زمان و مکاں کا اضافی یا چوتھا بُعد بن جاتا ہے۔ اس کے نظریہ اضافیت کے تحت مکان کا وجود ناظر کے لیے اضافی ہے اور جوں جوں ناظر اپنے عمل و رفتار میں تغیر و تبدل کرتا ہے مکان بھی اس کے مطابق بدل جاتا ہے۔ اضافیت پر اقبال کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ یوں زمان کا وجود غیر حقیقی ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر زمان کو مکان کی ابعاد میں شامل کر دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ماضی کی طرح مستقبل کا وجود بھی پہلے ہی سے متعین ہے۔ ایسی صورت میں زمان آزاد تخلیقی حرکت نہیں رہتا، نہ اس میں کوئی تسلسل رہتا ہے۔ گویا واقعات رونما نہیں ہوتے بلکہ ہم صرف ان سے دوچار ہو جاتے ہیں کیونکہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات کا محلِ وقوع پہلے ہی سے کسی نہ کسی نامعلوم مکان میں متعین ہے۔ پس

آئن سٹائن کا تصور زمان نہ تو زمان مسلسل ہے اور نہ برگساں کا زمان خالص۔ برگساں کے نظریے کے مطابق انسانی شعور ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور یوں ذہنی کیفیات کے پیہم ردوبدل کے سبب ہم لگاتار بدلتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی شعور کے دو پہلو ہیں۔ ایک خارجی یا فعال جس کا تعلق گردو پیش روزمرہ کی عملی زندگی یا زمان مسلسل سے ہے، برگساں کی نظر میں زمان کا یہ تصور حقیقی زمان نہیں ہے۔ دوسرا پہلو داخلی یا بصیر ہے، جس کا تعلق انسان کے گہرے غور وفکر کے لمحات سے ہے۔ جب انسان اپنے عمیق تر نفس میں ڈوب جاتا ہے تو شعور کا خارجی یا فعال پہلو معطل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں زمان محض ایک آن ہے یا اسے مستقل حال کہا جا سکتا ہے اور یہی برگساں کے نزدیک زمانِ خالص یا زمان حقیقی ہے۔ اقبال یہاں تک تو برگساں سے اتفاق کرتے ہیں، یعنی انسان جب اپنی خودی کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوبتا ہے تو اسے زمان خالص (بلا شائبہ مکان) کا تجربہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے خدا کا تخلیقی عمل بھی ایسا ہی تیز ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا (کلمح بالبصر) پس خدا کا زمان زمانِ خالص یا ایک طرح کی عدم زمانِ مسلسل کی کیفیت ہے، البتہ وہ اپنے تخلیقی عمل کے ساتھ زمان مسلسل لحظہ بہ لحظہ تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات خلا میں اشیاء کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے۔

بہر حال برگساں کے تصورِ زماں خالص میں صرف ماضی ہے جو مستقل حال سے ہمکنار رہتا ہے۔ وہ مستقبل کو اس میں شامل کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ یوں حیات کی تخلیقی آزادی پر قدغن لگنے کا امکان ہے۔ اس مرحلے پر اقبال برگسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں زندگی کی یہی ایک تعبیر نہیں۔ زندگی پے در پے تبدیلی اور کارفرمائی سے اغراض و مقاصد کی تشکیل کرتی ہے اور جوں جوں اس کا عمل بڑھتا ہے نئے نئے عزائم وضع ہوتے ہیں۔ اس تسلسل میں ہم

جو کچھ ہیں وہ نہیں رہتے۔ زندگی کا رستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے، مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس رستے کا تسلسل بے قاعدہ ہے۔ حیات و کائنات کا عمل زمان کے تسلسل میں اس لحاظ سے مقصد سے خالی ہے کہ وہ کسی پہلے سے متعین منزل کی طرف نہیں بڑھ رہا۔ پس زمان کی حرکت کسی پہلے سے کھنچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں، کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے مراد وہ امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے، وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے، نہ آئیں۔ اقبال کے نزدیک مستقبل انہیں معنوں میں بامقصد ہے اور وہ قرآنی اصطلاح "تقدیر" کی تشریح بھی اس انداز میں کرتے ہیں۔

آخر میں اقبال فرماتے ہیں کہ صرف وجدان کے ذریعے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ حیات دراصل ایک اپنی ذات پر مرتکز خودی ہے۔ ایسے علم کو خواہ نامکمل قرار دیا جائے لیکن پھر بھی وہ ایک نقطۂ آغاز ہے، جس کی بدولت انسان پر بلاواسطہ انکشاف ہوتا ہے کہ حقیقت مطلق کی ماہیت کیا ہے۔ محسوسات یا عقل ایسے ذرائع سے حاصل کردہ مختلف نوع کے حقائق سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حقیقت مطلق اپنی اصل میں روحانی ہے۔ اس لیے اس کا تصور ایک خودی کے طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مذہب کے عزائم فلسفے سے بلند تر ہیں۔ فلسفہ حقائق کا محض عقلی ادراک ہی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو محسوسات یا عقل ایسے ذرائع سے حاصل کردہ مختلف جزئی قسم کی معلومات کو سمیٹ کر کسی نہ کسی نظام میں مدغم کر دے۔ بالفاظ دیگر فلسفہ دور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے، مگر اس کے برعکس مذہب حقیقت سے قرب و اتصال کا آرزومند ہے۔ ایک صرف مفروضہ ہے اور دوسرا تقرب اور اتصال کا زندہ تجربہ۔ عقل کے لیے ایسا تقرب تبھی ممکن ہے کہ وہ اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے اور تکمیل آرزو کی خاطر ایسی ذہنی روش اختیار کرے جسے مذہب دعا سے تعبیر کرتا ہے۔

تیسرے مقالے کا موضوع ہے ''ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا'' اس مقالے میں اقبال فلسفے کی روشنی میں خدا کے اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں انسانی ذرائع علم کے اجتماعی تجربے سے ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ ان ذرائع کی اساس کوئی بابصر تخلیقی مشیت ہے۔ جسے ایک خودی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ خودی مطلق کی انفرادیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے اس کے لیے اللہ کا اسم معرفہ استعمال کیا۔ خودی مطلق اپنی تخلیقی فعلیت کے ممکنات میں، جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہیں، لامتناہی ہے۔ یعنی اس کی لامحدودیت وسیع ہونے کے بجائے عمیق ہے بعد ازاں وہ اس سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ خدا کی تخلیقی فعلیت سے عملِ تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر قرآنی آیات کی روشنی میں اقبال اشاعرہ کے افکار پیش کرتے ہیں۔ اشاعرہ کے نزدیک کائنات کی ترکیب جواہر یا ان لاتعداد چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے ہوئی جن کا مزید تجزیہ ناممکن ہے، اور چونکہ تخلیقی فعلیت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے جواہر کی تعداد لامتناہی ہے یہ جواہر تبھی وجود میں آتے ہیں جب ان کو ہستی کی صفت عطا ہوتی ہے۔ سو ہر لحظہ نئے نئے جواہر عدم سے وجود میں لائے جاتے ہیں اور کائنات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس جوہری عمل کی ذہنی تصویر قائم کرنا ممکن نہیں، مگر اقبال واضح کرتے ہیں کہ جدید طبیعیات میں عالم طبعی کی ہر مقدار کے اصل جوہر (ایٹم) کا تصور بھی بطور عمل کیا جاتا ہے۔ ان کی رائے میں اشاعرہ کا تخلیقِ کائنات کا نظریہ عہد حاضر کے طبیعی علوم میں موجود رجحانات سے زیادہ قریب ہے۔

اقبال کے نزدیک ان افکار کی روشنی میں خدا کا تخلیقی عمل وحدتوں کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ جن کو وہ 'خودیوں' سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جواہر کی میکانیاتی حرکت سے ہو یا ذات انسانی میں فکر کی آزادانہ کارفرمائی سے، سب کی حقیقت صرف خودیِ مطلق کے انکشاف ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس

کائنات کا ہر جوہر خودی ہی کی پست و بالا صورت ہے البتہ وہ ارتقائی منازل طے کر تی ہوئی ذات انسانی میں اپنے معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ اسی سبب قرآن حکیم نے خودیِ مطلق کو انسان کی شہ رگ سے قریب تر ٹھہرایا ہے۔ حیات الٰہیہ کا سیل رواں تمام خودیوں کا سرچشمہ ہے اور ہم اس میں موتیوں کی طرح زندہ اور متحرک ہیں۔ اس اعتبار سے انسان ہی جملہ مخلوق میں اس قابل ہے کہ خدا کی حیاتِ تخلیقی میں ایک معاون یا ہمکار کی طرح عمداً حصہ لے اور چونکہ وہ ایک بہتر اور خوب تر عالم کا تصور کر سکتا ہے اس لیے موجود کو مطلوب میں بدلنے کا اہل ہے۔

اقبال کی نگاہ میں فلسفہ تو صرف تصورات پر قناعت کرتا ہے، لیکن مذہب اپنے مقصود کا زیادہ گہرا علم حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب تر ہونے کی خواہش رکھتا ہے اور یہ قرب دعا کے ذریعے ہی میسر ہوتا ہے۔ دعا کا تعلق روحانی تجلیات سے ہے اور اس سے مختلف طبیعتیں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں

:

اسلام نے عبادت کے لیے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موج زن ہوں۔ بعینہٖ جس طرح اس کی ظاہری شکل سے مساوات اجتماعی کی حس بیدار ہوتی اور پرورش پاتی ہے، کیونکہ صلوٰۃ باجماعت سے مقصود ہی یہ ہے کہ شرکائے جماعت میں اپنے مرتبہ و مقام یا نسلی حیثیت کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔ مثلاً یونہی سوچیے کہ جنوبی ہندوستان کا وہ برہمن جس کو اپنے شرفِ ذات کا غرہ ہے، اگر ہر روز ایک اچھوت کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہونے لگے تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کیسا زبردست انقلاب رونما ہو جائے گا۔ نوع انسانی ایک ہے، اس لیے کہ وہ محیط بر کُل، ذات جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے، جو ہر انا کا خالق اور اس کا سہارا ہے، ایک ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے نسل اور قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم کو تعارف کا ایک ذریعہ ٹھہرایا، تو اس کی وجہ بھی

یہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسلام میں صلوٰۃ باجماعت حصولِ معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں، اُس کی قدر و قیمت اس سے بڑھ چڑھ کر ہے صلوٰۃ باجماعت سے اس تمنا کا اظہار بھی مقصود ہے کہ ہم ان سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے جو انسان اور انسان کے درمیان قائم ہیں، اپنی اس وحدت کی ترجمانی، جو گویا ہماری خلقت میں داخل ہے، اس طرح کریں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا اظہار سچ مچ ایک حقیقت کے طور پر ہونے لگے[41]۔

چوتھے مقالے میں اقبال نے ''خودی، جبر و اختیار، حیات بعد الموت'' کے موضوع پر بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے انسان کی انفرادیت پر زور دیا ہے۔ اور قرآنی نقطۂ نظر سے نہ تو ایک انسان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ اسے اپنی کوشش سے زیادہ کچھ ملے۔ اسلامی تصوف میں بعض صوفیہ کی واردات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خودی ایک حقیقت ہے اور اگر ایک عمیق اور پختہ شخصیت پیدا کر لی جائے تو وہ روحانی طور پر ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک ایسی واردات علم کا ایک ذریعہ ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں منصور حلاج کی مثال پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے صوفیہ کے اس قسم کے احوال اور مشاہدات کی علمی نہج پر تحقیق نہیں کی۔ اس لیے ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ وہ کہتے ہیں:

ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا مطمح نظر بڑا وسیع تھا اور اس لیے یہ کوئی

مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی۔ بہر حال اب ہمارے سامنے کوئی رستہ ہے تو یہ کہ علم حاضر کے احترام اور قدر و منزلت کے باوجود ہم اپنی آزادیِ رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیش نظر کس رنگ میں کرنی چاہیے، خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے اسلاف سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ۔۴۲

اقبال انسانی خودی کے اختیار یا اس کے کلی طور پر ذمے دار ہونے کے متعلق خدا کی تخلیقی فعلیت کے دو پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں، خلق، جس کے معنی پیدا کرنے کے ہیں اور امر، جس کے معنی ہدایت کے ہیں، قرآن حکیم واضح کرتا ہے کہ دونوں قسم کی تخلیق یعنی خلق اور امر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ روح کی حقیقی ماہیئت کا اظہار اصطلاع امر ہی سے کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ آزادی و اختیار کی قدرت خودی کی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن جائے۔ سو خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے۔ اس کا ہر عمل ایک نیا موقف پیدا کرتا ہے اور یوں انسان کو اپنی خلاقی، دریافت، ایجاد اور طباعی کے لیے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ مسئلہ حیات بعد الموت کے متعلق اقبال کہتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق اس بات کا امکان ہے کہ بعض انسان کائنات کے مقاصد میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں۔ مگر کائنات کے مقاصد میں وہی حصہ لے سکتے ہیں جو اپنے افعال و اعمال کی شیرازہ بندی اس طور پر کریں کہ ان کی خودی مستحکم ہو جائے اور وہ موت کے صدمے سے محفوظ رہے۔ ایسی صورت میں موت صرف ایک رستہ ہی ہوگی۔ پس اقبال کے ہاں حیات بعد الموت انسان کا حق نہیں بلکہ اس کے لیے اپنے آپ کو مستحق بنانا پڑتا ہے اور اس کی تحصیل کا دارومدار مسلسل جدوجہد پر ہے۔ انسان حیات بعد الموت کا امیدوار ہے اور اسے خدا کی طرف سے انعام کی صورت ہی میں

حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو۔ جنت اور دوزخ کسی مقام یا جگہ کے نام نہیں، انسان کے احوال ہیں، نہ جنت عیش و آرام کی کوئی حالت ہے اور نہ جہنم کوئی مستقل اذیت کا گھڑھا۔ حیات ایک تسلسل ہے اور انسان خدا کی نو بہ نو تجلیات کے لیے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔

پانچویں مقالے کا موضوع ''اسلامی ثقافت کی روح'' ہے۔ اس مقالے میں اقبال نے شعور ولایت میں امتیاز کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ولی یا صوفی کو جو لذت خدا کے قرب یا اتصال سے حاصل ہوتی ہے وہ اسے چھوڑ کر واپس آنا نہیں چاہتا کیونکہ یہی اس کے لیے آخری چیز ہے، لیکن نبی ایسی واردات سے نہ صرف واپس آتا ہے بلکہ نظام کہنہ کو زیر و زبر کر کے دنیا میں تمدنی انقلاب برپا کرتا ہے۔ نبی کے روحانی مشاہدات و واردات کو ایک تخلیقی عمل ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایک طرف تو وہ اپنے تجربے کی صداقت کو خود جانچتا ہے اور دوسری جانب اسے خارجی حقائق کی دنیا کے حوالے سے پرکھتا ہے۔ مزید برآں نبی کے مذہبی مشاہدات و واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ یہ دیکھ کر بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے، یا نبی کی تعلیمات کے زیر اثر انسانوں میں کسی قسم کا تغیر رونما ہوا، یا تہذیب و تمدن کی وہ کیا دنیا تھی جو اس کی دعوت سے ظہور میں آئی۔ اس بحث کے دوران میں اقبال عقیدۂ ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت پر ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور جوں جوں وہ ارتقاء حاصل کرتی ہے اس کی ماہیت بھی بدلتی جاتی ہے، حتیٰ کہ جب وہ اپنے معراج کمال کو پہنچتی ہے تو اس کا خاتمہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلعم کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سر

چشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ کے رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہ رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے، کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں[۴۳]۔

اقبال کی رائے میں قرآن حکیم نے مشاہدات باطن کے علاوہ علم انسانی کے لیے دوسر چشموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک عالمِ فطرت اور دوسرا عالمِ تاریخ۔ اقبال کے خیال میں ان دوسر چشموں سے استفادہ کرنے میں دنیائے اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ جب مسلمانوں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ کائنات حرکت میں ہے تو انہوں نے یونانی فلسفے کے قیاسیات و نظریات کے خلاف بغاوت کی۔ قرآنی تعلیمات کے زیر اثر ان کی توجہ ٹھوس حقایق کی طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے استقرائی منطق، منہاج تجرباتی، مشاہدۂ عملی، پیمائش، ریاضی و الجبرا، فلکیات، طب، کیمیا وغیرہ سے ابتدا کی۔ اقبال مسلم سائنسدانوں، ریاضی دانوں اور طبیعی علوم کے ماہروں کے افکار کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ قرآنی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے سائنس کی بنیاد رکھی، جس کے ثمرات بہت آگے چل کر یورپ میں ظاہر ہوئے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اسلامی ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتا نہ چلے۔

اسی طرح دنیائے اسلام میں حسِ تاریخ کی پرورش بھی قابل مطالعہ موضوع ہے۔ اس کی ابتدا ادیانِ حدیث سے ہوئی اور رفتہ رفتہ تاریخِ تنقید کے اصول مرتب ہوتے چلے گئے۔ ابن اسحاق، طبری اور مسعودی جیسے مورّخ پیدا ہوئے۔ بعد ازاں تاریخ کا نشوونما ایک علم کے طور پر ہوا۔ بالآخر ابن خلدون نے تعلیمات قرآنی ہی کی روشنی میں فلسفۂ تاریخ پیش کرتے ہوئے اس کی بنیاد دو اصولوں پر رکھی۔ وحدتِ انسانیت اور حیاتِ انسانی کی مسلسل اور مستقل حرکت۔

چھٹا مقالہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' کے موضوع پر ہے۔ دراصل اقبال کے اس مقالے کے انگریزی عنوان کا لفظی ترجمہ ''اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول'' ہے یعنی وہ اجتہاد کے روایتی فقہی معنوں (وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلہ میں رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے) سے ہٹ کر اس کی تعبیر ایک اصولِ حرکت کے طور پر کر رہے ہیں۔ مقالے کی ابتداء بھی اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ تحریک اسلام نے کائنات کو متحرک قرار دیا اور تاریخ انسانی کے ایک ایسے مرحلے پر نمودار ہوئی جب رنگ و خون کے زمینی پیوستگی کے رشتے توڑ کر حیات انسانی کے لیے اساس فراہم کرنے کی ضرورت تھی یا ایک قریب المرگ تمدن کی جگہ لینے کے لیے، جس کی بنا بادشاہت پر قائم تھی، دنیا کو نئی تہذیب کی حاجت تھی۔ اقبال فرماتے ہیں:

اس نئی تہذیب نے اتحاد عالم کی بنا اصول توحید پر رکھی۔ اسی اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک و سلاطین کی۔ اسلام کے نزدیک حیات کی روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونا چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم و انضباط قائم رکھیں، لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ اسلام کی ہئیت

ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے؟ اس کا جواب ہے، اجتہاد[44]۔

اقبال واضح کرتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا، مگر جب سے فقہ کے چار مکاتب فکر قائم ہوئے ہیں انہوں نے عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی، کیونکہ انہوں نے اجتہاد پر ایسی کڑی شرطیں لگا دی ہیں جن کا پورا کرنا محال ہے۔ اقبال اس روش کے اسباب گنواتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیاسی زوال اور انحطاط کے دور میں ایسا کرنا اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا، تاہم وہ قدامت پسند علماء کے رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے تو یہ کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، اگر قوم کے زوال وانحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیا، خود ساختہ ذرائع سے کریں۔ قوائے انحطاط کے سدِ باب کا کوئی ذریعہ فی الواقع موثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے۔ جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں، کیونکہ ایسے ہی افراد ہیں جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے نا قابل تغیر وتبدل نہیں اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ یوں بھی ماضی کا غلط احترام علیٰ ہذا ضرورت سے زیادہ تنظیم کا رجحان اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا۔ اگر اسلام کی نشاۃ الثانیہ ناگزیر ہے جیسا کہ میرے نزدیک قطعی طور پر ہے، تو ہمیں ایک نہ ایک دن اپنے عقلی اور ذہنی ورثے کی قدرومنزلت کا جائزہ لینا پڑے گا۔ جیسے جیسے مسلمانوں

میں زندگی کو تقویت پہنچے گی، اسلام کی عالمگیر روح فقہا کی قدامت پسندی کے باوجود اپنا کام کر کے رہے گی۔ بدقسمتی سے اس ملک کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ ائمہ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرفِ آخر ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعوے دار ہے کہ اسے اپنے تجربات، علیٰ ہذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے، بجائے خود اس امر کا متقضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، محض ایک افسانہ ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادیٔ ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔ اگر ہمارے افکار میں وسعت اور دقتِ نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے تجربات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں جرأت سے کام لیں۔ لیکن یہ کام محض اس زمانے کے احوال و ظروف سے مطابقت پیدا کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم یورپ کی جنگ عظیم نے بیداری کی لہر دوڑا دی ہے، علیٰ ہذا وہ نیا معاشی تجربۂ اشتراکیت، جو اسلامی ایشیا کے حوالی میں کیا گیا، یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے پیشِ نظر ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کا معنیٰ و منشا اور اس کی تقدیر فی الحقیقت کیا ہے[۴۵]۔

مقالہ کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ اقبال اجتہاد کے ذریعے فقۂ اسلامی کی تشکیلِ نو پر فقط اس لیے زور نہیں دے رہے تھے کہ عہد حاضر کے احوال

وظروف سے مطابقت پیدا کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، بلکہ اس لیے کہ انہیں ایک طرف مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور دوسری طرف روس کی ملحدانہ اشتراکیت کی نظریاتی یلغار کا خطرہ تھا۔ اقبال اجتہاد کا حق بحیثیت افراد علماء یا مجتہدین کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں یہ حق دنیائے اسلام کے ممالک میں مجالسِ آئین ساز کو سونپا جانا چاہیے۔ کیونکہ عہدِ حاضر میں فقہِ اسلامی کے مآخذ اجماع کا اسی صورت میں احیاء ممکن ہے۔

اس مقالے میں اقبال جدید اسلامی ریاست کے متعلق اپنا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی ریاست حُریّت، مساوات اور استحکام کی ابدی صداقتوں پر قائم ہوتی ہے اور جمہوری طرزِ حکومت کا اصول نہ صرف اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، بلکہ جو قوتیں دنیائے اسلام میں کام کر رہیں، ان کے لحاظ سے بھی وہ ناگزیر ہے۔ وہ ترکوں کے اس اجتہاد کو درست خیال کرتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے خلیفہ یا امام کا منصب فردِ واحد کی بجائے افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ مجلس کے ذمے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں عالمگیر خلافت یا امامت کا تصور تبھی قابلِ عمل تھا جب سارا عالمِ اسلام ایک سلطنت کی صورت میں تھا۔ لیکن متعدد آزاد اور خودمختار مسلم ریاستوں کی موجودگی میں ایسا تصور نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ ان ریاستوں کے اتحاد میں حائل ہو سکتا ہے۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالت میں ہر مسلم قوم کو اپنی تمام تر توجہ اپنے آپ پر مرتکز کرنی چاہیے، حتیٰ کہ اُن سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ باہم مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری کی صورت اختیار کر لیں۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

میں تو کچھ یونہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت، بلکہ ایک انجمنِ اقوام ہے جس

نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے، تو محض سہولت تعارف کے لیے اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں ۔[۴۶]

اقبال کے نزدیک فقہ اسلامی کے ماخذوں میں اجماع کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، گو ممالک اسلامیہ میں وہ کبھی ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ غالباً اس لیے کہ خلفاء راشدینؓ کے دور کے خاتمے پر عالم اسلام میں مطلق العنان ملوکیت رائج ہوئی اور اجماع کا ایک مستقل ادارے کی شکل اختیار کرنا اس کے مفاد کے خلاف تھا۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ تو اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق افراد کے ہاتھ میں رہے تا کہ حسب ضرورت ان پر ریاست کی طرف سے دباؤ ڈالا جا سکے، بجائے اس کے کہ وہ ایک مستقل قانون ساز یا با اختیار مجلس کی صورت میں قائم ہو جو انجام کاران سے بھی زیادہ اقتدار حاصل کر لے اقبال کے ہاں عہد حاضر میں اجماع کا تصور مجلس شوریٰ کے طور پر نہیں بلکہ ایک قانون ساز اور با اختیار ”پارلیمنٹ“ کی شکل میں ہے۔ وہ اپنی بحث میں شوریٰ کا ذکر نہیں کرتے۔ اقبال فرماتے ہیں:

یہ دیکھ اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی قوتیں اُبھر رہی ہیں، کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو و نما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بہت بڑا ترقی زا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مذاہب اربعہ کے نمایندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں اپنا یہ حق مجالس تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔ مزید برآں غیر علماء جو ان امور میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے۔ میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے، از سر نو بیدار کر سکتے ہیں ۔[۴۷]

اس مرحلے پر اقبال خود ہی ایک سوال اٹھاتے ہیں اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے، جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں اور یوں اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں شدید غلطیوں کی مرتکب ہوسکتی ہیں، لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہوگا؟ وہ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور کے حوالے سے جواب دیتے ہیں، کہ قانون ساز مجلس کے اندر اس امر کی گنجائش رکھی جاسکتی ہے کہ امورِ دینی کے معاملات میں علماء کی ایک الگ مجلس قائم ہو جو قانون ساز مجلس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور شریعت کی تعبیر میں غلطیاں نہ ہونے دے۔ لیکن ساتھ ہی وہ خبردار کرتے ہیں کہ ایرانی نظریۂ دستور کا یہ طریق کار بجائے خود نہایت خطرناک ہے، اس لیے سنّی ممالک اسے اختیار کریں تو صرف عارضی طور پر۔ آپ فرماتے ہیں:

انہیں (سُنّی ریاستوں کو) چاہیے کہ مجلس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک موثر جزو شامل تو کرلیں لیکن علماء بھی ہر امرِ قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ بایں ہمہ شریعتِ اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدِ باب ہوسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلادِ اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ (جورس پروڈنس) کا مطالعہ بھی باختیار اور سوچ سمجھ کر کیا جائے[۴۸]۔

اسی مقالے کے اختتامی پیرے میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ اس کا اصل مقصد ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے۔ فرماتے ہیں:

اسلام کا یہ بنیادی تصور کہ آئندہ کا انسان کسی بھی وحی کا پابند نہیں ہوگا، ظاہر کرتا ہے کہ ہم مسلمان روحانی طور پر دنیا کے آزاد ترین لوگ ہیں۔ ابتدائی زمانہ کے مسلمان جنہوں نے قبل اسلامی ایشیا کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی، اس بنیادی

نکتہ کی حقیقی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن آج کے مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنی حیثیت کو پہچانے اور اپنی معاشرتی زندگی کو بنیادی اصولوں کی روشنی میں، ازسرِنو تعمیر کر کے اسلام کے اصل مقصد، یعنی ''روحانی جمہوریت'' جس کا ابھی صرف ایک محدود حد تک اظہار ہوا ہے، مکمل طور پر نافذ کر کے دکھائے [۴۹]۔

ساتویں مقالے کا موضوع ہے ''کیا مذہب کا امکان ہے''۔ اس مقالے میں اقبال نے مذہب اور سائنس کی جستجوؤں کا موازنہ کیا ہے، بقول اقبال مذہبی زندگی کے تین ادوار ہیں: ایمان، فکر اور معرفت، ایمان کا دور احکام کے بے چون و چرا اطاعت کا دور ہے۔ اس کے بعد فکر کا دور آتا ہے، جب انسان عقلاً سمجھنا چاہتا ہے کہ احکام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس دور میں مذہب کو کسی ایسی مابعد الطبیعیات کی تلاش ہوتی ہے جو اس کے لیے ایک اساس کا کام دے سکے۔ سب سے آخر میں معرفت کا دور ہے کہ جب انسان کی آرزو ہوتی ہے کہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتصال قائم کرے۔

اقبال سائنس کے جدید اکتشافات کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی سمت میں بڑھ رہی ہے کہ اب عقلاً بھی الٰہیات کا ایک نظام تشکیل دے سکنا مشکل نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود عصرِ حاضر کا مغربی انسان اپنے تصورات کے اعتبار سے خود اپنی ذات سے اور سیاسی اعتبار سے افراد افراد سے متصادم ہیں۔ اس تصادم کا سبب وہ سنگدل اور بے رحم انانیت یا ناقابل تسکین جوع زر ہے جس پر قابو پانا مغربی انسان کے لیے مشکل ہے۔ بالفاظ دیگر مادیت نے اس کے رگ و پے مفلوج کر دیے ہیں۔ دوسری طرف مشرقی انسان کی کیفیت کہیں زیادہ المناک ہے۔ وہ اپنی اندرونی زندگی کی شیرازہ بندی کرنے سے قاصر ہے، لہٰذا تاریخ کی مسلسل حرکت میں عملاً حصہ لینے کی صلاحیت اس میں پیدا نہیں ہوتی۔ ترک، ایرانی مصری یا عرب مسلمان وطنیت کا سہارا لے رہے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ یوں انہیں

قوت اور طاقت کا کوئی نیا سر چشمہ مل جائے گا۔ دورِ حاضر کا مسلمان بحیثیت مجموعی یہ یقین کھو بیٹھا ہے کہ اس کی روحانی زندگی کا احیاء دراصل مذہب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اسے اس حقیقت کا احساس نہیں رہا کہ مذہب ہی وہ ذریعہ ہے، جس سے افکار وخیالات کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس کے سہارے وہ زندگی، طاقت اور قوت کے دائمی سر چشمے تک پہنچ سکتا ہے، مگر اسے گمان ہے کہ وہ ازسرِ نو زندگی اور طاقت حاصل کرے گا تو اس طرح کہ اپنے افکار وخیالات کی دنیا کو تنگ سے تنگ کرتا چلا جائے۔ ملحدانہ اشتراکیت میں گو ایک نئے مذہب کا جوش وخروش ہے، لیکن وہ اس چیز سے برسرِ پیکار ہے جو اس کے لیے زندگی اور طاقت کا سر چشمہ بن سکتی تھی

۔

پس دنیائے جدید کی مایوسی اور دل گرفتگی کا مداوا نہ تو تصوف ہے، نہ علاقائی وطنیت، اور نہ ملحدانہ اشتراکیت۔ عصر حاضر کا انسان اگر پھر سے وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو سائنس یا علوم جدیدہ کی ترقی نے اس کے کندھوں پر ڈال رکھی ہے، تو صرف مذہب کی بدولت۔ جب تک انسان کو اپنی ابتدا اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی، وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا، جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے، اور جس میں ہمہ گیر مقابلے اور مسابقت کی دوڑ نے ایک انتہائی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے اقبال کے خطبات میں بعض ایسے افکار ہیں جو ارتقائی مراحل سے گزرے اور بعض ایسے نظریات ہیں، جن پر مختلف اہل علم نے تبصرے بھی کیے ہیں، مگر ان میں سے بعض امور پر بحث آگے چل کر کی جائے گی۔ خطبات کے اس مختصر جائزے سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کرنے سے قبل اقبال نے اس کے لیے ایک دینی، تمدنی، معاشرتی یا نظریاتی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔

مآخذ

باب: ۱۶

۱۔ ''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۳۱۷۔

۲۔ ''متعلقاتِ خطبات اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحات، ۱۷ تا ۲۰

۳۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۱۵۵

۴۔ ایضاً، حصہ دوم، صفحات، ۳۴۲ تا ۳۴۴

۵۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۸

۶۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۸

۷۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۳، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' از محمد اقبال، (انگریزی)
صفحات ۷، ۸

۸۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۲۰۹

۹۔ ایضاً حصہ دوم، صفحہ ۲۸۱

۱۰۔ ایضاً حصہ دوم، صفحہ ۲۱۶

۱۱۔ ایضاً حصہ دوم، صفحہ ۳۴۸

۱۲۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۵۰

۱۳۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۷

۱۴۔ ایضاً حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۴

۱۵۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۰۳، ۱۰۴۔ اقبال کے بعض فارسی
اور اردو اشعار میں بھی جمہوریت پر تنقید کی گئی ہے۔

۱۶۔ دیکھیے اقبال کا خط اپنی ہمشیرہ کے نام مورخہ ۸/دسمبر ۱۹۱۹ء (اقتباس ''زندہ رود''
جلد دوم، صفحہ ۲۶۵)

۱۷۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحات ۴۹، ۵۰، ۱۱۶ تا ۱۸۷

۱۸۔ ''نقوش'' اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۵۷۲

۱۹۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل صفحہ ۱۴۵

۲۰۔ ''نقوش'' اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۵۵۰ تا ۵۷۱، مضمون بعنوان ''علامہ اقبال کے سفر کی روئیداد اور خطبات'' از محمد عالم مختار حق، ''متعلقاتِ خطبات اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحات ۱۷ تا ۴۵۔ باسن برج کے مقام پر جو مسلم لڑکی اپنے والد کے ساتھ اقبال کے استقبال کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی، وہ بیگم حجاب امتیاز علی تاج تھیں۔ انہوں نے اس ملاقات کی تفصیل خود بیان کی ہے۔ دیکھیے ''اقبال درونِ خانہ'' از خالد نظیر صوفی، صفحات ۱۸۳ تا ۱۹۴۔

۲۱۔ پوری تقریر کے انگریزی متن کے لیے، دیکھیے ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی اے ڈار (انگریزی) صفحات ۵۰، ۵۱،

۲۲۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۲۳۴ تا ۲۳۶

۲۳۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۵۷ تا ۸۴۔ اس تقریر کی اشاعت میں ''انقلاب'' نے غلطی سے لکھ دیا کہ عورتیں بچے جننے کی اُجرت طلب کر سکتی ہیں۔ اقبال نے ایک خط کے ذریعے تصحیح کرائی۔

۲۴۔ ''علامہ اقبال کی داستانِ دکن'' از میر محمود حسین میسور، صفحہ ۷

۲۵۔ ایضاً، صفحات ۹، ۱۰

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۰

۲۷۔ ایضاً، صفحات ۳، ۴، ۵

۲۸۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۲۲۹ کے بالمقابل اقبال کی تحریر کا عکس

۲۹۔ ''علامہ اقبال کی داستانِ دکن'' از میر محمود حسین، میسور، صفحات ۱۳، ۱۴

۳۰۔ ''اقبال اور حیدر آباد''، صفحہ ۱۴، اقبال کو عثمانیہ یونیورسٹی سے حیدر آباد میں تین لکچر، بمعاوضہ ایک ہزار کلدار، دینے کی دعوت موصول ہوئی تھی۔ لکچروں کے مضامین کا

انتخاب ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اقبال نے یہ دعوت ۹ ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو قبول کی، لیکن معلوم ہوتا ہے انہوں نے مدراس میں دیے گئے تین لکچروں میں سے صرف دو حیدر آباد میں دیے۔ انہیں جنوری ۱۹۳۰ء کے آخر میں بقیہ تین لکچر بھی اسی معاوضے پر دینے کی دعوت ملی تھی، لیکن اقبال کے لیے چونکہ دوبارہ حیدر آباد آنا ممکن نہ تھا اس لیے انہوں نے معذرت کر دی۔ دیکھیے ''اقبال ریویو'' اقبال اکیڈمی حیدر آباد، خصوصی ایڈیشن، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۴ء، صفحات ۸، ۹، ۱۰، ۱۸، ۱۹

۳۱۔ ''اقبال اور حیدر آباد'' از نظر حیدر آبادی، صفحات ۱۴ تا ۱۶ ''اقبال اور بزم اقبال حیدر آباد'' از عبدالرؤف عروج، صفحات ۴۰ تا ۴۲

۳۲۔ ''نقوش'' اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۵۷۲ تا ۵۷۵۔ اقبال دسمبر ۱۹۲۹ء میں دوبارہ علی گڑھ گئے۔

۳۳۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی: صفحات ۴۵، ۴۶

۳۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۴

۳۵۔ ایضاً، صفحات ۴۲، ۴۳

۳۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۵

۳۷۔ دیکھیے مقدمہ از مترجم: صفحہ ا۔ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (اردو)

۳۸۔ دیباچہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (اردو)

۳۹۔ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۱۲۔ راقم نے ترجمے میں اصل متن کی روشنی میں کچھ ترمیم کی ہے۔

۴۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۲ کچھ ترمیم کے ساتھ

۴۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۴۰

۴۲۔ ایضاً، صفحات ۱۴۵، ۱۴۶

۴۳۔ ایضاً، صفحات ۱۹۳، ۱۹۴

۴۴۔ ایضاً، صفحات ۲۲۷، ۲۲۸

۴۵۔ ایضاً، صفحات، ۲۳۲۔۲۳۳، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۶۰، ۲۷۴، ۲۷۵

۴۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۶

۴۷۔ ایضاً صفحہ ۲۶۸

۴۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۱

۴۹۔ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' از علامہ اقبال (انگریزی) طبع ۱۹۸۲ء، اردو ترجمہ از راقم۔

باب: ١٧

مُسلم ریاست کا تصوّر

ہندو مسلم امتیاز کا مسئلہ، جسے بعد میں فرقہ وارانہ مسئلے یا دوقومی نظریے کا نام دیا گیا، آٹھویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلام کے ورود کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس امر کے متعلق تاریخی شہادت پہلی بار، آج سے تقریباً نو سو برس قبل، البیرونی کی تصنیف ''کتاب الہند'' فراہم کرتی ہے، جس میں ہندو مسلم اختلافات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد البیرونی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جو عبور نہیں کی جا سکتی ۱۔ تاریخ کا مطالعہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل یا قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنے کے لیے پہلی شعوری کوشش سولہویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعے کی۔ لیکن یہ کوشش اس لیے ناکام رہی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایسے ادغام کے خلاف تھے۔ مسلمانوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی اور ہندوؤں میں راجہ مان سنگھ نے شہنشاہ اکبر کو صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی مذہب ہیں، ہندومت اور اسلام، اور ان کا ادغام کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ۲۔ سترھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اکبر ہی کے خطوط پر قومیت متحدہ کو وجود میں لانے کی دوسری شعوری کوشش دارا شکوہ نے کی۔ جسے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ناکام بنا دیا۔ پس انہی تاریخی شہادتوں کی بنا پر اقبال شیخ احمد سرہندی اور اورنگ زیب عالمگیر کو ہندوستان میں مسلم قومیت کے بانیوں میں شمار کرتے تھے۔

برصغیر میں اسلام کا جدید احیاء اٹھارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، جب جنگ پلاسی ۱۷۵۲ء اور بالخصوص سلطان ٹیپو کی شہادت ۱۷۹۹ء کے بعد مسلم

علماء وفقہا نے فتوے صادر کیے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں رہا، بلکہ دارالحرب بن چکا ہے، اس لیے مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جہاد کے ذریعے اپنا کھویا ہوا سیاسی اقتدار حاصل کریں یا ہندوستان چھوڑ کر کسی مسلم ملک میں ہجرت کر جائیں۔ انہی فتووں کی اساس پر سید احمد بریلوی شہید، شاہ اسمٰعیل شہید، مولوی شریعت اللہ، دو دومیاں، میر نثار علی شہید اور غلام معصوم شہید ایسی برگزیدہ ہستیوں نے دعوت اصلاح وتنظیم جہاد کی تحریکیں چلائیں سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے شمال مغربی سرحد کو مرکزِ جہاد بنا کر مسلم اکثریتی علاقوں پنجاب اور کشمیر کی آزادی کے لیے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ اس زمانے میں سرحد اور بلوچستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کے سردار یا حاکم مسلمان تھے، جو سید احمد بریلوی شہید کے مددگار تھے۔ سید احمد بریلوی شہید کا مقصد شمال مغربی مسلم اکثریتی علاقوں میں اسلامی ریاست کا قیام تھا اور اسی سبب وہ پنجاب اور کشمیر کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اسی طرح مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے میں میر نثار علی شہید اور غلام معصوم شہید کی مسلم کاشتکاروں پر مشتمل عسکری تنظیم بھی ہندو جاگیرداروں کے استحصال کا خاتمہ کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی اور ان کے اعلان جہاد کا مقصد بھی مشرقی بنگال میں اسلامی ریاست کا انعقاد تھا، مگر برصغیر کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں اسلامی ریاستوں کے قیام کے لیے مسلمانوں کی کوششیں اس لیے ناکام رہیں کہ انگریزوں کے جدید اندازِ جنگ کا مقابلہ فرسودہ طور طریقوں سے نہ کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال اسلام کے احیائے جدید کے تاریخی پہلو کے مطالعے سے یہ تو صاف عیاں ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے مسلمانوں میں اسلامی عصبیت کے جذبے کے تحت آزادی کی تحصیل کے لیے شعور پیدا ہوا اور انہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں اسلامی ریاستوں کے انعقاد کی

خاطر عملی جستجو کی۔ یہ جستجو گو وقتی طور پر نا کام رہی، لیکن تحریک احیائے اسلام کا خاتمہ نہ ہوا۔ انگریزی غلبے کے تحت برصغیر میں نئے مغربی تصورات داخل ہوئے اور سرسید احمد خان نے اسلامی عصبیت ہی کے جذبے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، مگر اسی دوران میں مغربی نظریات کے زیر اثر ہندو اکثریت میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور وہ جمہوری اداروں کے قیام کے لیے اجتماعی مظاہرے کرنے لگے۔ اُس دور کے مسلمانوں میں سرسید پہلی شخصیت ہیں۔ جنہوں نے محسوس کیا کہ مغربی طرز کے جمہوری اداروں کے قیام سے برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ممکن نہ ہو سکے گا، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ بالآخر ان کے معتقدین محسن الملک اور وقار الملک کی کوششوں سے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول مان لیا گیا۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلمانانِ ہند کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں سرسید کے نظریات نے اقبال کے ہاں ۱۹۰۷ء ہی سے ایک عقیدے کی صورت اختیار کر لی تھی اور اسی عقیدے کے پیش نظر وہ اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں کے ذریعے نہ صرف مسلم قومیت کے اصول کو اجاگر کرتے رہے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کا علیحدہ قومی تشخص برقرار رکھنے کی خاطر ایک مضبوط فکری اور نظریاتی اساس بھی فراہم کی۔ ۱۹۲۷ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک اسی نظریاتی اساس پر انہوں نے مسلمانوں کی کل ہند سیاسیات میں عملی طور پر حصہ لیا اور بالآخر برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔

برصغیر میں فرقہ وارانہ مسئلہ یا اس کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں مسلم اکثریت کی موجودگی بجائے خود ایسی حقیقتیں تھیں جو روز روشن کی طرح عیاں تھیں، اس لیے اقبال سے پیشتر بھی بعض شخصیتوں کو ان کا احساس تھا اور فرقہ وارانہ مسئلے

کے حل کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہندوستان کی تقسیم کے متعلق بسا اوقات خیالات کا اظہار کیا جاتا یا تجاویز پیش کی جاتی تھیں ۔شریف الدین پیرزادہ نے اپنی انگریزی تصنیف ''ارتقائے پاکستان'' میں سرسید، حالی، اور عبدالحلیم شرر (دونوں سرسید کے معتقدین میں سے تھے) کے علاوہ ایسی انیس شخصیتوں کا ذکر کیا ہے، جن کی کارگزاری کا اس مرحلے پر جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شریف الدین پیرزادہ کی تحقیق کے مطابق ۱۸۵۷ء میں جان برائیٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں بیس مختلف قومیں آباد ہیں جو بیس مختلف زبانیں بولتی ہیں ۔اس لیے انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے سے پیشتر وہاں پانچ یا چھ آزاد ریاستیں قائم کرنی پڑیں گی ۔۱۸۸۱ء میں جمال الدین افغانی نے وسطی ایشیا کے روسی مسلم علاقوں افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ری پبلک کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں ولفرڈ بلنٹ نے تجویز پیش کی کہ شمالی ہندوستان میں مسلم اور جنوبی ہندوستان میں ہندو حکومتیں قائم کر دی جائیں، مگر ہر صوبے میں انگریزی فوج موجود رہے ۔۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا نفاذ کیا تا کہ مشرقی بنگال کے پسماندہ مسلمان ترقی کر سکیں، لیکن چونکہ بنگالی مسلمان سیاسی طور پر منظم نہ تھے، اس لیے بنگالی ہندوؤں کے احتجاجی مظاہروں کے سبب تقسیم منسوخ کرنا پڑی ۔۱۹۱۱ء میں سید امیر علی نے سر محمد شفیع کو خط لکھا تھا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو علیحدہ قومیں ہیں، اس لیے یہاں صرف ایسا دستوری نظام ہی قابل عمل ہو سکتا ہے جو ان کے جداگانہ قومی تشخص یا حقوق کے تحفظ کا ضامن ہو۔۱۹۱۳ء میں ولایت علی بمبوق نے اخبار ''کامریڈ'' کے مزاحیہ کالم میں تحریر کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانون کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھنا چاہیے تا کہ شمالی ہندوستان مسلمانوں کو دیا جا سکے ، اور جنوبی ہندوستان ہندوؤں کو ۔۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر

عبدالستار خیری نے یورپ میں سٹاک ہوم کی سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس کے دوران میں ایک تحریری بیان میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر صوبے کو خودمختاری کا حق دیا جانا چاہیے، تاکہ مسلم اور ہندو اکثریتی صوبے علیٰحدہ علیٰحدہ وفاق قائم کرسکیں۔ ۱۹۲۰ء میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے اخبار ''ذوالقرنین'' بدایوں میں مہاتما گاندھی کے نام ایک خط شائع کیا، جس میں تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کردینا چاہیے۔ اس خط میں صوبوں کے مختلف اضلاع میں ہندو مسلم آبادی کے تناسب کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نادر علی نے، جو انگریزوں کے بڑے مداح تھے اور تحریک خلافت کی مخالفت میں سرگرم عمل رہے، حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعوں کے حل کے لیے ہندوستان کی تقسیم لازمی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں سردار گل محمد خان، صدر انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان نے سر ڈینس برے کی زیر صدارت شمال مغربی سرحد کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ پشاور سے آگرہ تک کا علاقہ مسلمانوں کو اور آگرے سے راس کماری تک کا علاقہ ہندوؤں کو دے دیا جائے اور دونوں قومیں آپس میں اپنی اپنی آبادیوں کا تبادلہ کرلیں۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے تجویز پیش کی تھی کہ شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں کو مدغم کرکے ایک صوبہ بنا دیا جائے اور اسے ہندوستان کے وفاقی نظام میں ایک وحدت کی پوزیشن حاصل ہو۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی نے رد کردی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں لالہ لاجپت رائے نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ہندو مسلم آبادی کے لحاظ سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کردی جائے اور پھر مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے علاقے مسلمانوں کو دے دیے جائیں اور ہندوستان کے باقی تمام صوبوں میں ہندو حکومتیں قائم کی جائیں، مگر بعد میں لالہ لاجپت رائے مکر گئے اور کہا کہ انہوں نے ایسے کسی خیال کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء ہی میں اسٹالن (روسی آمر) نے کہا تھا کہ ہندوستان بظاہر ایک متحد ملک

دکھائی دیتا ہے لیکن جب وہاں انقلاب آیا تو کئی اجنبی قومیں منصۂ شہود پر آ جائیں گی ۔۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ سے لے کر دہلی تک ایک ''کارے ڈور'' (رستہ کی شکل میں علاقے کا ٹکڑا) بنا دینا چاہیے ۔ ۱۹۲۵ء میں دست شناس کیرو نے پیشگوئی کی تھی کہ ہندوستان سے انگریزوں کو بالآخر نکلنا پڑے گا اور وہ مسلمانوں اور بدھ مت کے ماننے والوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ ۱۹۲۸ء میں ''ایک ہندی مسلمان'' نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی ہی مختلف قومیں ہیں جیسے جرمن اور فرانسیسی اور چونکہ ان میں اتحاد ممکن نہیں، اس لیے ہندوستان کو ان میں تقسیم کر دینا چاہیے ۔ ۱۹۲۸ء میں مرتضیٰ احمد خان نے اخبار ''انقلاب'' میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا، جس میں شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم وطن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی ۔ ۱۹۲۹ء میں دُرانی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں، اس لیے مسلمان یا تو خودکشی کر لیں ۔ یا ہندو بن جائیں اور یا ہندوستان کی حکومت میں اپنا حصہ طلب کریں[۳]۔

شریف الدین پیرزادہ ان تمام شخصیات کو مسلم ریاست (یعنی پاکستان) کے بننے میں معاون یا اس کے ''بنانے والوں'' میں شمار کرتے ہیں[۴]۔ ان کی کتاب کے مطالعے سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی انہی شخصیات کی طرح ہندوستان کی تقسیم یا الگ مسلم ریاست کا تصور دیا تھا، لیکن اس مرحلے پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اقبال نے تو مسلم ریاست کی تجویز پیش کرنے سے قبل اس کے لیے ایک فکری یا نظریاتی اساس فراہم کی اور پھر جب تک ان کی زندگی نے وفا کی اسے وجود میں لانے کے لیے عملی طور پر جدوجہد بھی کرتے رہے، لیکن باقی شخصیات مثلاً برائیٹ، ولفرڈ بلنٹ، لارڈ کرزن، لالہ لاجپت رائے، اسٹالن یا دست شناس کیرو

نے اس سلسلے میں کون سی ایسی خدمات انجام دی ہیں، جنہیں مسلمانوں کے لیے نظر انداز کرنا مناسب نہیں؟ ظاہر ہے کہ بعض لوگوں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے طور پر تقسیم ہند کی تجاویز پیش کیں؟ لیکن انہیں پاکستان بننے میں معاون یا اس کے بنانے والوں میں شمار کرنا درست نہیں۔

اشتیاق حسین قریشی نے اپنی انگریزی تصنیف ''پاکستان کے لیے جدوجہد'' میں اقبال سے پیشتر برصغیر میں مسلم ریاست کا تصور پیش کرنے والوں میں جمال الدین افغانی، چودھری رحمت علی، ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری، محمد عبدالقادر بلگرامی، لووٹ فریزر، ساورکر، لالہ لاجپت رائے، سردار گل خان، مولانا محمد علی اور آغا خان کے ناموں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان سب اور اقبال میں وہ یہ فرق روا رکھتے ہیں کہ اقبال نے ایک اہم عوامی شخصیت کے طور پر مسلم ریاست کا تصور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا[۵]۔ گویا وہ بھی اس سلسلے میں اقبال کے مسلم ریاست کے پیش کردہ تصور سے قبل اس کے لیے فکری یا نظریاتی اساس کے فراہم کرنے یا زندگی بھر اس کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے کے پہلوؤں کو نظر انداز کرنا مناسب خیال کرتے ہیں یا شاید حیاتِ اقبال کے یہ اہم پہلو ان کے علم یا تحقیق کی زد سے باہر رہے۔

دونوں مصنف یعنی شریف الدین پیرزادہ اور اشتیاق حسین قریشی اپنی تصانیف میں ذکر کرتے ہیں کہ جمال الدین افغانی نے وسطی ایشیا کے روسی مسلم علاقوں، افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ری پبلک کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔ اس ضمن میں شریف الدین پیرزادہ، اشتیاق حسین قریشی کی تحریر پر انحصار کرتے ہیں اور اشتیاق حسین قریشی کا انحصار کتاب ''تاریخ تحریک آزادی'' جلد اوّل (انگریزی) کے صفحات ۴۸، ۴۹ پر ہے، مگر تحریک آزادی (جلد اوّل) کا مصنف اس روایت کی تائید میں کوئی مستند ماخذ

یا حوالہ پیش نہیں کرتا۔ "تاریخ تحریک آزادی" کی جلدیں اس لیے نامکمل رہیں کہ یہ سلسلہ ہائے کتب تحقیقی طور پر ناقابل اعتماد قرار دیا گیا تھا۔ بلاشبہ جمال الدین افغانی ترکی کے سلطان خلیفہ کی سربراہی میں جمہوریت کی بنیادوں پر ایک دستوری وفاق کی صورت میں ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے داعی تھے اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال انہیں عصر حاضر کا مجدد سمجھتے ہیں ۶۔ مگر مسلمانان ہندوستان کے متعلق ان کے نظریات وہی تھے جو مولانا شبلی کے تھے، یعنی یہ کہ ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ اغراض کی بنیاد پر تعاون کیا جائے اور ترکی خلافت کے حق میں تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا جائے۔ انہوں نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران میں سرسید احمد خان اور ان کے مکتبہ خیال کے لوگوں سے کوئی تعلق یا وابستگی پیدا نہ کی، بلکہ سرسید کے نظریات کی تردید میں "ردِ نیچریہ" تحریر کی اور اپنے اخبار "العروۃ الوثقیٰ" میں بھی ان کے خلاف لکھتے رہے۔ اسی اخبار کے ایک مضمون میں جمال الدین افغانی نے تحریر کیا کہ سرسید اور اس کے حامیوں نے مذہب کا لبادہ اتار پھینکا ہے اور وہ مسلمانوں میں کفر و الحاد پھیلا رہے ہیں۔ یہ مادہ پرست یورپ کے مادہ پرستوں سے بھی گئے گزرے ہیں، کیونکہ مغربی ممالک میں جو کوئی بھی اپنا مذہب چھوڑتا ہے وہ محبِّ وطن تو رہتا ہے اور غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف اپنے وطن کے دفاع کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے، مگر ان لوگوں میں یہ جذبہ بھی مفقود ہے ۷۔ سو راقم کی رائے جمال الدین افغانی سے منسوب متذکرہ مسلم ری پبلک کا تصور ایک ایسی روایت ہے جس کی تائیدی شہادت اب تک کسی نے پیش نہیں کی۔ بہر حال شریف الدین پیرزادہ، اشتیاق حسین قریشی یا مصنف "تاریخِ تحریک آزادی" کی تحریروں پر انحصار کرتے ہوئے بعض اور مصنفین نے بھی اسی مشکوک روایت کو دہرایا ہے۔

ایک اور کتاب جس کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہے چودھری خلیق الزمان کی

انگریزی تصنیف "شاہراہ پاکستان" ہے۔ اس کتاب میں مسلم ریاست کے تصور کے خالقوں میں سر تھیوڈور ماریسن وغیرہ کے ناموں کا اضافہ ہوا ہے، لیکن اقبال کے بارے میں ایک مقام پر غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے دوران میں چوہدری رحمت علی نے لندن میں کئی مسلم قائدین سے ملاقات کی اور انہیں اپنی تقسیم ہندوالی اسکیم سمجھائی، جس کو انہوں نے پہلی مرتبہ پاکستان کا نام دیا اور آخر کار دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال نے خود اسی کو کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ چودھری خلیق الزمان کی تحریر سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ چوہدری رحمت علی سے متاثر ہو کر اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور پیش کیا ۸۔ چوہدری خلیق الزمان پہلی گول میز کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شریک نہ ہوئے اور وہ اس موقع پر لندن میں موجود بھی نہ تھے۔ سو یہ ان کا چشم دید واقعہ نہیں، مگر عین ممکن ہے کہ یہ غلط بات انہوں نے اپنے قیاس سے تحریر کی ہو، اور ان کے قیاس نے انہیں دھوکا دیا ہو۔ بات یہ ہے کہ برصغیر میں مسلم ریاست یا پاکستان کے لیے تحریک کے متعلق اب تک اسلامی یا نظریاتی نقطۂ نظر سے کوئی مستند کتاب تحریر نہیں کی گئی۔ مسلمانوں یا غیر مسلموں نے اس موضوع پر جو کتب انگریزی یا اردو میں لکھی ہیں ان میں اس تحریک کا صرف نیشنل پہلو نمایاں کیا گیا ہے۔ یعنی ان میں اسلام کو ایک قومیت ساز عنصر کی حد تک تو قبول کیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ ایسی تمام کتب کے مطالعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دوقومی نظریہ (جس کی حقیقت کا اعتراف بعض انگریزوں یا ہندوؤں کو بھی تھا) مسلمانوں کی ہندوؤں اور انگریزوں کے ساتھ سیاسی جنگ میں ایک طاقتور ہتھیار تھا جو پوری شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ گویا تحریک کے لیڈر اس ہتھیار کے بار بار استعمال سے یہ واضح کرتے تھے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ بالفاظ دیگر مسلم ریاست کے

قیام کے لیے تحریک کا مقصد صرف ایک آزاد قومی وطن کی تحصیل تھا اور جونہی وہ وطن حاصل ہوا دو قومی نظریے کے ساتھ تحریک کی مقصدیت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جان برائیٹ، بلنٹ، لارڈ کرزن، تھیوڈور ماریسن، لووٹ فریزر، ساورکر، لالہ لاجپت رائے، اسٹالن یا دست شناس کیرو ایسے سب کا شمار مسلم ریاست کے تصور کے خالقوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے پرابلم کا تعلق ہے اسے حل کرنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ اقبال کی تصویر بھی دوسروں کے شانہ بشانہ اسی آرٹ میوزیم میں لٹکا دی جائے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے بعض لیڈر خود ہی اقبال کو مسلم ریاست کے تصور سے الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔ ایسی احسان فراموشی کی ایک مثال مسلم لیگ یا تحریک پاکستان کے ایک نامور لیڈر اور قائد اعظم محمد علی جناح کے دست راست ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی کی تحریر کے حوالے سے پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ شریف الدین پیرزادہ، اشتیاق حسین قریشی یا چودھری خلیق الزمان کی کتب میں درج کردہ بیانات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی تحریر میں مسلم ریاست کے تصور کے خالقوں میں جمال الدین افغانی، خیری برادران، محمد عبدالقادر بلگرامی، سردار گل خان اور چوہدری رحمت علی کے نام گنوانے کے بعد فرماتے ہیں:

اس بات سے بلا شبہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر اقبال کا فکر، شاعری اور خطبات بھی اسی سمت میں اشارہ کرتے تھے (یعنی مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت کی طرف) لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے تاریخ کو منسوخ کرنا ہے۔۹

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کے بارے میں پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر امبید کرنے بھی، جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا، کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ وہ اپنی اپنی تصانیف میں فرماتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے لیے تحریک سے اقبال کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں

لکھا؟ ہندو لیڈروں کو اندیشہ تھا کہ اگر اقبال کی تحریک پاکستان سے وابستگی ثابت ہوتی ہے تو تحریک کو ایک جامع نظریاتی اساس یا مقصدیت مل جاتی ہے، لیکن اقبال کی تحریک سے لاتعلق اسے کسی پائدار نظریاتی اساس یا مقصدیت سے محروم رکھے گی اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں یہی اس کی موت کا سبب بن جائے۔ بہر حال پاکستان ایک مسلم نیشنل ریاست کی صورت میں تو قائم ہو گیا، مگر اسلامی ریاست نہ بن سکا۔ پس اسلامی عصبیت کی بجائے علاقائی تعصب نے زور پکڑا اور اقبال کے عقابی فکر کے پر اس تعصب کی قینچی کی نذر ہو گئے:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

پاکستان کے تصور کے متعلق محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

تصور پاکستان کو جن اشخاص سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں سے کسی کو بھی تصورِ پاکستان کا بانی اوّل قرار دینا درست نہیں ہے۔ ان میں سے بعض (جیسے سرسید، تھیوڈور ماریسن) نے صرف دو قومی نظریے کا اظہار کیا، بعض (بلنٹ، شرر، بمبوق، خیری برادران، سردار گل خان، مولانا حسرت موہانی، لاجپت رائے، مرتضیٰ احمد خان) نے مسلم اضلاع یا مسلم صوبوں کے قیام کا خیال ظاہر کیا اور بعض (جیسے عبدالقادر بلگرامی اور نادر علی) نے حلقۂ اثر یا تقسیم ہند کی مبہم تجویز پیش کی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب تجاویز ۱۹۳۰ء سے قبل (یعنی علامہ اقبال کے تصور پاکستان پیش کرنے سے پہلے) کی ہیں، لیکن ان میں کسی تجویز میں بھی واضح طور پر مسلم صوبوں کے ایک علیٰحدہ وفاق یا ایک آزاد، مقتدر مسلم مملکت کے قیام کا ذکر نہیں ہے ان تجاویز کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم ان تجاویز کو پڑھتے ہیں تو ہمارے متخیلہ میں پاکستان کا موہوم سا تصور یا ہلکی سی جھلک پیدا ہوتی ہے، لیکن اقبال کی پوری سیاسی فکر اور عملی جدوجہد کے پس منظر میں، جب ہم ان کے خطبۂ

صدارت مسلم لیگ اور قائد اعظم کے نام ان کے دونوں خطوط (مورخہ ۲۸ رمئی ۱۹۳۷ء اور ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء) کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان کی نہایت واضح، بہت ہی صاف اور کاملاً جامع تصویر اجاگر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام تجاویز میں صرف ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں ایک تاثر یا ایک احساس پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا تاثر یا مسلمانوں کی ہندوؤں سے مغائرت کا احساس لیکن پاکستان کا تصور کسی مبہم احساس یا سرسری تاثر کا نام نہیں ہے۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی نغمہ سرائی کے ذریعے اس احساس کو مسلمانانِ برصغیر کے لاشعور سے نکال کر ان کے شعور میں لے آئے۔ پھر اپنی صوت سرمدی سے اس شعور کو پختہ کیا اور اپنی سیاسی بصیرت سے اس کی عملی تجسیم و تشکیل کا خاکہ پیش کیا اور یہی ان کی اوّلیت ہے[10]۔

اقبال ۱۹ ردسمبر ۱۹۳۰ء کی صبح کو الہ آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر ان کے میزبان نواب سر محمد یوسف اور چند دوسرے مسلم لیگی لیڈر موجود تھے۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم انہیں دیکھنے کی خاطر اکٹھا ہو گیا تھا، اور نہایت گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ سید شمس الحسن تحریر کرتے ہیں کہ اقبال کے عظیم الشان استقبال کی اصل وجہ ان کی منفرد شخصیت تھی اور لیگ کے اجلاس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں ایک جلوس کی شکل میں اسٹیشن سے نواب سر محمد یوسف کی کوٹھی لے جایا گیا[11]۔

لیگ کا اجلاس کالیون ہسپتال (اب موتی لعل نہرو ہسپتال) کے بالمقابل مسلمانوں کے محلّہ یاقوت گنج میں واقع دوازدہ منزل میں منعقد ہوا۔ اس زمانے میں اس عمارت کے مالک ایک تاجر شیخ رحیم بخش تھے، جن کا تمباکو کا بہت وسیع کاروبار تھا اور شیخ رحیم بخش کا خاندان تمباکو والوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ عمارت کے صحن یا ہال کے چاروں طرف بارہ دروازے برآمدوں میں کھلتے تھے، اسی لیے اس کا نام دوازدہ

منزل رکھا گیا تھا[12]۔ اجلاس میں لیگ کے صرف چند نمائندوں نے شرکت کی اور اس کا کورم بھی بڑی مشکل سے پورا ہوا۔ سید حسین امام، مولوی عبدالقادر قصوری، سر محمد یعقوب، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید حبیب اور ذاکر علی اجلاس میں موجود تھے[13]۔ مفتی فخر الاسلام وکیل کے مطابق، جو اس جلسے میں موجود تھے، حاضرین کی تعداد مشکل سے چار یا پانچ سو ہوگی یا شاید اس سے بھی کم۔ ان میں بہت سے اسکول کے لڑکے بھی شامل تھے، جو تفریحاً شریک ہو گئے۔ اقبال، نواب سر محمد یوسف کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں تشریف لائے[14]۔

نہایت خاموشی سے جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تلاوتِ قرآن مجید کے بعد اقبال نے اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ خطبہ انگریزی میں تھا اور غالباً چند لوگ ہی اسے سمجھ سکے، باقیوں کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ فرانسیسی مفکر البرٹ کامیوں کا قول ہے کہ عظیم خیالات دنیا میں معصوم پرندوں کی طرح چپ چاپ آتے ہیں لیکن اگر ہم اپنی توجہ سے سننے کی کوشش کریں تو شاید قوموں اور سلطنتوں کے شوروغل میں ہمیں ان کے پروں کی ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے جائے۔ گویا زندگی میں معمولی ہلچل کے ساتھ امید کا خاموش پیغام دیا جا رہا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبے میں جن امور کا ذکر کیا، ان پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ خطبے میں پیش کردہ تجویز کی حمایت میں کوئی قرارداد منظور نہ ہوئی۔ مقامی اخباروں نے بھی خطبے کی تفصیل شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی، کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ خطبے میں جو خیال پیش کیا جا رہا ہے، اس کے سبب ہزاروں انسان اپنی جانیں قربان کر دیں گے، لاکھوں انسانوں کی زندگیاں متاثر ہوں گی اور کروڑوں انسانوں کی آبادی پر مشتمل ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آ جائے گا۔

اقبال نے دو دن الہ آباد میں قیام کیا۔ ظہور احمد بیرسٹر کے ساتھ پیدل بازاروں میں گھومتے رہے۔ دکاندار اور لوگ بڑھ بڑھ کر ان سے ملتے اور مصافحہ

کرتے تھے۔ مفتی فخر الاسلام انہیں پرانا کالا ڈانڈا کے قبرستان میں لے گئے، جہاں انہوں نے اکبر الہ آبادی کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور واپسی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچے، لیکن پنجاب میل لیٹ تھی۔ ریاض الہ آبادی کے بیان کے مطابق پلیٹ فارم پر دو چار اشخاص ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریاض الہ آبادی نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: جناب، میں ایک معمولی طالب علم ہوں اسکول میں مدرس ہوں اور بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا، مہربانی کر کے اس کا مطلب واضح کر دیجیے۔ اقبال نے نہایت شفقت سے ان کا ہاتھ پکڑا، انہیں فسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں لے گئے، بٹھایا اور پوچھا، کون سا شعر ہے؟ ریاض الہ آبادی نے عرض کیا۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی ہستی ہے

اقبال نے مطلب سمجھاتے ہوئے کہا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومیں فنا نہیں ہوتیں، آئندہ نسلوں کی صورت میں اپنا قائم مقام پیش کر دیتی ہیں اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے، جس طرح ستارے فنا نہیں ہوتے بلکہ اپنا قائم مقام آفتاب کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں جو تابانی میں ستاروں سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ اتنے میں پنجاب میل آ گئی اور وہ چلے گئے۔[15]

خطبۂ الہ آباد میں شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کا تصور تو پیش کیا گیا، لیکن مسلم اکثریتی صوبہ بنگال کا ذکر موجود نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوزہ مسلم ریاست کا تصور ایک نصب العین کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور شمالی مغربی ہند میں مسلم ریاست کے قیام کے سلسلے میں بھی وہاں کی مسلم اکثریت کے بارے میں ''کم از کم'' کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے، جس سے ظاہر ہے کہ بنگال بھی اقبال کے پیشِ نظر تھا، مگر اس کا واضح ذکر اس لیے نہ کیا گیا کہ اگر شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریت کی بنا پر

مسلم ریاست کے قیام کا اصول قابل قبول ہوتا ہے تو منطقی طور پر اسی اصول کا اطلاق مشرقی ہند پر بھی کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے، ان کا خطبے میں ذکر کرنا اس لیے غیر ضروری تھا کہ وہاں مسلمانوں کو ویٹیج یا پاسنگ دینے پر ہندوؤں کو کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کے نتیجے میں قوت کے توازن کے سبب ان کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔

خطبے میں پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور نہ کیے جانے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ لیگ کے سرکردہ لیڈر محمد علی جناح سمیت گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے، لیکن چند اور اہم وجوہ بھی تھیں۔ اس مرحلے پر ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے لیے مسلمانوں کی طرف سے محمد علی جناح نے چودہ نکات پیش کر رکھے تھے اور گول میز کانفرنس میں حکومت برطانیہ کے نمائندوں کے سامنے بھی یہی مطالبات تھے۔ گویا چودہ نکات ابھی زیرِ غور تھے اور ان کے قبول یا کلی طور پر رد کیے جانے کا حتمی فیصلہ ابھی ہونا تھا۔ اس صورت حال میں اقبال کی پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور کرنا نامناسب یا قبل از وقت تھا۔ علاوہ ازیں اس کے باوجود کہ اقبال، لیگ کے ساتھ عرصے سے وابستہ تھے، پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور اب مسلم لیگ کے منتخب صدر کے طور پر اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔ انہوں نے خطبے کے ابتدائی حصے میں واضح کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے رہنما یا کسی سیاسی رہنما کے پیرو کی حیثیت سے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش نہیں کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر اقبال کی پیش کردہ تجویز ایک متبادل بلکہ ایک قدم آگے بڑھانے کی تجویز تھی، یعنی اگر چودہ نکات رد کر دیے گئے یا ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا قائم کرنے کی تجویز منظور نہ ہوئی تو پھر یہ لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ اقبال نے خطبے کے آخری حصے میں اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

میں کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے کے امکان کے متعلق نا امید نہیں ہوں، لیکن میں اپنا یہ احساس بھی آپ سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا کہ موجودہ سیاسی بحران سے نپٹنے کی خاطر ملت اسلامیہ کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور ایسے نازک وقت میں آزادانہ سیاسی راہ عمل اختیار کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو باعزم ہوں اور اپنی قوت ارادی ایک مخصوص مقصد پر مرتکز کر سکیں ۱۶۔

چنانچہ خطبے میں ایک مخصوص متبادل مقصد مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا، لیکن اس کی تائید میں فوری طور پر کسی قرارداد کو ترتیب دینے یا منظور کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ حالات اس کے موافق نہ تھے۔

بہر کیف اقبال کی احتیاط کے باوجود، حکومت برطانیہ کے سرکردہ لیڈروں نے جو اپنی طرف سے ہندوستان کے آئندہ دستور کا پیچیدہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، اقبال کے خطبے کو پسند نہ کیا۔ بمبئی کے انگریزی اخبار ''انڈین ڈیلی میل'' نے اپنے لندن کے نامہ نگار کے حوالے سے لکھا کہ اقبال کے خطبے پر وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سخت برہم ہوئے۔ الہ آباد کے انگریزی اخبار ''لیڈر'' کے نمائندے نے لندن سے تحریر کیا کہ وفاقی حکومت کے تصور اور اس کی حمایت میں ہندوستانی رہنماؤں کے نظریات پر اقبال نے جو حملہ کیا ہے اس کے رد عمل کے طور پر برطانوی اور ہندوستانی حلقے شدید غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے دو اینگلو انڈین اخباروں ''پائونیر'' اور ''ٹائمز آف انڈیا'' نے بھی اپنے اداریوں میں اقبال کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے رجعت پسند اور نا قابل عمل قرار دیا ہے ۱۷۔

جہاں تک ہندو پریس کا تعلق ہے، وہ خطبے پر تبصرہ کرتے وقت گالی گلوچ اور بہتان تراشی پر اتر آیا، اخبار ''ٹریبون'' لاہور نے لکھا کہ اقبال کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو نہیں کیا گیا اس لیے وہ انتقام پر اتر آئے۔ پہلے آغا خان کو

تار بھیج کر مخلوط انتخاب قبول کرنے پر احتجاج کیا اور پھر خطبۂ الہ آباد کے ذریعے ہندو مسلم مفاہمت کے تمام امکانات ختم کر دیے۔ ''پرتاپ'' نے ایک مضمون بعنوان ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان، ڈاکٹر اقبال کی گستاخیوں پر چند خیالات'' شائع کیا، جس میں اقبال کو جنونی، شر انگیز، احمق، خوفناک، زہریلا، تنگ خیال، پست نظر، متعصب، قابلِ نفرت، کمینہ اور نالائق کے القاب سے نوازا گیا[18]۔ پھر بھی، بقول عبدالسلام خورشید، ہندوؤں میں کم از کم ایک شخص ایسا تھا جس نے خطبے پر مثبت انداز میں تبصرہ کیا۔ اس نے اپنا اصل نام ظاہر نہ کیا، لیکن ''ایک روشن خیال ہندو'' کے قلمی نام سے ''ٹائمز آف انڈیا'' میں تحریر کیا کہ وفاقی ڈھانچے میں دیسی ریاستوں کی شمولیت کے سبب ہندوؤں کی پوزیشن مسلمانوں کے مقابلے میں بہت مضبوط ہو جائے گی۔ اگر اقبال کی تجویز کے مطابق سندھ، سرحد، اور بلوچستان کو پنجاب کے ساتھ ملا کر ایک شمال مغربی مسلم ریاست قائم ہو جائے تو اس میں ہندو ایک مضبوط اقلیت ہوں گے اور اگر سکھ ان کے ساتھ مل جائیں تو وہ ایک بہت بڑی قوت بن سکتے ہیں اس لیے ہندوؤں کو اس تجویز پر تشویش کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں[19]۔

مسلم پریس اقبال کا ہمنوا تھا۔ ''مسلم آوٹ لک''، ''سیاست''، ''ہمدم لکھنؤ'' وغیرہ سب نے اقبال کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور ''انقلاب'' تو ان کی حمایت میں سر فہرست تھا[20]۔ ''انقلاب'' کے دو شماروں میں خطبہ الہ آباد کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ ترجمہ غالباً غلام رسول مہر نے کیا تھا[21]۔ اس کے علاوہ ''انقلاب'' نے جنوری ۱۹۳۱ء میں خطبے کے حق میں تقریباً بارہ اداریے تحریر کیے۔ ایک اداریے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا، کہ تقسیم ہند کی تجویز تو دراصل ہندوؤں ہی کی طرف سے پیش کی گئی تھی، جب لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا کہ مسلمان شمالی ہند کو اپنا قومی وطن بنالیں اور ہندو ان علاقوں کو چھوڑ کر وسطی اور جنوبی ہند میں آباد ہو جائیں۔ بعد میں بھائی پرمانند

نے بھی اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا اور پھر خطبۂ الہ آباد سے چند روز پیشتر پروفیسر جی۔آر۔ابھیانکر نے برصغیر کو تین حصوں میں بانٹنے کا تصور پیش کیا۔یعنی ریاستی ہند مسلم ہند اور ہندو ہند۔پس اگر ہندو تقسیم ہند کے متعلق سوچ سکتے ہیں، تو پھر اقبال کو ایسی تجویز پیش کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا[۲۲]۔لالہ لاجپت رائے کے تصور تقسیم ہند کا ذکر اقبال نے بھی اپنے خط بنام سید نذیر نیازی محررہ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء میں کیا ہے، جس میں اپنی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔یہ خیال آبادیوں کے تبادلے کا مدت ہوئی لالہ لاجپت رائے نے ظاہر کیا تھا۔اس ایک یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق پیدا ہوں گی، ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا[۲۳]۔

''انقلاب'' نے کسی اور اداریے میں لکھا کہ اگر ہندو مسلمانوں کو نظر انداز کر کے محض اکثریت کے بل بوتے پر سواراج کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ایسے علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے مسلم ریاست کے قیام کو اپنا نصب العین بنائیں۔اسی فیصد مسلم اکثریتی علاقے میں مسلمانوں کو مسلم ریاست قائم کرنے کا حق تو جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) بھی دیتی ہے، کیونکہ وہ حق خود ارادیت کے اصول کی قائل ہے، ایک اور اداریے میں کہا گیا کہ اگر اقبال کی تجویز کے مطابق شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی علاقوں کا حق آزادی تسلیم کر لیا گیا تو سارے برصغیر میں امن اور سکون کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو ہندو اور مسلمان آپس میں ایک نہ ختم کو نے والی خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائیں گے[۲۴]۔

''انقلاب'' نے ایک طویل اداریے کے آخر میں اقبال کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا:

خدا اس مبارک ہستی کو زندہ رکھے جس نے پراگ (الہ آباد کا پرانا ہندو نام) میں سب سے پہلی مرتبہ راہ گم کردہ اور قومیت و جمہوریت کے فریب کارانہ دعادی سے مسحور ملت کے لیے ہدایت کی حقیقی روشنی کا بندوبست کیا۔ خدا کو منظور ہوا تو یہ روشنی زندگی کی صحیح منزل مقصود تک اسلامیان ہند کی رفیق رہے گی[۲۵]۔

"ہمدم" لکھنؤ نے تجویز کی حمایت میں تحریر کیا:

اقبال کا یہ مطالبہ نہایت حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کے قیام کا موقع ملنا چاہیے اور اس کی بہترین تشکیل اس صورت سے ہو سکتی ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد سلطنت قائم کر دی جائے۔ حق یہ ہے کہ ہندو مسلم تنازعات کا یہ بہترین حل ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان متحد ہو کر اس کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی قوتِ عمل کا مظاہرہ کر کے اس کو حاصل کر کے چھوڑیں[۲۶]۔

مسلم پریس، اقبال کے خلاف چلائی گئی ہندو پریس کی ہمہ گیر مہم کا ترکی بہ ترکی جواب تو بہر حال دیتا رہا۔ خطبۂ الہ آباد کے دیے جانے کے چند ہی روز بعد اس کی دھوم لندن میں بھی پہنچی اور وہاں کے اخبارات نے اس کے بعض حصے شائع کیے۔ اس سلسلے میں ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کی ناراضگی کا ذکر تو ہو چکا ہے، لیکن پہلی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں ڈاکٹر مونجے نے بھی اپنی تقریر کے دوران خطبۂ الہ آباد پر برہمی کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا:

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مرحلے پر جو کچھ کل کے پریس میں سر محمد اقبال کی تقریر کی رپورٹ کی صورت میں شائع ہوا ہے، اس کا ذکر کرنا مناسب ہے یا نہیں۔۔۔ وہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے صدر ہیں اور مجھے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت کوفت ہوتی ہے، لیکن چونکہ انہی خطوط پر مطالبات متواتر پیش کیے جا رہے ہیں، اس لیے مجھے نہایت تکلیف دہ احساس کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔

میں اپنے مسلم دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جذبات کی رو میں نہ بہ جائیں۔ہم سب لوگ ہندوستان کے باشندے ہیں۔ہمارے اور تمہارے خون اور ہڈیوں میں کوئی فرق نہیں۔ہم سب ایک ہی قوم کی اولاد ہیں اور ہم تمہارے مذہب تمدن اور نسل کی ترقی کے لیے ہر وہ تحفظ دینے کو تیار ہیں جس کا تم مطالبہ کرتے ہو۔میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ جرأت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں مستغرق کردو اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اگلے دس برس کے لیے یہ تجربہ کر دیکھو تو تمہیں کبھی کسی قسم کی کوئی شکایت نہ رہے گی ۲۷۔

اس کا جواب سر محمد شفیع نے سب کمیٹی کے اجلاس منعقدہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو دیا

۔آپ نے فرمایا:

ڈاکٹر مونجے نے اس تقریر کا خصوصی طور پر حوالہ دیا ہے جو کہتے ہیں سر محمد اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدرات کرتے ہوئے الہ آباد میں تین چار روز ہوئے کی تھی۔اے کاش! ڈاکٹر مونجے اس امر کی طرف اشارہ کر کے مجھے ایسے مسئلے پر زبان کھولنے کے لیے مجبور نہ کرتے جس کے متعلق بحث کرنے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔میں کمیٹی کو یقین دلاتا ہوں کہ کل صبح جب میں یہاں آیا تو ایسی نیت کے ساتھ نہ آیا تھا۔اب سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ جب تک اس تقریر کا پورا متن میرے سامنے نہ ہو، میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔۔۔۔اگر سر محمد اقبال نے کہا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ہندوؤں کی پائدار اور غیر متغیر اکثریت کے سبب سارے ہندوستان میں ہندو ریاست قائم ہوگی، یا ایسی غیر متغیر اور پائدار اکثریت کے سبب آٹھ گورنری صوبوں میں سے چھ میں ہندو ریاستیں قائم ہوں گی، تو پھر ان چار مسلم صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، چار مسلم ریاستیں کیوں نہ قائم کی جائیں؟ مجھے تو اس تجویز میں کوئی بری بات دکھائی نہیں دیتی اور میں بذات خود اس کمیٹی کے سامنے یہی تجویز دہرانے کے لیے تیار ہوں

۔۔۔ ہر صوبائی وحدت ایک ریاست بنا دی جائے۔ اگر انہوں نے (اقبال نے) یہ کہا ہے تو اس میں کچھ بھی نہیں اور اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ اگر انہوں نے مروجہ اصطلاح کے مطابق برٹش کامن ویلتھ سے باہر کسی آزاد مسلم ریاست کے قیام کا ذکر کیا ہے تو میں سارے مسلم ڈیلی گیشن کی طرف سے ایسی تجویز کو رد کرتا ہوں۔ جناب وزیر اعظم! میں ایک مسلمان کے پیمانہ صبر کے لبریز ہو جانے کا بخوبی تصور کر سکتا ہوں، جبکہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے ہندوستان کے مختلف حصوں میں، بغیر سوچے سمجھے مختلف قسم کے ایسے ہی متضاد اعلانات کرتے پھرتے ہیں ۲۸۔

بہر حال دیگر مسلم سیاسی رہنماؤں میں سے کسی ایک نے بھی خطبۂ الہ آباد کے حق میں یا خلاف اپنی زبان نہ کھولی، بلکہ سب کے سب خاموش رہے۔ اس خاموشی کا اصل سبب یہی تھا کہ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کے کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہونے کے بعد دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہو چکا تھا۔ پس مسلم سیاسی رہنما چودہ نکات کی بنیاد پر کسی نہ کسی ہندو مسلم سمجھوتے یا چودہ نکات کے حشر کے منتظر تھے۔ گول میز کانفرنسوں کا یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا اور ان میں اقبال نے بھی شرکت کی۔ اس لیے ان کے حتمی نتائج کا انتظار ضروری تھا۔ اقبال نے بھی خطبۂ الہ آباد کے بعد اپنی تجویز کردہ مسلم ریاست کے قیام کی خاطر اندرون خانہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ مثلاً ۱۹ر اپریل ۱۹۳۱ء کو اپنے ایک خط بنام سید نذیر نیازی میں لکھا کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا جلسہ بھی انشاء اللہ ہو گا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں بھی اقبال کے ذہن میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد کرنے کا خیال موجود تھا اور انہوں نے سید نذیر نیازی سے کہا کہ انتظار کرو، تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بقول سید نذیر نیازی وہ اس کے لیے خطبہ بھی تحریر کر رہے تھے۔ (یہ خطبہ بالآخر آل پارٹیز مسلم کانفرنس

کے اجلاس منعقدہ لاہور بتاریخ ۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا) لیکن اپر انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد نہ ہوا۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

رہی یہ بات کہ اس کانفرنس کا انعقاد کیوں نہ ہو سکا، سو اس کی بڑی وجہ تو گول میز کانفرنس کا انعقاد تھا جن میں خود حضرت علامہ کو بھی شریک ہونا پڑا۔ یہ کہنا کہ اس کانفرنس کی ناکامی میں بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے، غلط ہوگا، کیونکہ حضرت علامہ کسی فرد یا جماعت کے چکر میں نہیں آئے، خواہ اس فرد یا جماعت کے عزائم کچھ بھی ہوں۔ گول میز کانفرنسوں کی کارروائی اور اس کے نتائج کا انتظار بہر کیف ضروری تھا ۔۔۔ پھر جب ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس سے واپسی پر کچھ سفر کی کلفت اور کچھ اس وقت کے مخصوص احوال کے پیش نظر حضرت علامہ نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے اس ارادے کو چند دن اور ملتوی رکھیں حتیٰ کہ ۱۹۳۴ء کے آغاز میں حضرت علامہ خود ہی بیمار ہو گئے اور یہ کانفرنس رہ گئی [29]۔

حقیقت یہ ہے کہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کا خیال آخری دم تک اقبال کے ذہن میں رہا۔ اس کانفرنس کا ذکر ان کے ایک خط بنام محمد علی جناح محررہ ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء میں موجود ہے، اور پھر اپنے ایک دوسرے خط محررہ ۱۱ر اگست ۱۹۳۷ء میں انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا محور بنایا جائے [30]۔

سو خطبہ الہ آباد کے متعلق بیشتر مسلم سیاسی رہنماؤں نے تو مکمل خاموشی اختیار کی، البتہ سندھی مسلمانوں کے نامور رہنما حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون نے اقبال کے ساتھ تعاون کیا اور خطبے کی روشنی میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں اقبال سے خط و کتابت کرتے رہے۔ خطبہ کچھ پڑھے لکھے مسلمانوں اور طلبہ کی توجہ کا مرکز ضرور بنا [31]۔ رسالہ ''صوفی'' (منڈی بہاء الدین) کے اصرار پر اس کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے بھی کیا، کیونکہ بقول ان کے پنجاب، سرحد اور سندھ

کے بعض دور دراز حصوں میں مسلم ریاست کے اس نئے تخیل نے بڑا جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔ ترجمہ رسالہ ''صوفی'' کے زیر اہتمام چھپا اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا ۳۲۔ بعض مسلم نوجوانوں نے خطبے کے حق میں اخباروں میں مضامین شائع کیے۔ بقول عبدالسلام خورشید، الہ آباد کے ایک وکیل عبدالرب اور لاہور کے خان غلام مصطفیٰ خان تائب نے خطبے کی حمایت میں مقالات لکھے، کلکتے کے تین مسلم طلبہ راغب احسن، فضل رسول خان آفریدی اور ایس۔ ایم۔ سلیم نے ایک مشترکہ بیان میں خطبے کی تائید کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ مسلم ریاست کے قیام کے لیے تحریک کے تمدنی پہلو پر کتب کی اشاعت کی خاطر ایک ''مسلم نصب العین فنڈ'' کھولا جائے ۳۳۔ جہاں تک کانگرسی ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے خطبۂ الہ آباد کو ایک ''سیاسی غزل'' سے تعبیر کیا، سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں۔

یہ غالباً ۱۹۳۱ء کی ابتداء تھی جب قرول باغ دہلی میں شاید مولانا محمد علی مرحوم کے دولت کدے پر (غالباً ان کے انتقال کے فوراً بعد) بعض احباب جمع ہوئے۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جنہوں نے خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا اور تبدیلیِ حالات کے باوجود اپنے مسلک پر قائم تھے۔ دوران گفتگو میں کسی نے کہا ارے صاحب آپ نے وہ اقبال کا خطبہ صدارت بھی پڑھا۔ واللہ کیا خوب شاعری کی ہے، آخر شاعر ہی تو ہیں، کیسی غزل کہہ گئے ہیں۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا ۳۴۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے زمانے میں کانگریسی ذہنیت رکھنے والے علماء نے اقبال پر بہتان تراشی یا ان کی کردار کشی کی مہم کا آغاز کیا اور بعد میں ان کی بیل گاڑی میں مختلف نوع کے دشمنان اقبال سوار ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات کے دوران

میں اقبال کے حریف نے انہی بہتانوں کا اعادہ کرتے ہوئے ان کی ذات پر کیچڑ اچھالا، اس پس منظر میں ظاہر ہے خطبۂ الہ آباد کے بعد ان کے برا چاہنے والوں میں سیاسی دشمنوں کا خوب اضافہ ہوا۔ پس مہا سبھائی ہندو پریس کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقائد رکھنے والے ترقی پسند، کانگرسی ذہنیت رکھنے والے مسلمان اور مختلف قسم کے حاسدین پر مشتمل استغاثے نے الزامات کا ایک نیا پلندہ پیش دفتر کر دیا۔ الزامات تو کئی تھے۔ انگریز کا ایجنٹ، وطن کا دشمن، سرمایہ داروں کا حامی، غریبوں کا مخالف، متعصب، فرقہ پرست، رجعت پسند، بے عمل اور مایوس انسان وغیرہ وغیرہ۔ محمد احمد خان نے اپنی معروف تصنیف ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' میں اس طویل فہرست کے تین جلی عنوانات مرتب کر کے حق وصداقت کی عدالت میں تحقیق و تلاش کی فضا میں اقبال کی نہایت موثر دادرسی کی ہے ۳۵۔ راقم اقبال کے کیس کو محمد احمد خان سے بہتر طور پر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا انہی کے دلائل کی روشنی میں ان الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

جہاں تک انگریزی دوستی کے الزامات کا تعلق ہے اس بارے میں جو دلیلیں اقبال کے مختلف مخالفین نے وضع کیں وہ یہ تھیں:

۱۔ انگریز حکام کی مدح میں یا فرمائش پر نظمیں لکھنا۔

۲۔ خلافت یا ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ نہ لینا۔

۳۔ سر کا خطاب قبول کرنا۔

۴۔ پنجاب کونسل کی رکنیت کے ذریعے انگریز کے نظام حکومت سے تعاون کرنا۔

۵۔ کونسل کے اندر برطانوی استعمار کو مستحکم کرنے کی خاطر انگریز عہدہ داروں کی تعداد میں اضافے کی خواہش کا اظہار کرنا۔

۶۔ سائمن کمیشن سے تعاون کرنا

۷۔ سر محمد شفیع جیسے برطانیہ کے حاشیہ بردار کا ساتھ دینا۔

۸۔ انگریز کے اشارے پر خطبۂ الہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور پیش کرنا۔

۹۔ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگریزی حکومت کا انہیں نامزد کرنا۔

۱۰۔ انگریز کے اشارے پر ہندو مسلم مفاہمت میں رخنہ انداز ہونا۔

ایک لحاظ سے اس الزام کی بیشتر شقوں کا جواب اقبال کے حالات بیان کرتے ہوئے پچھلے صفحوں میں یا اسی کتاب کے دوسرے حصے میں دیا جا چکا ہے۔ جہاں تک ان کا انگریز حکام کی مدح میں یا فرمائش پر اشعار لکھنے کا تعلق ہے، تو اقبال نے کئی وقتی نظمیں کہی ہیں جو خاص خاص مواقع پر انہوں نے طبعاً، اخلاقاً یا مصلحتاً تحریر کیں اور جنہیں اس قابل نہ سمجھا کہ اپنے مطبوعہ کلام میں شامل کریں۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کا تعلق سر سید کے سیاسی مکتبۂ فکر سے تھا۔ وہ کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رہ سکتے تھے لیکن ایجی ٹیشنل یا احتجاجی سیاست ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ انگریزی حکومت اور ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کی نازک سیاسی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مسلمانوں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ ایجی ٹیشنل سیاست سے گریز کریں۔ مسلمانان ہند کی جدید تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ انہوں نے جب انگریزی حکومت کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا رویہ اختیار کیا تو نقصان ہندو اکثریت کی بجائے مسلم اقلیت ہی کو اٹھانا پڑا۔ سو ایجی ٹیشنل یا کھلم کھلا جنگ اقبال کے مصالح کے بھی خلاف تھی۔ اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے ملکۂ وکٹوریہ کی وفات پر مرثیہ بعنوان ''اشک خون'' تحریر کیا۔ غلام رسول مہر اس مرثیے کے متعلق فرماتے ہیں:

اقبال نے یہ نظم بڑی حد تک ارتجالاً لکھی۔ موضوع کے باب میں کچھ عرض کرنا غیر ضروری ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ملک کے سیاسی افکار و تصورات کا جو رنگ، جو انداز اور جو اسلوب تھا، اسے جانچنے کے لیے دس پندرہ سال بعد کا یا آج کا پیمانہ استعمال کرنا اتنا

ہی غیر مناسب ہوگا جتنا کہ افلاطون یا بوعلی سینا جیسے حکیموں کی زندگی سے بچپن اور طفولیت کا عہد خارج کر دینا غیر مناسب سمجھا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں ملک کی عام جماعتوں اور قوموں کا طریق فکر ونظر وہ نہ تھا، جو بعد میں اختیار کر لیا گیا اس سلسلہ میں خواجہ حالی مرحوم کا مرثیہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو انہوں نے ملکۂ وکٹوریہ کی وفات پر لکھا اور رسالہ ''معارف'' پانی پت بابت جنوری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا[۳۶]۔

اس دور کے اقبال کی ایک اور نظم بھی ہے جو انجمن حمایت اسلام کے اجلاس ۱۹۰۲ء میں سر میکورتھ ینگ، گورنر پنجاب اور ڈبلیو۔ بل، ڈائریکٹر سر رشتۂ تعلیم، پنجاب کی آمد پر بطور خیر مقدم پڑھی گئی، کیونکہ اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ایسے حکام کی آمد سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور ویسے بھی اسے بہت بڑا اور نہایت اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا[۳۷]۔ ۱۹۱۱ء میں اقبال نے کچھ اشعار ''بیادگار دربار شاہی'' (یعنی تاجپوشی جارج پنجم) بمقام دہلی کہے جو ''زمانہ'' کانپور کے دربار شاہی نمبر دسمبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئے[۳۸]۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا یورپ میں آغاز ہوا اور عثمانی ترکیہ نے جو خلافتِ اسلامیہ کا مرکز تھا، برطانیہ کے خلاف جرمنی کا حلیف بننے کا اعلان کیا۔ اس نہایت پر آشوب زمانے میں حکامِ وقت کی ناراضگی مول لینا حکومت کی گرفت میں آ جانے کے مترادف تھا، اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ سو اقبال نے مصلحتاً عزلت نشینی اختیار کی، لیکن ۱۹۱۸ء یعنی اواخر جنگ میں وائسرائے ہند نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی اور نواب سر ذوالفقار علی خان کی وساطت سے اقبال کو اس موقع کے لیے ایک نظم تحریر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ نکل سکتی تھی، اس لیے اقبال نے مجبوراً نظم بعنوان ''پنجاب کا جواب'' لکھی اور دہلی کے مشاعرے میں جا کر پڑھی[۳۹]۔ چند ماہ بعد اختتام جنگ پر مائیکل اڈوائر، گورنر پنجاب کی صدارت میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو بریڈلا

ہال لاہور میں جشنِ فتح کی صورت میں جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خان کے ساتھ شریک ہوئے اور گورنر کی فرمائش پر اردو اشعار اور چند فارسی اشعار پڑھے۔ اردو اشعار کا کوئی تعلق جشن فتح کے موقع سے نہ تھا اور وہ ''بانگ درا'' میں نظم ''شعاعِ آفتاب'' کی صورت میں شائع بھی ہو چکے ہیں[۴۰]۔ پس اقبال نے یہ پانچ نظمیں انگریز دوستی کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ اپنے سیاسی مسلک سے مطابقت رکھتے ہوئے مصلحتاً تحریر کی تھیں۔

اقبال نے اصولی طور پر خلافت یا ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ نہ لیا کیونکہ وہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک ترکِ موالات میں شامل ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے احتجاجی یا ایجی ٹیشنل سیاست میں ملوث ہونے کے بھی خلاف تھے۔ اس کے علاوہ انہیں شبہ تھا کہ ان تحریکوں کے لیڈر گو بظاہر مسلمان تھے۔ لیکن درحقیقت مسلم قومیت کی بجائے متحدہ قومیت کے مبلغ اور ترجمان تھے۔ اقبال کے علاوہ ہندوستان میں کئی اور شخصیات بھی تھیں جنہوں نے ان تحریکوں میں حصہ نہ لیا بلکہ ان کی مخالفت کی محمد علی جناح ان تحریکات کے خلاف تھے اور انہوں نے کانگرس سے ترک تعلق محض ان تحریکات ہی کی وجہ سے کیا۔ اسی طرح پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان تحریکوں کی مخالفت کی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کو ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا۔

اقبال کو سر کا خطاب ان کی علمی و ادبی خدمات کے سبب دیا گیا۔ سر مانٹیگو بٹلر کے بیان کے مطابق اقبال کی فارسی مثنویوں اور بالخصوص ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی ترجمے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ۱۹۲۲ء میں حکومت ہند کو اقبال کے لیے کسی خطاب کی سفارش کی تھی۔ سر مانٹیگو بٹلر نے ان کے لیے کسی پرانے ایرانی یا فارسی خطاب کے احیاء کی تجویز پیش کی تھی، لیکن حکومت ہند کو خدشہ پیدا ہوا کہ اقبال کو کسی ایسے خطاب سے نوازنے سے کہیں ایسی رسم ہی نہ چل نکلے۔ لہٰذا

انہیں انگریزی خطاب دینے کا فیصلہ کیا گیا[41]۔ اقبال کے نزدیک ایسے خطابات یا دنیوی اعزازات کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ خطاب کے خواہشمند نہ تھے اور نہ اس کے لیے انہوں نے انگریزی حکومت سے کوئی سودا کیا۔ اس لیے خطاب یابی کے بعد جیسا کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے، آزادی اظہار میں کمی کی بجائے زیادہ شدت سے اضافہ ہوا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں حق کہنے سے باز نہ رکھ سکی۔

کونسل کی رکنیت اقبال نے انتخاب لڑ کر حاصل کی اور اگر وہ چاہتے تو اس رکنیت کے بل بوتے پر سر فضل حسین یا یونینسٹ پارٹی سے مستقل وابستگی پیدا کر کے بلند مراتب حاصل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کی پالیسیوں پر شدید تنقید کی اور کونسل میں ان کی آواز ایک آزاد رکن کی آواز ہی رہی۔ اگر محض کونسل کی رکنیت حاصل کرنے سے انگریز کے نظام حکومت سے تعاون کا پہلو نکلتا ہے تو عدم تعاون یا سول نافرمانی کے حامی سوراجیوں نے بھی صوبائی کونسلوں کے انتخابات میں حصہ لیا یا کونسلوں کے رکن بنے اور کانگریس نے ۱۹۳۶ء میں نہ صرف انتخابات میں حصہ لیا بلکہ انگریز کے نظام حکومت میں وزارتیں بھی تشکیل دیں۔

الزام کی اس شق کا تعلق اقبال کی کونسل میں تقریر مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۹۲۷ء سے ہے، جب انہوں نے سردار اجل سنگھ کی اس تحریک کی مخالفت کی تھی کہ سرکاری عہدوں کو کھلے مقابلے کے امتحان کے ذریعے پُر کیا جائے۔ یہ مخالفت اس بناء پر کی گئی کہ سردار اجل سنگھ کی تحریک کا مقصد متحدہ قومیت کے لبادے میں تعلیمی طور پر پسماندہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم رکھنا تھا۔ اقبال ایسا نظام چاہتے تھے جس میں مقابلے کے امتحان کے ساتھ ساتھ انتخاب یا نامزدگی کی بھی گنجائش ہو، تاکہ پسماندہ طبقے انتظامیہ سے بے دخل نہ ہو سکیں۔ لہٰذا انہوں نے طنزاً ارشاد فرمایا کہ سرکاری عہدوں کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے پُر کرنے کی بجائے اگر

برطانوی عہدہ داروں کی تعداد بڑھادی جائے تو بہتر ہوگا۔ یعنی اگر مسلمانوں کو انتظامیہ سے بے دخل کرنا مقصود ہے تو پھر سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کی بجائے انگریز عہدہ دار زیادہ تعداد میں فائز کیے جائیں تاکہ مسلمان ہندو عہدداروں کے تعصب کا نشانہ نہ بنیں۔ اگر ان کا مقصد انگریز عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ کر کے برطانوی استعمار کو مستحکم کرنا تھا تو کونسل میں ایسے عہدداروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی تحریک پیش کیوں کرتے۔ آخر بڑی بڑی تنخواہیں بھی تو انگریز عہدہ دار ہی لیتے تھے جن کی ادائیگی صوبے کے خزانے سے کرنا پڑتی تھی۔ سائمن کمیشن سے تعاون کی اصل وجہ بھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبات ماننے کو تیار نہ تھے، اس لیے فرقہ وارانہ بے اعتمادی اور بدظنی کی فضا میں کمیشن سے تعاون کے ذریعے ہی مسلمان اپنے اندیشے امیدیں اور مقاصد اس کے سامنے پیش کرسکتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی بھی، جنہوں نے آزادی کی راہ میں کئی قربانیاں دیں، سائمن کمیشن سے تعاون کے حق میں تھے۔

سرمحمد شفیع کو برطانیہ کا حاشیہ بردار سمجھا جاتا ہے، لیکن جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم رہ کر انہوں نے مسلمانوں کی جو خدمت انجام دی اس کا ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا گیا۔ سو اس امر کا فیصلہ کرنا کہ آیا ان کی سیاست انگریز کی ہوا خواہی تھی یا مسلمانوں کی بہی خواہی، مستقبل میں ان کے کسی سوانح نگار کا کام ہے۔ بہرکیف اقبال نے ان کا صرف اس حد تک ساتھ دیا جس حد تک مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا تقاضا تھا سائمن کمیشن کے لیے تیار کردہ یادداشت میں اگر صوبائی خودمختاری کا ذکر نہ آیا تو وہ سرمحمد شفیع سے الجھ گئے۔ شفیع لیگ کی سیکرٹری شپ سے استعفادے دیا۔ یہاں تک کہ سرمحمد شفیع کو یادداشت میں ترمیم کرکے اس میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ شامل کرنا پڑا، مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر سرمحمد شفیع تو کیا وہ ہر کسی سے جھگڑنے کو تیار ہو جاتے، کانگرس سے، مولانا محمد علی سے،

محمد علی جناح سے۔

اگر اقبال نے انگریز کے اشارے پر خطبۂ الہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا تو پھر ریمزے میکڈانلڈ اس خطبے پر اتنا برہم کیوں ہوا؟ اور ہندوستان میں برطانوی استعمار کے پاسبان اخباروں نے خطبے کی مذمت کیوں کی؟ مزید برآں اگر اقبال انگریزوں کے ایجنٹ تھے تو پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انہیں نامزد کیوں نہ کیا گیا؟ خطبہ الہ آباد کے خلاف جو ہمہ گیر مہم ہندو اخباروں نے چلائی تو اس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ چونکہ اقبال کو انگریزی حکومت نے گول میز کانفرنس کے سلسلے میں نظر انداز کیا تھا، اس لیے وہ انتقام پر اُتر آئے تھے۔ گویا خطبۂ الہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور انگریزوں سے بدلہ لینے کی غرض سے پیش کیا گیا۔ اگر یہی صورت تھی تو وہ انگریزوں کے ایما سے مسلم ریاست کا تصور کیونکر پیش کر سکتے تھے؟

گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ہر نمائندے کو انگریزی حکومت ہی نامزد کرتی تھی۔ مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی، اور محمد علی جناح بھی انگریزی حکومت ہی کی نامزدگی کی بنا پر گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ اسی طرح اقبال کو بھی دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کیا گیا، لیکن ان دونوں کانفرنسوں میں اقبال کا رویہ کیا رہا؟ بقول عظیم حسین وہ دوسری گول میز کانفرنس میں سر اکبر حیدری سے ریاست حیدر آباد دکن کو ڈومینین اسٹیٹس نہ دلوانے کے معاملے میں جھگڑے اور واپس آکر کھلے اجلاس میں انہوں نے حکومت برطانیہ پر شدید نکتہ چینی کی۔ نتیجے میں انگریزی حکومت اور بالخصوص وزیر ہند کو ان کی نامزدگی پر پشیمانی اٹھانا پڑی اور تیسری گول میز کانفرنس میں ان کی نامزدگی بادل ناخواستہ کی گئی ۴۲۔ مگر تیسری گول میز کانفرنس ابھی جاری تھی کہ انہوں نے اختلافات کی بنا پر اس سے استعفا دے دیا۔ ہندوستان واپس چلے آئے اور یہاں پہنچ کر پھر حکومت برطانیہ کی

شدید مذمت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو یہ یقین کبھی نہ آیا کہ ایسی ہندو مسلم مفاہمت ہو سکتی ہے جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہو، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایسی ہر کوشش میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا خیال یا جداگانہ انتخاب کا اصول چھوڑے بغیر گفت وشنید کرنے والے مسلم لیڈروں کا ساتھ دیا۔ ہندو لیڈروں نے محمد علی جناح کی تجاویز دہلی منظور کر لینے کے بعد انہیں نہرو رپورٹ میں جگہ نہ دی۔ نہرو رپورٹ میں محمد علی جناح کی ترمیمات ٹھکرا دی گئیں۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تجاویز اور چودہ نکات کا بھی بالآخر یہی حشر ہوا۔ کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء کے بعد بھی جتنی ایسی کوششیں مولانا شوکت علی یا دیگر مسلم قائدین نے کیں، بار آور ثابت نہ ہوئیں کیونکہ ہندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ کیا ان سب موقعوں پر مفاہمت میں رخنہ اندازی انگریز کے اشارے پر اقبال کی طرف سے ہوتی رہی جو ایسی گفت وشنید کرنے والی پارٹیوں میں شامل تک نہ تھے؟ اقبال نے نفسِ مفاہمت کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ البتہ مسلمانوں کے مفادات کے پیش نظر مفاہمت کے طریقِ کار پر معترض ضرور ہوئے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی انگریزی تصنیف ''ہندوستان کا مستقبل'' میں خود تحریر کرتے ہیں:

۷/ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے صدر (اس زمانے میں صدر اقبال ہی تھے) کا یہ اعلان شائع ہوا کہ اب پھر سے جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا سوال اٹھانا بہت ہی بے موقع ہوگا اور مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کو چھوڑ دیں، لیکن وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر اکثریتی فرقے کی جانب سے اس قسم کی تحریک ہو تو وہ ان قطعی تجاویز پر غور کر لیں جس میں تمام ضروری اور اہم مسائل شامل ہوں۔[۴۳]

اگر اقبال انگریز دوست ہوتے تو بڑے اہم مراتب حاصل کر کے اپنی زندگی

کو مالی اعتبار سے کامیاب بنا سکتے تھے، لیکن ان کی زندگی کا سرسری مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی انگریزوں کی ملازمت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انگلستان سے واپس آ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے، مگر کچھ مدت کے بعد ملازمت سے استعفا دے دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے پوچھا کہ استعفا کیوں دیا؟ اقبال کا جواب تھا:

میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا سا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے، اس دن سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ دل میں ٹھان لی ہے کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا[۴۴]۔

علی بخش کے بیان کے مطابق جس روز وہ استعفا دے کر واپس آئے تو اس نے پوچھا کہ نوکری کیوں چھوڑ دی۔ جواب دیا:

علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ میں اب بالکل آزاد ہوں جو چاہے کروں، جو چاہے کہوں[۴۵]۔

اسی آزادی کی خاطر انگریزی حکومت کا انڈین ایجوکیشن سروس میں پیش کردہ عہدہ قبول نہ کیا۔ قید ملازمت کے خیال سے علی گڑھ میں فلسفے کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری ٹھکرا دی۔ فرماتے ہیں:

لفٹنٹ گورنر (پنجاب) گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ سے میری سفارش کرنے پر آمادہ تھے، لیکن میں نے اپنے میلانِ طبع کے خلاف اس اسامی کی امیدواری سے دست برداری کا فیصلہ کر لیا ہے[۴۶]۔

اقبال نے شاید ایک مرتبہ کسی انگریز افسر کو ملازمت کے لیے سفارش کی خاطر لکھا۔ یہ ان کا خط محررہ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۲۵ء بنام سر جے۔ پی۔ تھامپسن ہے۔ اقبال، تھامپسن کو بخوبی جانتے تھے۔ تھامپسن ان ایام میں انڈین کونسل آف سٹیٹس کا ممبر تھا اور اس حیثیت سے اس کا واسطہ ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں سے پڑتا رہتا تھا۔ ۱۹۲۵ء کا سال اقبال کے لیے کئی پریشانیوں کا سال تھا۔ اسی سال ان پر کفر کا فتوئ لگا۔ نیز سر شادی لعل کے تعصب کا نشانہ بنے اور انہیں عدالت عالیہ کا جج نہ بننے دیا گیا۔ اس پر سر شادی لعل کے خلاف مسلم پریس نے احتجاج کیا، سر شادی لعل کا خیال تھا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ اقبال بھی اس کے خلاف احتجاج کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ سو وہ اور اس کے حواری اقبال کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے۔ یعنی اقبال کے غیر مسلم اور مسلم مخالفین نے ان کی کردار کشی کی مہم تیز کر دی۔ اقبال ان کے ہاتھوں اس قدر بیزار تھے کہ انہوں نے لاہور کو خیر باد کہہ کر کشمیر میں ملازمت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ تھامپسن کو خط اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ تحریر کیا گیا۔ لکھتے ہیں:

میں آپ کو یہ خط ایک ایسے معاملے کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس کا فوری تعلق میری اپنی ذات سے ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ایک ایسے وقت میں میری مدد کریں گے جبکہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ لاہور ہائی کورٹ میں جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس کے متعلق حکومت کے فیصلے کی خبر تو آپ نے سن لی ہو گی۔ میری یہ بدقسمتی ہے کہ لوگوں نے مجھے اس سلسلے میں خواہ مخواہ ملوث کیا۔ مسلم پریس نے اب تک یہاں جتنا احتجاج کیا ہے یا آئندہ کرے گا اس سے مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چیف جج (سر شادی لعل) کا خیال ہے کہ چند اشخاص جن میں میرا نام بھی شامل ہے اس احتجاج کی پشت پناہی کر رہے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس قسم کی سازش میں مجھے

ملوث کیا جا رہا ہے میرا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بہر حال ان حالات میں میرے لیے یہاں پر ایک وکیل کی حیثیت سے کام کرنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ خاص طور پر جب کہ مجھے ماضی میں بھی کئی ذرائع سے نقصان پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر نا قابل بیان اسباب کی بنا پر جن کا اس خط میں ذکر کرنا مناسب نہیں، میں اس ماحول سے قطعی بیزار ہو چکا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے قلم کی ایک جنبش مجھے ان تمام مشکلات سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی فیاضی اور ہمدردی پر یقین رکھتے ہوئے میں آپ کی سرپرستی کا خواہاں ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے کشمیر کی اسٹیٹ کونسل میں کوئی جگہ دلوا سکیں؟ شاید آپ کو علم ہو کشمیر میرا آبائی وطن ہے اور اس خطۂ زمین سے مجھے خاص انس ہے۔ عین ممکن ہے کہ ریاست کا نیا مہاراجہ (ہری سنگھ) اپنی حکومت میں کچھ تبدیلیاں لانے کی سوچ رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں سلسلہ جنبانی کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اگر آپ مجھے تھوڑا سا سہارا دے سکیں تو یہ میرے لیے روحانی اور مادی طور پر ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی اور میں آپ کے اس لطف و کرم کا ہمیشہ ممنون رہوں گا[۴۷]۔

خوش قسمتی سے اس زمانے میں حکومت ہند کی پالیسی یہ تھی کہ ریاستوں میں ملازمتوں کے لیے اس وقت تک سفارش نہ کی جائے جب تک کہ اسے ایسا کرنے کے لیے خصوصی طور پر کہا نہ گیا ہو۔ پس تھامسن اقبال کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے صرف یہی جواب دیا کہ اگر عہدوں کے تعین کے لیے حکومت ہند کا مشورہ طلب کیا گیا تو وہ اقبال کی درخواست کا خیال رکھے گا۔

سو اقبال کو لاہور ہی رہنا پڑا، کیونکہ آئندہ سال یعنی ۱۹۲۶ء میں صوبائی کونسل کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا یا کل ہند مسلم سیاسیات کے میدان میں ایک اہم سیاسی شخصیت کی حیثیت سے اُبھرنا ان کے مقدر میں تھا۔

اقبال کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ دولت اکٹھی کرنا یا اپنی زندگی کو آسائشوں کے ذریعے آرام دہ بنانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وکالت میں کام بھی اتنا لیتے تھے، جس کے معاوضے سے ان کے ماہ دو ماہ کے اخراجات پورے ہو سکیں مہینے میں کم از کم پانچ سو روپے تک کا کام مل جائے تو مزید نہ لیتے تھے، اور اگر کوئی موکل آ پہنچتا تو اسے اگلے ماہ آنے کو کہتے۔ پیشہ وکالت کے اخلاقی پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ ایک مرتبہ غالباً پٹنہ میں عدالت عالیہ کے سامنے کوئی اہم مقدمہ زیر بحث تھا۔ اس مقدمے میں ایک طرف سے سی۔ آر۔ داس اور دوسری طرف سے پنڈت موتی لعل نہرو اور عبداللہ سہروردی وغیرہ پیش ہوئے۔ اس مقدمے میں بعض مسودات فارسی یا عربی میں تھے، اور چند لفظوں کی تشریح متنازعہ فیہ امر بن گیا۔ سی۔ آر۔ داس وکیل سرکار تھے۔ چنانچہ انہوں نے حکومت سے اجازت لے کر اقبال کو لاہور سے اس غرض کے لیے بلوایا کہ وہ ان الفاظ کی تشریح عدالت کے سامنے پیش کریں۔ ایک ہزار روپیہ روزانہ ان کی فیس منظور ہوئی، بلکہ عدالت نے انہیں کہا کہ وہ بہار میں ایک دو ماہ تک جتنی مدت چاہیں مقدمے کی تیاری کے سلسلے میں قیام کر سکتے ہیں۔ نیز اگر کتب یا حوالے تلاش کرنے کے لیے لاہور یا کلکتے جانا پڑے تو آمد ورفت کے اخراجات بھی حکومت ادا کرے گی۔ پٹنہ میں سی۔ آر۔ داس اقبال کو لینے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور انہیں ایک مہنگے ہوٹل میں اتارا۔ ایک دن کے وقفے کے بعد سی۔ آر۔ داس انہیں ملنے آئے۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ متنازعہ الفاظ کی تشریح کے متعلق انہوں نے تیاری کر لی ہے اور اسی دن اپنا نقطۂ نظر عدالت کے سامنے پیش کر کے جلد واپس لاہور جانا چاہتے ہیں۔ سی۔ آر۔ داس نے انہیں کہا کہ یہ مقدمہ حکومت کا ہے اور اس میں اس قدر جلد اپنی رائے دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ انہیں چاہیے کہ اطمینان سے اپنے کاغذات تیار کریں، کیونکہ اس سلسلے میں دو ماہ کی مدت تک وہاں قیام کر سکتے ہیں۔ جس کے لیے انہیں ایک ہزار روپیہ روزانہ ملتا

رہے گا۔ مگر اقبال کا اصرار تھا کہ ان کی تیاری مکمل ہے اور وہ جلد از جلد اپنا بیان عدالت کے سامنے دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگلے روز انہوں نے اپنے بیان کو قطعی صورت دے دی اور اسے عدالت کے سپرد کر دیا۔ بیان عدالت میں پیش کرنے کے بعد جب لاہور واپس جانا چاہا تو بنک بند ہو چکے تھے، اور ان کی فیس نقد کی صورت میں عمال حکومت کے پاس موجود نہ تھی۔ اگر وہ ایک دن کے لیے مزید ٹھہر جاتے تو انہیں ایک ہزار روپیہ اور مل جاتا، لیکن انہوں نے اس لیے واپسی پر اصرار کیا کہ ان کا کام ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ عمال حکومت نے اِدھر اُدھر سے نقد روپیہ جمع کر کے اقبال کی فیس انہیں ادا کر دی اور وہ پہلی ٹرین سے واپس لاہور روانہ ہو گئے۔ اسی طرح ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے متعلق مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں ("آتش فشاں" لاہور شمارہ نومبر ۱۹۷۹ء صفحات ۶۲-۶۳):

ایک مرتبہ کا واقعہ سُن لیجیے جس سے اِس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال، سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی عالیشان کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے اُس نے بوریے پر سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے

میں ہی سوتے رہے۔

سو پیشہ وکالت اقبال کے لیے کوئی معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا، ساتھ مختلف یونیورسٹیوں کے لیے پرچے بناتے اور دیکھتے تھے تب کہیں جا کر اخراجات پورے ہوتے تھے۔ بعد میں کتب کی اشاعت سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ آمدنی کی بے قاعدگی یا خرچ کی تنگی کے سبب بیوی نے کئی بار ملازمت اختیار کرنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ کسی امیر گھرانے سے تعلق نہ تھا۔ بڑے بھائی کی اعانت میسر نہ ہوتی تو تعلیم بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ہندوستان میں غریب ترین نائٹ (سر کے خطاب یافتہ کو نائٹ کہا جاتا تھا) کے طور پر مشہور رتھے۔ وکالت چمکانے کے لیے احباب نے مشورہ دیا کہ حکام کی دعوتیں کیا کریں۔ مرزا جلال الدین تحریر کرتے ہیں:

ہم نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کبھی کبھی کھانے پر حکام کو اپنے یہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ اکل وشرب کی دعوت ہے...... مگر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہمارے مشورے قابل قبول نہ ہوتے۔ وہ یہی جواب دیتے کہ وہ ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی ان کی دلچسپیوں کے دائرے سے باہر تھا۔[۴۸]

عظیم حسین شکایتاً اپنے والد کی بائیوگرافی میں لکھتے ہیں کہ سر فضل حسین نے اقبال کی زندگی مالی طور پر کامیاب بنانے کے لیے بارہا کوششیں کیں لیکن اقبال نے اُن مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اُن کوششوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ ۱۹۲۴ء میں سر فضل حسین نے سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) سے سفارش کی کہ اقبال کو ہائی کوٹ کا جج بنا دیا جائے۔ مگر ابھی معاملہ زیر غور تھا کہ اقبال نے حکومت پر بے لگام تنقید کر کے سرکاری حلقوں کی ہمدردیاں کھودیں۔

۲۔ ۱۹۲۷ء میں مستقبل میں آنے والی دستوری اصلاحات کے سلسلے میں مسلمانوں

کے مطالبات وزیر ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک مسلم وفد کو انگلستان جانا تھا۔ سر فضل حسین نے اقبال سے اس وفد کی قیادت کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

۳۔ ۱۹۳۱-۳۲ء کی گول میز کانفرنسوں سے واپسی پر چونکہ اقبال نے حکومت برطانیہ پر شدید نکتہ چینی کی تھی، اس لیے سر فضل حسین کی کوششوں کے باوجود حکومت ہند نے انہیں فیڈرل سٹرکچر کمیٹی کا رکن مقرر کرنے یا جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح وائسرائے نے سر فضل حسین کی کوششوں کے باوجود اقبال کو پبلک سروس کمیشن کا ممبر بنانے سے انکار کر دیا۔

۴۔ ۱۹۳۳ء میں فضل حسین نے تجویز کیا کہ اقبال کو حکومت ہند کے ایجنٹ کے طور پر جنوبی افریقہ بھیج دیا جائے، مگر اقبال نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کی بیوی پردہ کرتی تھیں، اور مخلوط محفلوں میں شریک نہ ہو سکتی تھیں۔ ۵۰

اقبال کی تمام زندگی معاشی تنگی ہی میں گزری۔ آخری چند سالوں میں علالت کے سبب وکالت چھوٹ گئی تھی۔ بیوی فوت ہو چکی تھی اور گھر کے اخراجات کے علاوہ دو نابالغ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ سر فضل حسین نے میاں امیر الدین کو تحریر کیا کہ میں نے سنا ہے اقبال بیمار ہیں اور مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے مطلع کیجیے کہ ان کی صحت مالی حالت اور پیشۂ وکالت سے آمدنی کی کیا صورت ہے۔ میاں امیر الدین نے اُنہیں جواب دیا کہ اقبال وکالت ترک کر چکے ہیں۔ اُن کی صحت اور مالی حالت خراب ہے اور اُن کی آواز بڑی سرعت کے ساتھ بیٹھتی چلی جا رہی ہے۔ عظیم حسین، اقبال کی ناکام دنیادارانہ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

درحقیقت ڈاکٹر اقبال سیاست دان نہ تھے۔ وہ تو سیاسی فلسفی یا آئیڈلسٹ تھے اور یہ

نہ سمجھ سکے کہ سیاسیات حالات کے ساتھ مصالحت کا ایک کھیل ہے وہ کوئی بلند عہدہ حاصل کرنے یا سیاسی لیڈر بننے میں اس لیے ناکام رہے کہ ایک معاملات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کی بجائے وہ محض شاعر اور مفکر تھے۔ ۵۱

خیر یہ تو اقبال کی ناکام زندگی کے متعلق عظیم حسین کی رائے تھی۔ محمد احمد خان کا سوال غور طلب ہے۔

کیا انگریز کے ہوا خواہوں اور سرکار کے نیاز مندوں کی زندگی کا بھی یہی حال رہا ہے؟...... مگر اس کے باوجود نکتہ چین اور معترضین یہی کہتے رہے کہ اقبال برطانیہ کا ہوا خواہ، انگریز کا نیاز مند اور امپریلزم کا ایجنٹ ہے۔ واہ رے سرکار کے اقبال۔ ۵۲

ایسا سوچنے والے ایک نہیں کئی تھے۔ مسلم ہند کے برگزیدہ عالم مولانا حسین احمد مدنی بھی تمام عمر اقبال کو غلط فہمیوں کا شکار اور ''ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا سمجھتے رہے۔ ۵۳

البتہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے مختلف تھی۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

انگریزی سیاست سے ان کو خیال اور عمل دونوں میں سخت نفرت تھی۔ بارگاہ حکومت سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ سرکار اور اس کے پرستار دونوں سے سخت بدگمان تھے اور ان کی ذات کو اپنے مقاصد میں حارج سمجھتے تھے۔ سیاست میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں دارالاسلام کو اپنا حقیقی مقصود بنائے ہوئے تھے۔

صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبوراً تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقے میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اِس طبقے کے ساتھ جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں دارالسلام کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح بھڑک نہ اٹھے وہ اس کے

لیے سرفروشانہ جدوجہد پر آمادہ نہ ہوں، اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رخ کو بالکل دوسری جانب پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔ اس بنا پر انہوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوانان اسلام کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی، جس سے سب لوگ واقف ہیں اور دوسری طرف عملی سیاسیات میں وہ روش اختیار کی۔ جس کے اصل مقصود سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقف نہیں اور جس کے بعض ظاہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدت مند معترضین کے طعنے سنتے رہے۔[54]

اقبال کے خلاف دوسرا بڑا الزام یہ تھا کہ وہ ایک متعصب فرقہ پرست تھے۔ یہ الزام ان کی شاعری اور سیاست دونوں پر لگایا گیا۔ دلیل یہ تھی کہ قیام انگلستان کے دوران میں جب اقبال ذہنی و قلبی انقلاب سے گزرے اور ان کی شاعری نے کلی طور پر اسلام کا رُخ اختیار کیا تو وہ اس دور ہی سے ایک متعصب فرقہ پرست بن گئے تھے۔ گویا اسلامی عصبیت قبول کرتے ہی ان کے دل میں ہندوؤں کے خلاف تعصب نے گھر بنا لیا تھا۔ اگرچہ تعصب اور عصبیت کا آپس میں لفظی تعلق ہے لیکن دونوں اصطلاحیں اپنے مفہوم میں لازم و ملزوم نہیں۔ اقبال ایک خط میں عصبیت اور تعصب میں امتیاز کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

عصبیت اور چیز ہے اور تعصب اور چیز ہے۔ عصبیت کی جڑ حیاتی ہے اور تعصب کی نفسیاتی۔ تعصب ایک بیماری ہے جس کا علاج اطباء روحانی اور تعلیم سے ہو سکتا ہے۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے، جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی عصبیت دونوں کے حدود مقرر ہیں۔ انہی کا نام شریعت ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے بلکہ ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ان حدود کے اندر رہنا باعث فلاح ہے اور ان سے تجاوز کرنا بربادی[55]۔

خطبۂ الٰہ آباد میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

فرقہ پرستی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ جو فرقہ دوسرے فرقوں کے لیے بدخواہی کے جذبات رکھتا ہو۔ وہ نیچ اور کمینہ فطرت ہے۔ میں دوسرے فرقوں میں رسوم، قوانین، مذہبی اور معاشرتی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں اور یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ضرورت پڑنے پر ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے، اس کے باوجود مجھے اس فرقے سے محبت ہے جو میری زندگی اور کردار کا سرچشمہ ہے اور جس نے مجھے اپنا مذہب، ادب، فکر اور تمدن دے کر میری تشکیل اس صورت میں کی ہے جیسا کہ میں ہوں اور اس طرح اپنے سارے ماضی کی تعمیر نو کر کے اسے میرے شعور میں ایک زندہ و فعال عنصر بنا دیا ہے۔ ۵۶

اقبال کے دوستوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو اور سکھ بھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے تمام عمر ان کے گہرے روابط قائم رہے۔ یہاں تک کہ وہ اقبال سے اپنی بیٹیوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں مشورہ بھی کرتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں اقبال تحریر کرتے ہیں:

مجھے جو خلوص سرکار سے ہے، اس کا راز معلوم کرنا مشکل نہیں۔ یہ راز مضمر ہے اس دل میں، جو اللہ تعالےٰ نے آپ کو بخشا ہے، سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے۔ مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے۔ ۵۷

اسی طرح سوامی رام تیرتھ کے ساتھ ان کی زندگی بھر مخلصانہ تعلقات قائم رہے، اور ان کی وفات پر اقبال نے ایک دل آویز نظم لکھی۔ پنڈت شیو نارائن شمیم اپنی نظموں کی اصلاح ان سے لیتے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو کے وہ مداح تھے۔ اور نہرو خاندان، بالخصوص پنڈت جواہر لعل نہرو سے تو واقعی محبت کرتے تھے۔ راقم نے اپنی آنکھوں سے انہیں پنڈت جواہر لعل نہرو سے شفقت کا اظہار کرتے دیکھا ہے۔ شاید اُس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان پنڈت جواہر لعل نہرو کی وسیع النظری، آزاد خیالی اور

اعتدال پسندی کی بنا پر اقبال نے ان کی ذات کے ساتھ بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، یا ممکن ہے محبت و شفقت کا ایک پہلو یہ بھی ہو کہ پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے خاندان کا تعلق اقبال کی طرح وادی کشمیر سے تھا۔ سکھوں میں سر جوگندر سنگھ اور امراؤ سنگھ شیر گل سے بہت قریبی مراسم تھے۔ اور راجکماری بامبا کی اس لیے عزت کرتے تھے کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں۔ گھر کے نجی ماحول میں اقبال نے راقم کی ابتدائی تعلیم کے لیے اسے ایک ہندو استاد جناب ماسٹر تاراچند کے سپرد کر رکھا تھا، جن پر انہیں بہت اعتماد تھا۔ زندگی کے آخری چار پانچ سالوں میں اقبال کے معالج ایک ہندو ڈاکٹر جمیعت سنگھ تھے۔ اور اقبال کی وفات کے بعد جب تک وہ زندہ رہے، بغیر کسی معاوضے کے خاندان اقبال کی خدمت کرتے رہے۔ میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ ایک بوسیدہ کوٹھی تھی، جس کا ایک سو تیس روپے کرایہ ادا کرتے تھے۔ کسی نے سوال کیا کہ اتنے گراں کرائے میں تو بہت نفیس کوٹھی مل سکتی ہے جواب دیا: ٹھیک ہے، مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ کوٹھی دو ہندو یتیم بچوں کی وراثت ہے۔ میرے چلے جانے سے ان کو بہت تکلیف ہوگی۔ اتنا کرایہ شاید اور کوئی نہ دے"۔ ۵۸

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کو اپنی دنیادارانہ زندگی میں جسٹس سر شادی لعل جیسے متعصب ہندو کے ہاتھوں کچھ نقصان پہنچا، لیکن اس قسم کا نقصان، ذہنی کوفت یا اذیت تو انہیں بعض علماء اور مسلم حاسدین بھی باقاعدہ پہنچاتے تھے۔ جہاں تک اقبال کی اپنی زندگی کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جو یہ ثابت کرے کہ ان کے ہاتھوں محض تعصب کی بنا پر کسی ہندو یا سکھ کو کوئی گزند پہنچی ہو۔ خیر یہ تو اقبال سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھنے والے ہندو یا سکھ افراد کی باتیں ہیں۔ انہیں ہندوؤں سے من حیث القوم یا فرقہ بھی کوئی تعصب دشمنی یا عناد نہ تھا، بلکہ ان کی ترقی اور کامیابی پر خوش ہوتے تھے۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں تحریر کرتے

ہیں:

براہ کرم یہ نہ سمجھیے کہ مجھے ہندوؤں سے کوئی تعصب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حالیہ سالو ں میں ایثار وجرأت کی جو اسپرٹ انہوں نے دکھائی ہے، اس کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔انہوں نے زندگی کے میدان میں ممتاز افراد پیدا کیے ہیں اور معاشی اور معاشرتی راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں۔۵۹

اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی اوتاروں اور بانیوں سے انہیں دلی عقیدت تھی۔رام چندر جی کی مدح میں نظم لکھی اور انہیں امام ہند، چراغ ہدایت او رملک سرشت کہا۔اسی طرح بابا گورونانک کو پیغامبر توحید وحق،توحید پرست اور نور ابراہیم کہہ کر خطاب کیا۔گوتم بدھ کو بھی پیغامبر کا مرتبہ دیا۔رام چندر جی کی مدح میں نظم تو بالآخر کفر کے فتوے پر منتج ہوئی۔''رامائن''اور''گیتا'' کا منظوم اردو ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔مثنوی''اسرار خودی'' کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ منسلک دیباچے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کے دشمن کبھی بھی نہ تھے۔بلکہ اُنہوں نے ہندو ادبیات اور مابعد الطبیعیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور وشوامتر یا بھر تری ہری کے علاوہ سری کرشن اور رامانج ایسی عظیم ہستیوں سے تو نہ صرف عقیدت تھی بلکہ ایک طرح کی محبت تھی۔اقبال جس اسلام پر ایمان رکھتے تھے اس میں تعصب کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔جگن ناتھ آزاد نے ان کے عقیدۂ اسلام پر بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔لکھتے ہیں:

ترک عمل کا فلسفہ......جسے اقبال نے جا بجا غیر اسلامی تصوف کا نام دیا ہے،ضروری نہیں کہ یہ فلسفہ شری شنکر اچاریہ ہی نے پیش کیا ہو۔جب اس خیال سے محی الدین ابن عربی اندلسی قرآن حکیم کی تفسیر کرتے ہیں تو اقبال اسے بھی غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔اس تمیز میں ہندو مسلمان کی وہ قید نہیں جو عصر حاضر کے اس ترقی یافتہ دور میں ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔اقبال کے یہاں لفظ اسلام اپنے حقیقی معنوں

میں استعمال ہوا ہے اور ان معنی میں استعمال نہیں ہوا جس میں آج کی سیاست اسے استعمال کر رہی ہے۔ اقبال کے سارے کلام میں اسلام سے مراد امن و سلامتی اور صالح ذوق، جدو جہد و عمل کی تلقین ہے اور یہی سبب ہے کہ جہاں آپ نے شری شنکر، شیخ اکبر اور خواجہ حافظ کے خیالات کو غیر اسلامی کہا ہے، وہاں سری کرشن اور رامانج کے افکار کو غیر اسلامی نہیں کہا بلکہ ان افکار کی تائید کی ہے اور انہیں برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے:۶۰

اقبال نے خود کہا ہے:

اسلام اور مسلم میرے لیے خاص اصطلاحات ہیں، جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لیے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔۶۱

اقبال کے ہاں مذہب کا تصور، ہندوؤں یا قدیم یونانیوں اور مصریوں کے مذہب کی طرح قومی ہے نہ یہودیوں کے مذہب کی طرح نسلی، نہ عیسائیوں کے مذہب کی طرح نجی، ذاتی یا انفرادی۔ ان کا تصور اسلام خالصتاً انسانی ہے بالفاظ دیگر وہ اسلام کو ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ کا ایک اصول سمجھتے تھے۔ اور مسلمانوں کو وہ جماعت جو اس اصول کی علمبردار ہو۔ لیکن انہیں متعصب فرقہ پرست ثابت کرنے کے لیے معترضین کتنی دور کی کوڑی لائے؟ اس کی ایک مثال محمد احمد خان دیتے ہیں: ڈاکٹر سچد انند اپنی انگریزی تصنیف ''اقبال بحیثیت شاعر اور اس کا پیغام'' میں تحریر کرتے ہیں کہ نظم ''ہندوستاں ہمارا'' اس لیے قوم پرستی کے جذبات سے خالی ہے کہ اس میں اقبال نے فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور نظم ''نیا شوالہ'' میں انہوں نے برہمن کی بت پرستی پر طنز کر کے ہندوؤں کے خلاف اپنے تعصب کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اقبال کے ہاں فارسی کوئی مذہبی زبان نہ تھی اور ''نیا شوالہ'' میں وہ برہمن کے بت او رواعظ کے خدا دونوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل اقبال کی شخصیت پہلو دار تو تھی، مُعمانہ تھی۔ لیکن ہندوستان میں اسے معما بنا دیا گیا۔ ہندوؤں نے انہیں

متعصب مسلم قوم پرست سمجھا اور مسلمانوں کے بعض حلقوں نے انہیں کافر گردانا۔
شاید اسی احساس کے تحت اقبال اپنے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلمان ہوں ہیں ۶۲

بہرکیف ان میں اسلامی عصبیت ضرور تھی اور اپنی جماعت یا فرقے سے وہ محبت کرتے تھے، لیکن دوسروں سے نفرت نہیں۔ ان کی آرزو تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنا اپنا قومی تشخص قائم رکھتے ہوئے ترقی کریں۔ مثنوی ''اسرار خودی'' میں پیش کردہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:
میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطباء کو اپنے مریض کا اصل مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا...... اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نقطۂ خیال کی اصلاح کی جائے۔ ۶۳

اقبال نے مسلم ریاست کا تصور اس لیے پیش نہیں کیا تھا کہ وہ ہندوؤں سے کوئی بغض یا عناد رکھتے تھے وہ برصغیر کے سیاسی حالات کے ذاتی مشاہدے اور تجربے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دونوں مذہبی فرقوں میں اشتراک اقتدار کا کوئی قابل قبول سمجھوتا ہو سکنا ممکن نہیں۔ دو بھائیوں میں اگر اتفاق نہ ہو تو وراثت تقسیم کرنا پڑتی ہے۔ یہ انسان کی خاندانی یا اجتماعی زندگی کا خاصہ ہے۔ مسلم ریاست کے تصور سے قبل مہا سبھائی لیڈروں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے بدظن کرنے کے لیے مشہور کر رکھا تھا کہ اگر برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں کا بلاک بن گیا تو وہاں کے مسلمان مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک سے ملکر ہندوستان پر دباؤ

ڈالیں گے اور ماضی کی طرح ممکن ہے پھر ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ لیکن آج سے نصف صدی پیشتر اقبال کو احساس تھا کہ ہندو لیڈروں کا اندیشہ بے بنیاد ہے اور اگر ہندوستان کو کسی نظریاتی یا عسکری حملے کا خطرہ ہے تو مسلم ممالک سے نہیں بلکہ وسطی ایشیا یا سوویٹ روس کی جانب سے ہے، جو زاروں کے عہد سے جنوبی سمندروں کے گرم پانیوں تک پہنچنے کا آرزومند رہا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر مسلم ریاست کا تصور پیش کرتے وقت اقبال نے واضح کیا کہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے اس کا مطلب اندرونی توازن قوت کے باعث، امن اور سلامتی ہوگا اور جہاں تک بیرونی حملے کا تعلق ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک بری، فضائی اور بحری افواج برصغیر کے دفاع کے لیے اس کی سرحدوں پر متعین کی جاسکتی ہیں۔ اگر اقبال ایک متعصب فرقہ پرست تھے یا ہندوؤں کے دشمن تھے تو برصغیر کے تحفظ کے لیے مشترکہ دفاع کا تصور پیش کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔

تیسرا الزام یہ ہے کہ وہ ایک بے عمل اور مایوس انسان تھے۔ اس الزام کی دو شقیں ہیں۔

۱۔ اقبال بنیادی طور پر شاعر و مفکر تھے اس لیے ان کی سیاست بے عملی کی سیاست تھی۔ دراصل وہ سیاست دان نہ تھے۔

۲۔ مسلم ریاست کا تصور اقبال کی ذہنی مایوسی کی پیداوار تھا۔

جہاں تک اس الزام کی پہلی شق کا تعلق ہے، وہ سیاست دان کے اس تصور پر قائم ہے جو ہندوستان میں عموماً مقبول رہا ہے۔ عملی سیاست میں اس کی دو تصویریں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرے، احتجاجی جلوسوں یا مظاہروں میں شریک ہو۔ اخباروں میں بیانات داغے، حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرے یا ان کی مخالفت کرے۔ عدم تعاون، سول نافرمانی، ترک موالات، عدم تشدد کے ذریعے اپنے مطالبات منوائے۔ مار کھائے گرفتار ہو، سزایاب ہو یا نظر

بند کر دیا جائے، جیل میں بھوک ہڑتال کرے وغیرہ۔ دوسری تصویر یہ ہے کہ جلسوں میں تقریریں کرے۔ اخباروں میں بیانات دے، کبھی حکومت پر تنقید کرے لیکن کبھی اس کی تعریف بھی کر دے، روپیہ خرچ کر کے پارٹی بنائے، انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے اسمبلی کی نشستیں قابو کرے اور وہاں یا تو کسی سیاسی جماعت سے ساز باز کر کے یا حکومت کے ساتھ سازش کر کے کوئی نہ کوئی اہم منصب حاصل کر لے۔ اقبال کی سیاست چونکہ ان دونوں تصویروں میں کسی ایک کے ساتھ بھی مطابقت نہ رکھتی تھی اور مزید برآں چونکہ گوشہ نشینی بھی ان کے مزاج یا ان کی افتاد طبع کا ایک وصف تھی، اس لیے معترضین نے انہیں نہ صرف بے عمل ہونے کا طعنہ دیا بلکہ یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ وہ سرے سے سیاست دان ہی نہ تھے۔

اقبال کی گوشہ نشینی کی عادت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ان سے جب پوچھا گیا۔ کہ آپ اشعار تو بڑے جوشیلے کہتے ہیں، لیکن عملی جدوجہد نہیں کرتے تو ان کا جواب تھا شعر کہتے وقت میں عالم علوی میں ہوتا ہوں لیکن ویسے میرا تعلق عالم اسفل سے ہے۔ اس لیے میرے اشعار اور میرے عمل میں کیونکر مطابقت ہو سکتی ہے [۶۴]۔ جب مولانا محمد علی نے طنزاً کہا کہ میاں اقبال! ہم تو تمہارے اشعار پڑھ کر جیل چلے جاتے ہیں لیکن تم ویسے کے ویسے ہی گھر میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے ہو۔ تو جواب دیا: قوال گاتا ہے، اور سننے والے وجد میں آ کر ہوحق کرتے ہیں، ناچتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں، لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہونے لگیں تو قوالی ہی ختم ہو جائے [۶۵]۔ گھر سے باہر قدم رکھنا ان کے لیے ایک عذاب ہوتا تھا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ یا سیاسی استحکام کی خاطر عملی سیاسیات میں حصہ لیا، یعنی عزلت نشین اقبال کو اپنی افتاد طبع کے خلاف اگر کوئی سیاسی ہنگاموں میں کھینچ لانے کا محرک ہوا تو مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یا ان کے سیاسی استحکام کا جذبہ تھا۔ ۱۹۲۶ء سے لیکر ۱۹۳۴ء تک انہوں نے برصغیر کی مسلم

سیاسیات میں عملی جدوجہد کی اور اس کے بعد علالت کے دور میں بھی جوان کی زندگی کے بقیہ چار برس تک مسلسل طاری رہا، بے عملی کے طعنوں سے بے پرواہ بستر مرگ پر لیٹے لیٹے بلکہ آخری دم تک مسلم قائدین کو اسلامی ریاست کی تجویز قبول کر لینے پر آمادہ کرتے رہے اور جب کسی نے ان کی خدمات کو سراہنے کی کوشش کی تو عجز و انکسار سے فقط یہی کہا:

میں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ میری خدمتِ اسلامی تو بس اس قدر ہے جیسے کوئی شخص فرطِ محبت میں سوتے ہوئے بچے کو بوسہ دے۔٦٦

سید نذیر نیازی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

انہیں اپنی قوم سے بے عملی کے طعنے سننے پڑتے، حالانکہ ان کے نکتہ چین اس امر کو فراموش کر دیتے کہ ان کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے اور اگر عمل کے معنی ہیں نصب العین حیات کے لیے ترغیبات و ترہیبات دنیوی کے باوجود ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کی بالا رادہ پرورش، تو حضرت علامہ کسی صاحب عمل سے پیچھے نہ تھے۔٦٧

الزام کی دوسری شق سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ اقبال چونکہ ہندو مسلم مفاہمت سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے مایوسی کے عالم میں مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ یعنی اگر کوئی قابل قبول ہندو مسلم سمجھوتا ہو جاتا تو مسلم ریاست وجود میں لانے کی ضرورت پیش نہ آتی، لہٰذا مسلم ریاست کا تصور کسی نظریاتی اساس پر قائم نہیں بلکہ ایک شاعر کی مایوسی اور نا امیدی کی پیداوار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا منفی پہلو نکالا جا سکتا ہے۔ اور اس کا انحصار معترض کی اپنی ذہنیت پر ہے کہ وہ کس حد تک بیمار ہے جو لوگ فکر اقبال سے بخوبی شناسا ہیں انہیں علم ہے کہ اقبال قنوطیت کے قائل نہ تھے بلکہ رجائیت پسند تھے اور ان کے ہاں مستقبل یا تقدیر کی کوئی متعین صورت نہیں ہے، صرف امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے

وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے کہ نہ آئیں۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبے ایک دوسرے کے ساتھ ملحق ہیں اور ان کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی مصلحت کے لیے یکجا رکھا ہے، سو انہوں نے مسلم ریاست کے لیے ایک فکری یا نظریاتی اساس بھی ترتیب دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۷ء سے لے کر ان کی وفات تک جاری رہا۔ مدعا یہ تھا کہ اگر بالآخر مسلم ریاست وجود میں آتی ہے تو اس کے لیے فکری یا نظریاتی اساس پہلے ہی سے موجود ہو۔ گویا انہوں نے اس کے وجود میں آنے کے امکان کی بنا پر اسکے لیے تقریباً تیس برس کی مدت میں نظریاتی اساس فراہم کر دی تھی۔ تیس برس یا اقبال کی نصف عمر پر پھیلا ہوا یہ تخلیقی اور تعمیری عمل کیا ان کی قنوطیت، مایوسی یا نا امیدی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اقبال کے معترضین بالخصوص پنجاب کے ہندو پریس نے ان پر ہمیشہ یہ الزام لگایا کہ اقبال ہی وہ خوفناک مسلمان ہے جو ہر مرحلے پر ہندو مسلم مفاہمت میں رخنہ انداز ہوتا ہے۔ اگر اس الزام کو لحظہ بھر کے لیے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے؟ یہی کہ وہ کسی صورت میں بھی ہندو مسلم مفاہمت کے خواہشمند نہ تھے۔ ان کا نصب العین مختلف تھا یا وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کو مسلم ریاست کی طرف لے جانے کے لیے فکری اور عملی جدوجہد میں مصروف تھے۔ پس دونوں صورتوں میں اقبال کے نقطۂ نظر سے مسلم ریاست کے قیام میں مایوسی یا نا امیدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ہندوستان میں اور انگلستان کے بعض حلقوں میں اقبال کے خطبۂ الہ آباد پر تبصرے جاری رہے۔ ۱۹۳۱ء کے چند ابتدائی مہینوں میں زور شور کچھ زیادہ ہی تھا، لیکن ۱۹۳۲ء تک بات آئی گئی ہو گئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے تقریباً دو سال بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے قرار دار لاہور (جسے بعد میں قرار دار پاکستان کا نام دیا گیا) منظور کی اور اقبال کا خطبۂ الہ آباد پھر

موضوع بحث بن گیا۔ اسے کئی اداروں نے دوبارہ شائع کیا اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوا۔ اقبال کی وفات کے بعد اس نئی بحث میں چند پرانے سوال اٹھائے گئے جو اقبال کی زندگی میں بھی زیر بحث آئے تھے، لیکن بعض سوال نئے تھے۔ سوال یہ تھے:

۱۔ کیا اقبال نے ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی یا وہ اسے ایک آزاد اور مقتدر مسلم مملکت کی صورت میں قائم دیکھنا چاہتے تھے۔

۲۔ اقبال نے خودمختار مسلم ریاست کی تجویز پیش کی تھی لیکن بعد میں اسکی لغویت کو محسوس کرتے ہوئے اس سے انحراف کیا۔

۳۔ اقبال تنہا مسلم ریاست کے تصور کے خالق نہ تھے بلکہ ان سے قبل کئی ہندو، مسلم انگریز یا دیگر شخصیتوں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے اسی قسم کی تجاویز پیش کررکھی تھیں اور اقبال ان شخصیات میں سے ایک تھے۔ یہ سوال قیام پاکستان کے بعد بالخصوص پاکستان میں اٹھایا گیا۔ اس کا تعلق بظاہر تو علمی تحقیق سے تھا، لیکن جیسا کہ واضح کیا جائے گا، اس کے پس منظر میں بعض مخصوص سیاسی مصلحتیں بھی برسر عمل تھیں۔

مسلم لیگ نے قرارداد لاہور میں چونکہ برصغیر کے شمال مغرب اور مشرق کے مسلم اکثریتی خطوں میں آزاد اور مقتدر مسلم ریاست یا ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اس لیے اس کی تعبیر دس سال قبل مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے اقبال کے خطبۂ الہ آباد کی روشنی میں کی گئی۔ ہندو لیڈروں میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے خطبۂ الہ آباد کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی انگریزی تصنیف ''منقسم ہندوستان'' میں تحریر کیا کہ اقبال نے تو ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ۶۸۔ یہی موقف آر۔ کوپ لینڈ نے بھی اپنی تصنیف ''ہندوستانی سیاست ۱۹۳۶ء

تا ۱۹۴۲ء'' (انگریزی) میں اختیار کیا۔۶۹

ہندو لیڈروں اور ان کے نقطۂ نظر کے حامی انگریزوں نے یہ موقف اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ ثابت کیا جاسکے کہ مسلم لیگ نے پہلے خود ہی مسلم اکثریتی ریاستوں کے قیام کا مطالبہ ہندوستان کے وفاق کے اندر کیا تھا اور اب بغیر کسی وجہ کے آزاد اور مقتدر پاکستان کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ گویا مسلم لیگ کے مطالبوں میں تضاد تھا یا مسلم سیاسی رہنماؤں کو خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے، اس لیے ایک ہی سانس میں کبھی کچھ مطالبہ کرتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ہندو لیڈروں اور ان کے انگریز حامیوں نے ایک اور غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی اور وہ یہ تھی کہ اقبال نے گو برصغیر میں خود مختار مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی، مگر بعد میں اس کی لغویت کا احساس کرتے ہوئے اس تجویز کو واپس لے لیا تھا یا اس سے منحرف ہو گئے تھے۔ یہ من گھڑت افسانہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے پروفیسر اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کے نامہ نگار اور ہندو کانگرس کے زبردست حامی ایڈورڈ ٹامسن کے ذہن کی اختراع تھا۔ اس نے کتاب بعنوان ''ہندوستان کو آزادی کے لیے تیار کرو۔'' (انگریزی) میں جولندن سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تحریر کیا:

چند سال سے ہندوستان کے ایک حصے کو قطع کر کے مسلم ریاست بنانے کے لیے ہاچل مچی ہوئی ہے۔ اس ہنگامے کی ابتداء کس نے کی، یہ معاملہ قدرے متنازع فیہ ہے۔ عام طور پر اس کا محرک ایک شاعر سر محمد اقبال کو قرار دیا جاتا ہے۔ آبزرور، میں ایک مرتبہ میں نے لکھا تھا کہ انہوں نے پاکستان منصوبے کی حمایت کی تھی۔ اقبال میرے ایک دوست تھے اور انہوں نے میرے غلط تصور کی اصلاح کر دی۔ پہلے انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لیے تباہ کن ہے۔ ہندو فرقے کے لیے تباہ کن ہے اور

مسلم فرقے کے لیے تباہ کن ہے آخر میں انہوں نے کہا، لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں اس لیے میرا فرض ہے کہ اس تجویز کی حمایت کروں ۷۰۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۴۲ء میں اسی مصنف نے ایک اور کتاب بعنوان ''عصر حاضر کے ہندوستان میں اخلاقی تخیلات'' (انگریزی) شائع کی، جس میں لکھا:

اقبال بیک وقت ایک فلسفی، شاعر، عالم دین اور سیاستدان تھے۔ انہیں اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے ۷۱۔

قطع نظر اس کے کہ یہ جھوٹ اقبال کی وفات کے دو یا چار سال بعد بولا گیا جبکہ اقبال خود اس کی تردید کرنے کے لیے موجود نہ تھے، ان تحریروں میں سے ایک میں تو ایڈورڈ ٹامسن یہ دعوے کرتا ہے کہ اقبال نے اسے ایک ملاقات میں یہ بات کہی اور دوسری میں ان کے ایک خط کا حوالہ دیتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں شائع نہیں کیا۔ علاوہ ازیں پہلی تحریر میں وہ بیان کرتا ہے کہ گفتگو کے دوران میں اقبال نے اسے آخر میں کہا: لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں اس لیے میرا فرض ہے کہ اس تجویز کی حمایت کروں۔ اقبال تو صرف ایک بار مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تھے ۔یعنی دسمبر ۱۹۳۰ء میں جب انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں اپنا خطبہ پڑھا تھا۔ اس وقت مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان نہ تھا، بلکہ چودہ نکات تھے اور مسلم ریاست کے قیام کی جو تجویز اقبال نے تب پیش کی وہ ان کی ذاتی تجویز تھی۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی کے خلاف پاکستان کے قیام کی تجویز کی حمایت کرنے پر کیونکر مجبور ہو سکتے تھے۔

خطبۂ الہ آباد کے بعد جب اقبال ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو اسی ایڈورڈ ٹامسن نے ''لندن ٹائمز'' مورخہ ۳

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ''پان اسلامی سازش'' کے زیر عنوان ایک مراسلہ میں خطبہ الہ آباد میں اقبال کی پیش کردہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

جو کوئی بھی یہ کہتا ہے کہ ہندوؤں کا کیس (جو نہایت بری طرح سے پیش کیا جا رہا ہے) ہمدردانہ غور کا مستحق ہے، اس پر مسلمانوں کے مخالف ہونے کی مہر لگ جاتی ہے۔ لہٰذا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس جمہوریت کی تعریف کرتا ہوں جو آغا خان کو ہندومت کے مقابلے میں اسلام میں نظر آتی ہے اور میرا خیال ہے وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ واضح کرتے کہ انسانی اخوت کی تعلیم کو روبہ عمل لانے میں اسلام عیسائیت پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ (اگر ان کا اخلاق آڑے نہ آتا) میں ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلمانوں کے فرقہ وار صوبوں کے قیام کی مخالفت نہیں کر رہا، لیکن سر محمد اقبال تو ان کی کنفیڈریشن ہندوستان کی فیڈریشن کے ''اندر یا اس کے باہر'' قائم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ذرا نقشہ پر نگاہ ڈالیے کہ بقیہ ہندوستان کے لیے کس قسم کی قابل دفاع سرحد رہ جاتی ہے[۴۷]۔

اس کے جواب میں اقبال کا ایک خط بعنوان ''شمال مغربی مسلم صوبے'' لندن ٹائمز'' مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے تحریر کیا:

''آپ کے ۳ اکتوبر کے پرچے میں ڈاکٹر ای۔ ٹامسن نے میرے صدارتی خطبے کا، جو میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے گذشتہ دسمبر کے اجلاس میں پڑھا تھا، مندرجہ ذیل حصہ سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے ''پان اسلامی سازش'' کا ثبوت فراہم کرنے کی غرض سے پیش کیا ہے:

میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ شمال مغربی سرحد، سندھ اور بلوچستان کو یکجا کر کے ایک واحد ریاست بنا دی جائے، خود مختار حکومت، برطانوی سلطنت کے اندر ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم ریاست کی تشکیل، مسلمانوں، کم از کم شمال مغربی کے مسلمانوں کے لیے

بالآخر مقدر ہو چکی ہے۔

کیا میں ڈاکٹر ٹامسن کو یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے برطانوی سلطنت سے باہر مسلم ریاست کا مطالبہ پیش نہیں کیا ہے، بلکہ دھندلے مستقبل میں ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی کے متعلق یہ ایک تخمینہ ہے جو برصغیر ہند کے مقدر کی اس وقت صورت گری کر رہی ہیں۔ کوئی ہندوستانی مسلمان، جو عقل کا کوئی شائبہ رکھتا ہو، عملی سیاست کے ایک منصوبے کی حیثیت سے برطانوی دولت مشترکہ سے باہر شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست یا ریاستوں کے سلسلے کو قائم کرنے کا خیال نہیں کر رہا ہے۔ میں ہندوستان کے ایسے صوبہ جات میں از سر نو تقسیم کا حامی ہوں جس میں کسی ایک فرقہ کی موثر اکثریت ہو، جس کی وکالت نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم صوبوں کے متعلق میری تجویز، اسی تخیل کو آگے بڑھاتی ہے۔ ہندوستان کی سرحد پر مطمئن اور منظم مسلم صوبوں کا ایک سلسلہ سطح مرتفع ایشیا کی بھوکی نسلوں کے خلاف ہندوستان کے لیے اور برطانوی سلطنت کے لیے ایک فصیل ثابت ہو گا[۷۳]۔

سو اقبال نے اپنی زندگی میں ایڈورڈ ٹامسن کی شر انگیزی کی تردید کی تھی، جب اس نے ان کی مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کو پان اسلامی سازش قرار دیا تھا۔ بہر حال ان سب باتوں کے باوجود پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی انگریزی تصنیف ''ہندوستان کی دریافت''،[۷۴] ڈاکٹر امبید کر نے اپنی انگریزی تصنیف ''پاکستان پر خیالات''[۷۵] یا دیگر ہندو مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں ایڈورڈ ٹامسن کی علمی دیانت داری پر انحصار کرتے ہوئے اقبال کے متعلق اسی جھوٹ کو بار بار دہرایا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کتب اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئیں، جب وہ ان کی تردید نہ کر سکتے تھے۔

مسلمانوں میں چوہدری رحمت علی نے اقبال کے متعلق اس جھوٹ کو اپنے

مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ چوہدری رحمت علی پاکستان کی اسکیم اور اصطلاح کے موجد بیان کیے جاتے ہیں۔ اور وہ کیمبرج میں پاکستان نیشنل موومنٹ کے بانی تھے۔ وہ اپنی انگریزی تصنیف ''پاکستان''[۷۶] میں جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار بزم شبلی کی بنیاد رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کے اظہار کے سلسلے میں کہا تھا کہ شمالی ہند مسلم ہے اور ہم اسے مسلم ہی رکھیں گے صرف یہی نہیں بلکہ ہم اسے ایک مسلم مملکت بنائیں گے۔[۷۷] اقبال کے خطبۂ الہ آباد پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اقبال کے ہاں مسلم ریاست کا تصور ایک علیحدہ یا آزاد و مقتدر مسلم مملکت کی صورت میں نہ تھا بلکہ وہ اسے انڈین فیڈریشن ہی کے اندر بڑے صوبے یا وحدت کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے[۷۸]۔ مگر عملی طور پر ان کی تجویز بیکار ثابت ہوئی۔ مسلم سیاستدانوں نے اس کی مخالفت کی اور اقبال نے خود بھی اس تجویز سے انحراف کیا۔[۷۹]

اس مرحلے پر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا اقبال نے ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی یا وہ اسے ایک آزاد مقتدر اسلامی مملکت کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے، خطبۂ الہ آباد کا تجزیہ کرنا مناسب ہے۔ اس تجزیے کے ساتھ ضروری ہے کہ خطبے کے فوری بعد اس پر اخباری یا دیگر نوعیت کے تبصروں کو نگاہ میں رکھا جائے۔ مزید برآں خطبے کے بعد اقبال تقریباً آٹھ برس زندہ رہے۔ اور اس مدت میں انہوں نے وقتاً فوقتاً خطبے کی جو تعبیر از خود پیش کی، اسے بھی نگاہوں کے سامنے رکھنا لازم ہے۔ اقبال کی اپنی تعبیر کی روشنی میں یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے اپنی تجویز سے انحراف کیا تھا یا نہیں۔ یا ان کی تجویز نے ارتقائی منازل سے گزر کر بالآخر کیا صورت اختیار کی۔

خطبۂ الہ آباد میں ٹھوس دلائل کی بنیاد پر جو نظریہ پیش کیا گیا وہ اس زمانے میں ایک ایسا انقلابی نظریہ تھا جو دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ خطبے سے پیشتر مسلم

سیاسیات کے چار اہم مراحل گزر چکے تھے۔تجاویز دہلی رد کی جا چکی تھیں۔مولانا حسرت موہانی کی تجویز کہ شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے ادغام سے ایک مسلم اکثریتی صوبہ بنا کر اسے ہندوستان کے وفاق میں ایک وحدت کے طور پر شامل کر لیا جائے، نہرو کمیٹی نے ابتداء ہی میں مسترد کر دی تھی۔نہرو رپورٹ میں جناح ترمیمات کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔گو چودہ نکات میدان سیاست میں موجود تھے، لیکن ان کی بنیاد پر ہندو مسلم مفاہمت ہونے کے امکانات کم تھے اور ایسی صورت حالات میں مسلمانوں کو اپنے لیے کوئی علیحدہ سیاسی لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔جس کے لیے کسی نئے نصب العین کا تعین لازمی تھا۔ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کے سبب مسلم قائدین کی وفاقی مرکز میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور وہ مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے زیادہ سے زیادہ اٹانومی یا خود مختاری حاصل کرنے کے درپے تھے۔اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ اقبال نے خطبہ آلہ آباد میں چودہ نکات کی صورت میں پیش کردہ مسلم مطالبات سے ایک قدم آگے جاتے ہوئے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل مسلم اکثریتی علاقے کے لیے صوبہ کی بجائے ریاست یا سٹیٹ کا لفظ استعمال کیا۔اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ ایسی متحدہ مسلم ریاست برطانوی سلطنت کے اندر یا برطانوی سلطنت سے باہر خود مختار حکومت حاصل کر سکتی ہے ظاہر ہے یہ تجویز پیش کرتے وقت بھی اقبال کو توقع تھی کہ مستقبل میں کسی قسم کی ہندو مسلم مفاہمت کی صورت میں مجوزہ مسلم ریاست برطانوی سلطنت یا ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار حکومت حاصل کر سکے گی، لیکن ایسی صورت میں تو مسلم ریاست ہندوستان کے ساتھ صرف کسی ایسی فیڈرل ہئیت ہی میں مل سکتی تھی، جس سے اس کی خود مختاری متاثر نہ ہو۔سو خطبۂ الہ آباد میں اقبال نے ایک ایسی خود مختار مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی جو کسی قابل قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر تو ہندوستان کے وفاق کے اندر قائم کی جا سکتی تھی لیکن ایسی

مفاہمت کی عدم موجودگی میں ایک آزاد اور مقتدر مسلم مملکت کی صورت میں علیحدہ طور پر وجود میں لائی جاسکتی تھی۔ پس ابتداء میں ان کا نصب العین ایک خودمختار مسلم ریاست کا قیام تھا۔ یہ ریاست اگر علاقہ یا آبادی کے اعتبار سے غیر منظم ہوتو اس میں سے انبالہ ڈویژن اور بعض ایسے اضلاع کو، جن میں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، خارج کر کے اس کی وسعت کو کم اور مسلمانوں کی اکثریت کو غالب بنایا جاسکتا تھا۔ آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اپنی حدود کے اندر یہ ریاست غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت بہتر طور پر کرسکتی تھی۔ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے ایسی مسلم ریاست کا قیام اس کے اندورونی توازن قوت کا باعث بن سکتا تھا اور یوں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی امن اور سلامتی کے جذبات کوفروغ دے سکتی تھی ۔اسی طرح مسلم ریاست ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبدارانہ ہندو مسلم افواج کی تشکیل پر خوشی سے رضامند ہوسکتی تھی۔

خیر انگریز اور ہندو پریس نے خطبۂ الہ آباد میں پیش کردہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے قابل اعتراض، رجعت پسند اور ناقابل عمل قرار دیا۔وزیراعظم برطانیہ نے اس پر برہمی کا اظہار کیا۔ڈاکٹر مونجے نے پہلی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں اس کی مخالفت کی اور ایڈورڈ ٹامسن نے اسے پان اسلامی سازش قرار دیا۔

اقبال نے اپنی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں پہلی بار اپنے ایک خط محررہ ۱۱جنوری ۱۹۳۱ء بنام سید نذیر نیازی میں فرمایا کہ مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔ اس ایک یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق وجود میں آئیں گی۔ ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ پھر دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں انگلستان میں ایڈورڈ ٹامسن کے اعتراضات کا جواب

دیتے ہوئے 'لندن ٹائمز' مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں اپنے مراسلے میں تحریر کیا کہ میں نے برطانوی سلطنت یا دولت مشترکہ سے باہر مسلم ریاست کو قائم کرنے کا منصوبہ پیش نہیں کیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور کے صدارتی خطبے میں ارشاد کیا کہ میں نے خطبہ الہ آباد میں آل انڈیا فیڈریشن کے تصور کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی۔ ۸۰

ہندو مہاسبھائی لیڈروں ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے ایک نمائندے ایس وی للت کا ایک خط محررہ ۲۸ مئی ۱۹۳۲ء اقبال کو بمبئی سے موصول ہوا۔ جس میں للت نے انہیں لکھا:

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ہندوستان کے شمال مغربی بارڈر پر چار مسلم صوبوں کے ادغام کے متعلق آپ کی اسکیم کی حمایت کرنے کی اجازت ڈاکٹر مونجے سے انتہائی پرائیویٹ طور پر حاصل کر لی ہے ہم آپ کی اصطلاح "مسلم سٹیٹ" سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن انہی معانی کا اظہار "مسلم پراونس" کے عنوان سے بھی کیا جاسکتا ہے...... مہربانی کر کے یہ نوٹ کر لیجیے کہ فی الحال مونجے اعلانیہ طور پر آپ کی تجویز کی حمایت نہیں کریں گے۔ یہ مرحلہ بعد میں آئے گا۔ فی الحال انہوں نے مجھے بعض امور پر آپ سے خفیہ بات چیت کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اسی اختیار کے تحت میں چند اہم ہندو اور مسلم سیاسی جماعتوں کے قائدین کی آراء بھی معلوم کر کے انہیں اپنی کوششوں کی تفصیل پیش کروں گا اور اس کے بعد وہ کوئی مناسب قدم اٹھائیں گے۔ میں یہاں آپ کو اس حقیقت سے آگاہ کر دوں کہ مولانا شوکت علی نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کا جواب آنے پر کہ موجودہ حالات میں آپ ایسے سمجھوتے کو کیا اہمیت دیتے ہیں، بھائی پرمانند، ڈاکٹر چیت رام اور دیگر اکابرین سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ ڈاکٹر مونجے کو کوئی مناسب قدم اٹھانے کے لیے کہنے سے پیشتر ان اصحاب کی اجازت لینا اشد ضروری ہے کہ

ان باتوں کی رپورٹ مسٹر این۔ سی۔ کلکار کو فراہم کر دی گئی ہے، لیکن ابھی تک پنڈت مالویہ کو نہیں۔ مگر آپ اطمینان رکھیے، پنڈت جی ہر قیمت پر مفاہمت کرنا چاہتے ہیں[۸۱]۔

اقبال نے ایس۔ وی۔ للت کو کیا جواب دیا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا، مگر انہوں نے مولانا شوکت علی سے اس سلسلے میں ہندو مہا سبھائی لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے ضرور کہا، چنانچہ اپنے ایک خط محررہ ۸ جون ۱۹۳۲ء بنام مولانا محمد عرفان خان، میں تحریر کرتے ہیں:

کچھ روز ہوئے میں نے ان (مولانا شوکت علی) کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مسٹر للت کا خط میرے پاس آیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مونجے تمہاری اسکیم کو جو تم نے لیگ کے صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی، تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت مالوی سے بھی مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔ وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کر لیں گے، گو اس وقت اعلانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرنا مصلحت نہیں ہے یہ خط بصیغہ راز تھا اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مولانا شوکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ اسکیم جس کی طرف اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے ۔یعنی شمالی ہندوستان میں مسلم صوبوں کا ایک ہو جانا[۸۲]۔

ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار مسلم ریاست یا صوبے کے قیام کی بنا پر ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں مولانا شوکت علی جیسے مسلم قائدین اور ہندو مہا سبھائی لیڈروں میں خفیہ مذاکرات جاری رہے۔ اسی دوران اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان چلے گئے اور کانفرنس میں اپنی واحد تقریر کے دوران میں انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے لیے کوئی مرکزی حکومت نہ ہو اور صوبے خود مختار اور کلی طور پر آزاد ڈومینین ہوں جن کا براہ راست تعلق وزیر ہند سے لندن میں ہو۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۲ء کو لندن میں نیشنل لیگ کے اجلاس

میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا:

چار پانچ سال ہوئے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے ممکنہ حل کے طور پر مغربی ہند میں ایک وسیع مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ اگرچہ یہ تجویز مسلمانانِ ہند کے مطالبات میں شامل نہ تھی، لیکن میری ذاتی رائے اب بھی یہی ہے کہ صرف یہی ایک ممکنہ حل اس مسئلے کا ہے۔ میں اتنی دیر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ جب تک تجربہ اس تجویز کی معقولیت یا غیر معقولیت ثابت کر کے نہیں دکھا دیتا ۸۳۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شریک مسلم مندوبین کے رویے پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے سخت تنقید کی۔ اقبال نے اپنے جوابی بیان مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا کہ ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ ملک کو مذہبی تاریخی اور تمدنی میلانات کی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ ۸۴

انہی ایام میں چوہدری رحمت علی نے اپنا انگریزی پمفلٹ ''اب اور کبھی نہیں'' کیمبرج سے شائع کیا، جس میں انہوں نے شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کیا اور اس مسلم ریاست کا نام پاکستان رکھا۔ چوہدری رحمت علی نے کیمبرج میں پاکستان کے حصول کے لیے پاکستان نیشنل موومنٹ بھی قائم کی۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال کے مسلم ریاست کے قیام کے تصور اور چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم میں فرق کیا تھا۔ اقبال نے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز ہندوستان میں ایک ذمہ دار مسلم سیاسی شخصیت کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کی تھی۔ چوہدری رحمت علی نے ایک مسلم طالب علم کی حیثیت سے انہی مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ریاست کا نام پاکستان تجویز کر کے اپنا پمفلٹ انگلستان سے شائع کرایا۔ اقبال کی

خود مختار مسلم ریاست کسی قابل قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر ہندوستان کے وفاق، برطانوی سلطنت یا برطانوی دولت مشترکہ کے اندر قائم ہو سکتی تھی اور اس کا علیحدہ طور پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہونے کا امکان صرف اسی صورت میں تھا جب ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہ رہے، لیکن چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اقبال کی مسلم ریاست کے قیام کی تجویز میں آبادیوں کے تبادلوں کی ضرورت نہ تھی مگر چوہدری رحمت علی کے تصور پاکستان میں آبادیوں کا تبادلہ لازمی تھا۔

۱۹۳۲ء میں فرقہ وارانہ ایوارڈ کا اعلان ہوا۔ صوبہ سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ پھر سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ بنا کر اس میں بھی دستوی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اب بھی توقع تھی کہ نئے دستور کے نفاذ سے پیشتر یا اس کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی سمجھوتا ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۵ء تک کوششیں جاری ہیں۔

انہی سالوں یعنی ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں اقبال نے ایڈورڈ ٹامسن کے نام نو خطوط تحریر کیے جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں[۸۵]۔ ان خطوط میں انہوں نے سیاسیات سے اپنے تعلق اور مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ ایک خط محررہ ۲۰ / جون ۱۹۳۳ء میں تحریر کرتے ہیں:

آپ اطمینان رکھیے، خالص سیاسیات میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری دلچسپی دراصل اسلام بحیثیت ایک اخلاقی نظام میں ہے، جس نے مجھے سیاسیات کی طرف دھکیل دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہندو نیشنلزم بالآخر الحاد کی سمت لے جائے گا، اور میرے علم کے مطابق مسلمان اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے سبب اس نام نہاد نیشنلزم کے سیلاب میں تنکون کی طرح بہ جائیں گے۔ ان حالات میں میرا

فرض تھا کہ آگے بڑھوں اور نئی نسل کے سامنے اسلامی تعلیمات کے حقیقی معانی رکھ دوں میں خوش ہوں کہ انہوں نے میری بات سن لی ہے اور انگریزوں نے بھی کچھ حد تک اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں اپنے اصولوں کے مطابق آزادانہ ترقی کرنے کے لیے مواقع ملنے چاہئیں۔ یہ میرا انعام ہے گو اس انعام کو حاصل کرنے میں مجھے مالی طور پر شدید نقصان اٹھانا پڑا، کیونکہ ہندوستان سے دو برس کی مدت تک لگاتار عدم موجودگی کے سبب وکالت کے کام میں میری جو تھوڑی بہت پریکٹس تھی وہ تباہ ہوگئی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے بچوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے، مگر ایک مسلمان کے لیے اسلام کی خدمت اپنی ذات یا اولاد کی خدمت پر مقدم ہے۔ مستقبل میں اسلام اور انگلستان دونوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ افسوس ہے کہ اسلام کے پاس کوئی لیڈر نہیں اور انگریز سیاستدان بات سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں۔ بہرحال آپ دیکھیں گے کہ سیاسیات میں میری دلچسپی میری اپنی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے گی۔ نئے دستور کے تحت آئندہ کسی کونسل یا اسمبلی کے انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے میرا کھڑے ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے[۸۶]۔

اپنے ایک اور خط محررہ ۴ مارچ ۱۹۳۴ء میں تحریر کرتے ہیں:

آپ نے مجھے اس اسکیم کا حامی قرار دیا ہے جو ''پاکستان'' کے نام سے موسوم ہے ''پاکستان'' میری اسکیم نہیں ہے۔ جو تجویز میں نے اپنے خطبے میں پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبے کے قیام کی تجویز تھی۔ یعنی شمال مغربی ہند میں ایک ایسے صوبے کی تشکیل جہاں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ میری اسکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ آئندہ کی انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا۔ لیکن پاکستان اسکیم مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن کے قیام کی سفارش کرتی ہے، جس کا براہ راست تعلق انگلستان سے ایک علیحدہ ڈومینین کی صورت میں ہوگا۔ یہ اسکیم کیمبرج میں بنائی گئی اور اس اسکیم کے

موجدوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین نے مسلم قوم کو ہندو یا انڈین نیشنلزم کی بھینٹ چڑھا دیا ہے ۸۷۔

پھر ۲۶ رجولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے سندھ کی علیٰحدگی کی حمایت کرنا میرا فرض تھا۔ ذاتی طور پر میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں تینوں صوبوں کا ادغام انگلستان اور اسلام کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ آپ کو علم ہے کہ جمہوریت پر میرا اعتقاد نہیں ہے لیکن جمہوریت کی طرف قدم (میری رائے میں مہلک قدم) بہر حال اٹھایا جا چکا ہے۔ اب ہمیں معاشی تباہ حالی، سیاسی عدم استحکام اور ہندوؤں کے انتشار کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس وسیع، غیر منظم اور رفاقہ کش ملک میں جمہوریت کے انعقاد سے ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ مغرب کے حالات مخدوش ہیں۔ میں بخوبی سمجھتا ہوں، مگر ہندوستان کا آتش فشاں پہاڑ تو تھوڑا عرصہ ہوا پھٹ چکا۔ گو اس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اب یہاں صورت حال یہ ہے کہ شہری ہندو آپس میں لڑ رہے ہیں اور دیہات کے غریب لوگوں کو سمجھ نہیں آتی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ مسلمان ان سے نسبتاً زیادہ متحد ہیں مگر ان کے لیڈر بحیثیت مجموعی، خالصتاً درمیانے درجے کے ہیں، جو مستقبل میں مشرق اور مغرب کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق کوئی جامع اعتقاد نہیں رکھتے۔ اگر میں ان دو گول میز کانفرنسوں کے بارے میں، جن میں میں شریک ہوا ہوں، اپنے تاثرات ریکارڈ کروں تو مجھے اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں اور اس کے ساتھ ہی آپ کے ہم وطنوں کے متعلق، جن میں سے بعض نے اپنی بصیرت کے باوجود کم حوصلگی اور سوچ کے فقدان کا ثبوت دیا، نہایت ناخوشگوار باتیں کہنا پڑیں گی۔ مجھے یقین واثق ہے کہ انگلستان کی موجودہ حکمران پارٹی ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مگر یہ خیالات تو محض ایک شاعر کے ہیں اور شاعر، جیسے کہ آپ کو علم

ہے، بے عمل خواہیں دیکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی بالکل بیکار لوگ ۸۸۔

ان خطوط کی روشنی میں ایڈورڈ ٹامسن کی دو کتابوں میں اقبال کے متعلق ریمارکس سے اس کی علمی اور اخلاقی دیانت داری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اقبال اسے تحریر کرتے ہیں کہ ہندوستان جیسے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں جمہوریت کا انعقاد، معاشی تباہ حالی، سیاسی عدم استحکام اور ہندوؤں کے انتشار پر منتج ہوگا، مگر وہ اقبال کے منہ میں یہ الفاظ ڈالتا ہے کہ میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔ اقبال اسے لکھتے ہیں کہ ذاتی طور پر میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں کا ادغام انگلستان، ہندوستان اور اسلام کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا، لیکن وہ اقبال کے منہ میں یہ الفاظ ڈالتا ہے کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لیے تباہ کن ہے۔ ہندو فرقے کے لیے تباہ کن ہے اور مسلم فرقہ کے لیے تباہ کن ہے۔ اقبال اسے لکھتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے سندھ کی علیحدگی کی حمایت کرنا میرا فرض تھا، مگر وہ ان کے منہ میں یہ الفاظ ڈالتا ہے کہ میں مسلم لیگ کا صدر ہوں اس لیے میرا فرض ہے کہ منصوبۂ پاکستان کی حمایت کروں۔

بہر حال انہی ایام میں مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں انہوں نے راغب احسن کو بھی لکھا اور فرمایا کہ میری تجویز پاکستان اسکیم سے مختلف ہے۔ راغب احسن کے نام ایک خط محررہ ۶ مارچ ۱۹۳۴ء میں ارشاد ہوتا ہے:

میری تجویز انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلم صوبے کی تخلیق ہے، لیکن پاکستان اسکیم انڈین فیڈریشن سے باہر ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ جس کا تعلق براہ راست انگلستان سے ہوگا ۸۹۔

ہندوؤں نے نہ تو چودہ نکات کی صورت میں مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کیے اور نہ ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار مسلم ریاست یا صوبے کی بنا پر ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو محمد علی جناح، انگلستان سے واپسی کے بعد، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ اگلے سال یعنی ۱۹۳۵ء میں جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی صورت میں نیا دستور نافذ ہوا تو اس کے تحت منعقد انتخابات میں ہندو سیاسی جماعتوں نے بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۳۷ء میں بیشتر صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہوئیں۔ اس دور میں ان صوبوں میں ہندو حکمرانوں نے سیاسی طاقت کے نشے میں جو تکبر کا سلوک مسلم اقلیتوں سے روا رکھا۔ اس کی بنا پر ہندو مسلم تعلقات مزید خراب ہو گئے اور مفاہمت کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم نو کی جائے تاکہ وہ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر علیحدہ سیاسی پروگرام بنائیں۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ محمد علی جناح کے ہاتھوں مسلم لیگ کا احیاءِ عمل میں آیا اور بدلے ہوئے حالات کے تحت مسلم ریاست کے متعلق اقبال نے بھی اپنا موقف مختلف انداز میں پیش کیا۔

چنانچہ انہوں نے اپنے ایک خط بنام محمد علی جناح محررہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں فرمایا:

برصغیر میں شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقاء اتنی دیر تک ممکن نہیں جب تک کہ یہاں ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ کئی برسوں سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے...... کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟ ۹۰

پھر اپنے ایک خط محررہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح کو لکھا:

ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک مسلمان ہیں جن کی جانب صحیح راہنمائی کے لیے ملت اسلامیہ کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا

میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان یا بیرونِ ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خوداختیاری سے کیونکر محروم رکھا جا سکتا ہے ۹۱۔

سو اقبال ہندوستان کے وفاق کے اندر خودمختار مسلم ریاست یا صوبے کے قیام کی تجویز سے آگے نکل کر اب شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک ایسی علیحدہ فیڈریشن کی تخلیق کا ذکر کر رہے تھے جو نہ صرف آزاد اور مقتدر ریاست کی صورت ہی میں وجود میں لائی جا سکتی تھی بلکہ اس میں اسلامی اصطلاحات یا اسلامی شریعت نافذ کر کے اسے حقیقی معنوں میں اسلامی مملکت بھی بنانا تھا۔

اقبال کے خطوط بنام جناح کا پس منظر بیان کرتے ہوئے محمد علی جناح تحریر کرتے ہیں:

ان کے خیالات اور میرے اپنے خیالات میں ہم آہنگی تھی، اور ہندوستان کے دستوری مسائل کے محتاط مطالعے اور تجربے کے دوران، ان کے خیالات نے بالآخر مجھے انہی نتائج پر پہنچا دیا جن پر اقبال خود پہنچے تھے۔ رفتہ رفتہ انہی خیالات کا اظہار مسلمانان ہند کے متحدہ مطالبے کے طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور رہے، کیا گیا ۹۲۔

ایک اور مقام پر محمد علی جناح اقبال کے تصور مسلم ریاست کے متعلق ارشاد کرتے ہیں:

ایک عظیم شاعر اور مفکر ہوتے ہوئے وہ کسی سیاستدان سے کم نہ تھے۔ اسلام کے اصولوں پر ان کے پختہ عقیدے اور ایمان کی بدولت وہ اُن چند ہستیوں میں سے ایک تھے جس نے ہندوستان کے شمال مشرقی خطوں، جو مسلمانوں کے تاریخی

اوطان ہیں، میں ایک اسلامی ریاست کے ممکنہ انعقاد پر غور کیا[۹۳]۔

یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ اقبال نے نہ صرف برصغیر میں مسلم ریاست کو وجود میں لانے کی خاطر عملی طور پر سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا بلکہ مسلمانوں کی نیشنلیٹی اور ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے بنیادی اصول بھی وضع کر دیئے۔ مثلاً اُن کے نزدیک مسلم قومیت اور وطنیت کی بنیاد مسلمانوں کے ایمان یا عقیدے پر استوار ہے نہ کہ اشتراک لسان، نسل یا علاقہ پر۔ اسی طرح اُن کی جدید اسلامی ریاست کا ماڈل بھی مختصراً مندرجہ ذیل اصولوں پر قائم ہے:

۱۔ جمہوریت اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہے۔

۲۔ اسلام کا اصل مقصد روحانی جمہوریت کا قیام ہے۔

۳۔ ریاست قانون کی حاکمیت اور حقوق بشر کے تحفظ کی ضمانت دے۔

۴۔ پارلیمنٹ صرف شوریٰ ہی نہیں بلکہ اسلامی قانون سازی کے معاملہ میں تعبیر اور نفاذ کے اعتبار سے اجماع کی ہیئت میں کلی طور پر بااختیار ادارہ ہے۔

۵۔ صرف پارلیمنٹ کو اجتہاد کا عمل جاری رکھنے کا اختیار ہے۔

۶۔ مسلم اکثریتی ریاست میں مخلوط انتخابات کا نظام رائج کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ مذہبی امور کے شعبے کو ریاست کے دیگر شعبوں سے الگ کرنا دین اور سیاست کی علیحدگی نہیں۔

۸۔ اسلامی تعزیرات (حدود) کا سختی سے اطلاق کرنے کی ضرورت نہیں۔

۹۔ کثرت ازدواج کی قرآنی اجازت کی تحدید اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق پارلیمنٹ قانون سازی کرسکتی ہے۔

۱۰۔ اراضی کی ملکیت کی حد اس قدر مقرر کر دی جائے جو جاگیردار بذات خود زیر کاشت لاسکے۔ ایگریکلچرل انکم ٹیکس عام انکم ٹیکس کی شرح کے مطابق نافذ کیا جائے۔ بے زمین کاشتکاروں کو سرکاری اراضی آسان قسطوں پر دی جائے۔

۱۱۔ قرآنی احکام کہ ''امیروں کی دولت میں غریبوں کا حصہ ہے'' اور ''جو ضرورت سے زاید ہے وہ دے دیا جائے'' کے تحت مزدوروں کی کم از کم اجرت، پنشن، طبّی اخراجات، رہائش، بچوں کی تعلیم وغیرہ کا بندوبست کے سلسلے میں قانون سازی کی جا سکتی ہے۔

۱۲۔ اسلامی فلاحی قوانین (زکوٰۃ، عشر وغیرہ) اور خصوصی طور پر اسلامی قانون وراثت سختی سے نافذ کیئے جائیں۔

۱۳۔ ریاست فلاح عامہ کے خاطر ہر وہ قدم اٹھا سکنے کی مجاز ہے جس کی شریعت کے ساتھ مطابقت بذریعہ اجتہاد پارلیمنٹ (بطور اجماع) کردے۔

اس بات پر تو بحث کی گنجائش نہیں کہ چوہدری رحمت علی نے خطبۂ الہ آباد کے بعد اپنی پاکستان اسکیم پیش کی اور بقول اقبال مسلم ریاست کے قیام کے متعلق ان کی تجویز چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے مختلف تھی۔ مگر خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے نام ان کے کیمبرج سے تحریر کردہ سو سے زائد خطوط۹۴، راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ چوہدری رحمت علی بظاہر اقبال سے عقیدت کا دم بھرتے تھے، لیکن دراصل انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ انہیں شاید اس بات کا قلق تھا کہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کے سلسلے میں اقبال نے ان پر سبقت کیوں لے رکھی تھی۔ مثلاً خط محررہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں تحریر کرتے ہیں:

ہم میں سے کسی کو بھی ڈاکٹر صاحب کی اس خدمت سے انکار نہیں ہوسکتا جو انہوں نے اسلام کی کی ہے، لیکن تحریک پاکستان کو ان کے حلقۂ خاص کے رشید صاحب جیسے ممبر کا انکی بتانا (یعنی اقبال سے منسوب کرنا)، اہمیت سے معرّا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے حلقہ خاص میں اگر اس خیال کو اپنی زبان سے ظاہر نہیں فرماتے تو کم از کم اس کی تردید بھی نہیں کرتے اور اب جبکہ تین

سال کی محنت وخطرات کے بعد اس تحریک کا نام پاکستان کے سلسلے میں لوگوں کی زبان پر آنے لگا ہے تو غالباً حضرت کے قلب کے لیے یہ چنداں ناگوار نہیں کہ ہم سب کو اس کے تعلق سے محروم کرتے ہوئے اس کا نیک و بد کریڈٹ خود ہی حاصل کریں۔ آپ کو یاد ہوں گے میرے وہ الفاظ کہ میں تحریک پاکستان کی ممبری کے لیے بھی آپ کو اس وقت تک قبول نہ کروں، جب تک کہ آپ اس 'سری' سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ آواز کی تکلیف کی وجہ سے مایوس ہو بیٹھے ہیں۔ دیگر تمناؤں سے، اس لیے ہم عاجزوں کی طرف دست درازی فرما رہے ہیں۔ اگر میں نے انہیں اس سرقہ کا مجرم پایا تو مجھے کتاب میں ان تمام گفتگوؤں کا خلاصہ درج کرنا ہوگا جو اس سلسلے میں حضرت کی دردناک کمزوریوں کی داستان ہیں۔ میں یہ عرض کروں گا کہ یہ پہلو اپنے تک ہی محدود رکھیے یا یاران غار تک باہر نہ جانے دیں۔

اقبال کے خلاف چوہدری رحمت علی کے بغض کا اظہار کئی خطوط میں نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک خط محررہ ۳ فروری ۱۹۳۳ء میں اقبال کے تخیل اور عمل میں تضاد کو ''دردناک'' کہتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے خط محررہ ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء میں خواجہ عبدالرحیم سے شکایت کرتے ہیں کہ ''میکلوڈ روڈ کے مست'' (یعنی اقبال) کی جانب سے ایک لفظ بھی موصول نہیں ہوا۔ گویا اقبال نے چوہدری رحمت علی کو وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔

ان خطوط کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان اسکیم کے موجد تنہا چوہدری رحمت علی ہی نہ تھے، بلکہ خواجہ عبدالرحیم بھی اس مشق میں ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اس کا اعتراف انہوں نے ایک خط محررہ یکم نومبر ۱۹۳۳ء میں یوں کیا ہے:

کیمبرج اور لندن میں اسلامی صحبت کے اندر جہاں کبھی بھی اسلامیت ہے وہ آپ

کے اس آئیڈیل کے ساتھ ہے جس کا خواب آپ نے اور میں نے باہم ۱۹۳۱ء میں کیمبرج میں دیکھا تھا۔

ان کے اس خط کے بارے میں خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک انگریزی نوٹ ہے، جس میں فرماتے ہیں: اعتراف کیا ہے کہ وہ اور میں دونوں اس تصور کے خالق ہیں، مگر چونکہ خواجہ عبدالرحیم سرکاری ملازم تھے، اس لیے وہ پس پردہ رہے۔ کیمبرج میں خواجہ عبدالرحیم کے علاوہ چوہدری رحمت علی کے ہم خیال چند اور مسلم طلبہ بھی تھے۔ یہ لوگ مل کر پاکستان نیشنل موومنٹ کے لیے کام کرتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان نیشنل موومنٹ کیمبرج تک ہی محدود رہی۔ اس کا نام کبھی مسلم ہند میں سننے میں نہ آیا۔ غالباً اسی سبب اپنے ایک خط محررہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم کو لکھتے ہیں کہ آئندہ اس تحریک کا نظام تاسیسی نازی اصول پر ہوگا۔ چوہدری رحمت علی کی پاکستان نیشنل موومنٹ ہندوستان سے باہر ہی رہی۔ البتہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کے بعد مسلم لیگ نے محمد علی جناح کی زیر قیادت تحریک پاکستان چلائی، جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی۔ قیام پاکستان سے چند ماہ پیشتر، معلوم ہوتا ہے کہ چوہدری رحمت علی، محمد علی جناح کی قیادت سے بددل ہو گئے تھے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان قبول کیا۔ کے۔ کے عزیز اپنی انگریزی کتاب ''رحمت علی اور اس کی مکمل تحریریں'' (جلد اوّل) کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ چوہدری رحمت علی نے غصے میں آ کر محمد علی جناح کے خلاف ایک کتابچہ تحریر کیا اور اس میں ان پر اس قسم کے ذاتی حملے کیے کہ پمفلٹ کو پڑھنا مشکل ہے۔ یہ کتابچہ بعنوان ''عظیم غداری۔ ملت کو کس طرح بچایا جائے''۔ (انگریزی) حال ہی میں بک ٹریڈز لاہور کی طرف سے چوہدری رحمت علی کی تصنیف ''پاکستان'' (انگریزی) کے پاکستانی ایڈیشن میں شامل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد چوہدری رحمت علی پاکستان

آئے اور یہاں رہائش اختیار کرنے کے لیے جیل روڈ لاہور پر انہوں نے ایک کوٹھی بھی کرائے پر لی لیکن کسی نے بھی ان کا خیر مقدم نہ کیا، بلکہ خفیہ پولیس ان پر نگاہ رکھتی تھی، یا ان کا پیچھا کرتی تھی۔ سو وہ یہاں سے واپس کیمبرج چلے گئے۔ اس مختصر جائزے سے ظاہر ہے کہ چوہدری رحمت علی بیچارے بڑے خودسر مگر مایوس انسان تھے۔ وہ پاکستان اسکیم کے موجد کی حیثیت سے کیمبرج میں بیٹھے پاکستان نیشنل موومنٹ چلاتے رہے اور ہندوستان آ کر مسلمانوں کی عملی سیاسیات میں کبھی حصہ نہ لیا۔ اس کے باوجود انہیں ساری عمر یہی گمان رہا کہ اقبال نے ان کی پاکستان اسکیم چرالی ہے اور تحریک پاکستان کو کامیابی کے ساتھ چلانے یا پاکستان حاصل کرنے کا سہرا غلط طور پر محمد علی جناح کے سر باندھ دیا گیا ہے۔

ایک سوال جس کی وضاحت یہاں کر دینا ضروری ہے کہ اقبال سمیت بعض دیگر سیاسی قائدین نے چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے لاتعلقی کا اظہار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس مرحلے پر مسلم قائدین صدق دلی کے ساتھ ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کوشاں تھے اور اپنے آپ پر علیحدگی پسندی کی تہمت لگوانا نہ چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ تجویز کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم اکثریتی صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اٹانومی دی جائے یا بقول اقبال برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں کے ادغام پر مشتمل مسلم ریاست کو اس وفاق کے اندر خود مختار بنا دیا جائے، ٹھوس دلائل پر مبنی ایک معقول مطالبہ تھا، مگر اس مرحلے پر چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم ایک معقول مطالبہ کو نامعقول بنا سکتی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں جب پہلی بار انہوں نے پاکستان اسکیم کے متعلق اپنا کتابچہ برٹش پارلیمنٹ کے ممبران میں تقسیم کیا تو بقول سارنسن، لارڈ لائیڈ اور ونسٹن چرچل نے ان کی اسکیم کو سراہا، ۹۵ مگر جب عبداللہ یوسف علی، سر ظفر خان اور خلیفہ شجاع الدین سے پاکستان کے متعلق جائنٹ پارلیمنٹری سلیکٹ کمیٹی

کے سامنے اظہار خیال کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ یہ ایک ''خوفناک'' اور ''غیر عملی'' اسکیم ہے، جس کا موجد کوئی طالب علم ہے اور اسے کسی بھی ذمہ دار قائد یا سیاسی جماعت کی حمایت حاصل نہیں۔ ۱۹۴۷ء تک چودھری رحمت علی نے پاکستان کے علاوہ اپنی اسکیم میں دو مزید آزاد مسلم ریاستوں یعنی بنگ آسام اور عثمانستان کا اضافہ کر دیا۔ پھر ۱۹۴۰ء کے بعد وہ اور آگے بڑھے اور برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں میں بھی آزاد مسلم ریاستیں مثلاً صدیقستان اور فاروقستان، حیدرستان، معینستان، ماپلستان، سفیستان، نثارستان وغیرہ قائم کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ سمندروں اور جزیروں کے نام تک تبدیل کر دیے، یا ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ ظاہر ہے وہ برصغیر کے مسلمانوں کے معقول اور جائز مطالبے کو ایسی صورت دینے کے درپے تھے جسے سراسر نامعقول اور ناجائز سمجھا جانے لگے اور جسے نہ تو ہندو قبول کرنے کو تیار ہوں، نہ انگریز۔ یعنی ان کی پاکستان اسکیم سے مراد کسی معقول بنیاد پر تقسیم ہند نہ تھی، بلکہ ہندوستان کی 'بلقانائزیشن' (یا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دینا) تھی جس کے سبب مسلمانوں کا جائز مطالبہ بھی مسترد کیا جا سکتا تھا یا ان کے سیاسی مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسی بنا پر اقبال نے مسلم ریاست کے قیام سے متعلق اپنی تجویز کو چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے مختلف قرار دیا۔ بعد ازاں مارچ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد لاہور منظور ہوئی تو اس میں بھی پاکستان کا ذکر نہ تھا، بلکہ محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی بتاریخ ۲۴ راپریل ۱۹۴۳ء میں واضح طور پر فرمایا:

میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جب ہم نے قرارداد لاہور منظور کی تو ہم نے اس میں لفظ پاکستان استعمال نہ کیا تھا۔ یہ لفظ ہمیں کس نے دیا؟ (شور: ہندوؤں نے) میں آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ انہی کی غلطی تھی۔ وہ قرارداد لاہور کو پاکستان کہہ کر معتوب قرار دینے لگے۔ انہیں مسلم تحریک کے متعلق کوئی واقفیت نہ

تھی۔ سوانہوں نے یہ لفظ ہم پر ٹھونسا۔ گویا کتے کو گالی دو اور پھر اسے پھانسی پر چڑھا دو۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ لفظ پاکستان دراصل ہندو اور برٹش پریس کے بعض حلقوں نے ہمارے سروں پر تھوپا ہے...... اب میں اپنے ہندو اور انگریز دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں ایک طویل اصطلاح (قرارداد لاہور عام طور پر مشہور بہ پاکستان) کے بجائے ایک لفظ دینے کا شکریہ (مرحبا مرحبا) ۹۷۔

چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کے متعلق محمد علی جناح کا ردعمل کیا تھا؟ فرینک مورایسن تحریر کرتا ہے:

میں نے جب کبھی رحمت علی کا نام جناح کے سامنے لیا تو انہوں نے ایک مخصوص انداز میں اپنے ابرو اوپر اٹھا دیے۔ گویا وہ رحمت علی کے تصور پاکستان کو ایچ۔ جی۔ ویلز کا ڈراؤنا خواب نہیں تو کم از کم والٹ ڈزنی کا ڈریم لینڈ ضرور سمجھتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ (رحمت علی کے بارے میں) ان کا احساس کچھ ایسی حقارت کا تھا، جس کا اظہار پیشہ ور کھلاڑی ایک اناڑی کی غلطی پر کرتا ہے جو ترپ کو محفوظ رکھے بغیر ہاتھ کے تمام پتے دکھا دے ۹۸۔

چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کے بارے میں انگلستان میں عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا گیا۔ مثلاً بعض حلقوں میں اسکیم اس لیے بدنام تھی کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی پرانی خواہش کی تکمیل یعنی اسلامی ایمپائر قائم کرنے کا پروگرام تھا ۹۹۔ بعضوں کو شبہ تھا کہ اس اسکیم کا تعلق مستقبل کی افغان پالیسی سے ہے اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان پر سوویٹ روس کی امداد کے ساتھ افغانستان حملہ کرے گا ۱۰۰۔

۳۶-۱۹۳۵ء میں اسکیم کو بعض حلقے اسے لیے برا سمجھتے تھے کہ یوں برصغیر میں مستقل طور پر بدامنی اور تباہی کا دور دورہ ہوگا۔ ۱۰۱ بہر حال ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ کی رائے میں پاکستان اسکیم کو حکومت برطانیہ کی حمایت حاصل تھی اور کیمبرج یونیورسٹی کا

ایک ''طالب علم'' جو وہاں بیٹھا تحریک پاکستان چلا رہا تھا، انڈیا آفس کا تنخواہ دار تھا۔۱۰۲ ان سب باتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ کوئی بھی ذمہ دار مسلم سیاسی لیڈر چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کا حامی نہ تھا۔ یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ چوہدری رحمت علی کا رویہ اقبال کی طرف منافقانہ تھا۔ وہ اقبال کو شاید انگریزی حکومت کا کارندہ سمجھتے تھے اور بعد میں انہوں نے محمد علی جناح پر بھی قوم سے غداری کا الزام لگایا، لیکن کیا وہ خود واقعی دیوانے مستانے آدمی تھے، یا ان کی دیوانگی بامقصد تھی؟ اس کا جواب تو ان کا کوئی سوانح نگار ہی دے سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اقبال سے قبل فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے کئی انگریز ہندو اور مسلم برگزیدہ ہستیوں نے مسلم ریاست کے قیام یا تقسیم ہند کی تجاویز پیش کر رکھی تھیں۔ قرار داد لاہور منظور ہونے اور بالخصوص قیام پاکستان کے بعد اس موضوع پر علمی تحقیق کی گئی اور ثابت کر کے دکھایا گیا کہ اقبال ان ہستیوں میں محض ایک ہستی تھے، جنہوں نے دوسروں کی طرح تقسیم ہند کی تجویز پیش کی، لیکن اس تحقیق کے پس پشت کیا سیاسی مصلحتیں برسرِ عمل تھیں؟

یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ اقبال بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک ایسی علیحدہ آزاد و مقتدر فیڈریشن بنائی جائے جس میں اسلامی اصلاحات یا اسلامی شریعت کا نفاذ ہو۔ گویا اقبال کے ذہن میں مجوزہ آزاد و مقتدر مسلم ریاست کا تصور بطور ایک اسلامی مملکت کے تھا۔ محمد علی جناح کے بیان کے مطابق اقبال کے خیالات نے محمد علی جناح کو بھی انہی نتائج پر پہنچا دیا جن پر وہ خود پہنچے تھے۔ اور رفتہ رفتہ انہی خیالات کا اظہار مسلمانانِ ہند کے متحدہ مطالبے کے طور پر مسلم لیگ کی قرار داد لاہور میں کیا گیا۔ پس ظاہر ہے اقبال اس مسلم ریاست کو اسلامی ریاست کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس بات کا احساس محمد علی جناح کو بھی تھا، جو ان سے متفق تھے۔

بعدازاں بقول محمد علی جناح اس اسلامی ریاست کے تصور کو مسلمانانِ ہند کے متحدہ نصب العین کے طور پر مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور پیش کیا گیا۔ حصولِ پاکستان کے ایک سال بعد محمد علی جناح تو وفات پا گئے۔ ان کے بعد گو لیاقت علی خان کے دور میں قراردادِ مقاصد منظور کی گئی، لیکن مسلم لیگی یا دیگر سیاسی لیڈروں میں سے بیشتر اس اعلان کے باوجود کہ پاکستان ایک اسلامی ری پبلک ہے، پاکستان کو اسلامی مملکت ہرگز نہ بنانا چاہتے تھے۔ ان حالات میں ایسی تحقیق جو اقبال کو ان انگریز، ہندو یا مسلم ہستیوں میں سے ایک شمار کرے، جنہوں نے تقسیم ہند کی تجاویز پیش کی تھیں، مصلحت کے تحت نہایت مناسب تھی۔ ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی نے جب یہ لکھا کہ یہ کہنا کہ اقبال مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے، تاریخ کو مسخ کرنا ہے، تو آخر ان کا ذہن کس بات کی غمازی کر رہا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اسلامی عصبیت کی بجائے علاقائی تعصب کو فروغ حاصل ہوا۔ سیاستدان ناکارہ ثابت ہوئے تو بیوروکریسی نے اقتدار سنبھالا اور بیوروکریسی کی نااہلی کے سبب فوج اقتدار میں آئی۔ انتخابات ہوئے تو غیر اسلامی نظریات کے حامل یا علاقائی تعصب کے بل بوتے پر اپنی سیاسی دکان چمکانے والے سیاستدانوں نے بالآخر ایک پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اقبال نے غلاموں کو اسلامی اتحاد کا سبق دے کر آزادی کا رستہ دکھایا تھا۔ وہ برصغیر میں اس اسلامی انقلاب کے داعی تھے، جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان جدید عالمِ اسلام میں احیائے اسلام کی بنا پر پہلا اسلامی انقلاب تھا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ پاکستان میں علاقائی تعصب کے فروغ کے نتیجے میں اقبال کو جو اس اسلامی انقلاب کے شاعر و مفکر تھے، محض ایک پنجابی شاعر قرار دے کر پنجاب کے پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اقبال کو شاید اپنے گناہ کی سزا کا علم تھا۔ اسی لیے وہ فرما گئے:

تیرا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند!
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے
وہ پرشکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند!
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقام شوق و سرور و نظر سے محرومی

اقبال کو یہ صلہ تو پاکستان کی طرف سے ملا جو اس کے قائم کردہ اسلامی ریاست کے معیار پر پورا نہ اتر سکا، لیکن اقبال کو ہندوستان سے بھی نسبت تھی، کیونکہ بیسویں صدی کے عالم اسلام کو ایک ہزار سال بعد تجدید دین کے ذریعے انقلاب کا پیغام دینے والے اس ''برہمن زادے'' یا ''کافر ہندی'' کا تعلق اسی سرزمین سے تھا، تو ہندوستان میں اسے ایک ایسا متعصب مسلم قوم پرست قرار دیا گیا، جس نے اپنے افکار کے ذریعے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی ترغیب دی تھی۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کا نام تک لینا جرم کے مترادف تصور کیا گیا۔

بہر حال ۱۹۷۷ء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ ولادت اقبال کی صد سالہ تقریبات کے بعد ہندوستان میں اقبال شناسی کے سلسلے میں کاوش و تحقیق کا نیا دور شروع ہوا۔ اسی طرح پاکستان میں بھی تجدید دین یا احیائے اسلام کے نئے جذبہ کے تحت اقبال کو پنجاب کے پنجرے سے آزاد کر کے اسے اس کا صحیح مقام دلانے کی خاطر کوششیں جاری ہوئیں۔ اسی دوران میں ایران میں انقلاب آیا اور علی شریعتی اور دیگر اہل علم کی اقبال سے متعلق تحریروں کے سبب اسے تعظیماً ایران کے اسلامی انقلاب کے مفکروں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔

مآخذ

باب ۱۷

۱۔ ''کتاب الہند'' از البیرونی، انگریزی ترجمہ ای۔ زخاؤ، جلد اوّل، صفحات ۱۷، ۹، ۱۷

۲۔ ''منتخب التواریخ'' از ملاّ بدایونی، انگریزی ترجمہ ڈبلیو۔ ایچ۔ لو، جلد دوم صفحہ ۳۷۵۔

۳۔ ''ارتقائے پاکستان'' از شریف الدین پیرزادہ (انگریزی) صفحات ۳۷ تا ۱۲۰۔

۴۔ ایضاً، دیباچہ

۵۔ ''پاکستان کے لیے جدوجہد'' از اشتیاق حسین قریشی (انگریزی)، صفحات ۱۱۷ تا ۱۱۹۔

۶۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحہ ۲۳۰۔

۷۔ ''سرسید احمد خان کے اصلاحی اور مذہبی تصورات'' از جے۔ ایم۔ ایس بلجان، (انگریزی)، صفحات ۷۵، ۷۶

۸۔ ''شاہراہ پاکستان'' از چوہدری خلیق الزمان (انگریزی)، صفحہ ۲۳۸۔

۹۔ ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی کا خط ایڈیٹر کے نام ''پاکستان ٹائمز'' مورخہ ۷ مئی ۱۹۶۷ء (انگریزی)

۱۰۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحات ۹۱۳، ۹۱۴۔

۱۱۔ ''صاف گو مسٹر جناح'' (انگریزی)، صفحہ ۵۲۔ خطبۂ الہ آباد کے سلسلے میں خط وکتابت کے لیے دیکھیے ''اقبال کے چند نادر خطوط'' از بشیر احمد ڈار'' صحیفہ ''اقبال نمبر، حصہ دوم، صفحات ۱ تا ۱۰۔

۱۲۔ ''نقوش'' اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۴۹۹ تا ۵۰۴۔

۱۳۔ ''صاف گو مسٹر جناح'' (انگریزی)، صفحہ ۵۲

۱۴۔ ’’نقوش‘‘ اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۴۹۹ تا ۵۰۴۔

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۵۰۳

۱۶۔ ’’اقبال کی تقریریں اور بیانات‘‘ مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحہ ۳۱

۱۷۔ ’’سرگزشت اقبال‘‘ از عبدالسلام خورشید، صفحات ۳۲۳، ۳۲۴۔

۱۸۔ ایضاً، صفحات ۳۲۴، ۳۲۵

۱۹۔ ایضاً، صفحات ۳۲۶، ۳۲۷

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۸

۲۱۔ اقبال کا خط محررہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۰ء بنام سید نذیر نیازی۔ ’’فنون‘‘، اقبال نمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۵۔

۲۲۔ ’’سرگزشتِ اقبال‘‘ از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۳۲۸۔ شریف الدین پیرزادہ کی انگریزی تصنیف ’’ارتقائے پاکستان‘‘ میں بھائی پر مانند، پروفیسر جی۔ آر۔ ابھیانکر اور نواب سر ذوالفقار علی خان کی تقسیم ہند کے متعلق تجاویز کا ذکر موجود نہیں۔ یہ اسکیمیں بھی اقبال کی اسکیم سے پہلے پیش کی گئی تھیں۔

۲۳۔ ’’فنون‘‘ اقبال نمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۵۔

۲۴۔ ’’سرگزشت اقبال‘‘ از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۳۲۹۔

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۹

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۳۳۰۔

۲۷۔ ’’روداد اقلیتی سب کمیٹی پہلی گول میز کانفرنس‘‘ (انگریزی)، صفحات ۴۳، ۴۴۔

۲۸۔ ایضاً، صفحات ۶۰، ۶۱۔

۲۹۔ ’’مکتوبات اقبال‘‘ مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحات ۵۴، ۶۴، ۶۶، ۶۷۔

۳۰۔ ’’اقبال کے خطوط جناح کے نام‘‘ مطبوعہ ۱۹۴۳ء (انگریزی)، صفحات ۲۱ تا ۲۳۔

۳۱۔ ''سرگزشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحات ۳۳۰، ۳۳۱۔

۳۲۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۶۷۔

۳۳۔ ''سرگزشتِ اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۳۳۱۔

۳۴۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۵۵

۳۵۔ صفحات، ۶۱۴ تا ۶۹۰

۳۶۔ ''سرودِ رفتہ'' صفحات ۱۸۱ تا ۱۹۱

۳۷۔ ایضاً، صفحات ۱۷۶، ۱۷۷

۳۸۔ ''باقیات اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۲۰۶

۳۹۔ ''سرودِ رفتہ'' مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری، صفحات ۵۵ تا ۵۷

۴۰۔ ایضاً، صفحات ۱۳۹، ۲۰۰

۴۱۔ ''علامہ اقبال یورپ میں اور دیگر مضامین'' از سعید اختر درانی (قلمی مسودہ)

۴۲۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی) صفحہ ۳۱۹۔

۴۳۔ صفحات ۲۷۴، ۲۷۵۔

۴۴۔ ''آثار اقبال'' مرتبہ غلام دستگیر رشید، حیدرآباد دکن، صفحات ۲۲، ۲۳

۴۵۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ چراغ حسن حسرت، صفحہ ۲۹

۴۶۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ دوم، صفحات ۱۲۶، ۱۲۷

۴۷۔ ''افکار'' نومبر ۱۹۸۱ء، مضمون ''علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط'' از سلیم الدین قریشی

۴۸۔ ''ملفوظاتِ اقبال'' مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۹۷

۴۹۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی)، صفحات ۳۱۹، ۳۲۱

۵۰۔ ''جوہر اقبال'' مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، صفحات ۳۸، ۳۹

۵۱۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی)، صفحات ۳۲۰، ۳۲۱

۵۲۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحہ ۶۵۴

۵۳۔ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' از مولانا حسین احمد مدنی، صفحہ ۹

۵۴۔ ''جوہر اقبال'' مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، صفحات ۴۰، ۴۱

۵۵۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحات ۲۳۹، ۲۴۰

۵۶۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحہ ۱۰

۵۷۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحہ ۱۸۱

۵۸۔ ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ محمود نظامی صفحہ ۲۰۸

۵۹۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ شاملو (انگریزی)، صفحہ ۱۶۸

۶۰۔ ''اقبال اور تصوف'' مرتبہ آل احمد سرور۔ سری نگر، صفحہ ۶۹

۶۱۔ ''اُردو'' اقبال نمبر، طبع جدید، صفحہ ۱۹۶

۶۲۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحات ۶۶۰، ۶۶۱

۶۳۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر، حصہ اول، صفحہ ۱۶۶

۶۴۔ ''اردو'' اقبال نمبر، طبع جدید، صفحہ ۱۹۵

۶۵۔ ''آثار اقبال'' مرتبہ غلام دستگیر رشید، حیدرآباد دکن، صفحہ ۲۸

۶۶۔ ''اردو'' اقبال نمبر، طبع جدید، صفحہ ۲۳۵

۶۷۔ ایضاً، صفحات، ۳۱۴ تا ۳۱۶

۶۸۔ صفحات ۲۰۴ تا ۲۰۶

۶۹۔ صفحات ۱۹۸، ۱۹۹

۷۰۔ صفحات ۵۸، ۵۹

۷۱۔ اقتباس کے لیے دیکھیے ''اقبال کے آخری دو سال'' از عاشق حسین بٹالوی، صفحہ ۵۵۸ یا ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات، ۸۳۱، ۸۳۳

۷۲۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۱۱۷،

۷۳۔ ایضاً، صفحات ۱۱۹، ۱۲۰

۷۴۔ صفحہ ۶۹۸

۷۵۔ صفحہ ۳۲۶

۷۶۔ چوہدری رحمت علی دیباچے میں فرماتے ہیں کہ یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے اور اس سے پیشتر دو ایڈیشن ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۹ء میں سائیکلو اسٹائل صورت میں پاکستان نیشنل موومنٹ کے کارکنان کی خاطر چھاپے گئے تھے۔

۷۷۔ ''پاکستان'' (انگریزی) صفحہ ۲۱۴

۷۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۱۹

۷۹۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۱۔ اس سلسلے میں وہ اپنی ۱۹۴۷ء میں چھپی ہوئی انگریزی تصنیف ''پاکستان'' میں ڈاکٹر امبیدکر کی انگریزی تصنیف ''پاکستان پر خیالات'' (طباعت ۱۹۴۱ء) کے حوالے سے **ملک** برکت علی کی تقریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس میں ان کے ساتھ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں کہ میں یہ کہنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ سر محمد اقبال اپنی اس تجویز (مسلم ریاست کا قیام) سے منحرف ہو گئے ہیں اور اگر وہ اس تجویز سے اس بناء پر انحراف نہ بھی کرتے کہ کوئی معقول شخص ایسی تجویز پیش نہیں کر سکتا، تو میں خود اس تجویز کو پورے زور کے ساتھ اور بغیر کسی تامل کے رد کر دیتا۔ اب پہلی غور طلب بات تو یہ ہے کہ یہ سب تصانیف اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئیں جب وہ ان کی تردید نہ کر سکتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کا ایسا کوئی بیان یا تحریر ریکارڈ پر موجود نہیں جس سے واقعی یہ ثابت ہو سکے کہ انہوں نے کسی مرحلے پر اپنی تجویز سے انحراف کیا تھا بلکہ ان کے تمام بیانات اس کے برعکس ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر **ملک** برکت علی نے اپنے کسی بیان میں یہ الفاظ کہے بھی تھے تو ۱۹۴۱ء میں یعنی اقبال کی وفات سے تین برس اور قرارداد لاہور کے منظور

ہونے کے ایک برس بعد ان کا ذکر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟

۸۰۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔آر۔طارق (انگریزی)، صفحہ ۴۸

۸۱۔ اصل انگریزی خط علامہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے۔

۸۲۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحات ۲۰۸، ۲۰۹

۸۳۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔اے۔ڈار (انگریزی) صفحہ ۷۵، پاکستان یا تقسیم ہند'' (انگریزی)، صفحہ ۳۲۹

۸۴۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔آر۔طارق (انگریزی) صفحہ ۱۱۶

۸۵۔ ''اقبال ۔ ان کے سیاسی نظریات چوراہے پر'' مرتبہ اے۔حسن علی گڑھ (انگریزی)

۸۶۔ ایضاً، صفحہ ۷۲

۸۷۔ ایضاً، صفحہ ۸۰

۸۸۔ ایضاً، صفحات ۸۱، ۸۲

۸۹۔ روزنامہ ''جنگ'' اقبال ایڈیشن ۲۱ر اپریل ۱۹۸۲ء

۹۰۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' مطبوعہ ۱۹۴۳ء (انگریزی)، صفحات ۱۷، ۱۸

۹۱۔ ایضاً، صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۳

۹۲۔ ایضاً، دیکھیے دیباچہ صفحات ۴، ۵

۹۳۔ ''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' مرتبہ جمیل الدین احمد، جلد دوم (انگریزی)، صفحات ۱۴۶، ۱۴۷

۹۴۔ یہ خطوط غیر مطبوعہ ہیں اور جناب خواجہ طارق رحیم بیرسٹر کی تحویل میں ہیں۔

۹۵۔ ''ہندوستان کے متعلق میرے تاثرات'' از آر۔ ڈبلیو۔ سارنسن (انگریزی) صفحہ ۱۱۰

۹۶۔ شہادت کی تفصیل جو جائنٹ کمیٹی برائے ہندوستانی دستوری اصلاحات کے روبرو پیش کی گئی۔ سیشن ۳۳-۱۹۳۲ء (انگریزی) رومن پانچ۔ ااسی، صفحہ ۱۴۹۶۔

۹۷۔ ''جناح کی تقریریں اور تحریریں'' مرتبہ جمیل الدین احمد، جلد اوّل (انگریزی)، صفحات ۵۵۶-۵۵۵

۹۸۔ ''ایک عہد کا شاہد۔ ہندوستان ۱۹۲۰ء سے لے کر آج تک''، لندن ۱۹۷۳ء ایڈیشن (انگریزی)، صفحہ ۸۰

۹۹۔ ''پاکستان پر خیالات'' از ڈاکٹر امبیدکر (انگریزی)، صفحہ ۱۸، ''درون ہند'' از خالدہ ادیب خانم (انگریزی)، صفحہ ۳۵۵

۱۰۰۔ ''مسئلہ ہندوستان کے اہم حقائق'' از ڈچز آف اٹھال ایم پی لندن ۱۹۳۳ء صفحات ۲۶،۲۵

۱۰۱۔ ''پارلیمانی بحثیں'' ۳۰۱، ایچ۔سی۔ڈیب ۵ (۸) ۱۹۳۵ء انگریزی، صفحہ ۱۰۳۴ نیز دیکھیے۔ جے۔کوٹمین میگنا برٹینیکا (انگریزی)، صفحات ۳۲۲،۳۲۱

۱۰۲۔ ''جدید اسلام ہندوستان میں'' (انگریزی)، صفحات ۳۲۷،۲۵۴

باب ۱۸

گول میز کانفرنسیں

لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو اختتام پذیر ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم برطانیہ کے اعلان کے ذریعے دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شمولیت کے لیے رستہ ہموار کر دیا گیا۔ پہلی گول میز کانفرنس کے تحت کل آٹھ سب کمیٹیاں بنائی گئیں، لیکن ہندو مسلم اختلافات کے سبب اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ البتہ بحیثیت مجموعی کاروائی میں آئندہ طرز حکومت کے سلسلے میں جن اصولوں پر غور کیا گیا وہ یہ تھے: طرز حکومت وفاقی ہوگا جس میں برطانوی ہند کے صوبوں کے ساتھ دیسی ریاستیں بھی شریک ہوں گی اور یہ کہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو دفاع و امور خارجہ کے علاوہ باقی تمام اختیارات دے دیے جائیں گے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس کے سولہ مسلم مندوبین میں قابل ذکر مولانا محمد علی جوہر، سر آغا خان، محمد علی جناح، سر محمد شفیع یا مولوی فضل الحق ہی تھے۔ اقبال کو شرکت کی دعوت نہ دی گئی تھی، لیکن لندن میں مولانا محمد علی کی اچانک وفات اور محمد علی جناح کے وہاں رہائش پذیر ہونے کے فیصلے کے سبب کل ہند مسلم سیاسیات میں قیادت کا بحران پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اقبال کی مولانا محمد علی کے بارے میں یہ رائے تھی:

محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی بھی مداح نہ تھا، لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آرا کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انہوں نے ثبوت دیا، بہت احترام کرتا ہوں [۱]۔

اب مولانا شوکت علی ہی ایک ایسے مسلم قائد باقی رہ گئے تھے جو ہندو لیڈروں

کے ساتھ کسی نہ کسی سمجھوتے کے لیے بات چیت کرنے کے اہل تھے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے، وہ بقول ان کے کل ہند مسلم سیاسیات کی دلدل میں دھکیل دیے گئے تھے اور ایسے پھنسے تھے کہ اب نکلنا مشکل تھا۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدے کے تحت انگریزی حکومت نے سول نافرمانی کی تحریک میں گرفتار شدگان کو رہا کرنے کی ہامی بھر لی اور کانگرس نے سول نافرمانی کی مہم ختم کر دی۔ اگلے ماہ ارون کی جگہ ولنگڈن ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔ انھی ایام میں ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی گئی۔ مسلم لیگ تو انتشار کا شکار تھی، اس لیے اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ البتہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کچھ نہ کچھ اہمیت تھی، چنانچہ اس کا اجلاس دہلی میں طلب کیا گیا۔ اقبال ۳ر اپریل ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی پہنچے اور وہاں انہوں نے پانچ دن قرول باغ میں شیخ غلام علی صابر کے ہاں قیام کیا۔[۲] مہاتما گاندھی آل انڈیا مسلم کانفرنس کے قائدین سے ملے، لیکن مسلم مطالبات تسلیم کرنے سے انہوں نے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ متفقہ نہ تھے، یعنی کانگرسی مسلم لیڈران مطالبات سے اتفاق نہ کرتے تھے۔ ان حالات میں مولانا شوکت علی کو خیال آیا کہ کیوں نہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈروں سے بات چیت کر جائے اور اختلافات کے خاتمے کے لیے کوئی فارمولا تلاش کیا جائے۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈروں میں چودہ نکات میں سے تیرہ پر تو قریب قریب اتفاق تھا۔ ان کے مابین اگر کوئی نزاعی مسئلہ تھا تو جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا تھا۔ لیکن اس مسئلے سے قطع نظر بظاہر گفت و شنید حوصلہ افزا معلوم ہوئی۔ چنانچہ مولانا شوکت کی تحریک پر نواب صاحب بھوپال حمید اللہ خان نے آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے، قائدین کو بھوپال مدعو کیا۔ بھوپال روانہ ہونے سے بیشتر ۳ مئی ۱۹۳۱ء کو جداگانہ انتخاب اور دیگر مسلم مطالبات کی حمایت میں مسلمانانِ لاہور کا ایک

عظیم الشان جلسہ بیرون موچی دروازہ زیر صدارت اقبال منعقد ہوا۔ اقبال نے اپنی افتتاحی تقریر میں واضح کیا کہ یہ جلسہ متعدد جلسوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو اس نازک زمانے میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کے بعد ان میں روح حیات پھونکنے کے لئے کیے جائیں گے۔ تاکہ وہ سیاسیات کے میدان عمل میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ آپ نے فرمایا:

گاندھی جی نے مسلم کانفرنس دہلی کے متعلق کہا تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ متحدہ نہیں۔ لیکن وہ حق بجانب نہ تھے۔ میں اس صحبت میں موجود تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ جداگانہ انتخاب مانگتا ہے، دوسرا مخلوط انتخاب کا حامی ہے اور تیسرا سوشل ڈیموکریسی چاہتا ہے۔ جب ہندوؤں میں اس قدر اختلاف ہے تو مسلمانوں کے معمولی اختلاف پر ایک بہانہ بنا لینا اگر منافقت نہیں تو کیا ہے...... پہلے معلوم کرنا چاہیئے کہ قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا اس کا نتیجہ بے دینی اور لامذہبی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل، ذات پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں، سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں۔ اس لیے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں...... میں مسلمان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ قومیت کا صحیح تخیل معلوم کریں...... مسلم نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ منظم ہو جائیں، اور یہ کوششیں اس لیے ہیں کہ آپ گونڈ یا بھیل نہ بن جائیں، ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں دینا ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار

رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اسکی دستگیری کرے گا تو وہ بد بخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو[۳]۔

اقبال ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو مع غلام رسول مہر بھوپال پہنچے۔ انہیں سرکاری قیام گاہ قصر راحت منزل میں ٹھہرایا گیا۔ وہ دو دن بھوپال میں ٹھہرے، جہاں انہوں نے نواب حمید اللہ خان سے ملاقات کے علاوہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے راہنماؤں کی گفت وشنید میں حصہ لیا،[۴] لیکن ان قائدین میں اختلاف کی خلیج سکڑنے کی بجائے بڑھتی چلی گئی اور دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر ہندو مسلم مفاہمت کی جو کوشش کی گئی تھی، بارآور ثابت نہ ہوئی اس کوشش کے متعلق اقبال، مولانا شوکت علی، سر محمد شفیع اور شروانی کے دستخطوں سے ایک بیان ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا۔[۵]

پھر ۱۳ مئی ۱۹۳۱ء کو جب اقبال اور نواب محمد اسمٰعیل خان بھوپال سے واپسی پر دہلی سے گزرے تو ریلوے اسٹیشن پر اخبار "اسٹیٹسمین" کے نمائندے کو انہوں نے اسی سلسلے میں ایک انٹرویو بھی دیا[۶] مگر اقبال کے بیان مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء سے واضح ہو گیا کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے رہنماؤں اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے قائدین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اقبال نے اپنے بیان میں کہا:

اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انہوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ، جن کے ساتھ انہوں نے گفت وشنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی۔ میں اسے کامل طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عارضی میثاق کی قسم کی کوئی چیز حاضرین جلسے کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس جلسے میں اس سے زیادہ کوئی کاروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلم نیشنلسٹوں کو انتخابات کے متعلق آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلوں کے قریب تر

لانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں تا کہ لوگ پھر کامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہوسکیں، جس نے جداگانہ انتخاب کے بدستور بحال رکھنے کا ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جس میں کسی قسم کے مغالطے کی گنجائش باقی نہیں رہتی...... ایسی تجاویز کو گاندھی جی کے پاس بھاگے بھاگے لے جانے، جن پر کسی قسم کی بحث بھی نہیں ہوئی اور انہیں عارضی میثاق کے نام سے تعبیر کرنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اگر اسکی کوئی حقیقت ہے تو مجھے کامل یقین ہے کہ بھوپال یا شملہ میں دوسرا جلسہ کرنا نہ صرف مفید نہ ہوگا بلکہ لازمی طور پر مسلمانان ہند کے مفاد کے لیے ضرر رساں ہوگا[۷]۔

کانگرسی مسلم لیڈروں اور دیگر مسلم قائدین کے مابین جداگانہ یا مخلوط انتخاب کے مسئلے پر اختلاف ختم نہ کیا جاسکا اور ادھر ہندو مسلم سیاسی مفاہمت کی بھی کوئی صورت نہ نکلی۔ اسی دوران میں یعنی اپریل ۱۹۳۱ء سے ہندوستان کے متعدد مقامات پر ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ بنارس، آگرہ، مرزا پور اور کانپور فسادات سے بری طرح متاثر ہوئے۔ سب سے بڑا فساد کانپور میں ہوا جہاں مسلمانوں کو گھر گھر قتل کیا گیا۔ ان کے گھروں پر مٹی کا تیل ڈال کر جلایا گیا۔ اور بعض مساجد بھی مسمار کردی گئیں۔ مظلومین کانپور کی مالی امداد کے لیے اقبال نے دیگر مسلم قائدین کے ہمراہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو اخبارات میں پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں سے کانپور مسلم ریلیف فنڈ میں چندہ دینے کی پُرزور اپیل کی۔ انہوں نے فرمایا:

بنارس، آگرہ اور مرزا پور کے بعد کانپور میں مسلمانوں کا قتل عام ہندوستان کے مسلمانوں کو چیلنج تھا کہ وہ ایک ایک کر کے اس ملک سے نابود کردیے جائیں گے، اور کوئی ان کی امداد کرنے والا نہ ہوگا...... پوربیوں نے انگریزوں سے غدر میں وہ کچھ نہ کیا تھا جو اس شہر میں دوسرے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کیا ہے۔ جس طرح جنگلی جانوروں کے ایک گلے میں گھس کر شکاریوں کا گروہ بے تحاشا بندوقیں چلاتا

شروع کرتا ہے، اسی طرح کانپور میں ہوا۔ مسلمانوں کے ہزارہا مکانات جلا دیے گئے...... پیشہ وروں کے آلات بڑے بڑے ہتھوڑوں سے کوٹ کوٹ کر بیکار کر دیے گئے...... بیکس مسلمانوں کو مارا ہی نہیں گیا بلکہ ان پر تیل ڈال کر ان کو جلایا بھی گیا، اور بعض جگہ تو سسکتے ہوئے زندہ آدمی جلا دیے گئے ...... کئی گھروں اور مساجد میں اب تک خون کے چھینٹے ان دردناک حوادث کی یاد دلا رہے ہیں جن میں غریب مسلمانوں کو مار مار کر ان کے سر پھوڑ دیے گئے...... تیس مسجدیں کلی طور پر یا جزوی طور پر توڑ دی گئیں...... کئی جگہ قرآن مجید کی بھی بے حرمتی کی گئی [۸]۔

کانپور کے مسلم کش فساد نے اقبال پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہوئے بلکہ سنجیدگی سے یہ بھی سوچنے لگے کہ اگر آئندہ گول میز کانفرنس میں حکومت برطانیہ نے ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں کو نظر انداز کیا تو مسلمان سوویٹ یونین یا اشتراکیت کی طرف مائل ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔ اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء بنام سر فرانسس ینگ ہسبنڈ میں تحریر کیا:

برطانیہ نے اگلی گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ اختلافات سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو یہ دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اگر سیاسی اقتدار ہندو کے سپرد محض اس لیے کر دیا گیا کہ اسے حاکم بنانے سے برطانیہ کو کوئی مادی مفاد حاصل ہو سکتا ہے تو مسلمان سوراجی یا اینگلو سوراجی حکومت کے خلاف وہی حربے استعمال میں لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو گاندھی نے حکومت برطانیہ کے خلاف برتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورا مسلم ایشیاء روسی کمیونزم سے ہم آغوش ہونے پر مجبور ہو جائے...... میں نہیں سمجھتا کہ روسی طبعاً غیر مذہبی لوگ ہیں، بلکہ اس کے برعکس میرے خیال میں ان میں مضبوط مذہبی رجحانات موجود ہیں اور روسی ذہن کی موجودہ منفی کیفیت غیر معینہ عرصے تک جاری نہیں رہے

گی، کیونکہ کوئی معاشرتی نظام لامذہبی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات پرسکون ہوئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کا موقع ملا تو اس نظام کے لیے کوئی مثبت بنیاد تلاش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بالشوزم میں اگر خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام کے بہت حد تک مماثل ہو جاتا ہے، اس لیے مجھے اس بات پر حیرت نہ ہو گی اگر مستقبل میں اسلام روس پر حاوی ہو جائے یا روس اسلام پر چھا جائے۔ نتیجے کا انحصار، میرے خیال میں کافی حد تک اس پوزیشن پر ہو گا جو ہندی مسلمانوں کو نئے آئین کے تحت ملے گی۹۔

انہی ایام میں لاہور میں مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کی اسلام دشمنی کے سبب مسلم طلبہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مسلم طلبہ کا ایک وفد پرنسپل کے سامنے اپنی چند شکایات لے کر گیا تھا، لیکن اس نے شکایت کا ازالہ کرنے کی بجائے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بعض ایسے کلمات منہ سے نکالے جن سے مسلم طلبہ مشتعل ہو گئے۔ اسی کیفیت میں وہ اخبارات کے دفاتر میں پہنچے اور اقبال یا دیگر سیاسی قائدین سے بھی ملے اور پھر جلسوں اور احتجاجی جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، کئی مسلم انجمنوں اور اخباروں نے پرنسپل کے رویّے کے خلاف آواز بلند کی۔ اسی سلسلے میں ۳جون ۱۹۳۱ء کو ایک جلسہ موچی دروازے کے بیرون باغ میں زیر صدارت اقبال منعقد ہوا۔ اقبال نے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

چونکہ مسلمان منتشر ہیں اس لیے یہاں کی ہر قوم مسلمانوں سے عناد رکھتی ہے۔ یہ صورت حال قابل افسوس ہے۔ تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو اب ایک تدبیر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی آزماؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اتحاد امتی حجتہ قاطعتہ۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو۔ اگرچہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی ہیں، لیکن حضرت محمد مصطفےٰؐ کا بتلایا ہوا یہ نسخۂ شفا کبھی ناکام نہیں ہو گا[10]۔

پنجاب کی انگریز حکومت نے مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے معاملے کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا، لیکن اسے مسلمانانِ لاہور نے قابل اعتماد نہ سمجھا اور متحد ہو کر احتجاج جاری رکھا۔ اس پر حکومت نے ان کے مطالبات مان لیے اور ایک نیا تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر ایک اور جلسہ ۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو زیر صدارت مولانا داؤد غزنوی باغ بیرون موچی دروازے میں منعقد ہوا۔ جلسے میں مولانا داؤد غزنوی نے ایک قرارداد پیش کی۔ اقبال نے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

سب سے پہلے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد حضورؐ کے مطابق برہانِ قاطع ہے۔ آپ نے اس امر میں خلوص نیت سے عمل کیا اور اس کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا۔ مسلمانوں کے سامنے عنقریب بہت بڑے امور پیش ہونے والے ہیں، جن کا تعلق آپ کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اسی طرح سے ثابت قدم رہیں اور میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اسی طرح اتحاد نصیب کرے جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو نصیب ہوا تھا"۔

بالآخر اقبال اور مولانا داؤد غزنوی کے مشورے سے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا خاتمہ ہوا اور کمیشن کے سامنے پرنسپل کے رویّے کے خلاف شہادتیں قلمبند کرانے پر اصرار کیا گیا، مگر اسی دوران میں پرنسپل نے مسلم طلبہ سے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

انہی مہینوں میں ریاست جموں اور کشمیر میں حالات نے سنگین صورت اختیار کر لی اور تحریک کشمیر کی ابتداء ہوئی۔ ایک عرصے سے ڈوگرہ شاہی نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور ان کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ کشمیری مسلمانوں میں بے چینی تو پہلے ہی سے موجود تھی مگر ۱۹۳۱ء میں دو واقعات کے سبب وہ غصّے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ پہلا واقعہ تو یوں پیش آیا کہ مسلمان کسی جگہ نماز کے لیے

اکٹھے ہوئے۔ امام خطبہ پڑھنا چاہتا تھا کہ ایک ہندو پولیس افسر نے اسے خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔ کچھ مدت بعد دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سنٹرل جیل میں کسی ہندو سپاہی نے قرآن مجید کو زمین پر پٹک دیا۔ اس پر سری نگر کی خانقاہ معلیٰ میں صوبہ سرحد کے عبدالقدیر خان نے ایک جوشیلی تقریر میں احتجاج کیا، لیکن اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو عبدالقدیر خان کا مقدمہ عدالت میں پیش کیا گیا اور باہر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع تھے۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلادی۔ جس سے اکیس مسلمان شہید ہوگئے۔ اس کے بعد کشمیر کے مختلف شہروں میں مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے شروع کردیے جنہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ بالآخر مظاہروں نے ہندو مسلم فسادات کی صورت اختیار کرلی۔ حالات مہاراجہ ہری سنگھ کے قابو سے باہر ہوگئے اور اس نے برطانوی فوج کی امداد طلب کرلی۔[۱۲]

کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی حالت پہلے ہی سے نہایت پست تھی۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند تھے۔ مذہبی آزادی مفقود تھی۔ بیشتر مساجد ریاستی حکومت کی تحویل میں تھیں، اخباروں، جلسوں اور جلوسوں پر پابندیاں عاید تھیں۔ اور اب انہیں گرفتار کرکے جیلوں میں ٹھونسا جارہا تھا۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ جیسے امن پسند کشمیری راہنماؤں اور کئی دیگر کارکنان کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ریاست میں مارشل لا نافذ تھا۔ جگہ جگہ ٹکٹکیاں نصب کی گئی تھیں، جن پر کشمیری مسلمانوں کو باندھ کر کوڑے لگائے جاتے تھے[۱۳]۔

کشمیریوں کی بے بسی سے بالخصوص پنجاب کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مجلس احرار نے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کے جتھے بنا بنا کر ریاست میں بھیجنے شروع کردیے اور انہوں نے کشمیر کی تمام جیلیں بھر دیں۔ مسلمانانِ کشمیر کی حمایت کی خاطر جولائی ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے میں آل انڈیا کشمیر

کمیٹی قائم کی گئی۔ مرزا بشیر الدین محمود (امیر جماعت احمدیہ قادیان) صدر بنے اور اقبال کمیٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ کشمیر کمیٹی کے مقاصد میں کشمیری مسلمانوں کے حق میں رائے عامہ منظم کرنا، آئینی ذرائع سے ریاست کے اندر اصلاحات نافذ کرانا، شہیدوں کے ورثا اور زخمیوں کو مالی امداد مہیا کرنا اور گرفتار شدگان کی رہائی کے لیے قانونی امداد بہم پہنچانا شامل تھے۔ مسلمانان کشمیر پر مظالم کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو ہندوستان بھر میں یوم کشمیر منانے کا فیصلہ ہوا۔ اقبال نے چند مسلم قائدین کی معیت میں یوم کشمیر منانے کے لیے لاہور سے یہ اپیل شائع کی:

مسلمانو! پے در پے حملے کر کے تمھارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے، اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لیے آپ کا یہ فرض ہے کہ یوم کشمیر کو کامیاب بنائیں اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں[۱۴]۔

۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو مسلمانان لاہور نے یوم کشمیر منانے کی خاطر ایک عظیم الشان جلوس نکالا۔ جلوس کے اختتام پر اقبال کی زیر صدارت ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن کریم کے بعد، انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

پہلے پنجاب اور ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے حالات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، بلکہ وہ لوگ جو کشمیر سے یہاں آئے وہ بھی اس کی تاریخ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اب جو مظالم کشمیر میں برپا کیے گئے، انھوں نے اہل پنجاب کو بھی بیدار کر دیا ہے...... مسلمانوں نے جو عرصے سے اپنے جائز حقوق کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اب منظم طریق پر مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی تو حکومت کشمیر اور ہندو اخبارات نے بے بنیاد خبریں اڑا کر اسے فرقہ وارانہ فساد قرار دے دیا...... حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک کا اثر اہل کشمیر پر بھی ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے پڑوسیوں کی حالت سے متاثر ہو کر بیدار ہو گئے۔ زمانہ خود لوگوں کو

بیدار کر رہا ہے۔ اور کشمیر میں عرصے سے جو مظالم برپا ہیں، ان کی موجودگی میں ضروری تھا کہ وہاں کی رعایا بھی اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتی...... تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ تلوار سے کسی ملک کو فتح کرتے ہیں، ان کی حکومت بھی رعایا کی خوشنودی کے بغیر نہیں چل سکتی۔ بادشاہی خرید نے سے نہیں چل سکتی۔ اس لیے ہر ملک کے حکام کے لیے ضروری ہے کہ رعایا کی رضا جوئی حاصل کریں [۱۵]۔

اسی جلسے میں سید محسن شاہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ہندو اخبار ان مسلم قائدین کے متعلق جو مسلمانان کشمیر کی حمایت کرتے ہیں، مختلف قسم کی جھوٹی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک اخبار ''کیسری'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: یہ اخبار لکھتا ہے کہ اقبال کشمیر کے وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں۔ اور سید محسن شاہ جج بننے کے آرزو مند ہیں۔ اس پر اقبال نے مداخلت کرتے ہوئے جلسہ عام پر واضح کیا کہ وہ ایسے حاکم کی وزارت پر لعنت بھیجتے ہیں [۱۶]۔ ہندوؤں کے انگریزی اخبار ''ٹریبیون'' میں بھی اسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ اس کے ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء کے پرچے میں مسٹر راگھون کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس نے اقبال کا نام لیے بغیر شرارتاً تحریر کیا کہ بعض شخصیتوں کی نیتوں کا حال اس سے واضح ہے کہ شورشِ کشمیر کے دوران برطانوی ہند کے ایک ممتاز لیڈر نے کشمیر کی وزارت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دی ہے۔ اس پر مدیر ''انقلاب'' نے اقبال سے استفسار کیا کہ یہ ممتاز لیڈر کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

میں نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مراد ہے، لیکن چونکہ پہلے بھی ایک ہندو اخبار میرا نام لے چکا ہے اور ممکن ہے کہ مسٹر راگھون کے اس فقرے سے بھی کسی کو غلط فہمی ہو۔ اس لیے میں اپنے متعلق نہایت زور سے اس افواہ کی تردید کرتا ہوں۔ میں نے یوم کشمیر کے جلسے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے تو اس وزارت سے بڑی بڑی چیزوں کے لیے کبھی کسی سے درخواست نہیں کی۔

علاوہ بریں میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا ممبر ہوں، جو کشمیر کے نظام حکومت میں اصلاحات چاہتی ہے۔ میرے نزدیک اس کمیٹی کا ممبر ہونے کی حالت میں کوئی ایسی حرکت کرنا دیانت و امانت کے خلاف ہے[17]۔

اقبال نے مظلومین کشمیر کی امداد کے لیے چندہ کی رقوم جمع کر کے ریاست میں بھجوائیں اور اپنے جاننے والے بعض نامور وکلا کو قانونی امداد کے سلسلے میں کشمیر بھیجا، لیکن ریاستی حکام نے یا تو انہیں حدود ریاست سے خارج کر دیا یا داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ اقبال کے لیے بھی کشمیر میں داخلہ ممنوع تھا اور یہ پابندی اخیر عمر تک عائد رہی۔ لہٰذا وہ اپنی خواہش کے مطابق مرنے سے پہلے وادی کشمیر نہ دیکھ سکے۔ اقبال ہی کی کوششوں سے گلانسی کمیشن کا تقرر ہوا، جس نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں کئی قسم کی اصلاحات کی سفارش کی[18]۔

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے وائسرائے نے اقبال کو بقول عظیم حسین، سر فضل حسین کے ایماء پر نامزد کیا تھا۔[19] انگریزی حکومت نے مختلف مندوبین کو دعوت نامے ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو جاری کر دیے تھے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچنا لازمی تھا تا کہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا آغاز ہو سکے۔ انگلستان روانہ ہونے سے پیشتر اقبال نے ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء کو ایک خط سردار بیگم کے نام تحریر کر کے میاں امیر الدین کے حوالے کیا۔ یہ خط حال ہی میں میاں امیر الدین کے ریکارڈ سے ان کے پوتے اور منیرہ بیگم کے فرزند یوسف صلاح الدین نے دریافت کیا اور ان ہی کی تحویل میں ہے۔ اقبال اس خط میں لکھتے ہیں:

والدۂ جاوید کو بعد سلام علیک کے واضح ہو کہ چونکہ میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ولایت جانے والا ہوں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس واسطے یہ تحریر لکھتا ہوں کہ صورت حال سے تم کو آگاہی رہے، اگرچہ پہلے بھی تم کو کل حالات معلوم ہیں۔

(۱) عرصہ دو تین سال کا ہوا جب میں درد گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا اور زندگی کی

امید منقطع ہوگئی تھی، لیکن خدا تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے صحت عطا کی۔
اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ
پر واضح ہوگئی۔ صحت یابی کے بعد میں نے مبلغ دس ہزار روپیہ جاوید کے نام ہبہ کر کے
پنجاب نیشنل بنک لاہور میں اس کے نام جمع کرادیا اور چند ماہ ہوئے اس ہبہ میں
پانچ ہزار کا اور اضافہ کر دیا۔ یعنی پانچ ہزار روپیہ مزید ہبہ کر کے اس کے نام اسی بنک
میں جمع کرادیا۔ اس رقم کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ میں نے منیرہ بیگم کے نام ہبہ کر کے
پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع کرادیا۔ کل پندرہ ہزار روپیہ جاوید کے نام اور پانچ
ہزار منیرہ بیگم کے نام بنک مذکورہ میں جمع ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں ان کا
گارڈین ہوں۔ میری زندگی کے بعد تم ان دونوں کی گارڈین ہوگی۔ بنک کی
رسیدات تمہارے پاس ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ میں نے دس ہزار روپیہ تمہارے نام ہبہ کر دیا تھا۔ یہ
روپیہ سنٹرل کواپرٹیو بنک لاہور میں میرے اور تمہارے نام سے جمع ہے۔ لیکن
میرا نام محض اس لیے درج کیا گیا تھا کہ اگر تمہارے لیے کوئی جائداد خرید کرنے کی
ضرورت پڑے تو بنک سے اس کے نکالنے میں آسانی ہو۔ حقیقت میں یہ روپیہ
تمہارا ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ مبلغ
پندرہ سو روپیہ بھی اسی بنک میں میرے اور تمہارے نام سے جمع ہے۔ یہ روپیہ
تمہارے بعض زیورات کی فروخت سے حاصل ہوا تھا۔ یہ بھی تمہاری ملکیت ہے اور
مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا نام اس رقم کے سلسلے میں محض مذکورہ بالا سہولت
کی غرض سے درج کیا گیا تھا۔

(۳) مبلغ آٹھ ہزار روپیہ خالصتاً میرے نام سنٹرل کوآپرٹیو بنک لاہور میں جمع ہے اس
روپیہ میں کچھ روپیہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

(۴) مبلغ دو ہزار روپیہ کے قریب منشی طاہر الدین کے پاس ہے کچھ اور روپیہ آنے

والا ہے۔ جس کو وہی وصول کریں گے۔ اس روپے میں سے انکم ٹیکس ادا کرنا ہے اور بعض اور اخراجات جو میری عدم موجودگی میں لاحق ہوں۔ مثلاً کرایہ کوٹھی اور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اس کے علاوہ گھر کے اخراجات، گھر کے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ تمہارے پاس بھی موجود ہے۔

(۵) ''جاوید نامہ'' میں نے چھپنے کے لیے دے دیا ہے۔ اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہر الدین اور چوہدری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی، اخراجات اشاعت وطباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔

(۶) میں نے زبانی کہا تھا کہ تمہارا حق مہر میں نے پندرہ ہزار روپیہ باندھ دیا ہے۔ وقت نکاح کوئی رقم مقرر نہ کی گئی تھی، لیکن اب میں اپنی مرضی سے تمہارا حق مہر مبلغ پندرہ ہزار مقرر کرتا ہوں۔ اور اس تحریر میں یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ تمہارا اطمینان ہو جائے۔ شرعاً یہ روپیہ مجھ پر قرض ہے اور تم اس رقم کو میری ہر قسم کی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ سے وصول کر سکتی ہو۔ شرع شریف کی رو سے تم کو میری ہر قسم کی جائداد پر قابض ومتصرف رہنے کا حق ہے جب تک مذکورہ بالا رقم تم کو وصول نہ ہو جائے۔

(۷) باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں تم بچوں کی تربیت سے غافل نہ رہو گی۔ اور بحیثیت ان کی ماں ہونے کے جو فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں، ان کو ادا کرو گی۔ محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء۔

یہ خط سردار بیگم کو اقبال کی ناگہانی موت کے موقع پر دیا جانا تھا، لیکن چونکہ ایسی صورت پیدا نہ ہوئی، یہ خط میاں امیر الدین کے پرانے ریکارڈ میں پڑا رہا اور کسی کا خیال اس کی طرف نہ گیا۔ اقبال کا ارادہ تھا کہ سفر یورپ کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچیں گے۔ اسی سفر کے دوران

میں وہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرنے کے بھی آرزومند تھے۔[20] مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے انہیں دسمبر ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس (یروشلم) میں منعقد ہونے والے موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیج رکھا تھا۔ اسی طرح مارکونی، صدر اکادمی دانشوران روم کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ روم آ کر تقریر کریں۔ چند روز بعد انگلستان سے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ، صدر ادبی انجمن انڈیا سوسائٹی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اقبال انڈیا سوسائٹی کی نائب صدارت قبول کر لیں۔[21] لیکن لاہور سے چلنے سے چند گھنٹے قبل اقبال کو بخار ہو گیا اس لیے ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ آخر کار وہ ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ علی بخش بمبئی تک ان کے ساتھ رہا[22]۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر انہیں رخصت کرنے کے لیے احباب جمع تھے۔ اقبال نے کچھ دیر سر عبداللہ ہارون سے جو انہیں اتفاقاً مل گئے، سیاسی مسائل پر بات چیت کی۔ پھر عبدالمجید سالک کی فرمائش پر ''انقلاب'' کے لیے یہ پیغام دیا:

کوئی ایسا دستور اساسی جو مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو، ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی آزادی ہندوستان کی قوموں کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ ہندوستان کی آب و ہوا میں کوئی سمجھوتا ہندی اقوام کے درمیان نہیں ہو سکا حالانکہ کم از کم مسلمانوں نے اپنے بعض ضروری اقتصادی اور اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کر کے گذشتہ دس سال میں اس کے لیے کوشش بھی کی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ انگلستان کی فضا اور برطانوی مدبرین کا ''جینیس'' شاید اس گتھی کو سلجھا سکے جس کو ہندوستانی مدبرین نہیں سلجھا سکے۔ آخر میں میں اپنے ہندو بھائیوں اور خصوصاً ہندو اخبار نویسوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ؎

سخن درشت مگو در طریق یاری کوش

کہ صحبت من و تو درجہاں خدا ساز است۲۳

۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے سات بجے وہ دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر تقریباً تین ہزار افراد جمع تھے۔ بعض تو صبح چھ بجے سے منتظر کھڑے تھے۔ مولانا سید احمد، امام جامع مسجد دہلی، مولانا مظہر الدین مدیر سہ روزہ ''الامان''، حاجی محمد یوسف، سیکرٹری خلافت کمیٹی، نواب ابوالحسن خان اور سیّد نذیر نیازی کے علاوہ صوبہ مسلم کانفرنس دہلی، سنٹرل مسلم یوتھ لیگ، انجمن رفیق المسلمین، انجمن اتحاد و ترقی و انجمن تیموریہ کے ارکان اور محمد علی اسکول کے طلبہ و اساتذہ موجود تھے۔ اقبال کو متعدد سپاس نامے پیش کیے گئے، لیکن وقت کی قلت کے سبب انہوں نے تمام سپاسناموں کو سننے سے معذوری کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ دوران سفر خود پڑھ لیں گے۔

صرف مولانا سید احمد امام جامع مسجد دہلی نے صوبہ مسلم کانفرنس کی طرف سے سپاسنامہ پڑھ کر سنایا جس پر اراکین کانفرنس کے دستخط تھے۔ سپاسنامے کے جواب میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے، جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں، بلکہ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن مجید) ہے جس کی روشنی میں میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگرس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اب اگر لندن میں بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشل اٹانومی نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو

مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی۔ (نعرہ اللہ اکبر) اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستورِ اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمانانِ ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔ (نعرہ اللہ اکبر) سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرنے کا کام جیسا چاہیے تھا ہرگز نہیں کیا، لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لیے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہوں گی (نعرہ اللہ اکبر)[۲۴]۔

اقبال ۱۰ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں قیام کیا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت عطیہ فیضی نے ان کے اعزاز میں ایوانِ رفعت کے وسیع لان میں چائے پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں بمبئی کے اہلِ علم و فن بھی مدعو تھے۔ اقبال دیر سے آئے اور عطیہ فیضی سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ چائے سے فراغت کے بعد انہیں مہمانوں کے لیے کوئی پیغام دینے کی فرمائش کی گئی۔ اقبال نے کھڑے ہو کر چھوٹی سی تقریر کی اور پھر اپنا یہ شعر پڑھ کر بیٹھ گئے:

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد!

لوگوں نے اصرار کیا کہ ترجمہ کیا جائے۔ اس پر انہوں نے وہیں شعر کا انگریزی ترجمہ تحریر کروا دیا کہ زندگی ایسی خوبصورتی سے گزارو کہ اگر موت ہی سب کا انجام ہے تو خدا کو تمہاری زندگی ختم کرنے پر بجائے خود شرمندگی اٹھانی پڑے۔

اس کے بعد مہمانوں کو کوٹھی کے ایوان میں لے جایا گیا، جہاں رقص و سرود کی محفل آراستہ کی گئی تھی۔ کچھ دیر سازوں پر موسیقی کی دھنیں بجتی رہیں۔ اقبال بڑے عرصے کے بعد عطیہ فیضی کی معیت میں ان کی حاضر جوابی سے محظوظ ہو رہے تھے۔

اتنے میں کسی رقاصہ نے رقص کرنا شروع کیا اور ہر کوئی اس کے کمالات دیکھنے میں محو ہوگیا۔ اقبال نے کاغذ کا کی پرزہ منگوایا اور اس پر یہ اشعار لکھ کر عطیہ فیضی کے ہاتھ میں تھمادیے:

ترسم کہ تومی رانی زورق بسر آب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
بر کشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صورت دلآ ویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

چند لمحوں بعد ایک اور کاغذ کے پرزے پر یہ مزاحیہ مصرع اور عبارت تحریر کر کے عطیہ فیضی کو پیش کی:

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء ۲۵

ایوان رفعت پہنچنے سے بیشتر وہ سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل افغانستان مقیم بمبئی کے ہاں کھانے پر گئے تھے اور ان کے اور مرزا طاعت یزدی کے ساتھ شعرو شاعری کی پر لطف محفل میں شریک ہوئے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کو وہ ملوجا نامی جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوگئے۔ روانگی سے چند گھنٹے قبل ''بمبئی کرانکل'' کے نمائندہ خصوصی نے ان کا انٹرویو لیا۔

یہ انٹرویو خاصا دلچسپ ہے۔ اقبال نے گفتگو کی ابتداء میں واضح کیا کہ وہ کسی فرقے یا قوم کے متعلق تعصب نہیں رکھتے بلکہ صرف یہی چاہتے ہیں کہ ہندوستانی پر امن رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرقے کو اپنی تہذیب اور انفرادیت بر

قرار رکھنے کا موقع دیا جائے۔ انہیں سوال کیا گیا کہ پان اسلامزم کے متعلق ان کا تصوّر کیا ہے، جواب دیا کہ یہ اصطلاح ایک فرانسیسی صحافی کی اختراع ہے اور اس نے جن معانی میں اسے استعمال کیا ہے، ایسا پان اسلامزم سوائے اس کے تخیل کے اور کہیں بھی موجود نہیں۔ فرانسیسی صحافی اس اصطلاح کے ذریعے ایک ایسا ہوا کھڑا کرنا چاہتا تھا جو اس کے خیال کے مطابق دنیائے اسلام میں موجود تھا۔ یہ اصطلاح اسی طرح وضع کی گئی جیسے چینیوں یا جاپانیوں کے لیے خوف یا نفرت پیدا کرنے کی خاطر اصطلاح ''زرد خطرہ'' بنائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں یورپی جارجیت کو جائز قرار دیا جا سکے۔ بعد میں اس اصطلاح کو ایک قسم کی سازش کے طور پر ظاہر کیا گیا جو قسطنطنیہ میں تیار کی جا رہی تھی یعنی یہ کہ مسلمانان عالم تمام مسلم ریاستوں کے اتحاد کا ایک ایسا منصوبہ بنا رہے ہیں جو یورپ کے خلاف ہو گا۔ بہر حال اس اصطلاح کے استعمال کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ جو قرآنی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے پان اسلامزم کا کوئی سیاسی مقصد نہیں، بلکہ اتحاد انسانی کے لیے ایک معاشرتی تجربہ ہے۔ ان معانی میں پان اسلامزم سے مراد دراصل اتحاد انسانی ہے اور اس کے لیے لفظ ''پان'' استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ اصطلاح اسلام بجائے خود کافی ہے سوال کیا گیا کہ وہ برطانوی استعمار کو مذہبی سمجھتے ہیں۔ جواب دیا کہ تمام ریاستیں جو استحصال کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، غیر مذہبی ہیں۔ سوال کیا گیا سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ بالشوزم میں اگر خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام ہو گا، کیا وہ اب بھی اس نظریے کے حامی ہیں۔ جواب دیا کہ اسلام ایک سوشلسٹ مذہب ہے۔ قرآن مجید انفرادی ملکیت اور مکمل اشتراکیت کے بین بین نظام قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی ذاتی رائے میں جدید انسان کا ضمیر ایسے نظاموں میں جنہیں امپریلزم اور بالشوزم کہا جاتا ہے، بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی

سلطنتوں کے دن اب گزر چکے ہیں۔ اسی طرح بالشوزم بھی مکمل اشتراکیت کی ہیئت میں زیر ترمیم ہے۔ سوال کیا گیا کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر اقبال پر سیاستدان اقبال سبقت لے گیا ہے، اس لیے اس کا رویہ اس کی شاعری کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں رہا۔ جواب دیا گیا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے تصور قومیت میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ کٹر نیشنلسٹ تھے، لیکن اب نہیں رہے۔ یہ تبدیلی پختگی فکر کے سبب آئی۔ سوال کیا گیا کہ کیا وہ شاہی نظام کے حق میں ہیں۔ جواب دیا کہ وہ شاہی نظام قائم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں، مگر جمہوریت کے بھی دل سے قائل نہیں۔ وہ جمہوریت کو محض اس لیے برداشت کرتے ہیں کہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ سوال کیا گیا کہ ان کے خیال میں سیاست دان بننے کی بجائے اگر وہ شاعر ہی رہتے تو ملک کے لیے زیادہ فائدہ مند نہ ہوتے۔ جواب دیا کہ وہ اب بھی ادبیات میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں اور ان کا بیشتر وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ وہ ہر کسی سے کہیں زیادہ ایسی کانفرنسوں اور جمعیت اقوام جیسے اداروں کا پول کھولنے میں اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود گول میز؛ کانفرنس کے نتائج سے اپنی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اس تضاد کی کیا وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے جواب دینے کی بجائے اپنی آنکھیں جھپکیں اور اپنے مستقل ساتھی حُقے کی طرف رجوع کیا۔ سوال کیا گیا کہ وہ نیشنلزم کے مخالف کیوں ہیں۔ جواب دیا گیا کہ وہ اسے اسلام کے ارفع اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام نے دنیا میں پہلی بار نسل انسانی کو اتحاد اور روحانی ہم آہنگی کا سبق دیا تھا۔ سوال کیا گیا کہ عرب ممالک کے وفاق کے وجود میں آنے کے کیا امکانات ہیں۔ جواب دیا کہ وہ عرب ریاستوں کے وفاق پر یقین رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس کی راہ میں بعض بہت بڑی مشکلات حائل ہیں، لہٰذا وہ مستقبل میں ایسے وفاق کے وجود میں آنے کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔ فرمایا کہ ان کی

نظر میں موجودہ زمانے میں اسلام ہی ایک مثبت نظام حیات ہے، جسے مسلمان غور وفکر کے بعد عہد حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق نافذ کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندی مسلمان نے مستقبل میں اسلام کی سر بلندی کے لیے ایک نہایت اہم کردار ادا کرنا ہے۔ پس اسلام کے احیاء کا انحصار زیادہ تر نئی نسل پر ہے، جس نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کی ہے۔ علماء کو چاہیے کہ ان سیاسی اور معاشی مسائل کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں جو اسلام کو درپیش ہیں۔ کیونکہ ماضی کے متعلق ان کا علم مسلمانوں کی تعمیر نو کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ سوال کیا گیا کہ کیا وہ اسلامی ممالک کی سیاحت کریں گے۔ جواب دیا کہ انگلستان سے واپسی پر مصر جائیں گے اور جتنے مسلم ممالک کی سیاحت ممکن ہوسکی کریں گے تاکہ ان کے حالات کا مطالعہ کر کے ایک کتاب بعنوان ''جدید دنیائے اسلام'' تحریر کی جا سکے۔[۲۶]

۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے حکیم طاہر الدین موجد دلروز کے نام ''ملوجا'' جہاز سے ایک خط تحریر کیا جس میں سفر کے تمام حالات بڑی وضاحت سے بیان کیے۔ فرمایا:

بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوتی قونصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی۔ اِن کے ہاں پُر لطف محفل رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علوم دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں۔ ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں۔ ان کے دولت کدہ پر مرزا طلعت یزدی نے، جو بمبئی میں دس سال سے مقیم ہیں، ایرانی لہجے میں اپنے اشعار سنائے جو آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔ اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی، جہاں اہل ہوس بار نہیں پا سکتے:

بر سماع راست ہر تن چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکی انجیر نیست!

۱۲ ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے روانہ ہوئے، "ملوجا" جہاز کی وسعت کا حال علی بخش سے سنیے [۱۶]۔ کی شام کو عدن پہنچے۔ عدن یہ اسی سرزمین کا ٹکڑا ہے جس کی نسبت حالی مرحوم فرما گئے ہیں۔

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

میرا مقصد ساحل پر جانے کا نہ تھا، مگر ہمارے شہر کے ایک نوجوان شیخ عبداللہ نامی یہاں وکالت کرتے ہیں۔ وہ جہاز پر آئے اور باصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ کشتی پر سوار ہو کر ساحل پر اترے اور وہاں سے موٹر پر سوار ہو کر شیخ صاحب موصوف کے مکان پر پہنچے۔ وہاں مرغ پلاؤ، کباب، قورمہ سب کچھ حاضر تھا۔ کھانے کے بعد یمن کی سیاہ و تلخ و خوشگوار کافی کا دور چلا، آغا فکری ایرانی اور ایک اور ایرانی سوداگر سے ملاقات ہوئی۔ آغا فکری نہایت ہوشیار اور مستعد نوجوان ہیں۔ یمنی کافی کی تجارت کرتے ہیں۔ بے انتہا لسان ہیں۔ رخصت کے وقت انہوں نے مجھے ایک دانہ عقیق یمنی کا بطور یادگار کے عنایت فرمایا۔ ۲۲ سال ہوئے، جب میں نے عدن دیکھا تھا، اس وقت کچھ نہ تھا۔ اب ایک بارونق شہر ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ حضرموت کے عرب یہاں ساہوکار ہیں۔ پنجابی بھی بہت سے ہیں۔ خاص کر سندھ کے دکاندار۔ مسلمانوں میں سومالی قوم نہایت ہوشیار اور محنتی ہے۔ شیخ عبداللہ سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض آٹھ آٹھ دس دس زبانیں بلاتکلف بولتے ہیں۔ عدن میں عرب نوجوانوں کا ایک لٹریری کلب بھی ہے، مگر چونکہ رات کا وقت تھا کلب مذکور کے ممبروں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غرضیکہ رات کے ساڑھے دس بجے شیخ عبداللہ کے مکان سے رخصت ہو کر تقریباً گیارہ بجے اپنے جہاز پر پہنچے۔ جہاز ساڑھے گیارہ بجے رات روانہ ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو تقریباً ۳ بجے شب پورٹ سعید مقام

ہوا۔ یہ جگہ بھی بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ میں تو سو چکا تھا، مگر ایک مصری ڈاکٹر سلیمان نے آ جگایا۔ میں اُٹھا اور ان سے ملاقات کی۔ اتنے میں اور مصری نوجوان جو وہاں کے شبان المسلمین کے ممبر تھے۔ ملاقات کو آئے ان نوجوانوں سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ ایک مصری کرنل کی لڑکی بھی ملنے کے لیے آئی۔ یہ ہمارے جہاز میں انگلستان جا رہی ہے تا کہ علم نباتات کے مطالعے کی تکمیل کرے۔ پہلے چار برس وہاں رہ آئی ہے۔ انگریزی خوب بولتی ہے۔ عام طور پر اہل مصر فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولتے ہیں۔ اس لڑکی کا لہجہ بالکل انگریزی تھا۔ لطفی بے نے، جو قاہرہ کے ایک مشہور بیرسٹر ہیں، ڈاکٹر سلیمان کی زبانی سلام بھیجا اور واپسی پر قاہرہ آنے کی دعوت دی۔ ''رنپورہ'' جہاز پر، جس میں میرا سفر پہلے قرار پایا تھا، لطفی بے تشریف لائے تھے، مگر افسوس کہ میں حالات کی وجہ سے سفر نہ کر سکا۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہ پراپیگنڈا دیگر ممالک میں بھی کیا گیا ہے۔ پورٹ سعید پر تقریباً ہر مسلمان نوجوان نے مجھ سے سوال کیا لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں سے رفتہ رفتہ حجاب اٹھ رہا ہے میں نے ان کو ایک طویل لکچر دیا اور بتایا کہ ہندوستان کا پولٹیکل پرابلم کس طرح مسلمانانِ ہند پر موثر ہوتا ہے۔ میری گفتگو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکی طبیعت سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ تقریر کے بعض حصے انہوں نے نوٹ بھی کر لیے تھے...... جہاز تقریباً ساڑھے چھ بجے صبح روانہ ہوا اور مصری جوان صبح تک میرے کیبن میں بیٹھے رہے۔ واپسی پر انہوں نے ساحل سے مصری سگرٹوں کے دو ڈبے ہدیۃً ارسال کیے۔ بمبئی سے لے کر اس وقت تک جہاز ''ملوجا'' بحرِ روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے۔ سمندر بالکل خاموش ہے۔ طوفان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار رہا۔ البتہ بحر احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے۔ گرم مزاج کیوں

نہ ہو۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے، سمندر ہے، گویا قدرت الٰہی نے آسمان کے نیلگوں خیمے کو الٹ کر زمین پر بچھا دیا ہے۔ سفر کی مختصر روئیداد تو میں نے لکھ دی ہے۔ سویز کنال کے متعلق لکھنا بھول گیا۔ شاید ۱۹ ستمبر کو ہم سویز کنال میں داخل ہوئے۔ فراعنۂ مصر، قدیم ایرانیوں، مسلمانوں اور اہل فرنگ نے اپنے اپنے عروج وقوت کے زمانے میں اس نہر کے مٹے ہوئے نقوش کو ابھار کر اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس حیرت انگیز کنال کی اہمیت یعنی تجارتی اہمیت کا خاتمہ قریب ہے۔ سیاسی اعتبار سے صلح و جنگ کے زمانے میں ہر قوم کے جہاز اس میں سے گزر سکتے ہیں۔ سویز کنال کے بیشتر حصص انگریزی تصرف میں ہیں اور یہ غالباً اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی عیش پرستی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اس نے اپنے تمام حصص انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیے تھے۔ قریباً ڈھائی کروڑ پونڈ کی لاگت سے ایشیا اور یورپ کے سمندروں کو ملانے والی یہ آبی سڑک تیار ہوئی تھی۔ لیکن اب جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، شاید اس کی وہ اہمیت نہ رہے، جو اسے پہلے حاصل تھی۔ پرواز کی وسعت وترقی اور وسط ایشیا اور وسط یورپ میں ریلوے کی تعمیر سے دنیا کے دو بڑے حصوں میں جدید تجارتی رستوں کا کھل جانا، ایک نئی مگر خشک کنال کو معرض وجود میں لانے والا ہے۔ جس سے تجارتی اور سیاسی دنیا میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا۔ اگر آئندہ بیس پچیس سال میں ایسا ہوگیا تو طاقتور کمزور اور کمزور طاقت ور ہو جائیں گے۔ جہاز کی روزمرہ کی زندگی کی داستان نہایت مختصر ہے۔ میں اپنی قدیم عادت کے مطابق آفتاب نکلنے سے پہلے ہی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد دیگر حوائج سے فراغت پاتے پاتے بریک فاسٹ کا وقت آ جاتا ہے۔ بریک فاسٹ کے بعد عرشۂ جہاز پر ہم سفروں سے گفتگو یا گول میز کانفرنس پر جس کی خبریں لاسلکی کے ذریعے سے ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں۔ بحث و مباحثہ یا گزشتہ سال کی رپورٹوں کا مطالعہ۔ ہاں کبھی شعروشاعری بھی ہو جاتی ہے۔

سید علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں "الولد سرٌ لابیہ"۔ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام ادبیات اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ جہاز پر میں نے گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ وطن میں بھی کم کھاتا تھا۔ مگر یہاں تو صرف سبزی، ترکاری، مچھلی اور انڈے پر گزران ہے۔ ایک تو گوشت کی طرف رغبت بہت کم ہے، دوسرے ذبیحہ بھی مشتبہ ہے، البتہ غیر مشتبہ ذبیحہ بھی کبھی مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سر علی امام کی بیگم صاحبہ، کہ نیک نفسی اور شرافت کا مجسمہ ہیں۔ اپنے شوہر کے ہمراہ ہیں۔ ذبیحہ کے متعلق خاص طور پر محتاط ہیں۔ اپنا باورچی ساتھ لائی ہیں۔ ان کی عنایت سے غیر مشتبہ ذبیحہ اور مغلئی کھانا قریباً قریباً ہر روز ہماری میز تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں میرا حصہ بالعموم سبزی اور چاول تک محدود رہتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں سب کچھ لکھ گیا مگر ہم سفروں کے متعلق اب تک خاموش ہوں۔ ہمارے جہاز میں کچھ زیادہ مسافر نہیں۔ گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات، آٹھ ہیں۔ راجہ نریندر ناتھ صاحب بھی اسی جہاز پر ہیں، چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں "مغرب زدہ"۔ مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح جو شاید "معارف" نے وضع کی تھی، نہایت پر لطف ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظ قرآن ہیں، یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین، مقدم الذکر ہر روز ورد کرتے ہیں اور سنا ہے کہ ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔ سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے: دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھ نمناک ہو گئی اور بے اختیار ہو کر بولے: بلغ سلامی

روضته فیها النبی المحترم ۔ انکے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی ۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی ۔ باقی ہم سفروں میں مسٹر جسٹس سہروردی، شیخ مشیر حسین قدوائی اور اودھ کے دو نوجوان تعلقدار ہیں۔ قدوائی صاحب نہایت پُر جوش پان اسلامسٹ ہیں۔ تبلیغی فرائض سے کبھی غافل نہیں رہتے اور اودھ کے دو تعلقداروں میں ایک عربی خوب بولتے ہیں۔ دوسرے سمجھ لیتے ہیں مگر بول نہیں سکتے ان دونوں نوجوانوں کے والد مدتوں کربلائے معلّی میں مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی بول اور سمجھ سکتے ہیں ۔ یہ ہے اس مغرب زدہ قافلے کی مختصر کیفیت [۲۷]۔

پورٹ سعید میں چند گھنٹے قیام کے دوران میں حکیم محمد صدیق ناڑو نے رائٹر کے نمائندے کی حیثیت سے اقبال سے ملاقات کی ۔ انہوں نے مصری نوجوانوں کی موجودگی میں فرمایا:

ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغان، بلوچ اور سرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کرلیں گے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مصر آزاد ہو جائے، تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالے کردیں گے کہ ترک مسلمان ہیں؟ نیز کانگرس کا عدم تشدد محض انگریزی سنگینوں کے سامنے ہے ۔ ورنہ مرزا پور، کانپور اور سری نگر وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تشدد ہے [۲۸]۔

بعد میں انہوں نے بیان بھی دیا جس میں ارشاد کیا:

مصری لوگوں کو شبہ ہے کہ ہندی مسلمان آزادی کے راستے میں کانٹا ہیں ۔ اس میں ذرا صداقت نہیں ۔ اگر مصری اصحاب کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے تو اس لیے کہ ان اصحاب نے ہندوستان کی سیاست سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی ۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مصری اخبارات کے مندوبین ہندوستان آ کر مطالعہ کریں۔ ہندوستان میں مصری مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مصری مسلمانوں

نے قرآن، اللہ اور اسلام کو خیر باد کہہ دیا۔ حالانکہ یہ ایک شرارت ہے۲۹۔

اقبال ۲۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچ گئے۔ اور راقم کے نام تار بھیجا۔ میں بخیریت لندن پہنچ گیا ہوں۔ ''جاوید نامہ'' چھپوانے میں عجلت سے کام لیا جائے۔۳۰ لندن میں ان کا قیام ۱۱۳ اے سینٹ جیمز کورٹ بکنگھم گیٹ ایس ڈبلیو نمبر ا میں تھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو غلام رسول مہر بھی ان سے آ ملے۔ گول میز کانفرنس کے اجلاس سینٹ جیمز پیلس میں ہوتے تھے۔ جو قریب ہی تھا۔ اقبال تقریباً تیئس سال بعد یورپ آئے تھے۔ اور اس دوران میں مغربی دنیا میں خاصا تغیر آ چکا تھا۔ یورپ میں بالخصوص اٹلی اور جرمنی نئی قوتوں کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ چین میں انقلاب کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور جمعیت اقوام ایک قطعی غیر مؤثر ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جمعیت اقوام اس غرض سے وجود میں لائی گئی تھی کہ اقوام عالم کے قضیوں کا فیصلہ کرے۔ ان میں مفاہمت اور امن کی فضا پیدا کرے اور مستقبل میں جنگوں کو روکے۔ اس کا پہلا اجلاس جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ امریکہ اس کا رکن بننے پر رضامند نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ جمعیت اقوام نے نوآبادیاتی قوتوں کی ایک ایسی کلب کی صورت اختیار کر لی جو مغلوب اقوام کے استحصال کو جاری رکھنے کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ ۱۹۳۰ء میں عالمی معاشی بحران کے سبب امریکہ اور یورپ کی اقوام اپنے اپنے معاشی مسائل سلجھانے میں مصروف ہو گئیں اور جمعیت اقوام میں بین الاقوامی مسائل کے حل کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیت اقوام جنگوں کی روک تھام کرنے میں ناکام ہو گئی۔ ۱۹۳۱ء میں مشرق کی اہم ترین صنعتی طاقت جاپان نے مانچوریہ پر حملہ کر دیا۔ اور جب چین نے مداخلت کی استدعا کی تو جمعیت اقوام کچھ نہ کر سکتی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ابے سینیا پر قبضہ جما لیا تو تب بھی جمعیت اقوام بیکار ثابت ہوئی۔ بالآخر ۱۹۳۹ء میں جرمنی اور جاپان کے ہاتھوں دوسری جنگ عظیم کا

آغاز ہوا، لیکن اس سے قبل جمعیت اقوام نزع کے عالم میں پہنچ چکی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر مسولینی نے اٹلی میں فاشسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ اس کے قائد اعلیٰ کے طور پر اس نے پارلیمانی جمہوریت کو کالعدم قرار دے کر اقتدار خود سنبھال لیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ایک فاتح کی طرح روم میں مارچ کرتا ہوا داخل ہوا اور اٹلی کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اٹھارہ برس کی مدت تک اٹلی پر ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس دوران میں اس نے نوآبادیاتی طاقتوں کی نقل کرتے ہوئے اٹلی کے لیے ایک ایمپائر تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر کمزور ممالک پر غاصبانہ قبضے کا عمل شروع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ ہوا اور ٹیونس، مالٹا اور کارسیکا پر اٹلی کی حکمرانی کے حق میں دعویٰ کیا گیا۔ بالآخر ۱۹۳۹ء ہی میں مسولینی جرمنی کے آمر ہٹلر سے معاہدہ کر کے دوسری جنگ عظیم میں کود پڑا۔

ہٹلر کے دماغ میں اس خیال نے کہ جرمن قوم دنیا کی تمام اقوام میں غالب قوم کی حیثیت سے فضیلت کی حامل ہے، ایک خبط کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے جرمنی میں نیشنل، سوشلسٹ جرمن ورکرز یا نازی پارٹی قائم کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر گرفتار ہوا۔ جیل سے رہائی کے بعد اس نے نازی پارٹی میں نئی روح پھونکی۔ ۱۹۳۲ء تک نازی پارٹی جرمنی میں سب سے زیادہ طاقتور پارٹی بن چکی تھی۔ نازی پارٹی کی مضبوطی کے سبب ہٹلر ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو جرمنی کا چانسلر مقرر کیا گیا۔ چانسلر بنتے ہی اس نے جرمن ری پبلک کا خاتمہ کر دیا اور اپنے سیاسی مخالفین کو یا تو جیلوں میں ٹھونس دیا یا قتل کروا دیا۔ ہٹلر نے بارہ سال کی مدت تک جرمنی میں ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس دوران اس نے فیکٹریوں میں جنگی ساز و سامان کی پیداوار پر زور دے کر جرمن افواج کی تشکیل نو کی اور رفتہ رفتہ جرمنی کو ایک بے مثال عسکری قوت بنا دیا۔ اس مرحلے پر یورپی اقوام

جنگ کی خواہشمند نہ تھیں، اس لیے ۱۹۳۶ء میں جرمنی نے جب رائین لینڈ پر قبضہ کرلیا تو فرانس خاموش رہا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں جرمن فوجیں آسٹریا میں داخل ہوگئیں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سوڈیٹن لینڈ اور پھر چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرلیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ ہوا۔ بالآخر ہٹلر کے ہاتھوں یورپ میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا، جو آج تک کی انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ ہولناک جنگ قرار دی گئی ہے۔

اسی دور میں چین میں ماوزے تنگ کی زیر قیادت چینی کمیونسٹوں کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ چین ۱۹۱۲ء سے چیانگ کائی شیک کی کاؤمن ٹینگ یا نیشلسٹ پارٹی کے زیر اثر ری پبلک بن چکا تھا۔ چیانگ کائی شیک کی افواج نے نان کنگ میں اپنی حکومت قائم کررکھی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں چیانگ کائی شیک اور اس کی افواج نے چینی کمیونسٹوں کو پیچھے دھکیلا اور وہ پہاڑوں کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ ماؤزے تنگ نے منتشر چینی کمیونسٹوں کو اکٹھا کیا اور پھر اس کی قیادت میں چینی کمیونسٹوں کے دَل کے دَل پہاڑوں کے نہایت دشوار گزار اور انتہائی خطرناک رستوں سے گزرتے ہوئے شمال مغربی چین کے علاقے میں جا پہنچے۔ ماؤزے تنگ کی زیر قیادت لاکھوں چینی کمیونسٹوں کے اس طویل سفر یا معجزے کو لانگ مارچ کا نام دیا گیا۔ اسی لانگ مارچ کی بدولت ماؤزے تنگ چینیوں کے ایک عظیم قائد کی حیثیت سے ابھرا اور دنیا توقع کرنے لگی کہ عنقریب سرمایہ داری کے خلاف ایک اور جنگ ہونے والی ہے یا پرانے چین کی کوکھ سے ایک نیا چین پیدا ہونے والا ہے۔

اقبال کی دوربین نگاہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور وہ محسوس کررہے تھے کہ نظام عالم کسی نئی تشکیل کا محتاج ہے، مگر اس جدید تشکیل میں اسلام نے کیا کردار ادا کرنا ہے؟ یہ سوال ان کے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا۔ اور غالباً اسی سوال کے جواب کی خاطر انہوں نے چند سال بعد اپنے ایک خط محررہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء بنام سید سلیمان

ندوی میں تحریر کیا:

دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مد ہو سکتا ہے[۳۱]

۔

تئیس سال بعد یورپ کے سفر نے کئی پرانی یادیں بھی تازہ کر دی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال واپس لاہور آئے تو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ پہلی بیوی سے کشیدگی کی ناگوار صورتِ حالات، والد اور بھائی کی مفاہمت کے لیے کوششوں کے باوجود، بدستور قائم تھی۔ مالی مشکلات یا فراہمی روزگار کا مسئلہ بھی تھا۔ سو ازدواجی بے سکونی اور مالی مشکلات کے سبب اضطراب کی اس کیفیت میں ہندوستان میں تو عطیہ فیضی جیسی حاضر دماغ خاتون نے اپنی ہمدردانہ توجہ کے ذریعے انھیں جذباتی سہارا فراہم کیا لیکن اس دور میں ان کی خط و کتابت جرمنی میں ایما ویگے ناست سے بھی جاری تھی۔

۱۹۳۱ء میں لندن پہنچنے پر اقبال نے اپنے کسی پرانے جرمن دوست سے ایما ویگے ناست کا پتا معلوم کیا اور انھیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

براہ کرم مجھے خط لکھیے اور ان سارے برسوں کے دوران میں اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجیے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر مسرت ہو گی فی الحال ہمیں کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے۔ جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور

چند پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقع ملے گا۔ اتنے سال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہوگی۔ مجھے اطلاع دیجیے کہ کیا ابھی کچھ دیر آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی[۴۲]۔

ایماویگے ناست کا جواب آنے پر انہیں اپنے خط مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ کئی مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود آپ اپنی زندگی خندہ پیشانی سے بسر کر رہی ہیں۔ میں ہائیڈل برگ میں ان ایام کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا جب آپ نے مجھے گوئٹے کا فاوسٹ پڑھایا تھا۔ اور ہر طرح سے میری امداد کی تھی۔ وہ واقعی بڑے خوشگوار دن تھے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے وقت پر اختیار حاصل نہیں۔ اس لیے میں پوری کوشش کروں گا کہ ہائیڈل برگ پہنچوں اور آپ کو ایک بار پھر اسی جگہ ملوں۔ مجھے دریائے نیکر اب تک یاد ہے، جس کے کنارے پر ہم دونوں اکثر ٹہلا کرتے تھے، لیکن میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے میں کچھ مدت تک آپ کو بتا سکوں گا کہ روم جاتے ہوئے جرمنی آنا میرے لیے ممکن ہے یا نہیں۔ مجھے روم سے دعوت نامہ موصول ہوا ہے اور میں ہندوستان جانے سے بیشتر وہاں پہنچنے کا خواہشمند ہوں۔ میرے لیے یہ بتا دینا ضروری نہیں کہ میرے دل میں آپ سے ملنے اور ان بیتے ہوئے خوشگوار ایام کی یاد کو تازہ کرنے کی کس قدر تمنا ہے، جو افسوس ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گزر گئے[۴۴]۔

لیکن اقبال اپنے پروگرام میں تبدیلی کے سبب ہائیڈل برگ نہ جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایماویگے ناست کو اپنے خط محررہ ۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء میں اطلاع دی:

میں ہائیڈل برگ میں آپ سے ملنے کے لیے چشم براہ تھا، لیکن نہایت افسوس سے

بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پروگرام میں اچانک ردّوبدل کی مجبوری کے سبب اب میرے لیے جرمنی میں سے گزر کر جانا ممکن نہ ہو سکے گا، بلکہ سیدھا روم پہنچنا پڑے گا، جہاں سائنیور مارکونی نے مجھے مدعو کر رکھا ہے اور وہاں سے ۷ دسمبر کو بین الاقوامی مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے یروشلم جاؤں گا۔ مجھے زندگی میں آپ سے ایک بار پھر مل کر اور پرانی وابستگیوں کی یاد تازہ کر کے بے حد مسرت ہوتی، مگر بدقسمتی سے فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ بہر حال امکان ہے کہ میں اگلے سال پھر یورپ آؤں گا۔ اگر ایسا ہو سکا تو میں ہائیڈل برگ میں ضرور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا[۳۴]۔

اقبال لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، لیکن وہاں پہنچتے ہی مرجع علم و ادب بھی بن گئے۔ سو انگلستان میں ان کے مشاغل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کی مصروفیات اور علم و ادب کی محفلوں یا ان کے اعزاز میں دی گئی دعوتوں میں ان کی شمولیت۔

جہاں تک دوسری گول میز کانفرنس کا تعلق ہے، اقبال چونکہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب برقرار رکھنے کے حامی تھے، اس لیے زیادہ تر اقلیتی سب کمیٹی کی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ اس سب کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ اجلاس میں مہاتما گاندھی کا اصرار تھا کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر انصاری کو بلوایا جائے اور اگر انصاری نے مسلم مطالبات کی حمایت نہ کی تو وہ ان کا ساتھ دیں گے۔ مسلم نمائندوں کا موقف یہ تھا کہ مہاتما گاندھی اگر چاہیں تو ڈاکٹر انصاری کو اپنے طور پر بلا لیں، جو انہیں قابل قبول نہ تھا۔ لہٰذا اس اعتبار سے پہلا اجلاس بے فائدہ رہا اور اسے دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا تا کہ مختلف فرقوں کے نمائندے آپس میں غیر رسمی بات چیت کر کے معاملہ طے کر سکیں۔ ۳۰ ستمبر کو اقلیتی سب کمیٹی کا دوسرا اجلاس ہوا، لیکن مہاتما گاندھی کی تجویز پر مزید گفت و شنید کی خاطر

وہ بھی آٹھ دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اس وقفے میں پرائیویٹ طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں یا دیگر فرقوں کے مابین مصالحت کی بات چیت ہوتی رہی، مگر ایسی تمام کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ بالآخر ۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس میں مہاتما گاندھی نے افسوس کا اظہار کیا کہ مصالحتی گفتگو ناکام رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ تجویز پیش کی گئی کہ اقلیتی سب کمیٹی کو غیر معین عرصے کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ بعد ازاں سر محمد شفیع نے اپنی تقریر میں مہاتما گاندھی کی تجویز کی مخالفت کی، کیونکہ ان کی رائے میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے بغیر کسی قسم کے دستور کا بننا ممکن نہ تھا۔ آخر میں وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ اقلیتی سب کمیٹی کا اجلاس جاری رہے گا، لیکن اس کی تاریخ اور وقت کو ان کی فرصت پر چھوڑ دیا جائے۔ اقبال نے مسلم مطالبات کے متعلق اپنی تقریر لکھ تو رکھی تھی، لیکن اسے کسی اجلاس میں پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس مدت میں مختلف قسم کی تجاوز پیش کی گئیں اور ان میں سے بعض کی تفصیل لندن کے اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلے کے کسی قابل قبول حل کے متعلق فریقین میں کوئی خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو سکا اور اجلاس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہوا۔ اس سلسلے میں اقبال کا خط محررہ ۳؍ نومبر ۱۹۳۱ء بنام عبداللہ چغتائی قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

یہ دن بہت مصروفیت کے گزرے۔ مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں دفعہ پرائیویٹ گفتگوئے مصالحت کے لیے ملتوی ہو گئی۔ پرائیویٹ گفتگو بہت ہوئی مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ جس کا میں ممبر ہوں۔ شاید ۱۱ نومبر کو ہو اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مینارٹی کمیٹی کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے۔ یہ کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں ہوا [۳۵]۔

۱۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی کے اجلاس کے متعلق مسلم نمائندوں کا

خیال تھا کہ چونکہ کوئی فرقہ وارانہ تصفیہ نہیں ہو سکا اور مسلم مندوبین فرقہ وارانہ تصفیے کے بغیر دستور پر بحث میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے حکومت برطانیہ اس معاملے میں اپنے مسلک کا اعلان کر دے گی۔ مگر اس اجلاس میں انہوں نے محسوس کیا کہ حکومت برطانیہ مباحث کو آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اجلاس کی کاروائی میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ اس مرحلے پر مسلم نمائندوں کا آپس میں اختلاف ہو گیا۔ اقبال کا موقف تھا کہ مسلم وفد آئندہ دستور کے متعلق بحث سے قطعی لاتعلق رہے، بلکہ اجلاس سے علیحدگی کا اعلان کر دے۔ اصولی طور پر سر محمد شفیع اور محمد علی جناح نے ان کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن وہ کانفرنس کو ختم کرنے کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم وفد کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ مرکز کی ذمہ داری کے معاملات کے متعلق بحث جاری رکھی جائے مگر مسلمان ایسے کسی دستور کو قبول نہیں کریں گے جس میں ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے ہوں۔ اقبال اس فیصلے کے خلاف تھے۔ مسلم وفد میں کسی نے بھی اقبال کا ساتھ نہ دیا۔ اس لیے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور ۱۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو مسلم وفد کے رسمی سربراہ آغا خان کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا کہ وہ وفد سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ چند دنوں بعد انہوں نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بھی اطلاع دی کہ ان کا لندن میں ٹھہرنا بے کار ہے اور وہ ۲۱ نومبر ۱۹۱۳ء کو چلے جائیں گے[۳۶]۔

دوسری گول میز کانفرنس کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے مباحث میں کوئی عملی حصہ نہ لیا بلکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاسوں میں خاموش بیٹھے رہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ خاموش نہ بیٹھتے تو کیا کرتے، کیونکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس تو ہر دفعہ ملتوی ہوتے رہے، یہاں تک کہ انہیں اپنی لکھی ہوئی تقریر بھی پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ فرقہ دارانہ مصالحت کے لیے پرائیویٹ گفت و شنید میں انہوں نے کچھ حد تک حصہ لیا، مگر یہ ایک بیکار مشق سے زیادہ نہ تھا۔ اور بہر حال اس کا کوئی نتیجہ برآمد

نہ ہوا۔ برطانوی حکام سے غیر رسمی طور پر انہوں نے ریاست حیدر آباد کو ڈومینین اسٹیٹس دلوانے کی بات چیت کی، مگر سر اکبر حیدری نے ان کی تجویز کی مخالفت کی، جس کے سبب، بقول عظیم حسین، اقبال سر اکبر حیدری سے جھگڑ پڑے۔ کانفرنس کے آخری مراحل میں اقبال کا دیگر مسلم مندوبین سے اختلاف ہو گیا، کیونکہ وہ فرقہ وارانہ مصالحت کی عدم موجودگی میں مرکزی ذمہ داریوں کے مسئلے پر بحث میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ دیگر مسلم مندوبین نے گو اصولی طور پر ان کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن جب اجلاس میں پہنچے تو ایسا اعلان کرنے کی بجائے مصلحتاً خاموش رہے جس کا اقبال نے بُرا منایا اور دل برداشتگی کے عالم میں وفد سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ بحیثیت مجموعی اقبال دوسری گول میز کانفرنس کی کاروائی سے مایوس تھے۔ علاوہ ازیں مسلم وفد کے بعض اراکین کے کردار سے بھی انہیں مایوسی ہوئی۔ سر فضل حسین، جس کے ایما پر وائسرائے نے اقبال کو دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے نامزد کیا تھا، اقبال کے کردار سے مایوس تھے اور انڈین پبلک سروس کمیشن کی خالی اسامی کے لیے وہ اقبال کے تقرر کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان کی ذاتی ڈائری کا اندراج مورّخہ ۲۵ر نومبر ۱۹۳۱ء ملاحظہ ہو:

میں اقبال کے اس منصب پر تقرر کے لیے آخر تک پورا زور لگاتا اگر اس بیوقوف نے بذریعہ تار یہ اعلان نہ کیا ہوتا کہ اس نے گول میز کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے جبکہ دوسروں نے ایسا نہیں کیا۔[۳۷]

انگلستان میں قیام کے دوران میں اقبال کی دیگر مصروفیات کی تفصیل یہ ہے:

یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر سیموئیل ہور وزیر ہند ان سے اُن کی رہائش گاہ پر ملنے آئے اور ہندوستان کے دستور میں مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق گفتگو کی۔

۷ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو وہ ایران کے سابق وزیر اعظم سید ضیاء الدین طباطبائی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ سید ضیاء الدین طباطبائی ۱۹۲۱ء میں احمد شاہ قاچار کے عہد

میں ایران کے وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ جب رضا خان، (بعد میں رضا شاہ پہلوی) وزیر جنگ تھے، لیکن رضا خان سے اختلاف کے سبب انہوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفا دے دیا اور سوئٹزرلینڈ میں آباد ہو گئے۔ سید ضیاء الدین طباطبائی نو زبانیں بول سکتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کے حامی اور اتحاد عالم اسلامیہ کے پر جوش مبلغ تھے۔ وہ بھی اقبال کی طرح بیت المقدس میں منعقدہ مؤتمر اسلامی میں شریک ہوئے۔ لندن میں صرف چند دن کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اقبال نے انہیں ''جاوید نامہ'' کے بعض حصے پڑھ کر سنائے، جنہیں سُن کر انہوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ ایسے اشعار پہلے کبھی نہ سُنے تھے۔ ۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے عراق کے سفارت خانے میں دعوت طعام میں شرکت کی۔ ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو البانیہ کے سفیر کی دعوت میں شریک ہوئے۔ اسی روز ''سیٹر ڈے ریویو'' کے مدیر پنکھرڈ نے انہیں چائے پر بلایا۔ اس موقع پر برطانوی پریس کے لوگوں سے انہوں نے مختصر سی تقریر میں فرمایا:

انگریزوں کو بحر مردار کے مالی ذخائر اور دوسرے معاملات کا خیال ترک کر کے اخلاقی حیثیت سے اہل فلسطین کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بلفور کا اعلان منسوخ کر دیا جائے [۴۸]۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ظفر اللہ خان نے انہیں اور دیگر مسلم مندوبین کو شفیع ریستوران میں ایک پُر تکلف دعوت دی۔ یہ ریستوران امرتسر کے ایک باشندے محمد شفیع کی ملکیت تھا اور یہاں عمدہ دیسی کھانے کھلائے گئے۔ اگلے روز مولانا فرزند علی، امام لندن مسجد نے اقبال اور ان کے رفقا کو مسجد فضل میں بلوایا اور ان کا تعارف چند انگریز نومسلموں سے کرایا گیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ڈینی سن راس انہیں ملنے کے لیے آئے اور اقبال کے ساتھ دنیائے اسلام میں مذہبی تحریکوں بالخصوص بہائیت کے متعلق بات چیت کرتے رہے، وہ اگلے روز دوبارہ ملاقات کے لیے آئے کیونکہ

اس موضوع پر لیکچر دینے کے لیے انہوں نے دو ایک روز میں امریکہ جانا تھا۔[۴۴] ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقبال کے اعزاز میں نومسلم بیرونٹ ماوام فاطمتہ العابد نے رٹز ہوٹل میں ایک دعوت دی جس میں وہ شریک ہوئے۔ ۱۶اکتوبر ۱۹۳۱ء کو غازی رؤف بے انہیں ملنے کے لیے آئے اور تین گھنٹے تک اس کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ رؤف بے نے ترکی کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا، لیکن مصطفےٰ کمال سے اختلاف کی بنا پر ۱۹۲۴ء میں جلاوطن کر دیے گئے۔ اسی دن اقبال نے افغان قونصل خانے میں سردار احمد علی خان، وزیر مختار کی عظیم الشان دعوت میں شرکت کی جو محمد نادر شاہ کی تاجپوشی کی سالگرہ کے موقع پر دی گئی تھی۔ انہی دنوں میں سے کسی دن کیمبرج سے چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور دیگر مسلم طلبہ انہیں ملنے کے لیے آئے۔ بقول خواجہ عبدالرحیم، انہوں نے اقبال کو بتایا کہ شمال مغربی ہند میں ان کی تجویز کردہ مسلم ریاست کا نام ''پاکستان'' رکھا گیا ہے اور یہ لفظ مرکب ہے۔ کشمیر سمیت تین مسلم اکثریتی صوبوں کے ناموں کے پہلے حروف کا اور بلوچستان کے ''تان'' کا[۳۹]

۔ اقبال اس روز کچھ علیل تھے اور بستر پر دراز تھے۔ انہوں نے طلبہ سے کہا کہ ''پاکستان'' کے مختلف حروف کو علیحدہ علیحدہ گتے کے ٹکڑوں پر تحریر کر کے ان کے بستر کے اردگرد رکھ جائیں تاکہ وہ اس نام پر غور کر سکیں۔ طلبہ نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی اور چلے آئے۔ ۲۰اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سروجنی نائیڈو کی وساطت سے اسلامی ممالک کی سیاح خاتون روزیٹہ فاربیز نے انہیں گھر بلوایا اور قرآنی تعلیمات کے متعلق ان سے سوال پوچھے۔ اس کے بعد وہ لیڈی ہاٹوگ کی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو کرنل فیرر اور دو ایک روز بعد پروفیسر گب انہیں ملنے کے لیے آئے اور انہوں نے اقبال کو لندن یونیورسٹی میں لکچر دینے کی دعوت دی، لیکن مصروفیت کے سبب دعوت قبول نہ کی گئی۔ کرنل فیرر سے ہندوستان میں اسلامی تحریکات اور پروفیسر گب سے افریقہ میں اسلامی تحریکات کے موضوعات پر گفتگو

ہوئی۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سعید شامل، اقبال سے ملنے کے لیے آئے۔ سعید شامل شمالی قفقاز میں روسی کمیونسٹوں کے خلاف اپنے علاقوں کی آزادی کے لیے لڑ چکے تھے۔ وہ ان مسلم علاقوں پر روس کے مظالم کا ذکر کرتے رہے۔ ان کا مستقل قیام وارسا (پولینڈ) میں تھا اور وہ اشتراکیوں کے سخت مخالف تھے۔ اقبال نے انہیں بتایا کہ روسی اشتراکیت یورپی امپیریلزم کے خاتمے کے لیے ایک کارآمد عنصر ثابت ہوسکتی ہے، اس لیے مسلمانوں کو ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے کہ اس کی مخالفت نہ کی جائے، لیکن سعید شامل نے ان سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ روسی اشتراکیت بظاہر یورپی امپیریلزم سے بہتر معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت وہ بجائے خود ایک قسم کا امپیریلزم ہے۔ اقبال ان سے یہی کہتے رہے کہ مسلمانوں کی روسی اشتراکیت کی مخالفت سے یورپی امپیریلزم فائدہ اٹھائے گا۔ اس لیے یورپ کی اقتصادی برتری اور دیگر امراض کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس کا وجود ضروری ہے۔ اسی شام انہوں نے نواب احمد سعید خان چھتاری کی مسلم مندوبین کے لیے دعوت چائے میں شرکت کی۔ لندن میں اقبال کا تعارف نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی صدر مس مارگریٹ فارقوہرسن سے ہوچکا تھا۔ مس فارقوہرسن مسلمانوں کی ہمدرد تھیں اور ان کی نیشنل لیگ کا مقصد سلطنت برطانیہ کے مسلمانان عالم سے خوشگوار تعلقات قائم کرنا اور ان کے ساتھ زیادتیوں کے مداوا کی کوشش کرنا تھا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انہوں نے اقبال اور مولانا شوکت علی کی دعوت کی جس میں اپنے ہم خیال لوگوں کو مدعو کیا۔ دعوت سے فراغت کے بعد اقبال چند ساتھیوں کے ساتھ قوا کر زہال پہنچے اور قوا کر مرد اور عورتوں کو دعا میں مشغول دیکھا۔

۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو پانچ بجے شام اقبال نے لندن میں انڈیا سوسائٹی کے علمی اجتماع سے خطاب کیا۔ انڈیا سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے حاضرین سے ان کا تعارف کرایا۔ اقبال نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ ان کی شاعری میں

بعض فلسفیانہ خیالات موجود ہیں، لیکن ان کا کوئی منظم فلسفہ نہیں ہے۔ وہ انسان کے درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اشعار میں سے بعض کی تشریح کی اور اپنی شاعری کے اسلوب کی وضاحت کی۔ پھر فارسی کی چند تصانیف کا ذکر کیا اور آخر میں اپنی تازہ تصنیف "جاوید نامہ" (جو ان دنوں زیر طباعت تھی) کے موضوع کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے انسانی خودی یا انا کے بارے میں چند سوالات کے جواب دیے۔ رات کے کھانے کے لیے لارڈ اور لیڈی ارون کے ہاں گئے۔[40] ۱۸ نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال ایک دن کے لیے کیمبرج گئے۔ غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داؤدی ان کے ساتھ تھے، اسٹیشن پر چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور متعدد دیگر اصحاب استقبال کے لیے موجود تھے۔ پانچ بجے شام ان کے اعزاز میں یونیورسٹی آمرز ہوٹل میں دعوتِ چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی سمیت یونیورسٹی کے کئی اساتذہ موجود تھے۔ مصر کے ڈاکٹر سلیمان نے، جو انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن کیمبرج کے صدر تھے، اقبال کا تعارف دیگر مہمانوں سے کرایا۔ مجمع سے پروفیسر سورلے، پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی نے خطاب کیا۔ آخر میں اقبال نے تقریر کی۔ انہوں نے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ محفل میں پروفیسر براؤن اور پروفیسر میک ٹیگرٹ موجود نہیں۔ پھر فرمایا:

کانفرنس کے کام میں میری شرکت بلاواسطہ نہیں بالواسطہ ہے۔ یہاں ہندوستان کی مختلف قوموں کی تقدیروں کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس کام میں شریک ہو کر میں بھی اپنے رفقا کاروں کا ہاتھ بٹاؤں جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ باہمی گفتگوؤں میں ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے اور ہم میں اتحاد نہیں ہو سکا میں ان

نوجوانوں کو جو کیمبرج میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں۔ چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیمبرج وہ سرچشمۂ علم و فضل ہے جس نے یورپی تہذیب و تمدن کی ترکیب میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت اور مادیت سے بچیں۔ اہل یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس سے انکی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہو گئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا میرا عقیدہ ہے کہ انسانی انا کائنات کا مرکز ہے۔ یہ اوّلین نقطۂ نظر ہے۔ فلسفی کثرت سے وحدت کی طرف آئے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کی طرف جائیں۔ میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پیش گوئیاں کی تھیں اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہو گئیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ دراصل اہل یورپ کی اسی غلطی کا نتیجہ تھی، جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور بالشوزم مذہب و حکومت کی علیحدگی کا طبعی نتیجہ ہے۔ میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں۔ چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بہت بڑے مجمع میں مجھ سے کہا گیا کہ میں عورتوں کو کوئی نصیحت کروں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیت کے چنگل سے بچائیں۔ مذہب بے حد ضروری چیز ہے۔ مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے[۱۴۱]۔

اقبال کے لندن کو خیر باد کہنے سے قبل ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو ہوٹل والڈورف میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان ٹی پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں تقریباً چار سو شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ دوسری گول میز کانفرنس

کے تمام اراکین اس دعوت میں موجود تھے۔ مہاتما گاندھی، سر تیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو، آغا خان، محمد علی جناح، سر عمر حیات ٹوانہ، سر محمد شفیع، سر ظفر اللہ خان، مولانا شوکت علی، سر اکبر حیدری، سر میرزا اسماعیل، سردار اجل سنگھ وغیرہ سب آئے تھے۔ بہت سے انگریز مہمان بھی تھے۔ خواتین کی خاصی تعداد تھی۔ اکابر علم و فضل بھی مدعو تھے اور لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ میں زیر تعلیم ہندو مسلم طلبہ، نیز غیر ہندوستانی طلبہ بھی شریک تھے۔ مسلم طلبہ میں چوہدری رحمت علی اور خواجہ عبدالرحیم پیش پیش تھے۔ مہمانوں کا استقبال ایک بڑے کمرے میں کیا گیا تھا۔ جہاں ہر آنے والے مہمان سے اقبال کا تعارف سر عمر حیات ٹوانہ کراتے تھے۔ چائے کا انتظام دو بڑے ہال کمروں میں کیا گیا تھا۔ چائے سے فراغت کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سر عبدالقادر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں پروفیسر نکلسن نے تقریر کی انہوں نے واضح کیا کہ اقبال اپنے کلام کے ذریعے ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں۔ جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے اور یہ پیغام دہریانہ مادیت کے خلاف ہے۔ ابتداء میں لوگوں نے گمان کیا کہ اقبال نطشے کے افکار کو فارسی جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں، مگر جس کسی نے بھی ان کے اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تعلیمات مختلف ہیں۔

پروفیسر نکلسن کی تقریر کے بعد نیاز محمد خان سیکرٹری اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے اقبال کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ایڈریس کے خاتمے پر اقبال نے میزبانوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ انگلستان آئے تھے تو انہوں نے کیا محسوس کیا تھا، وہ کس قسم کے خیالات لے کر وطن واپس گئے۔ انہیں مشرقی ادبیات میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنے کا خیال کیونکر آیا اور انہوں نے فارسی زبان میں اشعار کہنے کیوں شروع کیے۔ اس تقریر کا بیشتر حصہ اس کتاب کے دوسرے حصے میں پیش

کیا جا چکا ہے۔باقی حصہ مندرجہ ذیل ہے:

میں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، ان پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے۔حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ میں دہریت کی تبلیغ کرتا ہوں۔اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے کیا گیا۔سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا، اسے میں نے مختلف اشعار کے روپ میں پیش کیا ہے۔مثلاً

عشق ناپید وخرد مے گزدش صورت مار

گرچہ در کاسۂ زر لعل روانے دارد

میں مکرر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اگرچہ میرے ساتھ رفقار کی کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقاء کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد بڑھائیے۔میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند (جاوید اقبال) کو کی ہے۔

یعنی

کم خورو کم خواب و کم گفتار باش

گِرد خود گر دندہ چوں پُرکار باش

اور آپ کے سامنے وہی بات دہراتا ہوں جو میں نے صوفیوں سے کہی ہے

زمن گو صوفیان باصفارا

خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم

کہ بانورِ خودی بیند خدارا[۴۲]

بعد میں شیخ نور محمد اور عبداللہ یوسف علی نے بھی اقبال کی شاعری وفکر کے متعلق تقاریر کیں۔آخر میں سروجنی نائیڈو نے ایک نہایت دلکش تقریر کی۔پھر

آغا خان کی تقریر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔[۴۳]

۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء کو نو بجے صبح اقبال مع غلام رسول مہر وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے روم روانہ ہوئے۔ انہیں رخصت کرنے کے لیے چند اصحاب آئے ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب فرانس کی بندرگاہ بولون سے وہ پلمین ریل کار میں سوار ہوئے اور چار بجے پیرس کے اسٹیشن گاردی نورد پہنچے۔ یہاں اقبال کے تار کی وجہ سے امراؤ سنگھ شیر گل استقبال کے لیے موجود تھے۔ پھر گاڑی گاردی لیاں اسٹیشن پر رکی۔ اس مقام پر اقبال شیدائی انہیں ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سو کچھ وقت اس کی معیت میں گزارنے کے بعد تقریباً پانچ بجے شام اقبال اور غلام رسول مہر کی ٹرین پیرس سے روانہ ہوئی۔ شب اور ۲۲ر نومبر ۱۹۳۱ء کا پورا دن سفر میں گزرا۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے گاڑی روم پہنچی۔ اسٹیشن پر اقبال کے دوست ڈاکٹر سکارپا (قونصل جنرل اٹلی مقیم بمبئی) اور اٹلی کی رائل اکادمی کی طرف سے روم یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ایرسٹا کو استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے اقبال اور غلام رسول مہر کو موٹر کار میں لے جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ رات کا کھانا ڈاکٹر سکارپا کے ساتھ کھایا گیا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۳۱ء کو ڈاکٹر سکارپا صبح آئے اور اقبال کو بعض اہل علم سے ملوانے کے لیے ساتھ لے گئے۔ واپسی پر تقریباً ایک بجے رائل اکادمی کے نائب صدر فارمیکی انہیں ملنے کے لیے ہوٹل میں آئے اور دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ تین بجے ایک فاضل اطالوی خاتون اقبال سے ملاقات کے لیے آئیں۔ شام کو ایک اطالوی بینکر کی بیوی آئیں جو ہندوستان کے علاوہ وسط ایشیا کے مختلف حصوں کی سیاحت کر چکی تھیں۔ پھر وزارت خارجہ کا ایک اہم رکن ملاقات کے لیے آیا۔

۲۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح تاریخی مقامات کی سیر کے لیے مخصوص تھی۔ سو اطالوی محکمہ آثارِ قدیمہ کا ایک افسر اور ایک جرمن خاتون جو انگریزی جانتی تھی، اقبال اور

غلام رسول مہر کو ہوٹل سے لے کولسیزیم یا ایمفی تھیٹر پہنچے۔ آثار قدیمہ کے ماہر نے بتایا کہ اس تماشا گاہ میں جہاں انسانوں اور درندوں کی لڑائی کرائی جاتی تھی۔ پچاس ہزار افراد کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اقبال نے غلام رسول مہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو ایک طرف قدیم رومی بادشاہ تھے، جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض سے بنوائی کہ پچاس ہزار آدمی اس میں بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشا دیکھیں اور دوسری طرف لاہور کی شاہی مسجد اس غرض کے لیے تعمیر کی گئی تھی کہ ایک لاکھ بندگان خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت او رمحبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کریں۔ اسی ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اسلام کیسی برکات وحسنات کا سرچشمہ ہے۔ یہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد قیصر اگسٹن کے بابِ فتح سے گزرتے ہوئے وہ فورم میں داخل ہوئے۔ پھر سپلیٹن کے حصے دیکھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد لوٹے۔ کچھ دیر ہوٹل میں آرام کر کے کٹیا کومب دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ یہ زمین دوز پُرپیچ رستے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے غاروں یا کئی منزلوں کے تہ خانوں میں رومی دور کے عیسائی ولیوں یا راہبوں کے جسمانی پنجر اور کھوپڑیاں ترتیب سے رکھی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر اقبال کے دل پر بہت اثر ہوا۔ فرمایا:

مذہب بھی کیا عجیب چیز ہے۔ کوئی دوسری قوت، عقیدے اور ایمان کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا مذہبی عقائد کے جوش میں ہوا۔ عقیدہ اصلاً غلط بھی ہو، لیکن مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ کر لیتا ہے تو انسان کے قوائے عمل میں عجیب وغریب حرارت پیدا کر دیتا ہے[۴۴]۔

کٹیا کومب کی زمین دوزی اور تاریکی پر بھی اقبال نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا:

اسلام سے قبل ہر مذہب کا رجحان تیرگی، ظلمت، اخفا اور اسرار کی طرف تھا۔ اسلام

پہلا مذہب ہے جس نے سورج کی روشنی میں خدائے واحد وقہار کی پرستش کی اور مذہب کو مستوری اور اخفا سے باہر نکالا۔ اور یہ حقیقت اسلام کی عبادت گاہوں اور ماقبل اسلام کی عبادت گاہوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔

شام کو پانچ بجے اٹلی کے معروف عالم پروفیسر جنٹیلی انہیں ملنے کے لیے آئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ مترجم کے فرائض ڈاکٹر سکارپا نے انجام دیے۔ زیر بحث مسائل تھے: کسی قوم کی تعمیر و تربیت میں شعرو موسیقی کا حصہ، روم کے آثار قدیمہ کے متعلق اقبال کے تاثرات اور یورپی تہذیب کا مستقبل۔ ڈاکٹر سکارپا نے اطالوی اخباروں اور رسالوں میں اشاعت کے لیے اقبال پر اپنے مضمون میں ان کے بعض اشعار کے علاوہ نظم سسلی کا ترجمہ بھی اطالوی زبان میں کر رکھا تھا۔ پروفیسر جنٹیلی چونکہ خود سسلی کے رہنے والے تھے، اس لیے انہوں نے ڈاکٹر سکارپا سے ترجمے کی ایک نقل حاصل کی۔ بعد ازاں اقبال نے ان کے ساتھ جا کر اس محکمے کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا جہاں پروفیسر جنٹیلی کی زیر نگرانی انسائیکلو پیڈیا اطالیہ کی ترتیب دی جا رہی تھی۔

۲۵ رنومبر ۱۹۳۱ء کو تین بجے اقبال اور غلام رسول مہر افغانستان کے سابق شاہ امان اللہ خان کے مکان پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں امان اللہ خان نے بتایا کہ کن حالات کے تحت انہیں افغانستان چھوڑنا پڑا۔ پھر افغانستان کے مستقبل کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

۲۶ رنومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے اٹلی کی رائل اکادمی میں لیکچر دیا۔ اس جلسے میں روم کے تمام اہل علم، دانشور اور یونیورسٹی کے پروفیسر مدعو تھے۔ نیز روم کی بعض اہم شخصیات اور کئی خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ اس لیکچر کے نوٹس جو اقبال نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اقبال کے خطوط اور تحریریں مرتبہ بی۔ اے ڈار (انگریزی)، صفحات ۸۰ تا ۸۶ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو شاہ امان اللہ اقبال سے ملاقات کے لیے ان کے ہوٹل میں آئے اور تقریباً دو گھنٹے تک ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اقبال نے انہیں رخصت کرتے وقت فرمایا:

پیر ما گفت جہاں بر روشے محکم نیست
از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد

اسی دن مسولینی نے اقبال کو مدعو کر رکھا تھا۔ مسولینی سے اقبال کی ملاقات کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت تو غلام رسول مہر کی ہے۔ اِن کے بیان کے مطابق ڈاکٹر سکارپا مترجم کی حیثیت سے اقبال کے ساتھ گئے۔ مسولینی نہایت تپاک سے ملا، مگر ملاقات زیادہ طویل نہ تھی۔ اقبال کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی۔ مسولینی نے پیشکش کی کہ اقبال حکومت اطالیہ کے خرچ پر لیبیا جائیں۔ اور دیکھیں کہ عربوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اس مشاہدے کے بعد مشورہ دیں کہ حکومت اطالیہ کو مزید کیا کچھ کرنا چاہیے، لیکن اقبال نے فرصت نہ ہونے کا عذر کر کے اس پیشکش کو رد کر دیا۔

دوسری روایت سر مالکم ڈارلنگ کی ہے جس نے ۱۹۳۴ء میں اقبال سے لاہور میں ملاقات کی تھی اور بقول اس کے اقبال نے مسولینی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مسولینی سے اُن کی ملاقات ایک وسیع و عریض ہال میں ہوئی۔ جو اس کا دفتر تھا۔ ہال کے ایک سرے پر اونچے پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے بڑے سے بینر کے پیچھے ایک شاندار کرسی پر مسولینی بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ اقبال کو اس حد تک پہنچنے کے لیے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ کون آ رہا ہے۔ جب وہ پلیٹ فارم کے قریب پہنچے تو اس نے نظریں اٹھائیں اور ان کی طرف بڑھ کر پر تپاک طریقے سے مصافحہ کیا۔ یہ ملاقات تقریباً چالیس منٹ تک جاری رہی۔ مسولینی نے اقبال سے اٹلی کے متعلق ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہے۔ اقبال

نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رائے میں اطالوی لوگ ایرانیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ بڑے خوب رو، فن پرست اور ذہین و فطین ہیں اور ان کا عظیم الشان ماضی تہذیب و تمدن کی کئی صدیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مگر ان میں خون نہیں ہے، اس پر مسولینی نے انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ اقبال نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایرانیوں کو ایک فائدہ حاصل ہے جو بدقسمتی سے اطالویوں کو حاصل نہیں اور وہ یہ ہے کہ ایرانیوں کے اردگرد توانا قومیں ترک، افغان اور کرد آباد ہیں، جن سے تازہ خون حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن اطالویوں کے لیے ایسی صورت موجود نہیں۔ مسولینی نے پوچھا کہ پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے جواب دیا کہ یورپ سے مُنہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو۔ یورپ کا اخلاق رو بہ تنزل ہے، لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے اور اس میں سانس لینا چاہیے۔ بعد ازاں مسولینی نے اقبال کو خط لکھ کر پوچھا کہ اٹلی میں آباد مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی تجویز پیش کریں۔ اقبال نے مشورہ دیا کہ روم میں ایک مسجد تعمیر کی جائے اور سلرنو میں علماء کی ایک کانفرنس بلوانے کا اہتمام کیا جائے کیونکہ سلرنو کو مسلم حلقے ایک قدیم اسلامی شہر تصور کرتے ہیں۔ مسولینی سے ملاقات کے اختتام پر جب اقبال قصر وینس سے باہر نکلے تو انہیں صحافیوں نے گھیر لیا اور پوچھا کہ ڈوچے کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ اس خوف سے اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ کہیں پوپ اسے ناپسند نہ کرے، لیکن صحافیوں نے انہیں نہ چھوڑا۔ بالآخر اقبال نے بہ عالم مجبوری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کا دوچے ایک لوتھر ہے مگر بغیر انجیل کے''۔

تیسری روایت فقیر سید وحید الدین نے اپنی تصنیف میں پیش کی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

انہیں (اٹلی میں) مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ساری کیفیت میں نے خود

ان کی زبانی سنی ہے۔انہوں نے خود مسولینی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی، بلکہ جن دنوں وہ روما میں مقیم تھے، مسولینی نے اپنے سٹاف کے آدمی کے ذریعے انہیں کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی اور مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے۔وہ ایک بڑے وسیع کمرے میں میز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پیشوائی کے لیے بڑھا۔اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔رسمی مزاج پُرسی کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے انہوں نے جواب دیا: آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو گا۔لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مسولینی کے ذہن میں آسانی سے آ جاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسولینی کو یہ مشورہ دیا کہ یورپ سے اپنا مُنہ موڑ لو(یعنی یہ کہ یورپ جس معاشرہ کی ترقی کا داعی ہے تم اس کی تقلید سے اجتناب کرو)مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے کہا: مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبہ کو اٹلی بلوائیے۔مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا۔انہوں نے کہا: ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اُسے حد سے نہ بڑھنے دو۔اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔مسولینی نے حیران ہو کر کہا: اس میں کیا مصلحت ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے۔اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکات شر لے لیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے کہا: یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں

ہے بلکہ میرے پیغمبرؐ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔ یہ حدیث سُنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا: کتنا اُچھوتا خیال ہے۔[۴۵]

ان تینوں روایتوں میں سے کون سی درست ہے؟ یہ بتانا تو ممکن نہیں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اقبال ملاقات کے وقت واقعی مسولینی کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔ آل احمد سرور کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء میں فرماتے ہیں:

مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندۂ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں۔ تو اس کا میں کیا علاج کروں۔ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جس کو شعاع آفتاب سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے اس قسم کا احساس ہوا[۴۶]۔

اقبال نے مسولینی کی نگاہ کی جس ناممکن البیان تیزی کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل ذہنی طور پر بیمار مجرموں یا قاتلوں کی نگاہوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایسی تیزی انتہائی بے چینی کی علامت ہوتی ہے اور اس ناممکن البیان بے چینی ہی کے عالم میں کسی بڑے جرم یا قتل کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ بہر حال جب اقبال، مسولینی سے ملے تو وہ اپنے عُروج پر تھا اور اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اطالوی قوم میں زندگی کی نئی روح پھونکی تھی اور اس کے جوشِ خطابت کے سبب نوجوانوں کے سینے آرزوؤں سے تنے ہوئے تھے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی تعمیری کام میں

مصروف تھا۔ ملک تیزی سے ترقی کی طرف رواں تھا اور اقبال کو یقین تھا کہ اطالوی نوجوانوں کی گرم جوشی ان کے عمل کی شگفتگی اور جذبات کی بلندی مسولینی ہی کے فیض نظر یا کرامت کا نتیجہ ہے، مگر ۱۹۳۵ء میں جب مسولینی نے ایبے سینیا پر حملہ کر کے اس چھوٹے سے نادار ملک پر قبضہ کرلیا تو وہ ان کی نگاہوں میں گر گیا اور اقبال اسے بھیڑیے کی قسم کا درندہ تصور کرنے لگے۔ مسولینی کے قتل کے بعد جس کسی نے بھی شہر میلان میں اس کی لاش کو الٹا لٹکتے ہوئے دیکھا ہے وہ نہیں جان سکتا کہ یہی مسولینی جو بالآخر اطالوی قوم کی تباہی و بربادی کا باعث بنا، چند سال قبل اس قوم کے نجات دہندہ کی حیثیت سے پرستش کیا جاتا تھا۔ اقبال اپنی زندگی میں بعض سیاسی شخصیات سے ایسے ہی متاثر ہوئے تھے۔ گو بعد میں انہیں کسی نہ کسی بنا پر مایوس ہونا پڑا۔ اسی طرح شاہ امان اللہ خان سے توقعات وابستہ کیں کہ وہ افغانستان میں نئی روح پھونکیں گے، لیکن امان اللہ کو اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا۔ اسی طرح محمد نادر شاہ سے توقعات وابستہ کیں کہ وہ افغانستان کے اسلامی تشخص کو اُجاگر کریں گے، مگر نادر شاہ کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔ ترکی کے مصطفےٰ کمال اور ایران کے رضا شاہ پہلوی سے بھی اقبال وقتی طور پر متاثر ہوئے، لیکن بالآخر وہ ان دونوں سے نا امید اور مایوس ہوئے اور اسی نا امیدی اور مایوسی کے عالم میں فرمایا:

مری نوا سے گریبان لالہ چاک ہوا
نسیم صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دارورسن کی تلاش میں ہے ابھی

۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء ہی کے دن روم کے بعض اخباروں میں اقبال کی تصویریں یا

ان کی شاعری وفکر پر مضامین شائع ہوئے ۔ نظم سسلی کے چند حصوں کا اطالوی ترجمہ بھی اقبال کے رائل اکادمی میں لکچر کے اقتباسات کے ساتھ چھپا۔ سسلی کی ایک متمول خاتون اقبال کو کئی مرتبہ ملنے کے لیے آئیں اور انہیں سسلی میں اپنے محل میں ایک ماہ کے لیے قیام کرنے پر مجبور کرتی رہیں تا کہ وہ انہیں اسلامی تمدن کے آثار دکھا سکیں، لیکن اقبال نے وقت کی قلت کے سبب یہ دعوت قبول نہ کی ۔ اقبال کو لندن میں طالب علمی کے زمانے سے جاننے والی نیپلز کی بیرونس یا کاؤنٹس کارینوالے بھی روم میں انہیں بار ہا ملنے کے لیے آئیں۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ کاؤنٹس کا رینوائے ہی نے مسولینی سے اقبال کی ملاقات کرائی تھی ۔ کاؤنٹس کارینوالے اقبال کے اعزاز میں دعوت دینا چاہتی تھیں ۔ اقبال نے یہ دعوت اس شرط پر قبول کر لی کہ وہ اس میں روم کی حسین ترین خواتین کو مدعو کریں گی ۔ یہ عظیم الشان دعوت ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کی شب کو انہوں نے روم میں اپنے ویلا میں دی [۴۷] ۔ اس سے پیشتر شام کو نیپلز سے اٹلی کی اسمبلی کے ایک رکن بیرن رابرٹو ریکا ڈی اقبال سے ملاقات کے لیے ہوٹل میں آئے ۔ اور انہیں نیپلز آنے کی دعوت دی تا کہ وہ پمپئی کے کھنڈر اور آتش فشاں ماؤنٹ ویسوویس دکھا سکیں ۔ اقبال نے ان کے اصرار پر دعوت قبول کر لی۔

چنانچہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر نیپلز پہنچے ۔ بیرن ریکا ڈی کے بیٹے نے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سے پمپئی گئے اور دو گھنٹے تک کھنڈروں کی سیر کرتے رہے ۔ تیز بارش کے باعث ماؤنٹ ویسوویس کی چوٹی پر نہ جا سکے ۔ شام کو نیپلز کا میوزیم دیکھا۔ پھر بیرن ریکا ڑوی کے مکان پر پہنچے جو اقبال کے استقبال کی خاطر روم سے نیپلز آ گئے تھے ۔ رات کا کھانا بیرن ریکا رڈی کے ساتھ کھایا۔ بعد ازاں ریکا ڈی انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے آئے اور ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء کو ساڑھے گیارہ بجے رات اقبال اور غلام رسول مہر نیپلز سے روانہ ہو

کر اگلے روز برنڈزی پہنچے۔

۲۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو سہ پہر کے وقت بارش اور تند و تیز ہوا میں اقبال، غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داؤدی (جو انہیں یہاں آ ملے تھے) ''وکٹوریہ'' نامی جہاز کے ذریعے برنڈزی سے اسکندریہ (مصر) روانہ ہوئے اور دو دن کے سمندری سفر کے بعد یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح نو بجے اسکندریہ پہنچے۔ بندرگاہ پر پرنس عمر طوسون کے خاص آدمی جمعیۃ الشبان المسلمین کے چند ارکان، صدیق محمد ناڑو، مولانا شوکت علی، اور دیگر اصحاب جو ان کی آمد سے قبل روم سے سیدھے یہاں پہنچ چکے تھے، ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ شبان المسلمین کے ارکان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ انہوں نے استقبال میں نعرے بلند کیے اور اخباری نمائندوں نے اقبال او ران کے رفقا کی تصویریں کھینچیں۔ وہاں سے سب پرنس عمر طوسون کی موٹروں میں سوار ہو کر پہلے تو شاہی محل گئے، جہاں انہوں نے شاہ فواد کے ملاقاتیوں کی کتاب پر دستخط کیے اور پھر پرنس عمر طوسون کی رہائش گاہ پر پہنچ کر کچھ دیر آرام کیا۔ پرنس عمر طوسون خود اسکندریہ میں موجود نہ تھے۔ لیکن مہمانوں کی دیکھ بھال کا سارا انتظام انہی کا تھا۔ آرام کرنے کے بعد اقبال نے اسکندریہ شہر کی سیر کی۔ شبان المسلمین کے دفتر میں گئے۔ بعض اہل علم سے ملے اور اخباروں کے لیے انٹرویو دیا۔ پھر تین بجے بذریعہ ریل قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے اور چھ بجے شام قاہرہ پہنچے۔ اسٹیشن پر شبان المسلمین کے ارکان، چند ممبر پارلیمنٹ، اخبارات و رسائل کے مدیر، قاہرہ میں مقیم ہندوستانی مسلمان اور جامعہ ازہر کے ہندوستانی طلبہ ان کے استقبال کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ قاہرہ میں اقبال کا قیام میٹروپولیٹن ہوٹل میں تھا۔ لیکن اس رات کا کھانا انہوں نے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے ممبر پارلیمنٹ کے ہاں کھایا، جہاں شیخ الازہر مفتی ازہر محمد علی پاشا، سابق وزیر اوقاف اور دیگر اکابرین سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اخباری نمائندوں نے اقبال کو شبان مصر کے لیے کوئی پیغام دینے کو کہا،

فرمایا کہ نوجوانان مصر سے میری آرزو ہے کہ پیغمبرؐ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وفادار رہیں۔ رات کے گیارہ بجے واپس ہوٹل آئے۔

اقبال نے محسوس کیا کہ مصر میں عام تاثر یہی ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مسلمان روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے قیام کے دوران میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور مصری صحافیوں کو ہندی مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت یا ان کے سیاسی موقف سے آگاہ کیا۔ مصر کی کئی اہم علمی شخصیتیں اقبال کی آمد کی منتظر تھیں۔ چنانچہ ان میں سے مشہور وکیل اور فلسفے پر متعدد کتب کے مصنف لطفی بے جمعہ نے قاہرہ میں اپنا بیشتر وقت اقبال کے ساتھ گزارا۔

۲/ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو محمد صدیق ناڑو، محمود احمد عرفانی اور ماسٹر امام دین کار میں اقبال کو آثار قدیمہ کی سیر کرانے لے گئے۔ انہوں نے قاہرہ سے دس میل کے فاصلے پر اہرام مصر کی سیر کی، دریائے نیل کے کنارے خوبصورت باغات میں گھومے۔ یہاں کئی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ ہرم اکبر، ہرم اوسط اور ہرم اصغر دیکھے۔ اہرام سے کچھ فاصلے پر ابوالہول دیکھا۔ واپسی پر قصر العینی گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہسپتال ہے جو علامہ بدرالدین عینی کے نام سے موسوم ہے۔ اس علاقے کے بازاروں میں پھرے۔ دوپہر کا کھانا شام کے تاجر محی الدین الحضی کے مکان پر کھایا جہاں وہ شام میں فرانسیسی استعمار کے خلاف برسوں جہاد کرنے والے شامی مجاہد ڈاکٹر عبدالرحمٰن شہبندر سے ملے۔ ڈاکٹر شہبندر کو اقبال نے ہندوستان کے صحیح حالات سے روشناس کرایا۔ بعد ازاں عرب ممالک کے حالات اور عربوں کے مستقبل کے مسائل زیر بحث آئے۔ ساڑے تین بجے واپس ہوٹل پہنچے جہاں کئی حضرات کو منتظر پایا اور جن سے ملاقات کی گئی۔

اسی دوران میں اقبال سے ملاقات کے لیے مصر کے مشہور صاحب طریقت بزرگ سید محمد ماضی ابوالعزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اقبال

انہیں یوں ہوٹل میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ کہا کہ حضرت آپ نے تکلیف کیوں کی، میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔ انہوں نے فرمایا:

خواجہ دو جہاں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے۔ تو مجھے خوشی ہو گی، لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں تا کہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں۔

اقبال اُن کی بات سُن کر بیتاب ہو گئے اور انہیں چپ سی لگ گئی۔ سید العزائم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے اور اقبال خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو اقبال سے نہ رہا گیا آنسوؤں کا سیلاب بے اختیار آنکھوں سے بہ نکلا۔ فرمایا:

ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاںؐ کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودیٔ آنحضرتؐ ملنے آتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد پروفیسر علی بے عبدالرزاق ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنی کسی تصنیف میں مذہب اور سیاست کی علیحدگی کے مسئلے پر بحث کی تھی۔ جس پر علمائے ازہر نے ان کے خلاف فتویٰ دے رکھا تھا۔ اقبال نے انہیں اس مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا اور ایسی علیحدگی کے نقصانات کی تفصیل بیان کی۔ اسی دوران میں مصطفیٰ نحاس پاشا رئیس حزب الوفد کا ٹیلی فون آیا کہ وہ اقبال کے منتظر ہیں۔ چنانچہ اقبال انہیں ملنے کے لیے بیت الامہ چلے گئے۔ مصطفیٰ نحاس پاشا نہایت خلوص سے پیش آئے۔ ملاقات کے وقت انہوں نے اقبال کا تعارف وفد پارٹی کے دیگر ارکان اور نحاس وزارت کے چند وزراء سے بھی کرایا۔ گفتگو زیادہ تر مصری اور ہندوستانی سیاست کے متعلق ہوئی۔ بعد ازاں اقبال، احمد ذکی پاشا شیخ العروبہ کے مکان پر گئے جو دریائے نیل کے کنارے واقع تھا اور رات کا کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ گفتگو مسئلہ فلسطین اور مؤتمر اسلامی کو کامیاب بنانے کے بارے میں ہوئی۔

۳ / دسمبر ۱۹۳۱ء کو دوپہر کے کھانے کی دعوت مرزا مہدی بے ایرانی کے ہاں

تھی۔ مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، شیخ ازہر اور دیگر اصحاب بھی مدعو تھے۔
چار بجے انہوں نے احمد ذکی پاشا کے گھر چائے کی پارٹی میں شرکت کی۔ پانچ بجے محمود پاشا عبدالرزاق کے یہاں تشریف لے گئے جہاں محمود پاشا رئیس حزب الاحرار، محمد علی پاشا، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مدیر "السیاسۃ" اور دیگر اہل علم سے ملاقات ہوئی۔ ابھی یہیں بیٹھے تھے کہ سید ابو العزائم کے فرزند کار لے کر پہنچ گئے اور بتایا کہ ان کے والد نے یاد فرمایا ہے۔ سو اقبال وہاں سے سید ابو العزائم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہاں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید ابو العزائم نے معمول کے مطابق اپنے ناصحانہ انداز میں کہا کہ جب مسلمانوں کی تعداد صرف چند لاکھ تھی تو دنیا کی عظیم سلطنتیں ان کے قدم چومتی تھیں اور آج جب وہ چالیس کروڑ ہیں، تو ہر جگہ کفار ان پر مسلط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا اور اس کی روح سے کنارہ کش ہو گئے۔
پھر اقبال کے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
اس دل میں اسلام کی محبت اور رسولؐ کی خاص شیفتگی نظر آتی ہے۔
سید ابو العزائم کے اشارے پر ایک مرید نہایت دلکش مصری لہجے میں سورۂ فتح سنانے لگا۔ جب اقبال جانے کے لیے اٹھے تو سید ابو العزائم کے مریدوں نے حضرت اقبال زندہ باد کے نعروں سے انہیں رخصت کیا۔
۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال قاہرہ کا میوزیم دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ پہلے فراعنہ کے عہد کے آثار اور توت اخ آمون کے مقبرے سے برآمد کردہ نوادر دیکھے۔ حضرت موسیٰ علیہ سلام کے دور کے فرعون کی، جو سمندر میں غرق ہوا تھا، لاش کی ممی بھی موجود تھی۔ لیکن قبطیوں کے اعتراض کے پیش نظر ان ایام میں اس کی نمائش نہ کی گئی تھی۔ پھر عربی دور کے میوزیم کو دیکھنے کے لیے گئے، جس میں اسلامی تمدن کی یادگاریں موجود تھیں۔ اِن نوادر میں امام غزالیؒ کا قلمدان اور عثمانی سلاطین

محمد فاتح، سلیمان اعظم اور سلیم یلدرم کی شمشیریں بھی تھیں۔ میوزیم سے واپس آ کر چار بجے شام جمعیتہ الرابطہ الہندیہ کی طرف سے چائے کی پارٹی میں شریک ہوئے۔ تقریب میں صدیق محمد ناڑو اور محمود احمد عرفانی نے اقبال کو سپاسنامہ پیش کیا اور لطفی بے جمعہ اور منیر الحضی نے خطاب کیا، اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں اراکین جمعیت کا شکریہ ادا کیا۔ اور مصر و ہندوستان کے مابین تعلقات کو مضبوط بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بعد میں سات بجے شام اقبال شبان المسلمین کے ارکان سے خطاب کرنے کے لیے شبان المسلمین کے دفتر پہنچے۔ ہال اہل علم سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اقبال کی تقریر انگریزی میں تھی۔ رات کے کھانے کی دعوت محمد علی پاشا کے ہاں تھی ۔اقبال نے ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی جن میں مسئلہ سود، قرون اولیٰ کی اسلامی فتوحات، دور جدید میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہندوستان کی سیاسیات نمایاں تھی۔

۵ / دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو سید ابو العزائم نے اپنی کار مع ڈرائیور بھیج دی تا کہ اقبال فسطاط (مصر کا قدیم اسلامی دار الخلافہ) دیکھ آئیں۔ سو اقبال اور غلام رسول مہر، شیخ محمود احمد عرفانی کی معیت میں فسطاط پہنچے اور سب سے پہلے جامعہ عمرو ابن العاص دیکھی ۔ اس مسجد میں ایک مقام پر صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک بزرگ ہستی نے نماز ادا کی تھی جس کے سبب لوگوں نے اس جگہ کو چاٹ چاٹ کر گڑھے بنا دیے تھے۔ مسجد کے صرف دو ستون سلامت رہ گئے تھے مگر چونکہ بعض ضعیف الاعتقاد لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مسجد کے باقی تمام ستونوں نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ دو ستون کافر رہ گئے اس لیے نماز کے بعد ہر نمازی ان ستونوں کو جوتے لگایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ حکومت مصر کو ان کی حفاظت کے لیے آہنی جنگلا لگانا پڑا۔ مسجد کے شمال میں عیسائی بادشاہوں کے محلوں یا گرجوں کے کھنڈر تھے۔ اور جنوب میں فسطاط شہر آباد تھا۔ گو اب وہ صرف کھنڈر ہی کی صورت میں باقی ہے۔ فسطاط سے کچھ

فاصلے پر پرانے قبرستان میں مملوک سلاطین اور خدیو خاندان کے افراد کی قبریں تھیں۔ اقبال نے قبروں پر فاتحہ پڑھی اور پھر امام شافعیؒ کے مزار پر پہنچے۔ مزار مربع کمرے پر قبہ کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ دیواروں پر نقش و نگار تھے۔ تربت زمین سے تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ اور اس پر سبز غلاف چڑھا ہوا تھا۔ اردگرد جالی لگی تھی۔ اقبال جالی کے باہر بیٹھ گئے۔ اور دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ بعد ازاں بانی خاندان خدیو کے قلعے اور تاریخی مساجد کی زیارت کرتے ہوئے جامعہ ازہر پہنچے۔ جامعہ ازہر کے منتظم محمد خالد حسنین بے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اقبال نے کچھ دیر طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر تفسیر، حدیث، اور منطق کے درس سنے۔ جامعہ کا نیا حصہ بھی دیکھا جہاں طلبہ کو علوم جدیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز طبیعیات، کیمیا وغیرہ کے شعبوں کا معائنہ کیا۔ جامعہ کے ایک استاد نے اقبال کی شان میں قصیدہ لکھ رکھا تھا، جو انہیں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس پر تمام طلبہ نے ''دکتور اقبال زندہ باد'' اور ''شاعر ہندی زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ پھر اقبال، شیخ الازہر شیخ مصطفیٰ المراغی سے ملنے گئے جو اپنے دفتر میں ان کے منتظر تھے۔ اقبال نے جامعہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ راستہ وہی ہے گو قافلہ بدل گیا ہے۔ اس لیے اگر آپ موجودہ قافلے کی، وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ضروریات کا خیال نہ کریں گے، تو مقصد کی تحصیل میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

جامعہ ازہر سے ماسٹر محمد رمضان کے گھر آئے اور کھانا کھایا۔ پھر سید ابو العزائم کے مکان پر پہنچے اور کچھ دیر ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ بعد ازاں ہوٹل پہنچ کر سامان ریلوے اسٹیشن بھجوایا اور خود ڈاکٹر شہبندر کے ہاں چائے کی دعوت میں شرکت کے لیے گئے۔ یہاں کئی شامی مجاہدین ان سے ملاقات کے منتظر تھے۔ نیز احمد ذکی پاشا، علی بے عبدالرزاق لطفی بے جمعہ، ڈاکٹر منصور فہمی، منیر الحصنی، احمد جمال پاشا الغزی وغیرہ اصحاب بھی موجود تھے۔ چائے سے فراغت کے بعد

سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر کئی مصری اور ہندوستانی اصحاب انہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پورے چھ بجے ریل فلسطین کے لیے روانہ ہوئی۔ اور اقبال مصریوں کی محبت و شفقت کا ایک انمٹ نقش اپنے دل میں لے کر رخصت ہو گئے۔[48]

اقبال اور غلام رسول مہر کی ٹرین بہنا، رزقازق اور اسماعیلیہ میں ٹھہرتی ہوئی تین گھنٹوں کے بعد قنطرہ پہنچی۔ اسمٰعیلیہ کے اسٹیشن پر پنجابی مسلمانوں کا ایک گروہ اقبال کے خیر مقدم کے لیے موجود تھا۔ جب گاڑی چلی تو انہوں نے زندہ باد کے نعروں سے اقبال کو رخصت کیا۔ قنطرہ کے مقام پر ٹرین بدلنا پڑی۔ یہاں سے گاڑی خان یونس، غزہ اور مجدل کے ریگستانی علاقے سے گزر کر لد پہنچی۔ لد میں انہوں نے پھر ٹرین بدلی اور اب گاڑی بحر روم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پہاڑی علاقہ کی طرف مڑ گئی۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس (یروشلم) پہنچے۔ بارش جاری تھی۔ اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے مفتی سید امین الحسینی، مولانا شوکت علی اور مؤتمر اسلامی کے منتظمین موجود تھے۔ مؤتمر اسلامی کے اجلاس حرم مقدس کے متصل روضۃ المعارف کی عمارت میں منعقد ہو رہے تھے۔ اس لیے مندوبین کو اس کے قریب مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ بعض حضرات پیلس ہوٹل (فندق بلاس) میں مقیم ہوئے۔ بعض جن میں مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور رؤف پاشا شامل تھے، روضۃ المعارف ہی میں ٹھہرے۔ اقبال اور غلام رسول مہر کا قیام گرینڈ ہوٹل (فندق مرقص) میں تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء تک بیشتر مندوب بیت المقدس پہنچ گئے تھے۔ یہ مؤتمر مفتی سید امین الحسینی اور ان کے رفقاء کی طرف سے اتحاد اسلامی کے نصب العین کی تحصیل کی خاطر منعقد کی گئی تھی اور اس کی دعوت کسی اسلامی حکومت نے نہ دی تھی۔ اس مؤتمر میں بیشتر اسلامی ممالک اور تقریباً ہر اہم اسلامی خطے کے نمائندوں نے شرکت کی۔ مراکش، ریف، الجزائر، تونس، نائجیریا،

سوڈان، مصر، طرابلس، شام، عراق، شرق اردن، فلسطین، حجاز، یمن، حضرموت، ایران، ترکی، چینی، ترکستان، روسی ترکستان، بخارا، قفقاز، ایرال، اورال، یوگوسلاویہ، ہندوستان، سیلون اور جاوا کے مسلم نمائندے شرکت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ان میں ارباب علم، اہل سیاست اور بزرگان دین بھی تھے اور مجاہدین حریت بھی۔

مؤتمر کا تعارفی اجلاس ۶ ردسمبر ۱۹۳۱ء کو شام چار بجے روضۃ المعارف کے وسیع وعریض ہال میں ہوا۔اس وقت خوب بارش ہو رہی تھی۔اجلاس کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔جس میں مندوبین کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا گیا۔کارروائی کے اختتام پر دیگر مندوبین کے ساتھ اقبال بھی رضا کاروں کی معیت میں مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔رضا کار مل کر عربی زبان میں قومی نغمے گاتے جارہے تھے۔رستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر اقبال رک گئے۔فاتحہ پڑھی اور پھر مسجد اقصےٰ پہنچے۔مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔نماز کے بعد مسجد اقصےٰ میں محفل اسراء منعقد ہوئی جس میں قرآن کریم کی تلاوت اور نعت خوانی کی گئی، چند اصحاب نے آیات اسراء کی تفسیر بیان کی۔محفل کے اختتام تک نماز عشاء کا وقت ہوگیا تھا اور مسجد اس وقت پوری طرح بھر چکی تھی۔سب نے نماز عشاء پڑھی۔

فراغت کے بعد مفتی سید امین الحسینی نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا:

اس مؤتمر کے انعقاد کا مقصد ہے کہ ہم کسی امت یا دین پر دراز دستی کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم کسی سے مخاصمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان یک جان اور یک آہنگ ہو کر اپنے مصالح کے لیے جدوجہد کریں[۴۹]۔

بعد ازاں انہوں نے مؤتمر کے مقاصد کی تفصیل یوں بیان کی:

۱۔ مسلمانوں کے اتحاد وتعاون کے لیے جدوجہد

۲۔ صحیح اسلامی اخوت کا نشوونما

۳۔ مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرائض کی طرف متوجہ کرنا، اور
۴۔ دین اسلام کو عوارض سے بچانا، عقاید کو الحاد سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تمدن کی اشاعت کرنا۔

ان کے بعد اقبال سمیت بعض مندوبین نے مختصر تقاریر کیں اور داعیان مؤتمر کی مساعی کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مصر کے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے برکت مقام کے پیش نظر اراکین سے التماس کی کہ سب کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے عہد کریں کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ اس پر سب نے کھڑے ہو کر عہد کیا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ یہ تقریب رات کے دس بجے اختتام پذیر ہوئی۔

۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مؤتمر کا اجلاس شروع ہوا۔ عارضی صدر اور سیکرٹریوں کے انتخاب کے لیے اہل عرب کے اصول پر عمل کیا گیا۔ یعنی مجمع میں سب سے معمر شخص صدر منتخب ہوئے۔ اور سب سے کم عمر دو مندوب، سیکرٹریوں کے طور پر چنے گئے۔ مفتی سید امین الاحسینی کو مستقل صدر کی حیثیت سے اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ اقبال، محمد علی پاشا (مصر) سید ضیاء الدین طباطبائی (ایران) اور سید محمد زبارہ (یمن) نائب صدر منتخب ہوئے۔ پھر سیکرٹریوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انتخابات سے فراغت کے بعد دنیائے اسلام سے مبارکباد کے تار اور پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ بعد ازاں مولانا شوکت علی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے سات کمیٹیوں کا تقرر ہوا جنہیں خصوصی مسائل کے بارے میں رپورٹیں اور قراردادیں ترتیب دینے کی ہدایات کی گئیں۔ وہ کمیٹیاں یہ تھیں: حجاز ریلوے کمیٹی، مسجد اقصےٰ کمیٹی، نشر و اشاعت کمیٹی، تبلیغ دین کمیٹی، اماکن المقدسہ کمیٹی، قانون اساسی کمیٹی اور مالی کمیٹی۔

اقبال نے مؤتمر کے اجلاسوں میں ۷ دسمبر ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء تک شرکت کی اور اس دوران میں پانچ کمیٹیوں کی رپورٹوں یا پیش کردہ قراردادوں

پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مثلاً حجاز ریلوے کمیٹی کی سفارش تھی کہ حجاز ریلوے وقف اسلامی ہے اور اسے مختلف غیر اسلامی حکومتوں کے قبضے سے نکال کر ایک بین الاقوامی مسلم مجلس انتظامہ کی تحویل میں لانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔ مسجد اقصیٰ کمیٹی کی سفارش تھی کہ بیت المقدس میں تعلیم کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جو تمام عالم اسلام کے مسلم طلبہ کو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے بے نیاز کردے۔ اقبال کو اس یونیورسٹی کے قیام سے اختلاف تھا۔ وہ کسی ایسی قدیم طرز کی یونیورسٹی کے قیام کے خلاف تھے۔ جس میں صرف علوم دینیہ کی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے میں ایسی یونیورسٹی میں جدید و قدیم دونوں قسم کے علوم کی دور جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دینا ضروری تھا۔ دوم، ان کے خیال میں تجویز نا قابل عمل تھی کیونکہ یہ توقع نہ رکھی جا سکتی تھی کہ عالم اسلام کے تمام مسلم طلبہ تعلیم کی خاطر صرف اس یونیورسٹی کی طرف رجوع کریں گے۔ سو ان کی نظر میں تعلیمی اعتبار سے بیت المقدس کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مدینہ منورہ، قاہرہ، تہران اور دمشق کو حاصل تھی۔ نیز بیت المقدس میں صیہونی خطرہ بھی تھا جو شہر کے امن و سکون کو ختم کر سکتا تھا۔

مالی کمیٹی کی سفارشات زیادہ تر روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے وسائل کے متعلق تھیں۔ نشر و اشاعت کمیٹی کے تجاویز عربی اور دیگر زبانوں میں رسائل کے اجراء اخبارات میں مضامین کی اشاعت، کتب کی تالیف اور لیکچروں کے اہتمام وغیرہ کے متعلق تھیں۔ اماکن المقدسہ کمیٹی کی تجاویز یہ تھیں: تمام عالم اسلام میں یہودیوں کے مال کا بائیکاٹ کرنا۔ فلسطینی مسلمانوں کو صیہونی قرضوں سے نجات دلانے کے لیے فلسطین میں زرعی بنک کا قیام عمل میں لانا۔ عالم اسلام کو صیہونی خطرے کی شدت سے آگاہ کرنا۔ فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور دیوار گریہ کمیشن کی سفارشات کی مخالفت کرنا وغیرہ۔

ان کمیٹیوں کی رپورٹوں اور قراردادوں کے علاوہ اسلام کے دیگر مسائل پر بھی بحثیں ہوئیں اور ان کے حل کی تدبیر پر غور کیا گیا۔ اس زمانے میں دنیائے اسلام کے بیشتر ملکوں پر یورپی نو آبادیاتی طاقتوں یا سوویٹ روس کا تسلط تھا۔ اس لیے مراکش، الجزائر اور تیونس کے مندوبین نے تو فرانسیسی حکام کی چیرہ دستیوں کی تفصیل بیان کی اور روسی ترکستان کے نمائندگان نے اشتراکی روس کے ظلم و ستم کی داستانیں سنائیں۔

بیت المقدس میں اپنے قیام کے دوران میں اقبال نے مسلم یتیموں اور معذوروں کی درس گاہ دارالایتام اور اس کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا اور فلسطینی بوائے اسکاؤٹوں کے عربی قومی گیت سنے۔ ایک شب مسلم طلبہ نے فتح اندلس کے موضوع پر ڈارمہ پیش کیا۔ جسے دیکھ کر اقبال بہت خوش ہوئے۔ حاضرین نے اصرار کیا کہ اقبال بھی اپنے اشعار سنائیں۔ سو موقع کی مناسبت سے انہوں نے طارق فاتح اندلس سے متعلق اپنے چند فارسی اشعار سنائے جن کا عربی ترجمہ ایک عراقی مجتہد نے کیا۔

بیت المقدس میں عربوں اور یہودیوں کے تعلقات نہایت کشیدہ تھے۔ حکومت برطانیہ صیہونیوں کی امداد کر رہی تھی اور ان کی بے پناہ دولت کے سبب مقامی فلسطینی غریب مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ساحلی مقامات اور دیگر مراکز پر قبضے کے بعد فلسطین کی تجارت و زراعت پر یہودی بڑی سرعت کے ساتھ حاوی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہودیوں نے مؤتمر کی بھی مخالفت کی لیکن مفتی سید امین الحسینی کی ہمت سے مؤتمر نہ صرف منعقد ہوئی بلکہ کامیاب بھی رہی۔

اقبال نے بیت المقدس میں مختلف مقاماتِ مقدسہ کی زیارت میں کچھ وقت گزارا۔ جبل زیتون جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت عیسٰیؑ نے وعظ کیا تھا، حضرت مریمؑ کا روضہ، بستان جسمانیہ جہاں حضرت عیسٰیؑ کو گرفتار کر دیا گیا، حضرت

زکریا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند کی قبریں، بیت المقدس شہر کے دروازے اور دیگر مقامات کی زیارت کی۔ اقبال نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء تک مؤتمر کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ قانون اساسی کمیٹی اور تبلیغ دین کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے، کیونکہ وہ ان کی روانگی کے بعد منعقد ہوئے۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو انہوں نے مؤتمر کے مندوبین سے الوداعی خطاب کیا۔ خطبہ انگریزی میں تھا لیکن اس کا عربی ترجمہ ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن عزام کرتے گئے۔ اقبال نے فرمایا:

افسوس کہ میں مؤتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقامات مقدسۂ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں جو انبیاء کی سرزمین ہے میں آپ لوگوں کو اس روحِ اخوت و مودّت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں۔ اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بُری چیز نہیں، لیکن اگر اس میں خاص اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اور افراط و تفریط ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں مجھے اسلام کے دشمنوں سے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔ آنحضرتؐ کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انا حظیکم من الانبیا وانتم حظی من الامم میں جب کبھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہؐ ہم پر فخر کریں، ہاں، جب ہم اس نور کو اپنے دلوں

میں زندہ کرلیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضورؐ ہم پر فخر کریں۔ مؤتمر کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔ اس کے سامنے اہم کام ہیں۔ خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعہ اسلامیہ کا قیام۔ لیکن اگر ہم اسلام و اخوت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کرلیں گے۔ اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روحِ اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔ ہمارا مستقبل خاص انہی کی مساعی پر موقوف ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب کے نوجوانوں میں میں نے وہ روح دیکھی ہے جو اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ عربی نوجوان بلندی مرتبت کی روحِ صادق سے معمور ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کریں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔

عرب کے اتحاد کے متعلق اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں مہدی سوڈانی کے منہ سے اپنے عقیدے کا اظہار پہلے ہی کر دیا تھا، گو اقبال کی یہ تصنیف ابھی زیرِ طباعت تھی:

گفت اے روحِ عرب بیدار شو
چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو
اے فواد! اے فیصل! اے ابن سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود!
زندہ کن درسینہ آں سوزے کہ رفت
در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت
خاک بطحا! خالدؓ ے دیگر بزاے

نغمۂ توحید را دیگر سرائے!

اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر

برنخیز داز تو فاروقے وگر!

اے جہانِ مومنانِ مشک فام

از تو می آید مرا بوے دوام!

زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر

تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر!

بر مقام خود نیائی تا بکے

استخوانم در بیے نالد چونے!

از بلا ترسی؟ حدیث مصطفٰےؐ است

مرد را روزِ بلا روزِ صفا است

لیکن فلسطین میں قیام کے دوران میں وہ فلسطینی عرب کے جوش وخروش سے یقیناً متاثر ہوئے چنانچہ بعد میں انہوں نے فرمایا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ

میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!

سنا ہے میں نے غلامی میں اُمتوں کی نجات!

خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے!

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ مفتی سید امین الحسینی، سید ضیاء الدین طباطبائی، سعید شامل اور دیگر اصحاب انہیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر آئے۔ چھ بجے شام گاڑی قنطرہ پہنچی، وہاں

سے ڈاکٹر سلیمان کی کار میں بیٹھ کر پورٹ سعید گئے۔ سفر کے دوران میں اقبال کی طبیعت ناساز ہوگئی، تاہم ڈاکٹر سلیمان کے علاج سے وہ اگلے روز ٹھیک ہو گئے۔ پورٹ سعید میں ۱۶ ردسمبر ۱۹۳۱ء کی رات کا کھانا انہوں نے ڈاکٹر سلیمان اور ان کی جرمن بیگم کے ساتھ کھایا۔ ۱۷ ردسمبر ۱۹۳۱ء کی شب صدیق محمد ناڑو کی دعوت میں شریک تھے اور وہیں اطلاع ملی کہ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا ہے۔ سوا سی رات تقریباً بارہ بجے "پلسنا" نامی جہاز میں سوار ہو گئے۔

۱۸ ردسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح چار بجے جہاز پورٹ سعید سے روانہ ہوا۔ اس جہاز میں مہاتما گاندھی ہندوستان جا رہے تھے۔ اُن کے علاوہ دیگر معروف شخصیتیں بھی اسی جہاز میں سفر کر رہی تھیں۔ مثلاً حیدرآباد دکن کے شہزادہ اعظم جاہ، شہزادہ معظم جاہ اور ان دونوں کی بیگمات، شہزادی درشہوار اور شہزادی نیلوفر، ان کی والدہ معزول سلطان ترکی عبدالمجید خان کی بیگم اور بیگم اکبر حیدری وغیرہ۔ عدن کی بندرگاہ پر جہاز چند گھنٹوں کے لیے رکا او راقبال گھنٹہ بھر سیر کے لیے اترے۔

۲۸ ردسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو جہاز بمبئی پہنچ گیا۔ اقبال کے استقبال کے لیے مولانا محمد عرفان اور خلافت کمیٹی کے بعض ارکان بندگاہ پر موجود تھے۔ دس بجے کے قریب اقبال خلافت ہاؤس پہنچے۔ عطیہ فیضی نے اس مرتبہ بھی اُن کے اعزاز میں ایوان رفعت میں دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اقبال نے دن بھر تو خلافت ہاؤس میں آرام کیا، لیکن شام کو آدھے گھنٹے کے لیے ایوان رفعت میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ریل ساڑھے سات بجے بمبئی سے روانہ ہوئی۔ چند احباب نے انہیں رخصت کیا۔ روانگی سے قبل اخبارات کے لیے صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات اور صوبائی خودمختاری کے حصول کے بارے میں ایک بیان دیا۔

۲۹ ردسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں حافظ محمد صدیق ملتانی رئیس دہلی نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور بڑی تعداد میں لوگ استقبال کے لیے

موجود تھے۔ اسٹیشن پر اقبال کو سپاسنامہ پیش کیا گیا اور وہیں انہوں نے کھانا کھایا۔ ٹرین دہلی سے روانہ ہو کر رات چار بجے لدھیانے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں بھی اقبال کے عقیدت مند پھولوں کے ہار لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال اس وقت سو رہے تھے، اس لیے انہیں بیدار نہ کیا گیا۔ امرتسر کے اسٹیشن پر بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح آٹھ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ اسٹیشن پر ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ سپاسنامہ پیش کرنے والے اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ بے شمار لوگوں نے اقبال کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور اسی حالت میں گھر پہنچے۔ ۵۰

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے نے ان سے گھر پر ملاقات کی اور سفر فلسطین کے متعلق سوالات پوچھے۔ اقبال نے کہا:

سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانۂ قیام میں متعدد اسلامی ممالک کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ جیسی میں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ میں نے اسلام، عیسائیت، اور صیہونیت کے بعض مشترکہ مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ خصوصاً حضرت عیسٰیؑ کے مقام ولادت سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی۔ مؤتمر شاندار طریق سے کامیاب رہی۔ اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک نے نمایندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کہ آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا۔ جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کر گئی تھیں...... ایک سب کمیٹی میں میں نے یروشلم میں قدیم جامع ازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی

بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلط فہمی کیونکر پیدا ہوگئی کہ میں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک تار بھیج دیا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ پُر زور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک ہی نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علوم جدیدہ کو زبانِ عربی میں تبدیل کر لیں ۵۱۔

نمائندہ مذکورہ کو گول میز کانفرنس کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے واضح کیا:

میں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا بلکہ صرف مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اور میں نے یہ بات آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے ماتحت کی تھی...... مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریقِ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور پر بحث و تمحیص ختم ہو چکی ہے دارالعوام میں وزیر اعظم اور سر سیمول ہور نے ان کے متعلق واضح بیان دے دیا ہے۔ اب جس مسئلہ کا تصفیہ باقی ہے۔ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے۔

جن ایام میں اقبال واپس آئے، ہندوستان کے حالات پھر سے خراب ہو چکے تھے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے متعلق دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے سبب مسلم ہند کا سیاسی مستقبل غیر یقینی تھا۔ کانگرس انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے درپے تھی۔ صوبہ سرحد میں عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب (جن کی سرخ پوش جماعت اگست ۱۹۳۰ء سے کانگرس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی) جیلوں میں بند تھے اور ان کے حامیوں کی ایجی ٹیشن کو سختی سے دبایا جا رہا تھا۔ ادھر تحریک کشمیر بھی اپنے زوروں پر تھی اور کشمیری مسلمان ریاستی حُکام کے ظلم کے دور سے گزر رہے تھے۔ اسی طرح ریاست الور میں بھی مسلمانوں پر تشدد کا دور دورہ تھا۔ مسلمانانِ الور کی بعض پرانی شکایتیں تھیں: مثلاً مساجد پر ریاستی

حکام کا قبضہ تھا۔ اسکولوں میں ۱۹۱۰ء سے اردو اور فارسی کی تعلیم ممنوع تھی، مذہبی تعلیم پر پابندیاں عائد تھیں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت کم حصہ دیا جاتا تھا۔ ان شکایتوں کے ازالے کے لیے مسلمانان الور نے ایک جماعت انجمن خدام الاسلام قائم کر رکھی تھی۔ مہاراجہ الور نے اس پر پابندی لگا دی۔ مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالے اور ریاستی نے ان حکام پر فائرنگ کی ۔ حالات اس قدر بگڑے کہ مسلمانوں نے ریاست سے ہجرت شروع کر دی، اور ریاستی حُکام مہاجرین کی جائدادیں ضبط کرنے لگے۔ مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۱ء میں طے پایا تھا کہ مسلمانان الور کی شکایت مہاراجہ الور کے سامنے رکھنے کے لیے ایک وفد مولانا شفیع داؤدی کی قیادت میں بھیجا جائے، لیکن مہاراجہ نے وفد کو ملاقات تک کی اجازت نہ دی۔ جون ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسلم کانفرنس نے مطالبہ کیا کہ حالات کی تحقیقات کے لیے ایک غیر جانبدار کمیٹی مقرر کی جائے، مگر مہاراجہ نے کوئی پروا نہ کی۔ بعد ازاں اس سلسلے میں مسلم کانفرنس کی طرف سے ایک یادداشت وائسرائے ہند کو پیش کی گئی جس میں مہاراجہ کے مظالم کی تفصیل درج تھی۔ بالآخر مہاراجہ کو گدی سے اترنا پڑا ۵۲۔

چونکہ ان دنوں مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ضروری تحریکات کی سب سے بڑی کفیل مسلم کانفرنس تھی، اس لیے ایسے تمام مسائل پر غور و فکر کرنے کی خاطر اس سیاسی تنظیم کی مجلس عاملہ کے اجلاس اکثر دہلی یا شملہ میں ہوتے رہتے تھے۔ سفر سے واپس آتے ہی اقبال کو بحیثیت ممبر مجلس عاملہ ان اجلاسوں میں شریک ہونا پڑا۔ علاوہ ازیں وہ اسی سال یعنی ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ دراصل آل انڈیا مسلم کانفرنس بحیثیت آل پارٹیز مسلم کانفرنس ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی تھی اور اقبال اس کے بانیوں میں سے تھے۔ ابتداً کانفرنس میں مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کے ارکان اکٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ محض وقتی کانفرنس نہ رہی بلکہ

اس نے ایک منظم سیاسی ادارے کی صورت اختیار کر لی اور ۱۹۳۴ء تک مسلم سیاست میں نہایت اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ عالم انتشار میں تھی۔ خلافت کمیٹی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دیگر مسلم سیاسی جماعتیں گو کثیر التعداد تھیں لیکن انفرادی طور پر غیر مؤثر تھیں اور ان میں سے بعض مثلاً مسلم نیشنلسٹ پارٹی یا جمعیت العلماء ہند تو مسلمانوں کی ترجمان نہ تھیں بلکہ کانگرس کی ہمنوا تھیں۔ مسلم کانفرنس کی ایک باقاعدہ مجلس عاملہ تھی، ایگزیکٹو بورڈ تھا اور اس کی شاخیں بھی مختلف صوبوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

اقبال کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۸ جنوری ۱۹۳۲ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ سید نذیر نیازی شام تک ان کی خدمت میں رہے اور وہ اسی رات واپس لاہور چلے آئے ۵۳۔ اسی طرح پھر ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو دہلی جانے کے لیے تیار ہوئے، لیکن چونکہ نقرس کی تکلیف بڑھ جانے کے سبب گرگابی نہ پہنی جاتی تھی، اس لیے غلام رسول مہر کی وساطت سے ورکنگ کمیٹی اور سیٹھ عبداللہ ہارون کی خدمت میں معذرت کر دی ۵۴۔

فروری ۱۹۳۲ء میں اقبال کی معروف تصنیف ''جاوید نامہ'' شائع ہوئی۔ اس کا تصور ۱۹۲۷ء سے ان کے ذہن میں تھا، لیکن لکھنے کا کام ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا ۵۵۔ اس کے موضوع کے متعلق انہوں نے خود ہی گذشتہ سال لندن میں انڈیا سوسائٹی کی تقریب میں ارشاد کیا تھا کہ یہ حقیقت میں ایشیا کی ''ڈیوائن کامیڈی'' ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف سیاروں کی سیر کرتا ہوا مختلف مشاہیر کی روحوں سے مل کر باتیں کرتا ہے۔ پھر جنت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے روبرو پہنچتا ہے۔ اس تصنیف میں دور حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیر بحث آ گئے ہیں۔ روداد میں دو شخصیتیں یورپ کی ہیں۔ اول کچنر اور دوم نطشے، باقی ساری شخصیتیں ایشیا کی ہیں۔ اس معراج نامے یا

آسمانی ڈرامے میں اقبال کی خضر طریق یا رفیق سفر مولانا رومی ہیں ۵۶۔

فروری ۱۹۳۲ء ہی میں ہندوستان کے اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے ترکی زبان میں قرآن کریم کی تلاوت اور ادائیگی نماز کے متعلق ایک حکم نافذ کر دیا ہے۔ اس خبر نے مسلمانان ہند میں بے چینی پھیلا دی اور سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا مسلمان عربی کے علاوہ بھی کسی زبان میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اخباری نمائندہ اقبال سے بھی ملا اور ان کا انٹرویو ویکلی اخبار ''لائٹ'' (انگریزی) مورخہ ۶ افروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اقبال سے سوال پوچھا گیا کہ کیا مصطفیٰ کمال کے نافذ کردہ قانون کی تاریخ اسلام میں کوئی مثال یا سند موجود ہے؟ اقبال نے جواب دیا کہ ایک مرحلے پر امام ابو حنیفہؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ ہر مسلمان اپنی زبان میں نماز ادا کر سکتا ہے، مگر بعد میں بستر مرگ پر انہوں نے اپنا فتویٰ منسوخ کر دیا۔ ابن طومارت نے بھی جنہیں مغربی افریقہ کے مہدی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قانون نافذ کیا تھا۔ لہٰذا جب ان کے مریدوں نے اندلس (اسپین) میں اقتدار حاصل کیا تو وہ بربر زبان میں اذان دیا کرتے تھے۔ اقبال کی رائے میں مصطفیٰ کمال کا یہ فعل ترقی پسندانہ نہ تھا، بلکہ رجعت پسندانہ تھا۔ زمانۂ قدیم کے تمام مذاہب نیشنل یا قومی ہوتے تھے۔ اس لیے ترکی زبان میں نماز پڑھوانے سے مراد یہی تھی کہ اسلام کو اس کی انسانی سطح سے گرا کر قومی سطح پر لے آیا جائے یا اسلام کو قبل از اسلام زمانے کے قدیم انسانوں کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اقبال نے فرمایا کہ ان کے ذاتی عقیدے کے مطابق عربی چونکہ وحی کی زبان ہے، اس لیے نماز جو فرائض میں شامل ہے، لازمی طور پر عربی زبان ہی میں ادا کی جانی چاہیے۔ البتہ ایسی عبادت کے متعلق جو فرائض میں شامل نہیں۔ علماء اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی زبان میں کی جا سکتی ہے یا نہیں ۵۷۔

فروری ۱۹۳۲ء کے آخر میں نواب بھوپال نے اقبال کو دہلی بلوایا۔ بات یہ تھی

کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں نواب بھوپال سے مدد طلب کی تھی اور نواب بھوپال اس بارے میں اقبال سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ بعض اقبال شناسوں کی رائے میں اقبال اسی سلسلے میں جولائی ۱۹۳۱ء میں بھی بھوپال تشریف لے گئے تھے اور اقبال ہی کی کوششوں سے قضیۂ کشمیر کو سلجھانے کی خاطر گلانسی کمیشن کا تقرر ہوا۔ لیکن راقم کو اس سلسلے میں اقبال کے جولائی ۱۹۳۱ء میں فی الواقع بھوپال پہنچنے یا گلانسی کمیشن کے تقرر کے متعلق ان کی مساعی کا کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ درست ہے کہ جولائی ۱۹۳۱ء میں اقبال نے بھوپال جانے کا قصد کیا تھا، جیسا کہ ان کے خطوط بنام غلام رسول مہر محررہ لاہور ۱۰/ جولائی ۱۹۳۱ء اور شملہ ۲۳/ جولائی ۱۹۳۱ء سے ظاہر ہوتا ہے ۵۸۔ لیکن ان تحریروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶/ جولائی ۱۹۳۱ء کو کشمیر کے معاملات سے متعلق شملے میں مشورت ہونا تھی (غالباً حکومت ہند سے) اور فراغت کے بعد انہوں نے ۲۷/ جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور پہنچنا تھا بعد ازاں لاہور سے غلام رسول مہر کے ساتھ بھوپال جانے کا ارادہ تھا۔ مگر کیا وہ واقعی بھوپال گئے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال اگر وہ گئے بھی تو مسئلہ کشمیر کے متعلق نواب بھوپال کی وساطت سے مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ گفتگوئے مصالحت کامیاب نہ ہوئی۔ اسی سلسلے میں نواب بھوپال کے بلانے پر وہ دہلی جانا تو ضرور چاہتے تھے لیکن راقم کی علالت کے باعث جا نہ سکے۔ اور اپنے ایک خط محررہ ۲۹ فروری ۱۹۳۲ء بنام غلام رسول مہر فرمایا:

میں تو آج دہلی جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا مگر جاوید کا بخار بدستور ہے۔ رات بھی اسے ایک سو پانچ ہو گیا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب نے دیکھا ہے، ان کو شبہ ہے کہ بخار معیادی ہے۔ پختہ پتا کل صبح کے معائنے سے ہوگا۔ اس تشویش کی حالت میں میرے لیے سفر کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ آپ میری طرف سے ہز ہائی نس کی خدمت میں معذرت کریں کہ میں ان کے حکم کی تعمیل

میں سفر کے لیے تیار تھا، مگر مذکورہ بالا ناگہانی افتاد کی وجہ سے رک گیا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ بہت مشوش ہوں ۵۹۔

سو اقبال دہلی نہ گئے اور اگر گئے تو غلام رسول مہر ہی گئے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ گلانسی کمیشن کے تقرر کے وقت اقبال مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہو چکے تھے اور مسلم کانفرنس کو گلانسی کمیشن کی تشکیل پر اعتراض تھا۔

جہاں تک راقم کی علالت کا تعلق ہے ڈاکٹر یار محمد خان کے معائنے پر وہ میعادی بخار ہی نکلا۔ راقم کی یادداشت کے مطابق بخار گیارہ یا ممکن ہے زیادہ دنوں تک بدستور رہا اور اس کے سبب اقبال اور سردار بیگم کو بڑی تشویش رہی۔ راقم کے سرہانے روپوں کے نوٹ رکھے جاتے اور کھیلنے کے لیے سردار بیگم وہ اشرفیاں دیتیں جو راقم کی ولادت کے موقع پر اقبال کے مختلف احباب سے بطور تحفہ ملی تھیں۔ سردار بیگم کا خیال تھا کہ اگر بیمار بچے کو کھیلنے کے لیے روپے اور اشرفیاں دی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اقبال اس سے بار بار پوچھتے کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا اور اگر راقم انکار سے سر ہلاتا تو کہتے کہ منہ سے بولو بیٹا! سر مت ہلاؤ۔ جب راقم صحت یاب ہو کر بستر سے اٹھا تو بسبب کمزوری اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ راقم سردار بیگم اور تایا زادہ بہن وسیمہ بیگم کا جوان دنوں یہیں مقیم تھیں، سہارا لے کر چلتا تھا۔ تب راقم کی عمر تقریباً ساڑھے سات برس اور منیرہ بیگم کی عمر تقریباً ڈیڑھ برس تھی۔ راقم جب اپنی یادداشت کو پیچھے لے جانے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں اس ابتدائی دور کی صرف چند جھلکیاں نظر آتی ہیں، گویہ سب نقوش بہت دھندلے سے ہیں۔ مثلاً اکتوبر ۱۹۲۹ء میں پہلی بار سکول جانا، غالباً انہی ایام میں مولانا محمد علی کا اقبال کو ملنے کے لیے آنا اور ان سے انتہائی بے تکلفی سے باتیں کرنا، یا گھر میں منیرہ بیگم کا پیدا ہونا۔ گھر میں کھانا سردار بیگم ہی پکاتیں، گو وسیمہ بیگم اور رمائی رحمت بی بھی ان کی مدد کرتی تھیں۔ منیرہ بیگم کی دیکھ بھال قریب ہی نومسلموں کے محلے کی لڑکیاں کیا کرتیں جو

سردار بیگم یا وسیمہ بیگم سے قرآن مجید پڑھنے یا سینا پرونا سیکھنے کے لیے آتیں اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بھی بٹاتیں۔ ہمسایوں میں ایک تو بیوی صاحبہ تھیں جو سردار بیگم سے اکثر ملنے کے لیے آتیں اور جن کے چھوٹے فرزند معین کے ساتھ راقم کھیلا کرتا تھا۔ دو ایک اور خواتین بھی تھیں جو آیا کرتیں، لیکن راقم نے سردار بیگم کو شاذونادر ہی گھر سے باہر قدم رکھتے دیکھا ہے۔ راقم کا بیشتر وقت سردار بیگم کے ساتھ گزرتا تھا۔ کبھی کبھار ان کے ساتھ موچی دروازے کے اندر ان کی پھوپھی (جنھوں نے سردار بیگم کو ماں کی طرح پالا پوسا تھا) اور بڑے بھائی خواجہ عبدالغنی کے گھر جاتا، جن سے وہ بہت محبت کرتی تھیں۔ سردار بیگم ہی نے خواجہ عبدالغنی کی شادی کرائی لیکن ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ خواجہ عبدالغنی قالینوں کا بیوپار کرتے تھے اور بسا اوقات گرمیوں میں ڈلہوزی یا شاید مسوری غالیچے بیچنے کے لیے جاتے۔ راقم سے بہت محبت کرتے تھے اور راقم بھی ان سے بے حد مانوس تھا۔

اقبال کی میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ، جس میں راقم کا بچپن گزرا، کی بغل میں ایک قبرستان ہوا کرتا تھا، جس کا اب نام ونشان نہیں رہا۔ راقم نومسلموں کے محلے کے بچوں یا پڑوسیوں کے دو ایک لڑکوں کے ساتھ اسی قبرستان میں کھیلا کرتا تھا۔ بسا اوقات کوٹھی کے بالمقابل دالان میں کرکٹ کھیلا جاتا یا چھت پر چڑھ کر پتنگیں اڑائی جاتیں۔ گھر میں اقبال کے ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔ علی بخش اور رحماں انہیں اقبال سے ملواتے۔ منشی خانے میں مؤکلوں سے منشی طاہر الدین نبٹتے۔ باہر کے مہمان خانے میں شیخ مختار احمد رہتے تھے، جو پنجاب سول سکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ وہ چند سال یہیں مقیم رہے، مگر شادی کے بعد انہیں سرکاری کوارٹروں میں رہائش کے لیے جگہ مل گئی۔ وسیمہ بیگم بھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سیالکوٹ میں رہنے لگیں۔ فیروز شوفر، اقبال کو کار میں عدالت عالیہ لے جاتا، وکالت کے سلسلے میں وہ بسا اوقات لاہور سے باہر بھی جایا کرتے تھے۔

سردار بیگم پرانی وضع کی خاتون تھیں۔ نماز پڑھتیں، روزے رکھتیں اور رمضان میں باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں، لیکن ضیعف الاعتقاد بھی تھیں، جن بھوت سایہ، جادو وغیرہ سے بہت ڈرتی تھیں۔ راقم کی سالگرہ پر ہمیشہ بکرے کی قربانی دیا کرتیں۔ کھانا بھی اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتیں، کیونکہ انہیں یہی فکر دامنگیر رہتا کہ راقم جب بھی خود کھانا کھائے تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتا۔ سو راقم آٹھ نو برس کا ہو گیا مگر اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی۔ اقبال اور سردار بیگم کی اس بات پر بارہا تکرار ہوئی۔ اقبال کا احتجاج تھا کہ راقم جوان ہو کر بھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہوگا، لیکن سردار بیگم پر ان کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ ایک تبدیلی ضرور آئی اور وہ یہ تھی رات کو خشکہ چاول کھاتے وقت راقم کی پلیٹ کے قریب بطور احتیاط چمچہ رکھ دیا جاتا، گو کھانا وہ خود کھلاتیں۔ اقبال کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانے میں آیا کرتے تھے، اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ خیر جب بھی سردار بیگم راقم کو کھانا کھلا رہی ہوتیں تو ان کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وہ اقبال کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ بھی سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے کھینچ کر چمچہ راقم کے آگے رکھ دیتیں اور راقم خود کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

راقم بچپن میں بے حد شریر تھا اور پڑھائی میں بھی کوئی دلچسپی نہ لیتا۔ اس لیے سردار بیگم سے مار کھانا اس کا معمول بن چکا تھا۔ وہ کھانے میں تو بلاشبہ سونے کا نوالہ دیتیں، لیکن دیکھتیں قہر کی نظر سے راقم کو یاد نہیں کہ انہوں نے اس پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو، جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ راقم کی شنید کے مطابق وہ جب کبھی بھی اسے پیار کرتیں تو سوتے کے عالم میں تاکہ راقم کو پتا نہ چلے۔ شاید اسی سبب بچپن میں راقم کے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال گزرتا کہ اس کی ماں دراصل حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔ مگر کسی اور کو جرأت نہ تھی کہ راقم کو ہاتھ لگا سکے۔ اگر اقبال بھی کبھی راقم کی کسی شرارت پر اسے مارنے کے لیے ہاتھ

اٹھاتے تو سردار بیگم بیچ میں آ کھڑی ہوتیں اور انہیں روک دیتیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راقم کسی کو بتائے بغیر چپکے سے چند لڑکوں کی معیت میں کوٹھی کے قریب ایک سینما گھر میں فلم دیکھنے کے لیے گھس گیا۔ رات کے نو بجنے کو آئے لیکن فلم ختم نہ ہوئی اور اس لیے راقم گھر نہ پہنچا۔ گھر والے سخت پریشان تھے کہ کہاں غائب ہو گیا اور سب سے زیادہ پریشانی سردار بیگم کے بعد اقبال کو تھی۔ کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب جب راقم چھپتے چھپاتے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ہر طرف افراتفری کا عالم طاری ہے۔ راقم کے دیر سے گھر پہنچنے کی خبر بجلی کی طرح کوندگئی، اور آناً فاناً وہ اقبال کے حضور میں کھڑا تھا۔ اقبال غُصے کے شدت سے کانپ رہے تھے۔ انہوں نے راقم کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سردار بیگم بیچ میں آ کھڑی ہوئیں۔ اب ایک طرف اقبال تھے اور دوسری طرف راقم۔ وہ غصّے کے عالم میں اسے مارنے کے لیے ایک ہاتھ اٹھاتے لیکن سردار بیگم لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ راقم خوف کے مارے ان کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ یہ مشق کوئی تین چار منٹ تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ سردار بیگم کو سراسیمگی کے عالم میں یوں اُچک اُچک کر ان کے ہاتھ پکڑتے دیکھ کر اقبال کو ہنسی آ گئی۔

بہر حال راقم نے اقبال سے بہت کم مار کھائی ہے۔ اس کے لیے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے، نوکروں کو بُرا بھلا کہنے یا جھوٹ بولنے پر راقم کو کئی بار کوسا گیا۔ اقبال جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے ''احمق آدمی۔ بیوقوف''۔ غصہ کے عالم میں بعض اوقات پنجابی یا اردو کی بجائے انگریزی بولنے لگتے تھے۔ راقم نے ایک دو مرتبہ اُن سے جوتے بھی کھائے ہیں۔ لیکن جب جوتے سے مارتے تو تلے کی طرف سے نہیں بلکہ نرم چمڑے والی طرف سے مارتے۔

راقم کو بچپن میں روزانہ ایک آنہ خرچ کرنے کو ملتا تھا اور اُسے خرچ کر چکنے کے

بعد خواہ وہ سردار بیگم کی کتنی ہی منّتیں کرتا اُسے مزید کچھ نہ ملتا۔ ایک دفعہ کوئی مٹھائی بیچنے والا گھر کے سامنے سے گزرا مٹھائی دیکھ کر راقم للچا گیا۔ لیکن جیب خالی تھی۔ خوانچہ فروش نے خوش خبری سنائی کہ وہ پیتل کے کسی معمولی ٹکڑے کے عوض بھی مٹھائی دے سکتا ہے۔ پھر کیا تھا۔ راقم سائے کی طرح اقبال کے کمرے میں گھسا۔ بڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگا ہوا پیتل کا پرزہ اتار کر خوانچہ فروش کو دیا اور مٹھائی لے لی۔ مگر شامت اعمال سے فیروز شوفر نے یہ کاروائی دیکھ لی اور اقبال سے شکایت کر دی۔ راقم کو اُن کے کمرے میں طلب کیا گیا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ راقم کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دو تین تھپڑ اس کی گردن پر جما دیئے۔

گرمیوں کی ایک شام راقم آنکھوں پر دوپٹہ باندھے سردار بیگم کو پکڑنے کے لیے زنانہ دالان میں اُن کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور منہ کے بل گر پڑا ،جس کے باعث نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے عین اُسی لمحہ اقبال زنانے میں داخل ہوئے اور راقم کے منہ سے خون بہتا دیکھ کر اچانک بے ہوش ہو گئے۔ اسی طرح گرمیوں کی ایک شب جب راقم سویا ہوا تھا تو بڑے زور کی آندھی چلی۔ جس کے سبب کوٹھی کی دیال سنگھ کالج والی دیوار زنانے صحن میں سونے والوں پر آ گری اور ہر طرف کہرام مچ گیا۔ نتیجہ میں سردار بیگم، راقم اور چند اور خواتین زخمی ہو گئیں۔

گھر میں کسی قسم کا شور مچانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر راقم اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ باہر دالان میں کرکٹ کھیل رہا ہوتا تو حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو اور راقم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتا۔ مگر بعض اوقات اقبال خود بھی کھیل میں شریک ہو جایا کرتے۔ ایک دفعہ وہ اندر بیٹھے تھے راقم نے ہٹ جو لگائی تو گیند دروازے کا شیشہ توڑتی اُن کے کمرے میں جا گری۔ اس روز سے اُسے کرکٹ کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ بسا اوقات کھلی بہار میں جب راقم کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا تو وہ دبے پاؤں

اوپر آجاتے اوراس کے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے، لیکن گذشتہ چند سالوں سے اقبال کی نجی یا خانگی زندگی کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ وہ یا تو لاہور سے باہر ہوتے یا اگر گھر پر ہوتے تو ان کے ملاقاتیوں کا سلسلۂ نہ تھمتا تھا۔ ناشتا، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے یا رات کی چائے طشتری میں لگ کر ان کے کمرے میں جاتی تھی اور علی بخش انہیں کھلاتا تھا، لیکن لوگ تب بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔

۶ر مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور کی ایک علمی مجلس اسلامک ریسرچ سوسائٹی نے اقبال کی زندگی میں پہلی بار وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں یوم اقبال منایا جس میں بعض اصحاب نے تقریریں کیں یا مقالے پڑھے۔ اس سے اگلے روز یعنی ۷ مارچ ۱۹۳۲ء کی شام کو اقبال کے اعزاز میں لاہور کے ریستوران ''لورینگز'' میں دعوتِ چائے دی گئی جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۶۰۔

۱۹۳۲ء ہی میں اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور ۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں انہوں نے اپنا معروف خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ معرکۃ الآرا خطبہ اقبال کی دوسری اہم سیاسی دستاویز ہے، جسے برصغیر کی مسلم سیاسیات کا کوئی بھی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا۶۱۔

خطبہ کی ابتداء میں انہوں نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

میں آپ کا ممنون ہوں کہ اس نازک مرحلے پر آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے، لیکن میں یقیناً آپ کو ایسا شخص منتخب کرنے پر مبارک باد پیش نہیں کرسکتا جو ایک بصیر آئیڈیلسٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ شاید آپ نے سوچا ہو کہ اس مرحلے پر کسی صاحب بصیرت کی ضرورت ہے، کیونکہ اگر بصیرت نہ ہو تو قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

پھر ارشاد کیا:

جہاں تک ہماری پالیسی کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، میں آپ کے روبرو کوئی تازہ چیز پیش نہیں کر رہا۔ اُن کے متعلق میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں کر چکا ہوں۔

خطبے میں دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کی تفصیل بیان کی گئی۔ برطانوی حکومت کی سیاسی پالیسی پر تنقید ہوئی اور مہاتما گاندھی یا کانگریس کے مسلمانوں کے ساتھ مخالفانہ رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے فیڈرل سنٹر کی تشکیل میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ پھر صوبہ سرحد میں انگریزی حکومت کی سخت گیری اور کشمیر میں مسلمانوں پر تشدد کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

یہ سب مظاہر، آنے والے اس طوفان کا پیش خیمہ ہیں جو ممکن ہے تمام ہندوستان بلکہ پورے ایشیاء کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ یہ اس سیاسی تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ یہ اس سیاسی تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے جس نے انسان کو ایک ایسی شے سمجھ رکھا ہے۔ جو صرف استحصال کے قابل ہو اور جسے ایک شخصیت تصور کر کے تہذیبی طاقتوں کے ذریعے نشوونما کے مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔ ایشیا کی اقوام مغرب کی مروّجہ استحصالی معیشت کے خلاف، جسے مشرق پر مسلط کیا گیا ہے، یقیناً اٹھ کھڑی ہوں گی۔ ایشیا جدید مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی غیر منضبط انفرادیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مگر جس دین کی تم نمائندگی کرتے ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اسے ایک ایسے نظم و ضبط کے تحت لاتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خداوند تعالےٰ اور انسان کی خدمت میں صرف کر دے۔ اس کے امکانات ابھی اختتام پذیر نہیں ہوئے، بلکہ وہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا تخلیق کر سکتا ہے جس میں انسان کی معاشرتی حیثیت کا تعین نہ تو ذات پات و نسل و رنگ سے ہوتا ہے۔ نہ اس دولت سے جو وہ کماتا ہے، بلکہ اس طرز زندگی سے ہوتا ہے جو وہ بسر کرتا ہے۔ ایک ایسی نئی دنیا، جس میں غریب امیر پر ٹیکس عائد کرتا ہے، جہاں انسانی معاشرہ مساوات شکم پر نہیں بلکہ

مساواتِ ارواح پر مبنی ہے، جہاں ایک اچھوت کسی شہزادی سے شادی کر سکتا ہے، جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں سرمائے کو ایسے ارتکاز کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ حقیقی سرمایہ پیدا کرنے والے طبقے پر غالب آ جائے۔ لیکن تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری علماء و فقہا کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی کی طلبگار ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم خیالات و جذبات کے ایک ایسے زندان میں محبوس ہیں جو گزشتہ صدیوں میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لیے یہ بھی شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنی نوجوان نسل کو ان معاشی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو عصر حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر بدل دیا جائے۔ تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ محسوس کرنے لگے۔ جو سبق گزشتہ تجربے نے تمہیں سکھایا ہے وہ دل میں اتر جانا چاہیے پس کسی فریق سے توقعات وابستہ مت کرو۔ اگر تم اپنے نصب العین کی تحصیل ہوتے دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی خودی صرف اپنی ذات پر مرتکز کرو۔ اور اس کی تپش سے اپنی خاک کو پختہ بناؤ۔ مسولینی کا قول تھا کہ جس کے پاس لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو خود لوہا ہے اس کے پاس سب کچھ ہے سو سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی اصل راز ہے۔ ہمارا واضح نصب العین یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کے لیے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں لازم ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو منظم کیا جائے۔ شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا، وہ صرف اپنی روح کے آتش کدہ ہی میں روشن کیا جا سکتا ہے۔

اقبال نے مستقبل میں مسلمانوں کے سیاسی پروگرام کے سلسلے میں ایک پنج

نکاتی لائحہ عمل پیش کیا۔ اس لائحہ عمل کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ متفرق سیاسی جماعتوں میں بٹنے کی بجائے مسلمانانِ ہند کی طرفِ ایک سیاسی تنظیم ہو جس کی شاخیں ملک کے سارے صوبوں اور اضلاع میں قائم کی جائیں۔ اس کا نام خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کے آئین میں اتنی گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ ہر دبستان خیال کے حامی اس کی رکنیت اختیار کرسکیں اور کسی بھی دبستان خیال کے حامیوں کے لیے ممکن ہو کہ وہ اس میں برسر اقتدار آ کر اپنی صواب دید، نظریات یا طریق کار کے مطابق قوم کی رہنمائی کے لیے پالیسی مرتب کرسکیں۔ دوسرا نکتہ یہ تھا کہ مرکزی تنظیم کم از کم پچاس لاکھ روپے قومی فنڈ کے لیے جمع کرے۔ تیسرا نکتہ یہ تھا کہ مرکزی تنظیم کی رہنمائی میں یوتھ لیگیں اور قومی رضا کاروں کے دستے منظم کیے جائیں۔ ان کے فرائض میں خدمتِ خلق، رسوم و رواجات کی اصلاح، قوم کی تجارتی تنظیم اور شہروں، قصبوں اور دیہات میں معاشی پروپیگنڈا شامل ہوں۔ چوتھا نکتہ یہ تھا کہ برصغیر کے تمام بڑے شہروں میں مردوں اور عورتوں پر مشتمل الگ الگ ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ ان کا فرض نوجوان نسل پر صرف یہ واضح کرنا ہو کہ اسلام بنی نوع انسان کی مذہبی اور تمدنی تاریخ میں اب تک کیا کچھ کرچکا ہے اور مستقبل میں اس نے کیا کرنا ہے۔ پانچواں نکتہ یہ تھا کہ علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے جس میں ایسے وکلاء بھی شامل ہوں، جنہوں نے ماڈرن جورس پروڈنس کی تعلیم حاصل کررکھی ہو۔ اس تجویز کا مقصد اسلامی قانون کا تحفظ اس کی توسیع اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اس کی تعمیر نو تھا۔ اس مجلس کو ایسی آئینی حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ مسلمانوں کے شخصی قانون کو متاثر کرنے والا کوئی بھی مسودۂ قانون اس کی منظوری کے بغیر قانون سازاداروں میں پیش نہ کیا جاسکے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے فرمایا:

مسلمانانِ ہند کے لیے اس تجویز کی خالص عملی قدر و قیمت سے قطعِ نظر ہمیں یاد رکھنا

چاہیے کہ جدید مسلم اور غیر مسلم دنیا کو ابھی اسلام کے قانونی اَدب کی لامتناہی قدر و قیمت دریافت کرنا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام، جس کے اخلاقی معیار ایک عرصے سے انسان کے معاشی طریق کار کی نگرانی سے دست بردار ہو چکے ہیں، اس کی افادیت سے آگاہ ہونا ہے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس نے اپنے دو روزہ اجلاس زیر صدارت اقبال میں کئی قراردادیں منظور کیں۔ مثلاً یہ کہ مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصہ اور فوج میں پچاس فیصد ملازمتیں دی جائیں، یہ کہ مسلمان گذشتہ دو گول میز کانفرنسوں کے نتائج سے مطمئن نہیں اور فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق حکومت برطانیہ جلد از جلد اپنے فیصلے کا اعلان کرے۔ اگر یہ اعلان اواخر جون ۱۹۳۲ء تک نہ ہوا تو مسلم کانفرنس کے ایگزیکٹیو بورڈ کا ایک اجلاس ۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو راست اقدام کا پروگرام طے کرنے کے لیے منعقد کیا جائے، یہ کہ برطانوی ہند کے تمام صوبوں میں صوبجاتی خودمختاری کا فی الفور نفاذ کر دیا جائے، یہ کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے گلانسی کمیشن کے مسلمان اراکین کو مسلم جماعت سے مشورہ کر کے مقرر کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ ۶۲۔

پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے حق اکثریت کو بروے کار لانے کا مطالبہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کئی بار اپنی قراردادوں میں کر چکی تھیں۔ اقبال اس مطالبے کے زبردست حامی تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں نہ صرف اس مطالبے کو دہرایا بلکہ مسلم مطالبات کی عدم منظوری کی صورت میں راست اقدام کی دھمکی بھی دی۔ ہندو اور سکھ اس مطالبے کے سخت مخالف تھے، اس لیے اقبال کے خطبے کے بعد انھوں نے اس معاملے کے خلاف اپنی پروپیگنڈا مہم تیز کر دی۔ اس کے جواب میں اقبال نے چند رفقا کے ساتھ ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں فرمایا:

ہم گذشتہ کئی ہفتوں سے نہایت غور کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت کے اہم اور جائز مطالبے کے خلاف ایک نہایت ہی زہریلا پروپیگنڈا جاری ہے۔ ہم اس امر کا فیصلہ دُنیا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جس حالت میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ چھ صوبجات اور مرکز میں اپنے آپ کو عظیم ہندو اکثریت کے حوالے کر دیں، وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی شدید مخالفت کر کے ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت کی نیک نیتی کا نقش کس حد تک بٹھا سکیں گے اور مسلمانوں کے قلوب میں ان کی طرف سے کس حد تک اعتماد پیدا ہوگا......۔[٦٣]

۸ جون ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس شملہ میں منعقد ہوا۔ اقبال نے اس کی صدارت کی اور چند قراردادیں ریاست الور کے متعلق اور صوبوں کو مالی خودمختاری دیے جانے کے بارے میں منظور کی گئیں۔[٦٤] اسی ماہ میں پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک انگریز پروفیسر نے ہندوؤں کے زیر اثر آ کر تجویز پیش کی کہ اسلامی تاریخ کو بی۔اے کے پاس کورس سے حذف کرایا جائے۔ سینٹ کے مسلم ممبران کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز ایک ووٹ کی اکثریت سے منظور ہوئی۔ اس پر پنجاب کے مسلمان بڑے مضطرب ہوئے اور متعدد جلسوں میں اس فیصلے کی شدید مذمت کی گئی۔ اس ضمن میں ایک جلسہ زیر اہتمام اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ بیرون موچی دروازہ میں ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوا، جس کی صدارت اقبال نے کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ارشاد کیا:

میرا آج تک یہی خیال تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ تمدن و تاریخ اسلام سے ایسے ہی ناواقف ہیں۔ جیسے کوئی غیر مسلم۔ چند ماہ ہوئے مجھے مصر اور فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کے واقعات سے مجھے یقین ہو گیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں۔ فلسطین کی

مؤتمر اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے نوجوان مقررین کی ڈاڑھیاں منڈی ہوئی تھیں۔ اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آرہے تھے، انہیں علم و فضل اور جوشِ عمل کے اعتبار سے علماء کرام پر فوقیت حاصل تھی۔ مسٹر بروس کی تجویز ہے کہ اسے (تاریخ اسلامی کو) پاس کورس سے خارج کیا جائے۔ پاس کورس میں طلبہ کی زیادہ تعداد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کورس سے اسلامی تاریخ کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ عقل انسانی جب شرارت پر اتر آئے تو اپنے اندرونی جذبات اور محرکات سے کام لے کر اپنے مقصد کی تکمیل پر متوجہ ہو جاتی ہے...... مسٹر بروس کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنا چاہیے میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے۔ روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ خرچ کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ میں دلچسپی کیوں ہے تو انہوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے...... ۶۵

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۲/۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں ایک قرارداد یہ منظور کی گئی تھی کہ اگر حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان اواخر جون تک نہ کیا تو مسلم کانفرنس کا ایگزیکٹو بورڈ ایک جلسہ ۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو منعقد کر کے راست اقدام کا پروگرام طے کرے گا۔ اقبال نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس مجلس عاملہ کے بعض ممبران سے مشورہ کے بعد اس جلسے کو جولائی کے آخر تک ملتوی کر دیا۔ اس پر مختلف حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی، اور اقبال پر الزام

لگایا گیا کہ ان کا رویہ ڈکٹیٹرانہ تھا یا انہوں نے شملہ (یعنی انگریزی حکومت) کے اشارے پر اجلاس ملتوی کر دیا۔ نتیجہ میں ۴ر جولائی ۱۹۳۲ء کو الٰہ آباد میں مسلم کانفرنس کے بعض مقتدر اراکین نے ایک اجلاس عام منعقد کیا، جس میں اقبال کے اعلان التوا کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ نیز مولانا حسرت موہانی اور چند دیگر زعماء نے تجویز پیش کی کہ مسلم کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت بنائی جائے۔

بجائے اس کے کہ اقبال اپنے خلاف اس احتجاجی جلسے یا نئی جماعت سازی کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرتے، انہوں نے اپنے بیان مورخہ ۶ جولائی ۱۹۳۲ء میں مولانا حسرت موہانی کی تجویز کو سراہتے ہوئے نئی جماعت کا خیر مقدم کیا اور واضح کیا کہ یہ طرز عمل ان کی اپنی تجویز کے عین مطابق ہے جو انہوں نے مسلم کانفرنس کے خطبہ صدارت میں پیش کی تھی، یعنی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم کے آئین میں اتنی گنجائش ہو کہ اس میں ہر سیاسی مکتب فکر کو برسر اقتدار آنے کا موقع مل سکے۔ اقبال نے واضح کیا کہ جلسہ آمرانہ طور پر ملتوی نہیں کیا گیا، بلکہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں، جس میں وہ خود شریک نہ تھے، مولانا شفیع داؤدی کو بحیثیت سیکرٹری جنرل اختیار دیا گیا تھا کہ اگر فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان ۳ جولائی ۱۹۳۲ء تک نہ ہوا تو وہ اپنے طور پر ایگزیکٹو بورڈ کا جلسہ ملتوی کر سکتے ہیں۔ اقبال نے فرمایا:

اگر فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ہو تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت سے لڑیں، لیکن میں یہ مشورہ انہیں نہ دوں گا کہ وہ کسی قسم کا راست اقدام محض اس لیے شروع کر دیں کہ حکومت ایک مقررہ مدت کے اندر فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان نہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ واقعات کے اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کریں گے کہ ایگزیکٹو بورڈ کے جلسے کے ملتوی کرنے کا جو مشورہ میں نے دیا تھا، وہ کہاں تک شملہ کے چشم و ابرو کے اشاروں سے متاثر تھا۔ اپنی خانگی اور پبلک زندگی میں میں نے دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی کبھی نہیں کی۔

ایسے وقت جب کہ جماعت کے بہت ہی اہم مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، اس آدمی کو جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے میں اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں۔ میں اس امر کو اچھی طرح واضح کر دوں کہ جن لوگوں نے التواء کی خواہش کی تھی، ان کے رویے کی یہ تعبیر نہ کی جانی چاہیے کہ وہ قرارداد لاہور پر عمل کرنے کے لیے (اگر اس پر عمل کرنے کی ضرورت لاحق ہو) تو، دوسروں سے پیچھے رہیں گے۔ جب تک یہ ضرورت لاحق نہ ہو، جماعت کو چاہیے کہ اپنی طاقتوں کو محفوظ رکھے۔ دانائی یہ نہیں کہ اپنی توانائی کو غیر اہم مسائل پر صرف کیا جائے، بلکہ اس کو ان معاملات پر خرچ کرنے کے لیے محفوظ رکھا جائے جو واقعتاً اہمیت رکھتے ہیں [۶۶]۔

اسی دوران میں مولانا شفیع داؤدی نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ چند دنوں بعد نئی جماعت کے بانیوں نے اقبال سے ملاقات کی اور ان کی رائے کی تائید کی کہ اس مرحلے پر بورڈ کا اجلاس ملتوی کرنا مناسب تھا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

یہ طوفان بہت جلد تھم گیا اور اس نئی جماعت کے بعض لیڈروں نے خود علامہ اقبال سے ملاقات کر کے عرض کیا کہ موجودہ حالات میں مجلس عاملہ کے اجلاس کا التواء ہی مناسب تھا۔ اور برطانوی حکومت نے چونکہ ہندوستانی جماعتوں کی درخواست پر فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کرنے کی ذمے داری لی ہے، اس لیے ہم کو اس کے فیصلے تک انتظار کرنا چاہیے۔ غرض علامہ اقبال کے خلوص اور ان کی شخصیت کے اثر نے کانفرنس کو اختلاف کی نذر نہ ہونے دیا اور آخر میں سبھی ان سے متفق ہو گئے [۶۷]۔

۱۹ر جولائی ۱۹۳۲ء کو اقبال عید میلاد النبی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے جالندھر گئے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک عظیم الشان جلوس نکالا۔ بعد میں جلسہ ہوا۔ جس میں اقبال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے متعلق ایک ایسی جامع تقریر کی کہ اہل جالندھر کے ایمان تازہ ہو گئے۔ پھر ان کے اعزاز میں چائے پارٹی

ہوئی اور سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ شام کو واپس لاہور پہنچے ۶۸۔

دوسری گول میز کانفرنس میں سکھوں نے اقلیتوں کے ترتیب دیے ہوئے ایک میثاق کی مخالفت کی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ فرقہ وارانہ فیصلے میں ان کے حقوق کا تحفظ نہ ہوگا، اس لیے وہ اس ضمن میں بہت سے بیانات وغیرہ شائع کر رہے تھے۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان کے مواقع پر احتجاجی مظاہروں کا پروگرام بھی بنا رہے تھے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچانا تھا۔ اقبال نے ان کے طرز عمل کے متعلق ایک بیان ۲۵ر جولائی ۱۹۳۲ء کو جاری کیا جس میں مسلمانوں کے مؤقف کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

مسلمانانِ ہند جس قدر اپنی جماعت کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے مضطرب ہیں اتنے ہی وہ ملک کی دستوری ترقی کے لیے بے چین ہیں۔ مرکز میں اور ان صوبوں میں جہاں وہ نہایت ہی حقیر اقلیت میں ہیں، اکثریتی حکومت کے اصولوں کو وہ تسلیم کرتے ہیں، بشرطیکہ ان کو اس جائز اور متوازی فائدے سے محروم نہ کر دیا جائے، جو انہیں بعض دیگر صوبوں کے اندر اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حاصل ہے ۶۹۔

اقبال کے بیان پر سکھ مسلم مفاہمت کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۳۲ء کو ان کے پرانے دوست سردار جوگندر سنگھ نے انہیں ایک نوٹ تحریر کیا، جس میں وہ پنجاب کی کونسل میں مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت دینے کو تیار تھے۔ اقبال نے یہ تجویز مسترد کر دی اور انہیں لکھا کہ وہ کونسل میں مسلمانوں کے لیے کم از کم اکیاون فیصد نشستیں چاہتے ہیں۔ ۷۰ بعد ازاں سردار جوگندر سنگھ نے ایک بالکل ہی مختلف اسکیم انہیں روانہ کی، لیکن اقبال نے اسے بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہونی چاہیے، اور اس اصول کو پیشِ نظر رکھے بغیر کسی بھی اسکیم پر غور کرنا یا مذاکرات کرنا بالکل بیکار ہے۔ اگرچہ سردار جوگندر

سنگھ کے اپنے کہنے کے مطابق یہ تمام خط و کتابت پرائیویٹ تھی۔ انہوں نے خود ہی اسے اپنے بیان مورخہ ۴؍اگست ۱۹۳۲ء کے ساتھ اخباروں میں شائع کر دیا۔ بہر حال سکھ مسلم مفاہمت کے لیے شملے میں بھی گفت و شنید جاری تھی، مگر چونکہ اس گفت و شنید کے ذریعے سکھوں کا اصل مقصد برطانوی حکومت کے فرقہ وارانہ فیصلے کے اعلان کا مزید التوا تھا۔ اس لیے ۷ اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں زیرِ صدارت اقبال منعقد ہوا، جس میں قرار پایا کہ مسلم لیڈر سکھوں سے اپنی گفت و شنید کو اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک حکومت فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان نہ کر دیے۔ اسی اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت برطانیہ جلد از جلد فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کرے۔ نیز یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات بھی تسلیم نہ کیے گئے تو مجلسِ عاملہ کی مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل کمیٹی آئندہ کے لیے قومی لائحہ عمل ترتیب دے کر مجلس عاملہ کو پیش کرے گی: اقبال (صدر) مولانا مظہر الدین، مولانا حسرت موہانی، سید حبیب، غلام رسول مہر، حسن ریاض اور ذاکر علی [۱] ارکان مسلم کانفرنس کی قرارداد کے بموجب اقبال نے سکھوں سے مفاہمت کی بات چیت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور اپنے بیان مورخہ ۱۰؍اگست ۱۹۳۲ء میں اپنے طرز عمل کی وضاحت مجلس عاملہ کے فیصلے کی روشنی میں پیش کی [۲]۔ پس سکھ مسلم مفاہمت کی گفت و شنید بھی ناکام رہی۔

۱۶؍اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان کیا، جس کے سبب سارے برصغیر میں بحث و نزاع کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ۷؍اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں، جو زیر صدارت اقبال منعقد ہوا، ایک قرارداد کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلے میں احرار کی قید و بند پر احتجاج اور ان کی رہائی کے بارے میں منظور کی گئی۔ مگر تحریک کشمیر جاری رہی [۳]۔ ۲۴؍اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اور اجلاس زیر صدارت اقبال دہلی میں منعقد ہوا جس

میں فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔ ۲۴ راگست ۱۹۳۲ء کو اقبال نے اس قرارداد کی تائید میں ایک اہم بیان جاری کیا جس میں فرقہ وارانہ فیصلے پر اپنے اعتراضات کی وضاحت کی۔ ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ پنجاب کونسل میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں دی گئی اور سکھوں کو زیادہ پاسنگ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض نشستوں کی مشترکہ انتخاب کے ذریعے حاصل کرنے کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود ان کا حق مار کر یورپین جماعت کو پاسنگ دیا گیا ہے۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ بنگال، پنجاب اور سرحد میں غیر مسلم اقلیتوں کو زیادہ پاسنگ دیا گیا ہے، جبکہ ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلم اقلیت کو اس قدر پاسنگ نہیں دیا گیا تھا۔ فرقہ وارانہ فیصلے میں مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کے لیے اقبال نے دو تجاویز پیش کیں: اول یہ کہ بنگال میں دو ایوانی مقننہ بنائی جائے اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں۔ نیز کابینہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کے سامنے ذمہ دار ہو۔ یوں بنگال میں مسلمانوں کو ایک مضبوط اکثریت حاصل ہو سکتی تھی اور دوم، صوبوں کو حقیقی اختیارات زیادہ سے زیادہ دیے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات حاصل ہوں[۴۷]۔

فرقہ وارانہ فیصلے میں اچھوتوں کو جداگانہ نیابت دیے جانے کے خلاف مہاتما گاندھی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء سے مرن برت رکھا، لیکن مرن برت رکھنے سے قبل اسی سلسلے میں انہوں نے وزیر ہند اور وزیر اعظم برطانیہ سے خط و کتابت بھی کی تھی، جو گاندھی وزیر اعظم مراسلت کے عنوان سے اخباروں میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اس مراسلت پر تبصرہ اپنے اخباری بیان مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۲ء میں کیا۔ فرمایا:

یہ خطوط شخصی نفسیات کے دلچسپ مظہر ہیں اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے مجھے ایسی تحریروں سے بہت کم سابقہ پڑا ہے۔ خطوط میں مجھے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی

ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے نزدیک ہندو مذہب کی صداقت اخلاقی اور مذہبی مسائل پر مشتمل ہے۔ ذاتی طور پر میں ان خیالات کا بے حد مداح ہوں، لیکن باوجود اس امر کے ہندو اخبارات نے میرے متعلق بدگمانیاں پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ سیاسی مسائل بالخصوص ہندوستان میں مذہبی اور اخلاقی معاملات کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ چیز کوئی تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیّت کے تخیل کے علمبردار اور ہندوستانی اقلیتوں میں فرقہ وارانہ بیداری (جو سیاسی طاقت کے انتقال کا لازمی نتیجہ ہے) کے اشدترین مخالف نے نہایت دلیری سے بالخصوص ہندو قومیت کے تحفظ کے مسئلے کی حمایت کو نہایت ضروری خیال کیا۔ یہ صورت حالات مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ مہاتما جو ملک کی تمام اکثریتوں کو متحدہ قومیت ہند میں جذب ہو جانے کی تلقین کیا کرتا تھا، آج اسے ایک ایسے فرقہ وار اعلان میں ہندو قوم کا انتشار نظر آرہا ہے جس کے ذریعے سے مجالس وضع آئین میں ان لوگوں کو محدود نمائندگی حاصل ہونے کا امکان ہے جو خود مہاتما گاندھی کے نزدیک صدیوں تک ہندوؤں کی اونچی جاتیوں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔ اگر اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے یہ معنی ہیں کہ ہندو قوم کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے تو مخلوط انتخاب کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اقلیتیں اسے اختیار کریں گی وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گی۔ میرے خیال میں مہاتما گاندھی کی روش سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ جس اقلیت کو اپنے جداگانہ وجود کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہوگی اسے جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں تک گاندھی جی کی خودکشی کی دھمکی کا تعلق ہے، مذہب اسلام نے خودکشی کو خواہ وہ کسی حالت میں بھی ہو، نامردی کا ثبوت قرار دیا ہے۔ معاذ اللہ اگر اسلامیان ہند بھی ذات پات کی تمیز کے پابند ہوتے اور ان میں بھی اچھوت طبقے کا ایک جم غفیر موجود

ہوتا اور وہ بھی ہندو جاتی کی اُونچی ذاتوں کی طرح ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو اُونچے گھرانے کی ہندو، نیچ ذاتوں کے ساتھ سالہا سال سے کرتے چلے آرہے ہیں، اور گر مجھے بھی وہی طرز عمل اختیار کرنا پڑتا جو گاندھی جی نے اختیار کیا ہے، تو میں حکومت برطانیہ کو دھمکی دینے کی بجائے اپنی قوم کو دھمکی دیتا اور بجائے اس کے کہ اچھوتوں کو حاصل شدہ تحفظ سے محروم کرنے کی کوشش کرتا، میں اپنی قوم کو اس بات پر مجبور کرتا کہ وہ ایک خاص مدت کے اندر اچھوت اقوام کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے کامل مساوات کے ساتھ پیش آئے۔ اگر ہندو جاتی کو واقعی اچھوت اقوام کی بہتری مقصود ہے تو وہ یقیناً گاندھی جی کے حلف کو اسی روشنی میں ملے گی ۷۵۔

بہرحال اچھوتوں کے جداگانہ حق نیابت کے بارے میں حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے میں میثاق پونا کے تحت تبدیلی کر دی۔ میثاق پونا کے متعلق اقبال نے اپنے بیان مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۲ء میں صاف کہہ دیا کہ اس کی رد سے نہ تو اچھوتوں کی جداگانہ نیابت میں فرق آیا ہے اور نہ انہیں ہندو دھرم سے کوئی قرب حاصل ہوا ہے ۷۶۔

چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ وارانہ فیصلے سے غیر مطمئن تھے، اس لیے مولانا شوکت علی کو سوجھی کہ اس موقع پر ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے شیخ عبدالمجید سندھی کے ساتھ مل کر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے بمبئی میں گفت و شنید کا آغاز کیا۔ اس گفت و شنید کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور اقبال نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک مشترکہ بیان جاری کیا، جس میں فرمایا:

مسلمانانِ ہند اکثریت والی قوم کے ساتھ اتحاد کے لیے ہمیشہ بیتاب رہے ہیں اور اس حقیقت سے ہر وہ شخص باخبر رہا ہے، جو گذشتہ دس سال میں ان کوششوں کا مطالعہ

کرتا رہا ہے، جو مستحکم بنیادوں پر فرقہ وارانہ اتحاد و موافقت پیدا کرنے کے لیے کی گئی ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا مسئلہ چھیڑنا قطعی نامناسب ہے، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم اس نازک وقت میں اس تحفظ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ تاہم ہم ان واضح تجاویز پر غور و خوض کرنے کے خلاف نہیں جو دوسری قوم کے رہنما ضروری متعلقہ مسائل کو سمجھتے ہوئے پیش کریں۔ لیکن ہم اس امر کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ واضح تجاویز اکثریت والی قوم کی طرف سے پیش ہونی ضروری ہیں ۷۷۔

ابھی یہ مذاکرات جاری تھے کہ مولانا شوکت علی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے اعلان کیا کہ مسلم لیڈروں کی ایک کانفرنس ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں ہو گی۔ اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت اقبال کو بھی بھیجی گئی۔ جواب میں انہوں نے اپنے تار مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا:

باہمی سمجھوتے کی کوشش قابل ستائش ہے، لیکن ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجاویز پیش ہوئے بغیر مسلمان رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرنا نقصان رساں ہے۔ افسوس ہے کہ ان حالات میں میں شریک نہیں ہو سکتا۔ میری درخواست ہے کہ آپ کانفرنس کی تجویز پر نظر ثانی فرمائیں ۷۸۔

۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اسی موضوع پر اقبال نے ایک اخباری بیان بھی جاری کیا، جس میں ایسے ہی تاروں اور ان کے جوابات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ہندو لیڈروں کی طرف سے قطعی تجاویز کی عدم موجودگی میں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمیں اس کانفرنس میں کس چیز پر بحث کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ مسلمانانِ ہند نے دوسرے فرقوں سے مفاہمت کے لیے ہمیشہ اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہے، لیکن جو طریقہ اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے، وہ ہندوؤں سے معاملات کرنے کا طریقہ تو نہیں ہے بلکہ اس سے ہماری اپنی صفوں میں افتراق پیدا ہو گا جسے

ہم نے بڑی مشکلوں سے دور کیا ہے۔ طریقۂ انتخاب کے سوال کو معمولی قرار دینا اور اس کو دوبارہ چھیڑنا، باوجودیکہ مسلم جماعت نے اس بارے میں اپنا واضح فیصلہ دے دیا ہے، جیسا کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں سے ظاہر ہوتا ہے، ایک بہت ہی غیر دانشمندانہ طریقہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجوزّہ کانفرنس اسلام اور ہندوستان کے مفاد کے لیے مضر اور بالکلیہ تضیع اوقات کا باعث ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس کے داعیان اپنے موقف پر نظر ثانی کریں گے ۷۹۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مجوزّہ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی، مگر اس میں یہی قرارداد منظور ہو سکی کہ مسلمان مسئلہ انتخاب پر تبھی غور کر سکتے ہیں جبکہ اِن کے دیگر تیرہ مطالبات اکثریتی فرقہ تسلیم کر لے۔ پھر ہندوؤں اور سکھوں سے مذاکرات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان نے ہندو اور سکھ لیڈروں سے گفت وشنید کی۔ لیکن ہندو مسلم مفاہمت یا سکھ مفاہمت کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اقبال نے لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد پر اپنے بیان مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

یہ قرارداد عملاً اسی موقف کو دہراتی ہے جو فرقہ وارانہ گفت وشنید کے متعلق میں نے اختیار کیا تھا، یعنی یہ کہ قطعی تجاویز اکثریتی فرقے کی جانب سے سامنے آنی چاہئیں...... اب ہندوؤں کی باری ہے کہ وہ بتائیں کہ آیا وہ گفت وشنید کرنے کے لیے تیار ہیں ۸۰۔

عظیم حسین کے بیان کے مطابق ان کے والد فضل حسین نے حکومت کو پھر مشورہ دیا کہ اقبال کو تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیجا جائے، لیکن پچھلے سال کے تجربے کی بنا پر انگریزی حکومت اقبال کو آئندہ گول میز کانفرنس میں بھیجنے کے لیے اگر رضامند ہوئی تو سرد مہری کے ساتھ۔ ۸۱ سر ظفر اللہ خان تحریر کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت کو انہوں نے اقبال کی نامزدگی کے متعلق مشورہ دیا تھا کیونکہ

ان ایام میں فضل حسین رخصت پر تھے اور ان کی جگہ سر ظفر اللہ خان وائسرائے کی کونسل کے قائم مقام ممبر تھے۔ انگریزی حکومت کا اعتراض تھا کہ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں اقبال خاموش رہے اور کانفرنس کی کارروائیوں میں انہوں نے عملی طور پر کوئی حصہ نہ لیا۔ مگر بالآخر حکومت برطانیہ نے سر ظفر اللہ خان کا مشورہ قبول کیا[۸۲]۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائیوں پر شدید تنقید کی تھی اور مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے وہ انگریزی حکومت کے روّیے کی بھی مذمت کرتے رہتے تھے، اس لیے انگریزی حکومت انہیں خوش دلی سے تو آئندہ گول میز کانفرنس کا رکن نامزد نہ کرسکتی تھی، مگر اقبال کو مسلم ہند کی سیاسیات میں جو اہمیت حاصل ہوچکی تھی اسے نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ لہٰذا حکومت برطانیہ کو بادل نخواستہ انہیں کانفرنس کا رکن نامزد کرنا پڑا۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے سے پیشتر اقبال نے اپنے سیاسی موقف کی تشریح کے سلسلے میں ایک نہایت اہم خط ''ہمدم''، لکھنؤ کے ایڈیٹر کے نام تحریر کیا۔ جس میں فرمایا:

'ہمدم' نے مسلمانوں کو ہمیشہ بے لاگ مشورہ دیا ہے جس کے لیے تمام ملک آپ کا شکرگزار ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کرانے کے لیے دوبارہ کوشش کرنے کی تجویز آپ ہی کی تھی۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ شاید ایسی مفاہمت کا موقع پونا کے سمجھوتے کے بعد آجائے۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات تھی کہ شاید اکثریت کوئی تجاویز مسلمانوں کے سامنے پیش کرے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو دہلی میں اس سے پہلے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا تھا۔ بہرحال آپ نے مسٹر محمد علی جناح کا تار پڑھ لیا ہوگا۔ وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ مفاہمت کی تجاویز ہندوؤں کی طرف سے پیش ہونی چاہییں خواہ ان کی اساس

مخلوط انتخاب کا اصول ہی کیوں نہ ہو۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مطالبات میں جن کا اعادہ کئی بار کر چکے ہیں۔ از خود ترمیم کر دیں اور بالخصوص اصول انتخاب میں موجودہ حالات میں ایسا کرنا انتہا درجے کی سیاسی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور جو اتحاد خیال انہوں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے ضائع ہو جائے گا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفیے میں اور کچھ ہو نہ ہو پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ سات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ صوبہ سرحد کو آیندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے۔ سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آ گئے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی جداگانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے جو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ منتخب کر لیں۔ چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصص ملک میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کر لی تو آئندہ کا مورّخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومت برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا، بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انہوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی۔ تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض لیڈر جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں، مسئلہ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریق کار تصور کرتے ہیں اور بس جہاں تک میں نے مسلمانانِ ہند کی گذشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال و عواطف اور مغربی اقوام کی سیاسی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصے تک مسلمانانِ ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے۔ میرے

نزدیک جداگانہ انتخاب قومیت کے مغربی تصور سے بھی (قومیت کا مغربی تخیل ایک روحانی بیماری ہے) متناقض نہیں اور اس کے باوجود ہندی اقوام میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ خود یورپ میں بھی اس مقصد کا اب خاتمہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مشرقی اقوام یورپ کا اترا ہوا لباس پہن لیں اور انہی مصائب سے دو چار ہوں جن سے یورپ دو چار ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ خاص اس امر کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کرتا مگر کل شام یورپ جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ اس واسطے ان چند سطور پر کفایت کرتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ مفاہمت کی تجاویز مسلمانوں کی طرف سے پیش کرانا، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مطالبات ایک مدت سے سب کو معلوم ہیں، خلوص اور حب الوطنی کے نیک جذبات کا ثبوت نہیں بلکہ ایک سیاسی حیلہ ہے، جس کا مقصود یہ ہے کہ اکثریت، جس کا فرض ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرے، بھی اس کے لیے تیار نہیں۔ موجودہ حالت میں فرقہ وار مسائل کی بحث کو از سر نو چھیڑنا نہ مسلمانوں کی خدمت ہے نہ ملک کی[۸۳]۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اقبال نے ادارۂ معارف اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور چند دیگر اہل علم حضرات کی معیت میں اس کے اغراض و مقاصد، توسیع کے منصوبے اور طریق عمل وغیرہ کے بارے میں ایک تفصیلی بیان دیا۔ اس بیان کا تمہیدی حصہ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:

عہد حاضر میں اسلام اور تمدن اسلامی ہر نزدیک و بعید خطے میں ایک عظیم انقلابی کیفیت سے دو چار ہے۔ ترکی کا اجتہادی اقدام، ایران کا دور تجدد، مصر کا جوش اصلاح، افغانستان کا مغربی توغل، غرض عالم اسلام کے جس نقطۂ مدنیت پر نظر ڈالیے حیات کا ایک ہنگامہ زار برپا ہے۔ ممالک اسلامیہ کے یہ تمام تر تغیرات خفی اور جلی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جہاں ایک نوید زندگی کی شادابیوں سے لبریز

ہیں وہاں درحقیقت ایک پیام بیداری کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ۔ یہ پیغام بیداری کیا ہے؟ خالص علمی نقطۂ نظر سے اس کا اور اس کے معنوی اثرات کا تجزیہ کیجیے تو بھی ہماری نگاہوں کو اکثر اہم نتائج سے دوچارہ ہونے کا موقع ملتا ہے، جن میں سے ایک، کم ازکم تاریخی اعتبار ہی سے سہی، ماضیات اسلام کا تحفظ بھی ہے یعنی اخلاقی، معاشرتی تمدنی نقاط پر اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرنے کے علاوہ جس حد تک ہندوستانی مسلمانوں اور عام مسلمانوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے ۔ ازبس ضروری ہے کہ اس مفید سلسلے کی طرف بہترین توجہات منعطف کی جائیں کیونکہ مسلمانوں کو موجودہ دور جمود سے نکالنے اور ان میں ایک معنوی بیداری کی روح پھونکنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی[۸۴] ۔

تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہونا تھی، لیکن اقبال ایک ماہ قبل یعنی ۱۷ اکتوبر کو یورپ روانہ ہوئے ۔ خیال تھا کہ لندن پہنچنے سے پیشتر یورپ کے بعض علمی مراکز میں چند روز قیام کریں گے ۔ چونکہ ان کی روانگی کی اطلاع اہل لاہور سے پوشیدہ رکھی گئی تھی اس لیے احباب اور اعزہ ہی لاہور اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے آئے ۔ سید امجد علی مسلم وفد کے آنریری سیکرٹری کی حیثیت سے، اقبال کے ہم سفر تھے ۔ فرنٹیر میل کی روانگی سے قبل انہوں نے اخبارات کے لیے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ مسلمانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ اس حکمت عملی پر سختی سے کاربند رہیں گے ۔ جو آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادو ں میں درج ہے ۔ پھر ارشاد کیا:

میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے بیان کردہ اصول عمل یاد دلاؤں ۔ جب تو نے ایک طریق عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے ۔ تو فی الفور عمل شروع کردے اور اللہ پر بھروسا رکھ[۸۵] ۔

بمبئی پہنچنے پر صلاح الدین سلجوقی، افغان قونصل نے اقبال کا استقبال کیا اور

انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ بمبئی میں مختصر قیام کے دوران میں اقبال نے کچھ وقت عطیہ بیگم اور ان کے شوہر فیضی رحمین کے ساتھ گزارا۔ پھر سید امجد علی کے ہمراہ کونٹے روسو نامی بحری جہاز کے ذریعے یورپ روانہ ہو گئے۔ جہاز معمول کے مطابق عدن کے مقام پر ٹھہرا، لیکن اقبال طبیعت کی ناسازی کے سبب نیچے نہ اترے بلکہ اپنے کیبن ہی میں آرام کرتے رہے۔ بالآخر جہاز اٹلی کی بندرگاہ وینس پہنچا اور وہاں سے اقبال ریل کے ذریعے پیرس روانہ ہوئے۔ پیرس میں سردار امراؤ سنگھ شیر گل نے ان کا خیر مقدم کیا اور ایک سادے سے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اس زمانے میں سردار امراؤ سنگھ شیر گل اپنی ہنگیرین بیوی اور بیٹیوں (امرتا اور اندرا) کے ساتھ پیرس ہی میں رہائش پذیر تھے۔ اقبال ان سب سے ملے اور سردار امراؤ سنگھ شیر گل اور سید امجد علی کے ساتھ نپولین کا مزار دیکھنے کے لیے گئے۔ اگلے روز معروف فرانسیسی مستشرق لوئی میسنیوں سے ملاقات کی اور چند گھنٹے ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا۔ فرانسیسی فلسفی، برگساں سے بھی ملنے کا ارادہ تھا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ چند دنوں کے لیے پیرس سے باہر کسی گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے طے پایا کہ گول میز کانفرنس سے واپسی پر ان سے ملاقات کریں گے۔

پیرس میں چند روز قیام کے بعد اقبال اور سید امجد علی بذریعہ ریل لندن پہنچے۔ وکٹوریہ اسٹیشن پر انگریز نو مسلم خالد شیلڈریک نے ان کا استقبال کیا، اور اقبال کو مشہور برطانوی سیاست دان جان برائیٹ کی تقاریر کا مجموعہ پیش کیا۔ خالد شیلڈریک نے اقبال سے درخواست کی کہ گول میز کانفرنس کے مباحث میں حصہ لینے سے پیشتر وہ اس کتاب کو ضرور پڑھ لیں۔ جان برائٹ وہی شخص تھا، جس نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان سے نکلنے سے قبل وہاں کم از کم پانچ آزاد ریاستیں قائم کرنی پڑیں گی۔ بقول سید امجد علی اقبال نے رات بھر میں وہ کتاب پڑھ لی[۸۶]۔

تیسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی طرف سے کوئی شریک نہ ہوا۔ محمد علی جناح کو شرکت کے لیے نامزد نہ کیا گیا تھا، اس لیے وہ بھی موجود نہ تھے، البتہ قیام لندن کے دوران میں اقبال نے ان سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اقبال نے اس کانفرنس میں بھی محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شرکت کی اور اس کی کارروائیوں میں سرگرمی سے حصہ نہ لیا۔ انہیں اینگلو انڈین فرقے کی تعلیمی کمیٹی کا ممبر بنایا گیا، لیکن اس کمیٹی کے کسی بھی اجلاس میں وہ شریک نہ ہوئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ تیسری گول میز کانفرنس کے بیشتر مباحث کل ہند وفاق یا مرکزی حکومت سے متعلقہ امور کے بارے میں تھے اور اقبال وفاق میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے، بلکہ وہ تو مرکزی حکومت کے قیام ہی کے خلاف تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ صوبوں کو مکمل خود مختاری دے دی جائے اور ہر صوبے کا تعلق براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے ساری کانفرنس کے دوران میں صرف ایک تقریر کی اور اس میں جان برائیٹ کے اقوال کو اپنے مؤقف کی تائید میں اس لیے پیش کیا کہ برطانوی زعماء اُن کی تجویز سے سیخ پا نہ ہو جائیں، بلکہ اسے اپنے ایک پرانے سیاستدان اور پارلیمینٹیرین کی بلند کی ہوئی آواز کی بازگشت تصور کریں [۸۷]۔ اس کانفرنس کے دوران میں چوہدری رحمت علی اور کیمبرج کے دیگر مسلم طلبہ نے بھی پاکستان اسکیم سے متعلق انگریزی پمفلٹ ''اب اور کبھی نہیں'' مندوبین میں تقسیم کیا۔

اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبید کر تیسری گول میز کانفرنس میں بحیثیت مندوب کے شریک تھے۔ وہ اپنی انگریزی تصنیف ''پاکستان یا تقسیم ہند'' میں اقبال کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر ایک مشترکہ مرکزی حکومت کی مخالفت کو پاکستانی اسکیم کا خصوصی اور بنیادی پہلو قرار دیا جائے تو گول میز کانفرنس کا ایک ہی رکن ایسا نظر آتا ہے، جس نے اس اسکیم کا نام لیے بغیر اس کی تائید کی اور وہ تھا سر محمد اقبال، جس نے گول میز کانفرنس میں

اس رائے کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے لیے کوئی مرکزی حکومت نہ ہو اور یہ کہ صوبے خودمختار اور آزاد ڈومینین ہوں جن کا براہ راست تعلق وزیر ہند سے لندن میں ہو۸۸۔

۲۴رنومبر ۱۹۳۲ء کو مس فارقوہرسن نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی جانب سے اقبال کو ایک استقبالیہ دیا۔ اس تقریب میں گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور برطانیہ کی بعض مقتدر شخصیات موجود تھیں۔ مس فارقوہرسن نے اقبال کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

ہم انہیں غیر معمولی صفات کا حامل پاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعرانہ بصیرت سے مستقبل میں دور تک دیکھ سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایک فلسفی کی دقت نظر اور عمیق فکر سے وہ انسانی مسائل میں پنہاں اصولوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں اور پھر ان میں عملی انسان کی وہ صلاحیتیں بھی موجود ہیں، جن کے سبب وہ گول میز کانفرنس کے رکن بنائے گئے ۸۹۔

اس کے بعد لارڈ لیمنگٹن نے ان کی شعری تخلیقات کی تعریف کی اور دنیائے اسلام کی بیداری کے سلسلے میں اقبال کی خدمات کو سراہا۔ پھر انہوں نے اقبال کو حاضرین سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اقبال نے اپنی مختصر سی تقریر میں واضح کیا کہ وہ سب حکومت برطانیہ کے تعاون سے ہندوستان کے لیے آئین وضع کرنے کی خاطر اکٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں پایدار آئین بنانا چاہیے۔ جو ناکام نہ ہو۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب اور زبانوں کے لوگ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے ہیں۔ ضروری ہے کہ کانفرنس کے مقاصد کی وضاحت کر دی جائے۔ باہمی اعتماد ہونا چاہیے، کیونکہ اعتماد ہی سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ کانفرنس میں خیر سگالی کی فضا پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں جرأت ہے او رانہوں نے برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ پرخلوص اور وفا شعاری کے تعلقات استوار

رکھے ہیں۔لہٰذا انہیں توقع ہے کہ آخری فیصلہ کرتے وقت مسلمانوں کی خواہشات کا خیال اوران کے مطالبات کا تحفظ کیا جائے گا۔

بعد ازاں ۱۵ ارستمبر ۱۹۳۲ء کو اقبال نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے ایک اور اجلاس سے خطاب کیا۔ یہ اجلاس کمیٹی روم نمبر ۱۰میں منعقد ہوا اور اس میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین، غیر ملکی سفیر اور مسلم وفد کے دیگر ممبران موجود تھے۔اقبال نے اپنی تقریر میں فرمایا:

مسلمانانِ ہند کے مطالبات کے پیچھے جو اصول کارفرما ہے۔وہ اتنا سادہ ہے کہ برطانوی عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ سے اوپر ہے۔اس آبادی کا نصف حصہ پورے ملک میں بکھرا ہوا ہے۔تاہم اس کا بڑا حصہ نسبتاً گتھا ہوا ہے۔ بالخصوص ان صوبوں میں جو مغربی ہند کے علاقے میں واقع ہیں۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فیصد ہے۔سندھ میں تقریباً ۷۳فیصد اور صوبہ سرحد میں تقریباً ۹۵ فیصد ہے۔مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ بحثییت ان لوگوں کے جو ایک مخصوص تاریخی روایت اور یک جہتی کی نمائندگی کرتے ہیں، جو ہندوستان کی کسی دوسری جماعت میں نہیں پائی جاتیں، وہ اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتے ہیں۔اور اپنے تمدنی خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں یہی وہ اصول ہے جو اُن کے مطالبات کے پس پردہ کارفرما ہے۔یہ مطالبات آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد اقبال نے چودہ نکات کی روشنی میں مسلمانوں کے مطالبات کی وضاحت کی اور تقریر کے آخر میں فرمایا:

چار پانچ سال ہوئے بحثییت صدر آل انڈیا مسلم لیگ میں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے ممکنہ حل کے طور پر مغربی ہند میں ایک وسیع مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی

تھی۔ اگرچہ یہ تجویز مسلمانانِ ہند کے مطالبات میں شامل نہ تھی، لیکن میری ذاتی رائے اب بھی یہی ہے کہ صرف یہی ایک ممکنہ حل اس مسئلے کا ہے۔ میں اتنی دیر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ جب تک تجربہ اس تجویز کی معقولیت یا غیر معقولیت ثابت کر کے نہیں دکھا دیتا۔

یہ درست ہے کہ اقبال کی تجویز کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا، لیکن غالباً اسی کا نوٹس لیتے ہوئے کومین نے ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا:

ایک مضبوط اور متحد ہندوستان کو وجود میں لانا...... روز بروز ناممکن ہوتا چلا جارہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جگہ شمال اور شمال مغرب میں ایک ایسی طاقتور مسلم ریاست قائم ہو جائے گی جس کی نگاہیں یقیناً ہندوستان کی طرف سے ہٹ کر بقیہ دنیائے اسلام کی طرف مڑی ہوں گی جس کے کنارہ پر یہ ریاست واقع ہوگی ۹۰۔

بہر حال بقول اقبال، لارڈ لوتھیان نے ان کی تجویز سے متاثر ہو کر اتنا ضرور کہا کہ گو ان کی اسکیم ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے، لیکن اسے بار آور ہونے میں پچیس برس درکار ہوں گے ۹۱۔

قیام لندن کے دوران میں اقبال نے ارسطاطلین سوسائٹی کے اجلاس میں انگریزی میں اپنا فلسفیانہ مقالہ ''کیا مذہب ممکن ہے'' پڑھا۔ اس مقالے کے لیے دعوت انہیں لاہور ہی میں موصول ہوگئی تھی اور انہوں نے یورپ روانگی سے قبل اسے ایک ماہ کی مدت میں تحریر کیا تھا۔ اب یہ مقالہ اقبال کی انگریزی تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں شامل ہے۔

انگلستان سے رخصت ہونے سے پیشتر اقبال کے ایک انٹرویو کی روئیداد ''لورپول پوسٹ'' میں مشرق میں خواتین کا مقام کے عنوان سے شائع ہوئی۔ دراصل موضوع گفتگو اسلام میں عورتوں کے حقوق تھا۔ اقبال نے اس انٹرویو میں مسلم خواتین میں پردے کے رواج کی حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نیز فرمایا

کہ تعدادِ ازدواج کی اسلام میں محض اجازت ہے اور یہ فرض نہیں۔ سو اسلام کا آئیڈیل ایک ہی شادی ہے۔ مزید فرمایا کہ اسلامی قانون کے مطابق ایک مسلم ملک کی حکومت ایسے کسی بھی اختیاری حکم کو منسوخ کر سکتی ہے، جب وہ کسی نہ کسی انداز میں معاشرتی زندگی کی تباہی کا باعث بننے لگے۔ اس کے علاوہ اسلامی قانون کے تحت ہر عورت خواہ وہ کنواری ہو، شادی شدہ ہو مطلقہ ہو یا بیوہ ہو اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر اپنی جائداد کی دیکھ بھال خود کرنے کا حق رکھتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار خود چلا سکتی ہے۔ عدالتوں میں قانونی چارہ جوئی کا اختیار رکھتی ہے اور بعض مفتیوں کے فتاویٰ کے مطابق وہ خلیفہ (سربراہ مملکت) بھی منتخب کی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں انگلستان کے قانون کے تحت عورتیں قانونی طور پر معذور لوگوں یعنی پاگلوں اور نابالغوں کے زمرے میں آتی تھیں۔ اس لیے وہ نہ تو اپنی جائداد کی نگہداشت خود کر سکتی تھیں، نہ کوئی کاروبار خود چلا سکتی تھیں اور نہ انہیں عدالتوں میں کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق حاصل تھا کیونکہ قانون کی نگاہ میں ان کی حیثیت ویسے ہی تھی جیسے پاگلوں یا نابالغوں کی ہوتی ہے۔ اقبال نے واضح کیا کہ مسلمان خاوند پر اپنی بیوی کی مہر کی ادائیگی کے علاوہ اس کے نان و نفقہ کی کفالت کی ذمہ داری ہے اور اپنے ان حقوق کے حصول خاطر بیوی اس کی تمام جائداد پر کلی طور پر قابض رہنے کا حق رکھتی ہے پھر فرمایا کہ جس طرح مسلم خاوند کو طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح بیوی کو بھی خلع کا حق حاصل ہے وہ نکاح کے وقت اگر چاہے تو یہ حق اپنے بھائی والد یا کسی اجنبی شخص کو بھی بطور مختار تفویض کر سکتی ہے ۹۲۔

تیسری گول میز کانفرنس ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اختتام پذیر ہوئی تاہم اقبال ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء تک لندن ہی میں مقیم رہے۔ لندن میں انہوں نے سردار بیگم کے لیے چند زیورات خرید کیے جو ایک گلوبند اور دو تین انگشتریوں پر مشتمل تھے۔ راقم نے بھی انہیں قیام لندن کے دوران ایک خط لکھا تھا جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا

تھا کہ وہ واپسی پر اس کے لیے ایک گراما فون باجا لیکر آئیں۔ اقبال راقم کے لیے گراما فون لے کر تو نہ آئے لیکن راقم کا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی نظم "جاوید کے نام" کی شانِ نزول کا باعث بنا:

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں مری غزل ہے مرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو راقم کے نام اقبال کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انگلستان سے اسپین، جرمنی اور آسٹریا جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے لندن میں اپنی قیام گاہ کوئین اینز مینشنز سینٹ جیمز پارک ایس ڈبلیو سے ایما ویگے ناست کو تحریر کیا کہ وہ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو رات کے ساڑھے دس بجے ہائیڈل برگ پہنچیں گے اور بائرشر ہوف ہوٹل میں ٹھہریں گے اور یہ کہ ہائیڈل برگ میں ان کے قیام کا واحد مقصد ایما ویگے ناست سے اتنے سالوں کے بعد دوبارہ ملنا تھا۔ مگر ایما ویگے ناست کے نام ان کے میڈرڈ (اسپین) سے تحریر کردہ خط مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جرمنی اور آسٹریا جانے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا کیونکہ وہ وینس (اٹلی) سے ۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو ہندوستان روانہ ہونے والے جہاز کو نئے وردی

سے واپس جانا چاہتے تھے۔ بہر حال اقبال کو باوجود اپنی تمام تر خواہش کے زندگی بھر دوبارہ جرمنی جانے اور ایماویگے ناست سے ملنے کا موقع نہ مل سکا[۹۳]۔ وہ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لندن سے دوبارہ پیرس پہنچے۔

پیرس میں اقبال کی توجہ کا مرکز دراصل صرف دو شخصیتیں تھیں۔ اوّل لوئی میسنیوں اور دوم برگساں۔ لوئی میسنیوں نے منصور حلاج پر تحقیق کا کام کیا تھا اور حلاج کی ''کتاب الطّواسین'' کے عربی متن کو ایک مدلل مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ ۱۹۱۳ء میں شائع کیا تھا۔ اقبال سے ان کا تعارف اسی تصنیف کے سبب ہوا اور اسی تصنیف کو پڑھ کر اقبال کا حلاج کے متعلق نظریہ بدل گیا۔ ان کی آپس میں خط و کتابت شروع ہوئی۔ میسنیوں کے بیان کے مطابق اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۱۸ فروری ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا کہ وہ پیرس آکر ان سے ملیں گے۔ اور ساتھ اپنی تازہ تصنیف ''جاوید نامہ'' کا ایک نسخہ بھی ارسال کیا تھا۔ میسنیوں تحریر کرتے ہیں کہ پیرس میں اقبال سے ان کی ملاقات یکم نومبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی اور گفتگو کا محور زیادہ تر حلاج تھا، جس کی شخصیت کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس ملاقات کے وقت سید امجد علی و سردار امراؤ سنگھ شیر گل بھی اقبال کے ساتھ تھے جس کمرے میں یہ لوگ بیٹھے وہ غالباً میسنیوں کا کتب خانہ تھا، کیونکہ ہر طرف کتابوں کے انبار لگے تھے۔ میسنیوں اس ملاقات کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اقبال سے کئی صدیاں پیشتر ہندوستان کے کچھ مسلمان مفکرین نے وحدت الوجودی صوفیہ (دبستان ابن العربی) کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ صوفیہ کی فنائے اخروی کے متعلق ہندو تفکرات کی تمام کائنات ہے۔ دبستان شہودیہ علی ہمدانی سے شروع ہو کر سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی تک ہے۔ اقبال نے پیرس میں میرے ساتھ ملاقات کے دوران میں اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ وحدت الوجودی نہیں بلکہ وحدت الشہودی ہیں۔''[۹۴]

برگساں میں اقبال کی دلچسپی اس لیے تھی کہ ان کا تصورِ واقعیت زمان کچھ حد تک اقبال کے کیمبرج میں طالب علمی کے زمانے میں اس موضوع پر تحریر کیے ہوئے ایک مقالے میں پیش کردہ استدلال سے مطابقت رکھتا تھا، جو انہوں نے اپنے استاد میک ٹیگرٹ کی منطقی نکتہ چینی کے سبب ناقص سمجھ کو ضائع کردیا تھا۔ اقبال شاید برگساں سے مل کر انہیں اس نظریہ پر اعتراضات سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ پیرس میں برگساں سے ان کی ملاقات کی تاریخ کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ غالباً یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۳ء کے پہلے ہفتے کے کسی دن ہوئی ہوگی۔ ان ایام میں برگساں بہت ضعیف ہو چکے تھے، اور کئی بیماریوں کے سبب دو پہیوں والی کرسی کے بغیر حرکت نہ کر سکتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر رکھا تھا، لیکن اقبال کے اشتیاق ملاقات کی بنا پر اُنہیں خاص طور پر نوازا۔ یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی، اور برگساں کے نظریہ واقعیت زمان پر خوب بحث ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں اقبال نے ان کے روبرو اللہ تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی۔ ''لاتسبوا الدھر ان الدھر ھواللہ'' جسے سن کر برگساں بہت متاثر ہوئے اور بار بار اقبال سے پوچھتے کہ کیا یہ قول واقعی درست ہے۔ اس ملاقات میں گفتگو شاید سردار امراؤ سنگھ شیر گل کے توسط سے ہوئی اور انہوں نے اس کی تفصیل بھی قلم بند کی، مگر ایسے برے طریق سے کہ بعد میں ان سے خود اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہوگیا۔ سو بدقسمتی سے اس گفتگو کا ریکارڈ محفوظ نہ کیا جا سکا۔

اقبال نے برگساں سے ملاقات کا ذکر مختلف شخصیتوں سے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ مثلاً سر ولیم روتھن سٹائن کو ۱۹۳۳ء میں تحریر کرتے ہیں:

پیرس میں برگساں سے میری ملاقات ہوئی اور فلسفیانہ مسائل پر بے حد دلچسپ باتیں ہوئیں۔ برگساں نے کہا برکلے کے فلسفے کا حاصل یہ ہے: ادراک میں مادہ بہ تمام و کمال منکشف ہو جاتا ہے، لیکن ذہن کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا۔ برکلے

کے افکار پیش کرنے کا ایک اور انداز ہے۔ ہماری گفتگو دو گھنٹے جاری رہی، برگساں بوڑھے ہو گئے ہیں اور بہت بیمار ہیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے، لیکن مجھ سے ملاقات کے لیے انہوں نے از راہ کرم خاص طور پر وقت نکالا۔ بدقسمتی سے جو دوست ان کے ساتھ تھے، اور گفتگو قلمبند کر رہے تھے، بعد میں اپنا لکھا ہوا خود بھی نہ پڑھ سکے ۹۵۔

لارڈ لوتھیان کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۳ء میں اسی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

پیرس میں قیام کے دوران میں میری برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفہ اور تمدن پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلۂ خیال کیا، جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلاسفروں نے بعض نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے ہیں ۹۶۔

ایڈورڈ ٹامسن کے نام اپنے ایک خط محررہ ۲۹ جولائی ۱۹۳۳ء میں تحریر کرتے ہیں:

میں نے اپنے لیکچر ''کیا مذہب ممکن ہے'' میں جدید نفسیات کی زبان میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا تصوف کیا ہے۔ پروفیسر برگساں نے، جنہوں نے میرا یہ لیکچر پڑھا تھا، ملاقات پر میرے سامنے اعتراف کیا کہ ان کا اپنا فلسفہ بھی اسی سمت حرکت کر رہا ہے ۹۷۔

سید نذیر نیازی اپنی تصنیف ''اقبال کے حضور میں'' میں تحریر کرتے ہیں کہ انہوں نے اقبال سے پوچھا: جب آپ نے برگساں سے ملاقات کی اور گفتگو ہوئی تو کیا اس کی کوئی یادداشت بھی لی گئی تھی؟ فرمایا: امراؤ سنگھ میرے ساتھ تھے۔ گفتگو بھی انہی کے توسط سے ہوتی رہی اور انہی نے اسے قلمبند بھی کیا مگر اس بری طرح سے کہ بعد میں انہیں خود بھی اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔ آپ نے مزید ارشاد

فرمایا: اس گفتگو میں برکلے کے متعلق بھی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ برکلے کی اہمیت موجودہ زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ پھر فرمایا: اس گفتگو کا ملخص مشہور فن کار...... (یہاں مراد غالباً سردار امراؤ سنگھ شیر گل کی بیٹی امرتا شیر گل سے ہے) کو بھیج دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہیں موجود بھی ہے یا ضائع ہو گیا۔ سید نذیر نیازی کے سوال پر کہ اقبال نے برگساں سے اپنے نظریۂ زمان کا ذکر بھی کیا تھا، انہوں نے فرمایا: ہاں، اس کا ذکر آیا تھا اور برگساں کو بھی بڑا افسوس تھا کہ میں نے اسے کیوں ضائع کر دیا ۹۸۔

اقبال کی پیرس سے میڈرڈ (اسپین) روانگی کی تاریخ کا بھی حتمی طور پر تعین کرنا مشکل ہے، لیکن عین ممکن ہے کہ وہ ۵ یا ۶ / جنوری ۱۹۳۳ء کو پیرس سے میڈرڈ پہنچے ہوں اور ۲۶ / جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس آ گئے ہوں۔ پس اسپین میں ان کا قیام تقریباً تین ہفتوں کا تھا۔ ۹۹ میڈرڈ میں ان کے ہمراہ ایک دبلی پتلی انگریز لڑکی بھی تھی، جو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری یا شاید مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی اور جسے میڈرڈ کے اخباری نمائندوں نے غلطی سے اقبال کی بیٹی سمجھا۔ اس لڑکی کا ذکر میڈرڈ کی اخباری رپورٹ میں یا عطیہ فیضی کے نام اقبال کے ایک خط محررہ ۲۹ / مئی ۱۹۳۳ء میں آتا ہے عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

اسپین میں میری پرائیویٹ سیکرٹری کا، جو ایک انگریز لڑکی تھی رویہ مجھ سے اچانک بدل گیا اور وہ پرائیویٹ سیکرٹری کی بجائے ایک مرید کی طرح میری خدمت کرنے لگی۔ میں نے اس کے روّیے میں اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھی۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس پر منکشف ہوا ہے کہ میں کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔ اب میرے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ میں اپنے تاثر کی تشریح مثبت طور پر کر سکوں۔ البتہ منفی طور پر ضرور کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ میں احمق نہیں ہوں ۱۰۰۔

اس انگریز لڑکی کو اقبال نے کب اور کہاں اپنی لیڈی سیکرٹری کے طور پر منتخب

کیا؟ یار لوگوں نے اقبال سے منسوب کر کے اس پر بھی افسانہ گھڑ رکھا ہے۔ مثلاً چوہدری خاقان حسین کا بیان ملاحظہ ہو:

ایک دن آپ (اقبال) نے سفر اسپین کا ایک اچھوتا واقعہ سنایا، جس کے پس منظر کا شاید ہی کسی کو علم ہو۔ فرمانے لگے کہ لندن کے قیام کے دوران وہ نواب بھوپال سے ملنے گئے تو انہوں نے فرمایا اقبال اسپین کیوں نہیں جاتے، میں نے عرض کیا: اگر میں بھی نواب بھوپال ہوتا تو اب تک ہو آیا ہوتا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ دوسرے روز مجھے میرے ہوٹل میں نواب صاحب بھوپال کا ایک چیک چھ ہزار روپے کا ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سفر کے لیے ہے۔ چنانچہ میں نے اخبار میں ایک سیکرٹری کی ضرورت کا اشتہار دیا اور ایک موزوں لیڈی سیکرٹری کا انتخاب کر کے اسے سفر کی تفصیلات بتائیں اور یہ ہدایت کی کہ روانگی سے اختتامِ سفر تک وہ مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کرے گی۔ چیک کی ساری رقم میں نے اس کے حوالے کر دی اور سفر کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ اس قدر کارگزار سیکرٹری ثابت ہوئی کہ مجھے سفر میں کہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس نے میری رہائش، قیام کا بہت ہی اچھا انتظام کیا۔ اس سیکرٹری کے بارے میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کی عادات اور مزاج سے واقف ہونے کے بعد اس نے اچانک اپنا رویہ تبدیل کر لیا، اور پرائیویٹ سیکرٹری سے بڑھ کر "مرید" کی طرح آپ کی خدمت گزاری میں مصروف ہوگئی۔ جب علامہ نے اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا: آپ مجھے کوئی آسمانی مخلوق، معلوم ہوتے ہیں [۱۰۱]۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ چوہدری خاقان حسین مذکور سے اقبال کا کیا خاص تعلق تھا کہ صرف انہیں ہی سفر اسپین کے متعلق ایک ایسا اچھوتا واقعہ سنانے کے قابل سمجھا، جس کے پس منظر کا علم کسی اور کو نہ تھا۔ اقبال کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ تو لاہور ہی سے اسپین جانے کا تھا۔ اس لیے لندن میں نواب بھوپال

کے کہنے یا ان کے چھ ہزار روپے کا چیک دینے پر اسپین کیوں جاتے۔ پھر اس سفر کے لیے انہیں خصوصی طور پر لیڈی سیکرٹری منتخب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال یہ بتانا مشکل ہے کہ آیا متذکرہ انگریز لڑکی لندن ہی سے اقبال کے یورپی سفر میں ان کے ہمراہ گئی یا پیرس میں ان کی ہمسفر بنی یا میڈرڈ میں ان سے ملی۔ راقم کی رائے میں انگریز لڑکی کا تعلق برٹش انٹیلی جنس سے تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لندن ہی سے اقبال کے ہمراہ آئی ہو۔ لیکن سید امجد علی اس کا ذکر نہیں کرتے، اگر چہ وہ اقبال کے ساتھ لندن سے پیرس پہنچے تھے۔ عین ممکن ہے کہ پیرس یا میڈرڈ میں وہ ان سے اتفاقیہ ملی ہو اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ وہ اسپین جا رہے ہیں یا ہسپانوی زبان سے ناواقف ہیں، اس نے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری یا مترجم کے فرائض انجام دینے کی حامی بھر لی ہو۔ ان ایام میں سفر یورپ کے دوران میں ایک سیاح کو ہر قسم کے لوگ مل سکتے تھے، اور اقبال آخر سیاح ہی تو تھے۔ ایک واقعہ جو انہوں نے کئی احباب کو سنایا یہ تھا کہ جس ٹرین کے ذریعے وہ پیرس سے لندن جا رہے تھے اس میں ان کے کمپارٹمنٹ میں دو قمار باز بھی سوار تھے، جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے چند سادہ لوح مسافروں سے بیس پاؤنڈ کی رقم ہتھیا لی۔ اقبال ان کی چالوں کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ جب قمار بازوں نے انہیں بھی تاش کھیلنے کے لیے کہا تو اقبال نے دعوت قبول کر لی اور لندن پہنچنے تک ان سے بیس پاؤنڈ جیت لیے۔ جب وہ گاڑی سے نیچے اترے تو دونوں قمار باز ان سے ہارے ہوئے بیس پاؤنڈ واپس لینے کی غرض سے ان کی خوشامد کرنے لگے اور انہوں نے ہندوستانیوں کی سخاوت اور فیاضی کی خوب تعریفیں کیں۔ مگر اقبال نے انہیں ڈرایا کہ وہ کھیل میں دھوکے بازی سے کام لیتے رہے ہیں اور ان کی رپورٹ ابھی پولیس کو کی جائے گی۔ یہ سن کر وہ فوراً وہاں سے کھسک گئے[102]۔

برٹش انٹیلی جنس کو اقبال کے سفر ہسپانیہ میں دلچسپی ہوسکتی تھی۔ وہ گذشتہ

سال اٹلی جاکر مسولینی سے مل چکے تھے۔ اس مرتبہ ان کا ارادہ صرف اسپین جانے کا نہ تھا بلکہ وہ جرمنی اور آسٹریا بھی تھے۔ جس طرح مسولینی اٹلی کے سیاہ وسفید کا مالک تھا، اسی طرح ہٹلر بھی جنوری ۱۹۳۲ء میں جرمنی کا چانسلر بن گیا تھا۔ اسپین کا اٹلی کے فاشسٹوں اور جرمنی کے نازیوں سے رابطہ تھا۔ اسپین میں اقبال کی صدر جمہوریہ سے ملاقات کا امکان بھی تھا۔ اس کے بعد اگر وہ جرمنی جاتے تو عین ممکن ہے کہ ہٹلر سے بھی ملتے۔ ہندوستان کی ایک اہم مسلم سیاسی شخصیت کی یورپ میں ایسے لوگوں سے ملاقاتوں کی روئیداد برٹش انٹیلی جنس کے ریکارڈ کے لیے اشد ضروری تھی۔ بہر حال میڈرڈ میں انگریز لڑکی کے رویے میں اچانک تبدیلی سے اقبال کو پہلی بار یہ شبہ ہوا کہ اس کا تعلق کسی خفیہ برٹش ایجنسی سے ہے۔ اقبال نے اس مرتبہ سفر یورپ کے دوران میں فرانس اور اسپین دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور اپنی منشا کے مطابق جرمنی اور آسٹریا نہ گئے۔ خصوصاً جرمنی میں تو جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے اقتدار میں آجانے کے سبب بڑی گہما گہمی تھی۔ ممکن ہے اس خیال کے پیش نظر کہ برٹش انٹیلی جنیس یورپ میں ان کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے، انہوں نے جرمنی یا آسٹریا جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔

میڈرڈ میں اقبال کے میزبان دراصل پروفیسر آسین پیلاکیوس تھے، جنہوں نے دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' اور اسلام پر ایک کتاب تحریر کی تھی اور اقبال کو قیام لندن کے دوران میں میڈرڈ آکر یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ میڈرڈ پہنچتے ہی اقبال کی ملاقات اسپین کے وزیر تعلیم سے ہوئی۔ چند روز میڈرڈ ٹھہرنے کے بعد وہ اندلس (جنوبی اسپین) تشریف لے گئے۔ واپسی پر پھر کچھ دن میڈرڈ میں قیام کیا اور وہاں ان پروفیسروں اور دانشوروں سے ملاقات کی جو عربی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ یا جن کا موضوع تحقیق، اسلامی تمدن تھا۔ میڈرڈ ہی میں وہ عرب محقق محمود خضیری سے ملے جو اس زمانے میں وہاں فقہ اسلام پر تحقیق کر رہے تھے۔

چند سال بعد جب انہیں عبداللہ چغتائی سے معلوم ہوا کہ محمود خضیری، نصیرالدین طوسی پر ایک مقالہ تحریر کر رہے ہیں تو اقبال نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ طوسی کی اقلیدس اور ان کے معاصرین کی تحریروں کا بغور مطالعہ کریں، کیونکہ اس تحقیق سے انہیں معلوم ہوگا کہ مسلم ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ہوسکتا ہے مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں۔[۱۰۳]

۲۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے اسپین اور فلسفۂ اسلام کے موضوع پر میڈرڈ یونیورسٹی کی نئی عمارت میں لکچر دیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر آسین پیلاکیوس نے کی اور انہی نے اقبال کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ اجلاس کی روئیداد میڈرڈ کے اخبار 'الدبیت' میں شائع ہوئی۔[۱۰۴]

اقبال نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی سیر کی اور حدیقۃ الزہرہ (وہ محل جو عبدالرحمٰن اول نے اپنی چہیتی بیوی زہرہ کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا) کے کھنڈر بھی دیکھے، لیکن جو عمارت آنکھوں سے ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، وہ مسجد قرطبہ تھی۔

جس طرح مسولینی سے اقبال کی ملاقات کے متعلق کئی کہانیاں مشہور ہیں، اسی طرح مسجد قرطبہ میں اقبال کے تحیۃ المسجد کے نفل ادا کرنے کے بارے میں بھی مختلف روایتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرطبہ میں اس مسجد کی زیارت نے اقبال کو جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو انہیں پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس تجربے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے غلام رسول مہر کو تحریر کیا: مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو[۱۰۵]۔ پھر راقم کو بھی ایک تصویری کارڈ قرطبہ سے ارسال کیا اور لکھا: میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کو دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے کہ تم جوان ہوکر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو[۱۰۶]۔ اقبال کی یہ دعا بیالیس سال کے بعد پوری ہوئی جب

راقم اگست ۱۹۷۵ء میں سیاحت ہسپانیہ کے دوران میں قرطبہ پہنچا اور نہ صرف مسجد قرطبہ کی زیارت کی بلکہ محراب کے سامنے اس مقام کو بھی تعظیماً چھوا جہاں شاید کھڑے ہو کر اقبال نے نماز ادا کی تھی۔

اقبال غالباً پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسجد قرطبہ کے کلیسا میں منتقل کیے جانے کے کئی صدیوں بعد جنوری ۱۹۳۳ء میں یہاں پہلی بار دو رکعت نماز ادا کی۔ بہر حال ان کے نماز ادا کرنے کے متعلق جو مختلف روایتیں مشہور ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں کہ اقبال مسجد کی شان وشوکت سے اسے قدر متاثر ہوئے کہ ان کا دل بے اختیار نماز پڑھنے کو چاہا، چنانچہ انہوں نے گائیڈ سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا۔ ادھر اقبال نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پیشتر ادائے نماز سے فارغ ہو گئے [107]۔ سید امجد علی دعوٰی کرتے ہیں کہ اقبال نے انہیں ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ انہوں نے ادائیگی نماز سے قبل وہاں اذان بھی دی تھی [108]۔ غالباً اسی دعوے کو ذہن میں رکھتے ہوئے فقیر سید وحید الدین، لکھتے ہیں کہ اقبال نے تقریباً سات سو سال بعد مسجد قرطبہ میں اذان دی اور نماز پڑھی [109]۔ سر مالکم ڈارلنگ بیان کرتے ہیں:

اقبال نے مجھے اپنے قیام اسپین کی بڑی خوشگوار کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قرطبہ کی شاندار مسجد دیکھنے گئے تھے، جواب کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ انہوں نے گائیڈ سے اس جگہ نماز ادا کرنے کی اجازت طلب کی، کیونکہ یہ کسی زمانے میں مسجد رہ چکی تھی۔ گائیڈ نے کہا کہ کلیسا کے راہب اس پر خوش نہ ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور مصلیٰ بچھا دیا۔ اتنے میں ایک پادری احتجاج کے لیے وہاں آنکلا۔ اقبال نے گائیڈ سے کہا۔ پادری سے کہہ دو کہ ایک بار مدینہ میں عیسائیوں کا ایک وفد کچھ مطالبات لے کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ میں انہیں ٹھہرایا تھا۔ جب عبادت کا وقت آیا تو عیسائی متردد تھے کہ آیا وہ مسجد میں اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر سکیں گے۔ جب سرورِ کائنات کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے انہیں بخوشی عبادت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب ہمارے نبیؐ نے عیسائیوں کو اپنی مسجد میں عبادت کی اجازت دے دی تھی تو میں اس جگہ جو کسی وقت مسجد تھی، کیا نماز نہیں ادا کر سکتا؟ پادری سے اس کا جواب بن نہ پڑا اور اقبال نے نماز شروع کر دی۔ جب اقبال نے نماز ختم کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کلیسا کے تمام پادری اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں، بلکہ ان میں سے ایک نے تو اس منظر کی تصویر بھی لے لی۔ اس کے بعد اقبال نے کہا: غالباً میں واحد مسلمان تھا، جس نے گزشتہ چار سو سال میں یہاں پہلی بار نماز ادا کی ۔۱۱۰

اسی سلسلے میں ایک مضمون روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۴ء میں محمود الرحمٰن نے امتیاز محمد خان کے حوالے سے شائع کی ہے جس میں ارشاد کرتے ہیں کہ قیامِ لندن ہی سے اقبال کا ارادہ مسجد قرطبہ کی زیارت اور کسی نہ کسی طرح وہاں نماز ادا کرنے کا تھا۔ مگر مسجد گرجا بنائی جا چکی تھی اور وہاں اذان و نماز دونوں کی ممانعت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی طرف رجوع کیا۔ (واضح رہے کہ آرنلڈ دو سال قبل یعنی ۱۹۳۰ء میں فوت ہو چکے تھے) او ر آرنلڈ کی کوشش سے انہیں مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرنے کی اجازت اس شرط پر ملی کہ جب وہ مسجد کے اندر داخل ہو جائیں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا یا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے یوں چلتی ہے: اقبال حسب قرارداد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے آواز کی پوری شدت سے اذان دی۔ اقبال کہتے ہیں: میں اس جذبے، سرور اور کیفیت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، جو اس وقت مجھ پر طاری تھا۔ سالہا سال کے بعد مسجد کے اندر پہلی مرتبہ اللہ

اکبر کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اذان سے فارغ ہونے کے بعد اقبال نے مصلیٰ بچھایا اور نماز ادا کرنے لگے۔ دوران نماز ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ: سجدے میں گرتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔ اور جب اقبال ہوش میں آئے تو دل کا سکون اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا[111]۔

ان روایتوں میں حقیقت کتنی اور افسانہ کتنا ہے، اس کا اندازہ اقبال کے دو بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ لاہور واپس پہنچے اور اسٹیشن سے نکل کر گھر تشریف لائے تو بعض احباب ان کے ساتھ تھے اور موضوع گفتگو سیاحت ہسپانیہ تھی۔ قرطبہ کی عدیم المثال مسجد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

میری رائے میں اس سے زیادہ خوبصورت اور شاندار مسجد روئے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی۔ عیسائیوں نے بعد فتح قرطبہ اس مسجد میں جا بجا چھوٹے چھوٹے گرجے بنا دیے تھے۔ جنہیں اب صاف کر کے مسجد کو اصل حالت میں لانے کی تجویزیں کی جا رہی ہیں۔ میں نے ناظم آثار قدیمہ کی معیت میں جا کر بہ اجازت خاص اس مسجد میں نماز ادا کی۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے تسلط کے بعد جسے کم و بیش ساڑھے چار سو برس گزر چکے ہیں۔ اس اسلامی عبادت گاہ میں یہ پہلی اسلامی نماز تھی[112]۔

پھر عبدالرشید طارق سے گفتگو کے دوران میں انہوں نے اسپین میں مسلمانوں کی تاریخی عمارات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد کیا:

میں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے تاریخی مقامات کا معائنہ کیا۔ مسجد قرطبہ میں، جس کی فضا صدیوں سے بے اذان پڑی ہے، حکام کی اجازت لے کر نماز ادا کی۔ سجدے میں گر کر خدا کے حضور گڑگڑایا کہ اللہ اللہ! یہ وہ سرزمین ہے جہاں مسلمانوں

نے سینکڑوں برس حکومت کی، یونیورسٹیاں قائم کیں اور یورپ کو علم و فضل سکھایا۔ جن کے دبدبے سے شیروں کے دل دہلتے تھے اور جن کے احسان کے نیچے آج تمام فرنگستان دبا ہوا ہے۔ آج میں اسی قوم کا ایک فرد انہی کی تعمیر کردہ مسجد میں اغیار کی اجازت لے کر نماز پڑھ رہا ہوں ۱۱۴۳۔

سو ظاہر ہے اقبال حکومت ہسپانیہ کی اجازت خاص کے تحت ناظم آثار قدیمہ کی معیت میں مسجد میں نماز ادا کرنے کی خاطر گئے تھے، اس لیے مصلیٰ ساتھ لے کر گئے اور عین ممکن ہے کہ یہ انتظام انہوں نے قیام میڈرڈ کے دوران میں پروفیسر آسین پیلا کیوس یا وزیر تعلیم حکومت ہسپانیہ کے ذریعے کرایا ہو۔ ان کے ہمراہ فوٹو گرافر بھی تھے۔ جنہوں نے نماز کی ادائیگی کے دوران اور بعد میں ان کی کئی تصویریں مسجد کے اندر کھینچیں، جو کئی بار اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں اور خاصی مقبول ہیں۔ حکومت ہسپانیہ نے شاید اپنے ملک کے پراپیگنڈے کی خاطر انہیں یہ اجازت خاص دی تھی، لیکن جس کسی نے بھی مسجد قرطبہ کی زیارت کی ہے، اس نے دیکھا ہو گا کہ مسجد کے اندر اس کے لاتعداد ستونوں کے درمیان جگہ گھیر گھیر کر بیسیوں چھوٹے چھوٹے گرجے بنائے گئے ہیں جو ابھی تک صاف نہیں کیے گئے۔ البتہ مسجد کا خوبصورت ترین حصہ محراب والا حصہ ہے جو ستونوں سمیت تمام کا تمام سنہری ہے، کیونکہ اس پر سونے کا جڑاؤ کام کیا گیا ہے اور وہ اب تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ مسجد سے باہر اس کے عالی شان مینار واحد پر جو اذان کے لیے مخصوص تھا، اب گھنٹا آویزاں ہے اور رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق دن میں خاص خاص وقتوں پر اسے بجایا جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ اپنے عہد میں دیگر مساجد یا مسلمانوں کی عام عبادت گاہوں کی طرح خوب روشن اور تابندہ عبادت گاہ تھی۔ (چراغ جلانے کے لیے تیل کا خرچ ۲۱۴۴ من اور موم بتیاں جلانے کے لیے ۲/۱-۳ من موم اور ۲۴ سیر سوت سال بھر میں صرف ہوتا تھا)، لیکن اب عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی

طرح اس کی فضا تیرہ و تار ہے اور اس کے اندر بیٹھے ہوئے بھاری آرگن کی کرخت موسیقی کے پس منظر میں اس کی ویرانی اور کس مپرسی سے خوف آتا ہے۔ رات کو مسجد کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ راقم نے رات کو مسجد قرطبہ کے گرد طواف کیا اور مخصوص وقفوں کے بعد انتہائی تاریکی میں مینار سے آویزاں گھنٹے کو بجتے سنا تو یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک آسیب زدہ عمارت ہے مسجد کی شان و شوکت اور حسن و جمال اور اُسی کے ساتھ اس کی ویرانی، کس مپرسی اور تیرہ و تار فضا کا منظر، ایک بار دیکھ کر کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ راقم سفر ہسپانیہ سے واپسی پر عمرہ کی غرض سے مکہ معظمہ گیا اور مدینہ منورہ کی بھی زیارت کی، لیکن مسجد الحرام اور مسجد نبوی کی روشنیوں، رونقوں اور اذانوں میں مسجد قرطبہ کا تیرہ و تار منظر نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹتا تھا۔

خیر یہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے مسجد میں نماز ادا کرنے پر کسی پادری نے اعتراض کیا ہو اور اقبال نے اسے مدینہ میں عیسائیوں کے وفد کی آمد والی بات سنائی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب وہ وہاں نماز ادا کر رہے ہوں یا ان کی تصویریں اتر رہی ہوں تو پادریوں کا ایک غول اس منظر کو دیکھنے کے لیے آ کھڑا ہوا ہو۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی دعائیہ نظم:

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

اقبال نے اندلس میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے جو عظیم شاہکار دیکھے، ان کے متعلق مختلف شخصیتوں سے اپنے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً شیخ محمد اکرام کے نام اپنے ایک خط محررہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھا:

میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہو گی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ

ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی [114]۔

پروفیسر حمید احمد خان تحریر کرتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے مسجد قرطبہ کے حوالے سے فرمایا:

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آئی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قواء شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا۔ مگر الحمراء محض انسانوں کا...... میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر ''ہو الغالب'' لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہاں تو ہر طرف خدا ہی غالب ہے، کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو [115]۔

جیسے کہ ذکر کیا جا چکا ہے، اقبال ۲۶ رجنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس پہنچے۔ ان کے ایک خط بنام غلام رسول مہر محررہ یکم فروری ۱۹۳۳ء، سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شیدائی سے انہیں روزنامہ ''انقلاب'' کے بہت سے پچھلے پرچے پیرس میں پڑھنے کے لیے مل گئے اور یوں وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے باخبر ہوئے [116]۔

بالآخر وہ اپنے پروگرام کے مطابق ۱۰ رفروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بحری جہاز کونٹے وردی پر سوار ہوئے اور ۲۲ رفروری ۱۹۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔ کسٹمز سے نکلتے وقت ڈیوٹی ادا کرنے کی خاطر سردار بیگم کے زیورات کا ڈبا سوٹ کیس سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ کسی ساتھی نے مشورہ دیا کہ کم از کم انگشتریاں تو انگلیوں میں پہن لیجیے، کچھ ادا نہ کرنا پڑے گا۔ مگر وہ نہ مانے اور تمام زیورات پر جو بھی ٹیکس لگا، ادا کر کے باہر آئے۔

بمبئی میں ''خلافت'' کے نامہ نگار کو سیاحتِ ہسپانیہ کے متعلق اقبال نے ایک

انٹرویو بھی دیا جس کے دوران فرمایا:

میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح یہودیوں کے لیے ارض موعودہ فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے۔ اس قدر خوبصورت اس درجہ پُرفضا اور ایسا آرام دہ **ملک**[117]۔

ایک اور موقع پر سفر اندلس کے متعلق فرمایا:

میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کے علاوہ میں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہور عالم قصر عبدالرحمٰن اوّل نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے اس جگہ پر ایک ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا[118]۔

۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر راقم سمیت لاتعداد لوگ ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔[119] پلیٹ فارم پر جمعیۃ الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر نے سپاسنامہ پیش کیا اور تیسری گول میز کانفرنس میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا۔ مزید واضح کیا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ اقبال اس کی تکمیل کے لیے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ جواب میں اقبال نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارشاد کیا:

آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اول سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے مسلمانوں کے

حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو...... خدا کے لیے آپ اپنے تمام اختلافات کو خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں ۱۲۰۔

اسٹیشن سے نکل کر اقبال احباب کے ہمراہ گھر آئے، لیکن گفتگو زیادہ تر سیاحت ہسپانیہ کے متعلق ہی ہوئی۔ بار بار مسجد قرطبہ کا ذکر فرماتے رہے یوں معلوم ہوتا تھا گویا مسجد قرطبہ ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں رچ بس گئی ہے۔

مآخذ

باب ۱۸

۱۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل (خط محررہ یکم فروری ۱۹۳۱ء بنام عباس علی خان لمعہ)، صفحہ ۲۶۸۔ محمد دین تاثیر اور سید عبدالواحد معینی کی رائے میں لمعہ کے نام اقبال کے خطوط جعلی ہیں۔ دیکھیے "نیرنگ خیال" تاثیر نمبر جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۴۷۔ "نقش اقبال" از سید عبدالواحد معینی، صفحہ ۱۸۴ء

۲۔ مکتوبات اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۵۰

۳۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۱۶ تا ۱۱۸

۴۔ اقبال اور بھوپال" از صہبا لکھنوی، صفحات ۴۲ تا ۴۹۔ صہبا لکھنوی تحریر کرتے ہیں کہ چند ماہ بعد اقبال دوبارہ بھوپال گئے تھے اور دوسرا دورہ بھی اسی سلسلے میں تھا۔ لیکن اس کی تفصیل کے متعلق کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی فرماتے ہیں کہ جولائی ۱۹۳۱ء میں اقبال دوبارہ بھوپال گئے تھے، کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کی خاطر بھوپال سے مدد طلب کی تھی نواب بھوپال نے اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں اقبال کو مشورے کے لیے بھوپال بلوایا تھا مگر دوسری مرتبہ اقبال نے بھوپال میں کہاں قیام کیا یا کتنے روز ٹھہرے یہ انہیں معلوم نہیں ہوسکا۔ "اقبال اور دار الاقبال بھوپال" از عبدالقوی دسنوی بحوالہ سیفیہ یادگار اقبال' جلد ہفتم، سیفیہ کالج بھوپال، صفحہ ۱۰۸۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کے بیان کے مطابق اقبال ۲۱ جولائی ۱۹۳۱ء کے بعد بھوپال اور دہلی گئے، لیکن انکی نواب بھوپال سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے بارے میں ملاقاتوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اقبال اور کشمیر، صفحات ۸۳، ۸۴ نیز دیکھیے "انوار اقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۹۶، ۹۷

۵۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۱۸، ۱۱۹

۶۔ ایضاً، صفحات ۱۱۹، ۱۲۰

۷۔ ایضاً صفحات ۱۲۰ تا ۱۲۱

۸۔ ایضاً، صفحات ۱۲۵ تا ۱۲۹

۹۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحہ ۲۰۷

۱۰۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۱۲، انگریز پرنسپل کا نام وٹیکر تھا اور اس نے مسلم طلبہ کے احتجاج کے باوجود کالج کے ایک مسلم پروفیسر صدیقی کو برطرف کر دیا تھا۔ دیکھیے ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ صفحہ ۹۶

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۴

۱۲۔ اقبال اور کشمیر از صابر آفاقی، صفحات ۷۸، ۹۷، ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۲۲۴

۱۳۔ ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۲۲۵، ۲۲۶

۱۴۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۲۹، نیز دیکھیے ''آئینہ اقبال''۔ مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۲۲۴ تا ۲۲۶ ''اقبال اور کشمیر'' از صابر آفاقی، صفحات ۷۹، ۸۰

۱۵۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۳۰ تا ۱۳۱

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۳

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۲۔ نیز دیکھیے ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبد اللہ قریشی ، صفحہ ۲۲۵۔ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں اقبال راقم کو اپنے ساتھ وادی کشمیر لے جانا چاہتے تھے، لیکن کشمیر میں ان کے داخلے پر پابندی اٹھانے کے متعلق خط و کتابت شروع کی گئی اور خاصی مدت کے بعد جواب موصول ہوا کہ پابندی اٹھالی گئی ہے، یا وہ کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ مگر تب تک راقم کی تعطیلات گرما ختم ہو چکی تھیں اور موسم بھی بدل چکا تھا اس لیے کشمیر جانا ممکن نہ ہو سکا۔ اگلے موسم گرما کے آغاز سے بیشتر اقبال

رحلت فرما گئے۔ اس سلسلے میں جو خط و کتابت ریاست کشمیر کے حکام سے ہوئی وہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے۔

۱۹۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' انگریزی، صفحہ ۳۱۹۔ محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں کہ عظیم حسین نے جن الفاظ میں اس نامزدگی کا ذکر کیا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کہ محض سر فضل حسین کی سفارش کی بنا پر وائسرائے نے اقبال کو نامزد کر کے اعزاز بخشا تھا۔ حالانکہ ایسی بات نہ تھی، کیونکہ اقبال ہندوستان کی مسلم ریاست میں ایک خاص مکتب فکر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحات ۲۷۹ تا ۲۸۱۔

۲۰۔ ''سفرنامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحہ ۱۰، ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی صفحہ ۳۷

۲۱۔ ''سفرنامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۰، ۱۱

۲۲۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۷۶

۲۳۔ ''سفرنامۂ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحہ ۱۲، ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۳۵ تا ۱۳۷۔

۲۴۔ ''سفرنامۂ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۳، ۱۴، ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۳۵ تا ۱۳۷

۲۵۔ ''سفرنامۂ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۷ تا ۱۹

۲۶۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۵۴ تا ۶۲

۲۷۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۳۸ تا ۱۴۴

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۷

۲۹۔ ایضاً، صفحات ۱۳۷، ۱۳۸

۳۰۔ سفرنامۂ اقبال از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۲۹، ۳۰

۳۱۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاءاللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۱۸۱

۳۲۔ اصل خط انگریزی میں ہے، دیکھیے ''علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط مس ایما ویگے ناسٹ کے نام ترجمہ ڈاکٹر سعید اختر درانی، ''نوائے وقت'' خصوصی اشاعت ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء۔

۳۳۔ اس خط کی فوٹو کاپی راقم کو شیخ نسیم حسن وکیل برادر ممتاز حسن مرحوم نے دی۔ اصل خط انگریزی میں ہے۔ اردو ترجمہ راقم نے کیا۔ نیز دیکھیے ''علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط مس ایما ویگے ناسٹ کے نام'' ترجمہ ڈاکٹر سعید اختر درانی، ''نوائے وقت'' خصوصی اشاعت ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء مزید دیکھیے ''اقبال یورپ میں'' از ڈاکٹر سعید اختر درانی۔

۳۴۔ اصل خط انگریزی میں تحریر کیا گیا۔ راقم کے پاس فوٹو کاپی ہے اور اردو ترجمہ بھی راقم نے کیا۔ نیز دیکھیے ''نوائے وقت'' خصوصی اشاعت ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء۔ ان خطوط میں انداز خطاب اس طرح ہے: مائی ڈیر فرالین ویگے ناسٹ یا مائی ڈیر مس ویگے ناسٹ۔ ان خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال جرمن زبان بھولتے جا رہے تھے۔ محمد امان اللہ ہوبہم کی رائے میں اقبال کی ایما ویگے ناسٹ سے وابستگی عقیدت واحترام کی بنیاد پر تھی اور یہ دوستی غیر جذباتی نوعیت کی تھی۔ مثلاً خطوط میں اقبال انہیں تعظیم کے القاب یا ''آپ'' کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور بے تکلفی کا لہجہ ''تم'' یا ''تو'' کبھی اختیار نہیں کرتے۔ اسی طرح ایما ویگے ناسٹ انہیں ڈاکٹر یا پروفیسر اقبال کہتی تھیں، دیکھیے روزنامہ ''ڈان'' مورخہ ۸ مئی ۱۹۸۲ء (انگریزی)۔ اقبال نے واپس لاہور پہنچ کر ایما ویگ ناسٹ کو ایک اور خط تحریر کیا اور جرمنی نہ پہنچ سکنے کی معذرت کی۔ فرمایا:

''ان دنوں کی یاد جب ہم گوئٹے کا ''فاوسٹ'' ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام سال ہا سال کے دوران میں میں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں تو سنیے، میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں، وہ میں نے شائع کر دی ہیں۔ تاہم میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے اور خود کو اپنے اس ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پاتا ہوں۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے، لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں اور میں نے بھی پوری تسکین دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کیا ہے۔ یہ بات باعثِ تاسف ہے کہ میں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم نہ رکھ سکوں گا، لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں بجائے اس کے کہ کسی اور سے ان کا ترجمہ کرواؤں، اپنے خطوط کسی اور کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے چاہے آپ کا خط ختم کرنے میں تین دن لگیں پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے بجائے خود لغت کی مدد سے سمجھ پاؤں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں...... مجھے امید ہے کہ میں دوبارہ یورپ آؤں گا...... جرمنی میرے لیے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن ہے۔ میں نے اس ملک میں بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سوچا۔ یہاں تک کہ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر ایک دائمی گھر حاصل کر لیا ہے''۔

۳۵۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحات ۳۴۸، ۳۴۹، ''سفر نامۂ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۶۔

۳۶۔ ''سفر نامۂ اقبال'' محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۰۶ تا ۱۰۸۔ اقبال کا موقف اصولی طور پر درست تھا کیونکہ ۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی کی مجلس عاملہ کی قرارداد میں اس مؤقف کی توثیق کی گئی تھی۔ اقبال کے خط بنام سر آغا خان محررہ ۱۶ نومبر ۱۹۳۱ء کے لیے دیکھیے ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی اے ڈار

(انگریزی)، صفحات ۸، ۹ نیز دیکھیے ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۵۵ تا ۲۶۱، ''اقبال کا سیاسی نامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۳۱۰، ۳۱۱

۳۷۔ ''میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس'' مرتبہ وحید احمد۔ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان (انگریزی) صفحات ۶۹، ۷۰

۳۸۔ ''سفر نامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۳۰ تا ۳۳

۳۹۔ ایضاً، صفحات ۳۳ تا ۴۹۔ کیمبرج کے مسلم طلبہ کی اقبال سے ملاقات اور لفظ ''پاکستان'' کے متعلق معلومات خواجہ عبدالرحیم نے اپنی زندگی میں راقم کو فراہم کی تھیں۔

۴۰۔ ایضاً، صفحات ۵۴ تا ۶۳۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات، ۲۳۹ تا ۲۴۵۔

۴۱۔ ''سفر نامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۵۰ تا ۵۲۔ عورتوں کے جس اجتماع میں انگریز خواتین کو اقبال نے پیغام دیا وہ لیڈی لارنس کا ایٹ ہوم تھا۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۲۵۲

۴۲۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۲۵۱

۴۳۔ ایضاً، صفحات ۲۴۵ تا ۲۵۱

۴۴۔ ''سفر نامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۱۳ تا ۱۳۱، ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۶۱ تا ۲۶۵۔ ''سیاحتِ اقبال'' مرتبہ، حق نواز، صفحات ۱۴۴ تا ۱۵۵۔ اقبال کے بعض سوانح نگاروں نے ان کے سفر اٹلی کو ۱۹۳۲ء میں یعنی تیسری گول میز کانفرنس سے فراغت کے بعد بیان کیا ہے جو غلط ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔ ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحہ ۱۸۲، ''سرگزشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۴۱۹

۴۵۔ ''روزگارِ فقیر'' جلد اول، صفحات ۴۸، ۴۹

۴۶۔ ''اقبال نامہ''مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحہ ۳۱۴

۴۷۔ ''اقبال کے چند جواہر ریزے'' از عبدالحمید، صفحہ ۵۱۔ متذکرہ نیپلز کی بیرونس یہی کاؤنٹس کارنیوالے تھیں۔

۴۸۔ ''سفرنامۂ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحہ ۱۶۱۔ ایضاً، صفحات ۱۵۶ تا ۱۸۶۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل فلسطین عثمانی سلطنتِ ترکیہ کا حصہ تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جمعیت اقوام نے اسے برطانیہ کی تحویل میں دے دیا۔ حکومت برطانیہ نے صیہونی تحریک کو اعلان بالفور کے ذریعے ۱۹۲۷ء میں تسلیم کرلیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کا وطن قائم کیا جائے گا۔ سو ۱۹۱۷ء سے دنیا کے مختلف ممالک سے یہودی فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ آٹھ ہزار تھی، لیکن ۱۹۴۸ء تک ان کی تعداد سات لاکھ تک پہنچ گئی۔ فلسطینی عربوں کا مطالبہ تھا کہ فلسطین میں ایک آزاد عرب ریاست قائم کی جائے۔ اس لیے انہوں نے صیہونی تحریک کی مخالفت کی اور جوں جوں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا ان کے اور فلسطینی عربوں کے درمیان فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بہرحال یہودیوں نے اپنی بے پناہ دولت اور لا تعداد وسائل کے بل بوتے پر فلسطین کے کچھ حصے میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ نے قرارداد منظور کی کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ ایک عربوں کے لیے اور دوسرا یہودیوں کے لیے۔ مزید برآں اس قرارداد کے تحت بیت المقدس (یروشلم) کو اقوام متحدہ کے تحت ایک بین الاقوامی زون قرار دیا گیا تھا، لیکن اس قرارداد کو نہ تو عربوں نے قبول کیا اور نہ یہودیوں نے۔ ۱۹۴۸ء میں حکومت برطانیہ نے یہ علاقہ چھوڑا اور اسی سال یہودی ریاست اسرائیل نے اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ فلسطین کا تنازع ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کئی مراحل سے گزر کر اب انتہائی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔

۵۰۔ ’’سفرنامہ اقبال‘‘ از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۱۸۷ تا ۱۸۹

۵۱۔ ’’گفتارِ اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۴۵ تا ۱۴۷

۵۲۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان، صفحات ۴۲۳، ۴۲۴

۵۳۔ ’’مکتوباتِ اقبال‘‘ مرتبہ سید نذیر نیازی صفحات ۷۹، ۸۰

۵۴۔ ’’انوارِ اقبال‘‘ مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۹۸، ۹۹

۵۵۔ ’’مکتوباتِ اقبال‘‘ مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۳۱۔ اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں مرتبہ محمد حنیف شاہد، صفحہ ۲۰۳

۵۶۔ ’’گفتارِ اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۲۴۴

۵۷۔ ’’حیاتِ اقبال‘‘ از مسعود الحسن جلد اوّل (انگریزی) صفحات ۲۹۴ تا ۲۹۵

۵۸۔ ’’انوارِ اقبال‘‘ مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۹۶، ۹۷

۵۹۔ ایضاً، صفحہ ۹۹

۶۰۔ ’’حیاتِ اقبال‘‘ از مسعود الحسن، جلد اوّل (انگریزی)، صفحات ۲۹۵، ۲۹۶

۶۱۔ ’’اقبال کی تقریریں اور بیانات‘‘ مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحات ۳۳ تا ۵۵

۶۲۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان، صفحات ۳۳۹ تا ۴۱۸

۶۳۔ ’’گفتارِ اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۴

۶۴۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان، صفحات ۳۴۸، ۳۴۹

۶۵۔ ’’گفتارِ اقبال‘‘ مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۴

۶۶۔ ’’اقبال کا سیاسی کارنامہ‘‘ از محمد احمد خان، صفحہ ۳۵۱

۶۷۔ ’’ذکرِ اقبال‘‘ صفحات ۱۶۶، ۱۶۷

۶۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۷

۶۹۔ ’’اقبال کی تقریریں اور بیانات‘‘ مرتبہ شاملو (انگریزی)، صفحہ ۱۷۸

۷۰۔ ایضاً، صفحات ۱۷۸، ۱۷۹

۷۱۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۳۵۵، ۳۵۶، ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحات ۱۶۸، ۱۶۹

۷۲۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ شاملو (انگریزی)، صفحہ ۱۸۰

۷۳۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۴۲۰

۷۴۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ شاملو (انگریزی)، صفحات ۱۸۲ تا ۱۸۵

۷۵۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۵۵ تا ۱۵۷

۷۶۔ ''ایضاً، صفحات ۱۵۷، ۱۵۸

۷۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۹

۷۸۔ ایضاً، صفحات ۱۵۹، ۱۶۰۔ اسی قسم کے مضمون کا ایک تار شیخ عبدالمجید سندھی کے تار کے جواب میں ارسال کیا گیا۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۰۔ اسی دوران میں ڈاکٹر انصاری نے اقبال کو ایک تار بھیجا جس مین تجویز پیش کی کہ جس طرح اچھوتوں کی شکایات کا ازالہ ہو گیا ہے اسی طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی مانے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہندو مسلم اور سکھ مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ اقبال نے اپنے تار مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں انہیں بھی یہی جواب دیا کہ جس قسم کی کانفرنس وہ چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اکثریت کی طرف سے مفاہمت کی معین تجاویز پیش کی جائیں۔ ایضاً، صفحات ۱۶۰، ۱۶۱۔ لکھنؤ کانفرنس سے اقبال کی علیحدگی کو مضر قرار دیتے ہوئے جو تار سردار سلیمان قاسم مٹھا نے انہیں ۱۱/ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ارسال کیا۔ اس کا جواب بھی ایسے ہی الفاظ میں دیا گیا۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۱

۷۹۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان صفحات ۳۷۰، ۳۷۱، بحوالہ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ شاملو، صفحات ۱۸۶، ۱۸۷

۸۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۷۲، بحوالہ ایضاً، صفحات ۱۸۷، ۱۸۸

۸۱۔ ''فضل حسین، ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی)، ۳۱۹

۸۲۔ تحدیث نعمت از چوہدری ظفر اللہ خان۔ طبع ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳۱۴

۸۳۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۶۲ تا ۱۶۵

۸۴۔ ایضاً، صفحات ۱۶۹ تا ۱۷۲ فٹ نوٹ۔ اس ادارے کے لیے نظام حیدر آباد دکن نے تین سال کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ کی امداد منظور کی۔ دیکھیے اقبال ریویو اقبال اکادمی حیدر آباد، خصوصی اشاعت اپریل تا جون ۱۹۸۴ء، صفحات ۲۰ تا ۲۹

۸۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۲

۸۶۔ ''تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال'' از رحیم بخش شاہین۔ ''اقبال ریویو''۔ جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ء صفحات ۸۷ تا ۹۳

۸۷۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۳۸۱ تا ۳۸۳

۸۸۔ طبع ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳۲۹

۸۹۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۶۹ تا ۷۶

۹۰۔ ''تقدیر ساز سال (یعنی ہندوستان ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک)'' (انگریزی)، صفحات ۲۳۸ تا ۲۴۰

۹۱۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی) طبع ۱۹۴۳ء، صفحہ ۲۱، پچیس کی بجائے پندرہ برس بعد پاکستان قائم ہو گیا۔

۹۲۔ اقبال کے خطوط اور تحریریں مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی) صفحات ۶۳ تا ۶۷ اردو ترجمہ ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۳، ۱۴

۹۳۔ ''انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۱۰۰، ۱۰۱، نیز دیکھیے ''علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط مس ویگے ناسٹ کے نام'' ترجمہ ڈاکٹر سعید اختر درانی، ''نوائے وقت''، ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء ہفتہ وار خصوصی اشاعت

۹۴۔ ملاحظہ ہو مضمون: حکیم الامت علامہ اقبال، فرانسیسی مستشرق ماسینوں کی نظر میں "از محمد اکرام چغتائی"، نوائے وقت ۴ نومبر ۱۹۸۰ء

۹۵۔ اقبال کے خطوط اور تحریریں" مرتبہ بی۔اے۔ ڈار (انگریزی) صفحہ ۱۰۳ء نیز دیکھیے "اقبال ریویو" جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۰۵

۹۶۔ "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحہ ۲۲۵

۹۷۔ "اقبال ۔ ان کے سیاسی نظریات چورا ہے پر" مرتبہ اے۔ حسن علی گڑھ (انگریزی) صفحہ ۴۷

۹۸۔ صفحات ۲۰۵، ۲۰۶

۹۹۔ "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحہ ۲۲۴

۱۰۰۔ "اقبال کے خطوط اور تحریریں" مرتبہ بی۔اے۔ڈار (انگریزی)، صفحات ۱۰، ۱۱، ۷۸

۱۰۱۔ "یاد اقبال" از صابر کلوروی صفحات ۱۸، ۱۹۔ یہی من گھڑت روایت "اقبال اور بھوپال"، از صہبا لکھنوی میں بھی درج ہے، لیکن اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

۱۰۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۔ دیکھیے "ملفوظات اقبال" مرتبہ ابو اللیث صدیقی، صفحات ۲۶۹ تا ۲۷۰

۱۰۳۔ "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحات ۳۴۳، ۳۴۴، "انوار اقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحہ ۱۰۳، خطوط اقبال "مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحہ ۲۲۶

۱۰۴۔ "اقبال کے خطوط اور تحریریں" مرتبہ بی۔اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۷۷ تا ۷۹

۱۰۵۔ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۶۵ء

۱۰۶۔ "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحہ ۲۲۳

۱۰۷۔ "ذکر اقبال"، صفحہ ۱۸۲

۱۰۸۔ ''سرگذشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۴۱۹

۱۰۹۔ ''روزگارِ فقیر'' جلد اوّل، صفحہ ۱۴۸

۱۱۰۔ ''نوائے وقت'' ۱۰ مئی ۱۹۵۹ء، مضمون: لندن میں یوم اقبال

۱۱۱۔ یاد اقبال'' از صابر کلوروی، صفحہ ۱۹۔ ''اقبال ریویو'' جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۱۰، ۱۱۱ ''اوراق گم گشتہ'' مرتبہ رحیم بخش شاہین، صفحات ۳۳۲ تا ۳۳۴

۱۱۲۔ ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۸۔۱۹

۱۱۳۔ ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ ابواللیث صدیقی، صفحہ ۴۷

۱۱۴۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، جلد دوم، صفحات ۳۲۱، ۳۲۲

۱۱۵۔ ''ملفوظات اقبال'' مرتبہ ابواللیث صدیقی، صفحات ۱۵۷، ۱۵۸

۱۱۶۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحات ۱۰۱۔۱۰۲

۱۱۷۔ ''آئینہ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۱۵

۱۱۸۔ ''اقبال ریویو'' جولائی، اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۲۳، بحوالہ ''حرف اقبال''، صفحات ۱۹۳، ۱۹۴

۱۱۹۔ ان میں قابل ذکر شخصیات کے ناموں کی تفصیل کے لیے دیکھیے ''آئینہ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۱۷، ۱۸، ۱۹

۱۲۰۔ ایضاً، صفحات ۱۷، ۱۸، ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۶۶، ۱۶۷

---------اختتام---------

باب ۱۹

افغانستان

لاہور پہنچنے سے اگلے روز یعنی ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے گول میز کانفرنسوں کی بحثوں کی روشنی میں ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک اخباری بیان میں فرمایا:

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ آنے والے انتخابات کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسے تمام اسباب کا سدباب کریں جن کے سے ان کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مجوزہ دستور واضح طور پر اقلیتوں کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔[1]

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اقبال کے اعزاز میں ٹاؤن ہال لاہور کے باہر باغ میں دعوتِ چائے دی گئی، جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۔ اقبال نے ارکان انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ پینتیس سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے...... میری رائے میں اس (مسئلے) کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔[2]

۱۸ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملیہ میں رؤف بے کے دو خطبوں کی صدارت کے لیے دہلی پہنچے۔ رؤف بے ایک ترک سیاستدان اور دنیائے اسلام کے ایک بطل جلیل کی حیثیت سے پیرس سے دہلی مدعو کیے گئے تھے تا کہ جامعہ ملیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلے کا آغاز کر سکیں۔ اقبال اسٹیشن سے

سیدھے دارالاسلام، ڈاکٹر انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔شام کو ڈاکٹر انصاری، رؤف بے، ذاکر حسین اور دیگر احباب کی معیت میں جامعہ ملّیہ پہنچے۔ اجلاس کا اہتمام محمد علی ہال میں کیا گیا تھا۔ڈاکٹر انصاری نے جلسے کا افتتاح کیا اور اقبال کو کرسی صدارت پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ رؤف بے نے وطنیت اور اتحاد اسلامی کے موضوع پر اپنا خطبہ پڑھا۔بعد ازاں اقبال نے بحیثیت صدر جلسہ انگریزی میں ایک طویل تقریر کی۔اس تقریر میں انہوں نے عالم اسلام کی تازہ بیداری، انقلاب ترکی، مسئلہ اجتہاد، خلافت اور اتحاد اسلامی (مغربی اصطلاح کے مطابق پان اسلامزم) ایسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔آخر میں اپنی معروف نظم مسجد قرطبہ (جو اس وقت تک غیر مطبوعہ تھی) کا آخری بند سنایا جس میں ان اشعار کی تاثیر کے باعث اہل محفل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی:

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں !
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

ایک روز کے وقفے کے بعد یعنی ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو رؤف بے کے دوسرے توسیعی لکچر کے لیے اجلاس کی صدارت پھر اقبال نے کی۔اس مرتبہ ان کا موضوع خطبہ تھا ''جنگ عظیم''۔خطبے کے اختتام پر اقبال نے کوئی تقریر تو نہ کی، البتہ اتنا ضرور فرمایا کہ رؤف بے کی تقریر میں انہیں صرف ایک لطیفے کا اضافہ کرنا ہے، جس کا کسی زمانے میں یورپ میں بڑا چرچا تھا۔لطیفہ یہ تھا:

ایک روز کسی نے شیطان کو دیکھا، بڑے اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھا سگار پی رہا ہے اس نے جو شیطان کو اس حال میں دیکھا، بڑا متعجب ہوا۔کہنے لگا۔حضرت یہ کیا بات ہے؟ آپ اس اطمینان سے بیٹھے سگار پی رہے ہیں۔اب دنیا میں فتنہ وفساد

کون پھیلائے گا۔ اس نے کہا: فکر نہ کیجئے، میں نے یہ خدمت برطانوی کابینہ کے سپرد کر رکھی ہے۔[۳]

اس پر محفل میں بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء ہی میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) کی صورت میں شائع کر دیا۔ اس دستاویز پر ہندوستان بھر کے سیاستدانوں نے کڑی نکتہ چینی کی۔ اقبال نے بھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان ۲۰ / مارچ ۱۹۳۳ء کو جاری کیا، جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ وفاقی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں تین سو پچھتر نشستوں میں سے مسلمانوں کو صرف بیاسی نشستیں دی گئی ہیں۔ گویا ۲۱ء۸ فیصد نشستیں مسلمانوں کو مل رہی ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستانی ریاستوں کو ۳۳ء۳۰ فیصد نشستیں عطا کی گئی ہیں، حالانکہ ان کو اصولاً ۲۱ء۸ فیصد نشستیں ملنی چاہیے تھیں۔ ریاستیں نہ تو اقلیتیں ہیں اور نہ ان کے مفادات کو کوئی خطرہ لاحق ہے، لیکن قرطاس ابیض میں مسلمانوں کی حق تلفی کر کے ریاستوں کو پاسنگ عطا کیا گیا ہے۔

۲۔ وفاقی پارلیمنٹ میں نو نشستیں خواتین کو دی گئی ہیں۔ خواتین کے ان حلقہ ہائے انتخابات میں رائے دہندوں کی بڑی اکثریت غیر مسلم رہے گی، اس لیے کسی مسلم خاتون کا انتخاب عملاً ناممکن ہے۔

۳۔ پارلیمنٹ کے ایوان بالا کا انتخاب واحد قابل انتقال رائے دہی صوبجاتی کونسل کے اراکین کریں گے۔ اس کی وجہ سے مخلوط انتخاب کا اصول رائج ہو جاتا ہے۔

۴۔ صوبوں میں وزراء کو کم اختیارات دیے گئے ہیں اور گورنروں کو زیادہ۔

۵۔ مسلمانوں کے شخصی قانون کے لیے مناسب تحفظات نہیں رکھے گئے۔

۶۔ بلوچستان سے متعلق اسکیم سے نہ تو بلوچی مطمئن ہوں گے اور نہ عام مسلمان۔[۴]

۲۱ / مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال دہلی سے واپس لاہور آئے، لیکن ۱۵ اپریل

۱۹۳۳ء کی صبح کو انہیں پھر دہلی جانا پڑا۔ کیونکہ ۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو مسئلہ تعلیم پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس میں اقبال کو مدعو کیا گیا تھا، اور وہ اس لیے کہ تیسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں انہیں اینگلو انڈین فرقہ کی تعلیمی کمیٹی کا رکن بنایا گیا تھا۔ بہرحال ۵ اپریل ۱۹۳۳ء ہی کی شام کو ذاکر حسین کی صدارت میں انہوں نے جامعہ ملیہ میں ''لندن سے غرناطہ تک'' کے موضوع پر ایک لکچر دیا۔۵

اگلے روز اقبال پھر طلبہ سے خطاب کرنے کے لیے جامعہ ملیہ گئے۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ اقبال ہمارے مدۃ العمر کے محبوب ہیں۔ انہوں نے شعر کہنا کیا شروع کیے، ہمارے دل میں گھر کر لیا۔ ہم اپنی محبت کا اظہار ان کے استاد ہی کی زبان میں کریں گے۔

تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

ان کا گھر بھی عشاق کا دل ہے اور وہ ہم سب کے محبوب ہیں۔ اقبال نے ان کا شکریہ ادا کیا اور طلبہ سے خطاب کیا۔ بعد ازاں طلبہ سے بات چیت کی اور ان کی بیاضوں پر دستخط کرتے رہے۔ اقبال ۷ر اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور روانہ ہو گئے۔

۱۵ر اپریل ۱۹۳۳ء کو ادارۂ معارف اسلامیہ کا اجلاس زیر صدارت اقبال ہیلی ہال پنجاب یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا:

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم فقہی جزئیات کی چھان بین کے بجائے ان اہم شعبہ ہائے علم کی طرف متوجہ ہوں جو ہنوز محتاج تحقیق ہیں۔ ریاضیات، عمرانیات، طب اور طبیعیات میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے ابھی تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مستور و پنہاں ہیں، جن کے احیاء کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ یورپ کے علماء بیسویں صدی میں جن نظریات و انکشافات کو اپنے لیے نئی چیز سمجھتے ہیں۔ ان پر عرب علماء و فضلا صدیوں پہلے سیر حاصل بحثیں کر چکے ہیں۔ آئن سٹائن کا نظریۂ

اضافیت یورپ کے نزدیک نیا ہو تو ہو، لیکن علماء اسلام کی کتابوں میں صدہا سال پہلے اس کے مبادی زیر بحث آ چکے ہیں۔ برگساں کے فلسفۂ امتیازی کو سمجھنے کے لیے ابن خلدون کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے......٦

مئی ۱۹۳۳ء میں چینی ترکستان میں یورش کی خبریں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اقبال عالم اسلام کے ہر معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے ان خبروں کو پڑھ کر وہ وسطی ایشیا میں ایک اور مسلم مملکت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔ اس ضمن میں ١٦ مئی ۱۹۳۳ء کو انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں چینی ترکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

ترکستان ایک وسیع ملک ہے جو تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ پر روس، دوسرے پر افغانستان اور تیسرے پر چین کی حکومت ہے۔ ۱۹۱۴ء میں چینی ترکستان میں چینی مجسٹریٹوں کے تقرر اور ملک کی کل مسلم آبادی پر چینی زبان کے جبری نفاذ کے سبب بڑی بے چینی پھیلی تھی، لیکن حالات قابو سے باہر نہ ہوئے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس ملک میں ۱۹۳۰ء میں ایک سترہ سالہ نوجوان مسلم لڑکے، ماچاؤ نگ ینگ کی زیر قیادت جدید انقلاب کا آغاز ہوا۔ ستروں ہارڈٹ مہم کے مسٹر پٹرو اس نوجوان مسلم جرنیل سے ترکستان میں مل چکے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے انگلستان کی سنٹرل ایشین سوسائٹی میں ایک لکچر کے ذریعے اپنے تاثرات بیان کیے تھے۔ اس سال ماچاؤ نگ ینگ نے ایک شہر ہامی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ محصور چینی افواج سے صلح گفت و شنید کے لیے مسٹر پٹرو کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ شہر میں محصور چینی جرنیل اور چینی دفاعی کونسل نے مسٹر پٹرو کا خیر مقدم کیا۔ مسٹر پٹرو کا خیال تھا کہ وہ ان سے محاصرہ کرنے والی افواج کی مضبوطی یا ان کے ارادوں کے متعلق سوالات پوچھیں گے، مگر ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب چینی جرنیل نے صرف یہی ایک سوال پوچھا: کیا یہ سچ ہے کہ ماچاؤ نگ ینگ

صرف بیس برس کا ہے؟ اس جواب پر کہ مابیں برس سے بھی کم عمر کا ہے، چینی جرنیل نے دفاعی قونصل سے، جو شہر اس کے حوالے کر دینا چاہتا تھا، خطاب کرتے ہوئے کہا: میں اکیاسی برس کا ہوں اور ایک طویل عرصے سے میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میرا پڑپوتا بھی اس دودھ پیتے بچے سے عمر میں بڑا ہے۔ ان حالات میں تم مجھ سے یہ توقع کیونکر رکھ سکتے ہو کہ میں اس شہر کو اس بچے کے حوالے کر دوں گا۔ بوڑھا جرنیل اپنے الفاظ پر قائم رہا اور بڑے استقلال کے ساتھ بھوک اور دیگر مصائب برداشت کرتا رہا، حتیٰ کہ اسے چینی حکومت کی طرف سے کمک مل گئی۔ ایک زبردست معرکے میں مابری طرح زخمی ہوا اور اس نے کانسو میں پناہ لی۔ نیتجتاً لڑائی رک گئی، لیکن کچھ مدت کے بعد پھر شروع ہوگئی۔ کیا موجودہ یورش کی قیادت بھی ما کر رہا ہے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر مسٹر پٹرو نے جو معلومات اس کے بارے میں فراہم کی ہیں، ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سرزمین جس نے چنگیز، تیمور اور بابر پیدا کیے، اب بھی بہترین قسم کے عسکری جینیس پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ میری رائے میں اس یورش کا اصل سبب مذہبی تعصب نہیں، گو ایسی تحریک کے دوران میں قائدین ہر قسم کے انسانی جذبات کو اپنی اغراض کے حصول کی خاطر اکسا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کے اسباب زیادہ تر اقتصادی ہیں۔ علاوہ ازیں آج کل دنیا میں نسلی امتیاز کی بھی بڑی اہمیت ہے، اگرچہ میں اس انداز فکر کو جدید تمدن پر ایک بہت بدنما دھبہ سمجھتا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ ایشیاء میں نسلی امتیاز کے مسئلے کا ابھرنا کئی نہایت خطرناک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اسلام کی زیادہ تر کوشش بحیثیت مذہب یہی رہی ہے کہ اس مسئلے کو سلجھایا جائے اور اگر جدید ایشیا اس انجام سے بچنا چاہے جس کا سامنا یورپ کو کرنا پڑ رہا ہے، تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ تعلیمات اسلامی کو اپنائے اور نسلی بنیادوں پر سوچنے کی بجائے اسلامی بنیادوں پر سوچنے کی کوشش کرے۔ میرا یہ اندیشہ کہ چینی ترکستان کا انقلاب ممکن ہے

پان تورانی تحریک کی صورت اختیار کرلے، وسطی ایشیا میں رائج انداز فکر پر مبنی ہے۔ ابھی چند روز ہوئے افغانستان کے معروف ماہنامہ ''کابل'' میں ایران کے ڈاکٹر افشار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں افغانستان کو عظیم تر ایران کا حصہ تصور کرتے ہوئے مصنف نے دعوت دی تھی کہ تورانی تحریک کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ایران کا ساتھ دے۔ بہر حال اگر چینی ترکستان کا انقلاب کامیاب ہوا تو اس کا اثر یقیناً افغانی اور روسی ترکستان پر بھی پڑے گا...... انقلاب کی کامیابی کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ چینی ترکستان میں صدیوں پرانے چینی استعمار سے نجات حاصل کر کے یہاں ایک ایسی خوشحال اور مضبوط مسلم مملکت وجود میں آجائے گی جس کی ننانوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ پس ہندوستان اور روس کے درمیان ایک اور مسلم مملکت کا قیام بالشوزم کی ملحدانہ مادّیت کو ہمارے ملک کی حدود سے اور بھی پرے دھکیل دے گا۔

ریاست کشمیر کے حالات ابھی تک نہیں سدھرے تھے۔ گلانسی کمیشن کی سفارشات پر عمل ہونا ابھی شروع نہ ہوا تھا کہ کشمیری مسلمان دھڑے بندی کی نذر ہوگئے۔ اور دو تین سیاسی پارٹیوں میں بٹ گئے۔ حکومت کشمیر نے مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو پھر گرفتار کرلیا۔ نتیجتاً احتجاجی مظاہرے ہوئے اور کشمیر میں ایک بار پھر تشدد اور سخت گیری کے دور دورے کا آغاز ہوگیا۔ دوسری طرف آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے حالات بھی دگرگوں ہو چکے تھے۔ اس تنظیم کے پہلے صدر مرزا بشیر الدین محمود، امیر جماعت احمدیہ قادیان، مقرر ہوئے تھے۔ خیال تھا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی محض ایک عارضی تنظیم ہے اور جونہی کشمیری مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرلیے گئے یا ریاست کشمیر میں امن وامان قائم ہوگیا تو اس کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس لیے کشمیر کمیٹی کے لیے کسی باقاعدہ دستور وضع کرنے کی طرف توجہ نہ دی گئی، او ردستور کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے، صدر کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ کشمیر کمیٹی

کے ارکان میں احمدی بھی تھے اور ان کے مخالفین بھی۔ احمدیوں پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت کی خاطر استعمال کر رہے ہیں، اور اس کے ذریعے ان کا اصل مقصد کشمیری مسلمانوں کو احمدی بنانا ہے، اس کے علاوہ ریاست کشمیر کے حالات سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کشمیر کمیٹی کو بحیثیت ایک تنظیم کے ابھی کچھ مدت تک قائم رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے تجویز پیش کی کہ تنظیم کے لیے ایک دستور بنایا جائے تا کہ ہر کام اس کے مطابق انجام دیا جا سکے۔ احمدی ارکان کو یہ بات ناگوار گزری کیونکہ ان کی دانست میں دستور بنانے کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ بالآخر ایسے ہی اختلافات کے نتیجے میں مرزا بشیر الدین محمود کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے، اگرچہ ان کی جماعت کے باقی افراد بدستور کمیٹی کے رکن رہے۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر چنا گیا۔ بحیثیت صدر انہوں نے ریاست کشمیر کے حالات پر ایک بیان ۷ جون ۱۹۳۳ء کو جاری کی جس میں کشمیری مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں متحد رہیں اور ساری ریاست کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی سیاسی تنظیم قائم رکھیں:۸

کشمیر کمیٹی کے دستور کے طور پر اقبال نے ایک مسودہ مرتب کرایا، لیکن جب اسے کمیٹی کے اجلاس میں پیش کیا گیا تو احمدی ممبران نے اس کی مخالفت کی۔ دوران بحث اقبال نے محسوس کیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اگر کسی وفاداری کے پابند ہیں تو وہ ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ سو احمدی حضرات بظاہر کشمیر کمیٹی کو قائم رکھتے ہوئے اسے اندر سے دو حصوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صورت اقبال کے لیے ناقابل قبول تھی لہٰذا انہوں نے کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بیان مورخہ ۲۰ جون ۱۹۳۳ء میں واضح کیا:

بد قسمتی سے کمیٹی میں بعض ارکان کسی وفاداری کے پابند نہیں سوائے اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے ساتھ وفاداری کے۔ اس کی وضاحت حال ہی میں ایک احمدی وکیل نے اپنے پبلک بیان میں بھی کر دی ہے جو میر پور کے لوگوں کے کیس کر رہا تھا۔ اس نے صاف اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ یا اس کے ساتھی جو کچھ بھی کرتے ہیں، صرف اپنے امیر کے حکم پر کرتے ہیں...... بہر حال اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو ایک اور کشمیر کمیٹی بنا سکتے ہیں۔ ۹

اقبال کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجلاس میں پرانی کشمیر کمیٹی توڑ دی گئی اور ایک نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی وجود میں لائی گئی۔ اقبال نے نئی کشمیر کمیٹی کی صدارت قبول کر لی۔ ملک برکت علی ایڈووکیٹ اس کے سیکرٹری مقرر کیے گئے چنانچہ مظلومین کشمیر کی مالی امداد کے لیے اقبال نے ملک برکت علی کی معیت میں ایک اپیل ۳۰ر جون ۱۹۳۳ء کو شائع کی جس میں ارشاد کیا:

موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریک خلافت کے بعد تحریک کشمیر ایک ایسی تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی مظاہرے کا موقع ملا۔ اور جس نے قوم کے تن مردہ میں حیات کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑا دی...... اہل خطہ (کشمیر) ملت اسلامیہ ہند کا جزو لاینفک ہیں اور ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں فی الحقیقت ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو ان نکتوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اوّل یہ کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصہ ہے جو مذہبی اور کلچرل حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے اور ایسا اسلامی کہ اسلام نے وہاں جبر و اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بار آور پودا حضرت شاہ ہمدان جیسے نیک و کامل بزرگان دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے اور

انہی کی مساعی تبلیغ دین کا نتیجہ ہے جنہوں نے گھر بار اور وطن محض اس لیے ترک کیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار وممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمدللہ کہ وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے۔ دوسری بات جسے مسلمانانِ ہند کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ہے کہ ان کی تمام قوم میں سب سے بڑھ کر اگر صناعی و ہنر مندی اور تجارت کو بخوبی چلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقے میں موجود ہیں تو وہ یہی اہل خطہ کا گروہ ہے۔ افسوس ہے کہ اہل کشمیر کی زبوں حالی انہیں اپنی قوم کا مفید عنصر بننے کے راستے میں مانع آ رہی ہے بلکہ اقوام عالم کی اس نوع کی ترقی ان کی خدمات سے محروم ہے۔ ورنہ اگر ان کی زندگی بھی زندہ قوموں کی زندگی ہو تو صناعی اور ہنر مندی کے طبعی جوہر ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بدل دینے میں ممد ثابت ہوں۔ بہر حال اہل خطہ قومیت اسلامیۂ ہند کے جسم کا بہترین حصہ ہیں اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افرادِ ملت فراغت کی نیند سوئیں۔ ۱۰

جولائی ۱۹۳۳ء میں حکومت کشمیر نے اعلان کیا کہ گلانسی کمیشن کی تمام سفارشات پر عمل کیا جائے گا۔ اقبال نے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے بیان مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۳۳ء میں تجویز پیش کی کہ کشمیری مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے حکومت کشمیر میر پور اور بارا مولا کے سیاسی کارکنان کے خلاف دائر کردہ فوجداری مقدمات واپس لے۔ ۱۱

اسی دوران میں احمدیوں نے ''تحریک کشمیر'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت قبول کرنے کے لیے کہا۔ اقبال نے جواب دیا کہ اس معاملے میں حتمی فیصلہ کرنے سے پیشتر آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارکان سے مشورہ لینا ہوگا۔ اقبال کے جواب سے احمدیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خود اصولی طور پر صدارت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر اقبال نے ان کی پیشکش کو رد

کرتے ہوئے اپنے بیان مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا کہ جن وجوہات کے پس منظر میں پرانی آل انڈیا کشمیر کمیٹی توڑ کر نئی کشمیر کمیٹی بنائی گئی تھی، وہ بدستور قائم ہیں۔ آپ نے ارشاد کیا:

قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پریس "تحریک کشمیر" کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار "الفضل" "مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے ایک ایسی تنظیم ہے جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔[۱۲]

بہر حال کشمیر کے اندر مسلمانوں کو متحد رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ مختلف دھڑوں یا سیاسی گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے ان کے اختلافات دور کرنے کی خاطر تمام کارکنوں کی ایک کانفرنس سری نگر میں بلانے کا اہتمام کیا اور انہوں نے اقبال کو بھی کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اقبال خود تو نہ جا سکے مگر انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شیخ عبداللہ کو لکھا:

سنا ہے مختلف جماعتیں بن گئی ہیں۔ اور ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے، بلکہ اس وقت بھی ہیں۔[۱۳]

اس کے باوجود کشمیر کمیٹی میں مسلمانوں اور احمدیوں کے تنازعہ میں سر فضل حسین نے احمدیوں کا ساتھ دیا اور الٹا اقبال پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مسلم یک جہتی پر اندر سے وار کر رہے ہیں،[۱۴] اقبال ریاست کشمیر

کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ فروری ۱۹۳۴ء میں اس ضمن میں انہوں نے وائسرائے کو تار دیا۔ بعد ازاں ''لندن ٹائمز'' اور جمعیت اقوام کے نام برقیے روزانہ کیے کہ ریاستی حکام سیاسی کارکنان کو سزائے بید زنی دے رہے ہیں اور انہیں اس انسانیت سوز سزا دینے سے روکا جائے۔ ۱۵

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ فرقہ وارانہ مفاہمت کے لیے کل ہند بنیادوں پر آخری کوشش مولانا شوکت علی نے کی تھی جو ناکام رہی۔ لیکن صوبائی سطح پر ایسی کوششیں بہر حال جاری تھیں۔ اور اس سلسلے میں مئی ۱۹۳۳ء میں پنجاب میں سر فضل حسین، راجہ نریندر ناتھ اور سردار جوگندر سنگھ نے ملکر ایک فرقہ وارانہ فارمولا تیار کیا۔ فارمولے کے بنیادی نکات یہ تھے:

۱۔ صوبے میں ہندو، مسلم اور سکھ فرقوں کی آبادی کی پوری نمائندگی رجسٹر رائے دہندگان میں کی جائے۔

۲۔ طریق انتخاب مشترکہ ہو اور ایک رکنی حلقہ ہائے انتخاب کی تقسیم علاقہ وار اور آبادی کی بنیاد پر ہو۔

۳۔ ہر فرقے کو وہ حلقۂ انتخاب دیا جائے جہاں اس کے رائے دہندوں کا فیصد سب سے زیادہ ہو۔

۴۔ نشستوں کا تعین حلقہ ہائے انتخاب تک محدود ہو۔

۵۔ نشستوں کا تعین کسی خاص مدت تک کے لیے نہ کیا جائے۔ ۱۶

ہندوؤں اور سکھوں کے ممتاز لیڈروں نے اس فارمولے کی شدید مخالفت کی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اس کے خلاف اقبال اور ان کے بعض رفقاء نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں بقول عظیم حسین انہوں نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ اور پنجاب صوبائی مسلم کانفرنس کا ایک مشترکہ اجلاس طلب کر کے اس میں پنجاب فارمولے کی مذمت کی۔ ۱۷

عظیم حسین بیان کرتے ہیں کہ پنجاب فارمولا ان کے والد سر فضل حسین کے ذہن کی پیداوار تھا اور اقبال کے متعلق یہ افواہ بھی گرم تھی کہ وہ کہیں سے پچھتر ہزار روپیہ حاصل کر کے صوبے کا (انگریزی) اخبار ''ایسٹرن ٹائمز'' خرید رہے ہیں تا کہ اس میں مشترکہ انتخاب کے اس فارمولے کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی جا سکے۔۱۸

اقبال کے ''ایسٹرن ٹائمز'' خریدنے کے متعلق افواہ کا ذکر سر شہاب الدین کے ایک خط بنام سر فضل حسین محررہ ۴ مئی ۱۹۳۲ء میں ملتا ہے۔ جس میں لکھا ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال، مولوی فیروز الدین مالک ''ایسٹرن ٹائمز'' سے اس اخبار کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے گفت و شنید کر رہے ہیں...... چند دن ہوئے سردار حبیب اللہ میرے پاس آئے اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ اگر ہم کہیں سے پچیس ہزار روپیہ اس اخبار کو چلانے کی خاطر اکٹھا کر لیں۔ تو یہ اخبار اقبال کی بجائے ہمیں مل سکتا ہے۔ کل ایک ریٹائرڈ مسلم سب جج مجھے ملنے آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے مجھے بتلایا کہ صرف ڈاکٹر اقبال ہی مسلم قوم کے قابل اعتماد اور مقبول لیڈر ہیں اور ان کے خلاف کسی اور کی بات سننے کے لیے کوئی تیار نہ ہوگا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر اقبال کے علاوہ مسلمانوں کے تمام نام نہاد لیڈر خود غرض ہیں اور ان کا پنجاب کے مسلمانوں میں کوئی اثر و رسوخ نہیں ہے اور اگر ڈاکٹر اقبال مشترکہ انتخاب کے مخالف ہیں تو کوئی بھی انہیں قبول کرنے کو تیار نہ ہوگا۔۱۹

عظیم حسین مزید تحریر کرتے ہیں کہ اقبال نے پنجاب فارمولے کے خلاف لندن میں سر آغا خان اور دیگر مسلم شخصیتوں کے نام تار بھی ارسال کیے اور جب اقبال کے زیر اثر آغا خان نے فارمولے پر تنقید کی تو سر فضل حسین نے اپنے ایک خط محررہ ۱۵ جون ۱۹۳۲ء میں انہیں لکھا:

آپ سوال کریں گے کہ اگر معاملہ اتنا صاف اور سیدھا ہے تو لاہور کے بعض حلقوں میں اتنی بے چینی کیوں پائی جاتی ہے اور اقبال لندن میں اور اخبارات کو تار کیوں بھیج

رہے ہیں؟ بات یہ ہے کہ ہندوستانی سیاست میں انگریزی سیاست کی نقل اتاری جاتی ہے اور سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی سازش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ آنے والے انتخابات کے پیش نظر لاہور کے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سیاسی اصلاحات کے تحت بڑے بڑے زمینداروں یا اُن اشخاص نے جو اپنے پیشیوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، یا پھر ممتاز خاندانوں کے افراد نے فائدے اٹھائے ہیں اور یہ کہ شہر کے لوگ پیچھے دھکیل دیے گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ظفر اللہ خان جیسے گمنام آدمی کو آگے بڑھا کر میں نے اچھا نہیں کیا ہے اسی لیے ان لوگوں نے اس مخالفت کی شکل اختیار کی ہے مجھے کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں اور کچھ زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ انہیں پتا چل جائے گا کہ وہ ان مفادات کی خدمت نہیں کر رہے ہیں جو انہیں دل سے عزیز ہیں اور جہاں تک اقبال کا تعلق ہے یہ لوگ ان کے نادان دوست ہیں، جو دانا دشمن سے بدتر ثابت ہوں گے۔ ۲۰

اس خط کی عبارت سے عظیم حسین یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال تو ایک سادہ لوح شخص تھے، جن کی اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ چنانچہ اپنے چند شہری دوستوں کے ورغلانے پر اقبال نے پنجاب فارمولے کی مخالفت کی، لیکن جب سر فضل حسین نے انہیں ایک خط میں فارمولے کی وضاحت کی یا اس کی تائید میں دلائل پیش کیے تو فارمولے کے متعلق اقبال کا رویہ بدل گیا۲۱۔ بہر حال عظیم حسین کا یہ کہنا کہ اقبال نے پنجاب فارمولے کی مخالفت ترک کر دی تھی محض غلط بیانی ہے کیونکہ اقبال کے ایک اخباری بیان مورخہ ۴ر جولائی ۱۹۳۴ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شروع سے آخر تک فارمولے کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

یہ فارمولا پنجاب کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس کے برعکس مختلف فرقوں کے مابین اَن دیکھے تنازعات کے سلسلے کا یہ ایک سرچشمہ بن جائے گا۔...... یہ اسکیم (پنجاب فارمولا) شہری اور دیہاتی آبادیوں کے نقطہ نظر سے نہایت قابل اعتراض

ہے۔ جب اس کو روبہ عمل لایا جاہے گا۔تو اس سے وہ دیہاتی طبقے بھی واجبی نمائندگی سے محروم ہو جائیں گے۔جن کی اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں اکثریت ہے۔اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور ان تمام ممکنہ تنازعات کا جو اس کی وجہ سے پیدا ہوں گے اندازہ لگانے کے بعد، میرا یہ پختہ خیال ہے کہ یہ اسکیم ہر فرقے کے بہترین مفادات کے لیے نقصان رساں ہے۔۲۲

پنجاب فارمولے کے متعلق اقبال کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

اس بیان سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر اقبال شروع سے آخر تک فضل حسین کے مجوزہ فارمولے کے خلاف تھے۔اس فارمولے سے متعلق اقبال کا یہ ردِ عمل ان کے سابقہ طرزِ عمل بلکہ ان کے پورے سیاسی رول کے عین مطابق ہے۔ہم برابر یہی دیکھتے آ رہے ہیں کہ انہوں نے ہر موقع پر مشترکہ انتخاب کی مخالفت کی اور جداگانہ انتخاب کی ہر مرحلے پر حمایت کی اور اس کو مسلمانانِ ہند کے مطالبات کی اساس قرار دیا۔ان کے نزدیک یہ محض نمائندگی کا ایک طریقہ کار نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود کو برقرار رکھنے کا واحد وسیلہ تھا۔۲۳

ہندوستان کے شمال مغرب میں سرحدی قبائل کے ساتھ انگریزی فوجیں عموماً برسرپیکار رہتی تھیں اور یہ جنگ کسی نہ کسی صورت میں قیام پاکستان تک جاری رہی۔ چونکہ یہ قبائل مسلمان تھے، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے ساتھ ہمدردی تھی۔اگست ۱۹۳۳ء میں انہیں زیر کرنے کی خاطر ان کی چھوٹی چھوٹی پہاڑی بستیوں پر بے پناہ بمباری کی گئی۔اس بمباری کے خلاف ہندوستان کے بعض شہروں میں مسلمانوں نے احتجاج کیا۔لاہور میں بھی ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن یہ ملتوی ہوا۔اس کے باوجود مسلمانوں کا مطالبہ انگریزی حکومت تک پہنچانے کی خاطر اقبال نے ۱۱ اگست ۱۹۳۳ء کو ایک تار وائسرائے کو دیا، جس

میں تحریر کیا کہ مسلمان پر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ بمباری فوراً بند کردی جائے۔ اور امور متنازعہ کے تصفیے کے لیے پر امن طریقہ برتا جائے۔[۲۴]

اقبال نے سر فضل حسین کی سیاست کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور ابتدائی دور ہی سے ان کے آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے، جو وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ وسیع ہوتے چلے گئے۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں سر فضل حسین نے کونسل آف سٹیٹ میں ایک بیان دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ اسلامی اخوت کی بنیادوں پر کسی قسم کا قومی رشتہ استوار کرنے سے روکا جائے۔ اور ان پر واضح کیا جائے کہ وہ صرف ہندوستانی ہیں اور اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھتے ہوئے انہیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ نیز انہوں نے فرمایا کہ سیاسی طور پر پان اسلامزم کا کہیں بھی کوئی وجود نہیں اور اس کی بنا پر ہندی مسلمانوں کو ہندوستانی قوم کی حیثیت سے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے متعلق سوچنا چاہیئے۔ اقبال سر فضل حسین کا مدعا خوب سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے بظاہر سر فضل حسین کے بیان کی وضاحت کی صورت میں اپنے ایک اخباری بیان مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۳ء میں الفاظ کچھ ایسی ترتیب سے استعمال کیے کہ سر فضل حسین کے بیان کی تائید کرتے ہوئے درحقیقت اس کی تردید کردی۔ آپ نے ارشاد کیا:

سر فضل حسین نے بالکل درست کہا کہ سیاسی طور پر پان اسلامزم کا کبھی بھی کوئی وجود نہ تھا اور اگر اس کا کوئی وجود تھا بھی تو صرف ان لوگوں کے تخیل میں جنہوں نے یہ اصطلاح وضع کی یا شاید ترکی کے سلطان عبدالحمید خان کے ہاتھوں میں ایک سیاسی چاپلوسی کے ہتھیار کے طور پر، یہاں تک جمال الدین افغانی نے بھی جن کا نام اس تحریک سے وابستہ کیا جاتا ہے، جسے پان اسلامی تحریک کہتے ہیں، کبھی ایک سیاسی مملکت کی ہیئت میں مسلمانوں کے اتحاد کا خواب نہیں دیکھا۔ علاوہ ازیں کسی بھی

اسلامی زبان۔ عربی فارسی یا ترکی۔ میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جو پان اسلامزم سے مطابقت رکھتا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام بحیثیت ایک معاشرے کے یا انسانی نسلوں قوموں اور مذہبوں کی یگانگت کے حصول کے لیے، ایک عملی اسکیم کے نسلی قومی یا جغرافیائی حدود کو تسلیم نہیں کرتا۔ پس ایسے انسان دوستی کے آئیڈیل کے اعتبار سے ''پان اسلامزم'' یا صرف ''اسلام'' کا وجود یقیناً ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سر فضل حسین کا ہندی مسلمانوں کو یہ مشورہ کہ وہ ہندوستانی قوم کی حیثیت سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوں، بالکل بجا ہے اور بلاشبہ اسے مسلمان خوب سمجھتے اور پسند کرتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کو، جو ایشیا کے دیگر ممالک کے تمام مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں، اپنے آپ کو اسلام کا سب سے اہم معاون سمجھنا چاہیے اور ایشیا کی دیگر مسلم اقوام کی طرح انہیں اپنی اجتماعی ذات میں ڈوب کر اپنے منتشر وسائلِ حیات کو اکٹھا کرنا چاہیئے، تاکہ وہ سر فضل حسین کے مشورے کے عین مطابق اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں۔ ۲۵

اس بیان کے تقریباً ایک ہفتے بعد یعنی ۲۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے اصطلاح پان اسلامزم کی مزید تشریح کے سلسلے میں ایک اور بیان دینا ضروری سمجھا، کیونکہ بقول ان کے، بعض اشخاص کے دلوں میں ابھی تک غلط فہمیاں موجود تھیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ لفظ ''پان اسلامزم'' فرانسیسی صحافت کی اختراع ہے اور یہ لفظ ایسی مفروضہ سازش کے لیے استعمال کیا گیا تھا جو اس کے وضع کرنے والوں کے خیال کے مطابق مسلم ممالک یورپ کے خلاف کر رہے تھے۔ پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کرنے والوں کا منشا یہ تھا کہ اس کی آڑ میں یورپ کی چیرہ دستیاں جو مسلم ممالک میں جاری تھیں، جائز قرار دی جائیں۔ اقبال نے فرمایا:

سر فضل حسین نے جب یہ کہا کہ پان اسلامزم اگر کبھی موجود بھی تھا تو اب اس کی راکھ بھی اڑ چکی ہے لیکن گزشتہ دو ہفتوں میں ہندوستانی اخبارات میں اس لفظ کو کئی

معنی پہنائے گئے ہیں۔ اس لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پان اسلامزم سے اسلام کی عالمگیر سلطنت بہت مختلف ہے۔ اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہتوں او رسرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔ ایک مقامی ہندو اخبار نے ہندوستان کے مسلمانوں کی باہمی اتحاد کی خواہش کا نام پان اسلامزم رکھا ہے۔ یہ ایک اصطلاح کا غلط استعمال ہے، لیکن مسلمانوں کو اس بات کا اعلان کر دینے میں ہرگز پس و پیش نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو منجملہ دیگر ہندوستانی اقوام کے ایک علیحدہ قوم خیال کرتے ہیں اور ایسا رہنے کے خواہشمند ہیں وہ اپنے آپ کو علیحدہ معاشرتی جماعت کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ایک علیحدہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں۔ جو مسلمان قوم پرست کہلاتے ہیں، انہوں نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں کو اپنی علیٰحدہ تمدنی حیثیت چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی قسمت کو ایسی طاقتوں کے رحم پر چھوڑ دینا چاہیے جو ان کی علیحدہ ہستی مٹا دیں۔ اگر کوئی مسلمان سیاسی لیڈر اس کے برعکس خیال کرتا ہے تو اس نے اپنی قوم کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ ۲۶

اقبال کے ایک خط محررہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء بنام عطیہ فیضی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خط و کتابت مفتی سید امین الحسینی سے جاری تھی اور اقبال نے انہیں وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ہندوستان آنے کا مشورہ دیا تھا۔ مفتی سید امین الحسینی نے ان کے کہنے کے مطابق انہی ایام میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اقبال نے مسئلہ فلسطین اور دیگر امور کے لیے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں ہر ممکن طریق سے ان کی امداد کی ۔ ۲۷

اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ افغانستان کے نادر شاہ سے اقبال کے دیرینہ

تعلقات تھے۔ اقبال نادر شاہ کو اس زمانے سے جانتے تھے، جب وہ جرنیل محمد نادر خان کی حیثیت سے پیرس میں افغانستان کے سفیر تھے۔ نادر شاہ بقول اقبال نصف پنجابی تھے، کیونکہ ان کی والدہ کی جائے ولادت لاہور تھی اور وہ لاہور ہی میں رہائش پذیر رہیں ۲۸۔ نادر شاہ خود بھی ڈیرہ دون کے پڑھے ہوئے تھے اور اردو بڑی اچھی بولتے تھے ۲۹، بلکہ اقبال کے ساتھ اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ اقبال کی ملاقات نادر شاہ سے کب ہوئی؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات مشہور ہے کہ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں ایک دوسرے سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ملے، جب نادر شاہ افغانستان جاتے ہوئے یہاں رکے تھے۔ نادر شاہ کا قد زیادہ لمبا نہ تھا اور ویسے بھی وہ دبلے پتلے سے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نادر شاہ نے اقبال کو دیکھ کر کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ ایک لمبی چوڑی داڑھی والے بزرگ ہوں گے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ میرا خیال بھی یہ تھا کہ آپ کوئی قوی ہیکل قسم کے پہلوان ہوں گے، بہر حال نہ تو شاعر اسلام، نادر شاہ کی توقع کے مطابق نکلا اور نہ ہی غازیٔ اسلام کی صورت اس ذہنی تصویر سے مطابقت رکھتی تھی جو اقبال نے بنا رکھی تھی۔

اس کے بعد ایک روایت تو یہ ہے کہ اقبال، نادر شاہ کو ایک طرف لے گئے اور انہیں بتایا کہ میں نے زندگی بھر میں دس ہزار کی ایک پونجی جمع کر رکھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی مہم کے لیے اسے چندے کے طور پر قبول فرما لیں۔ نادر شاہ کو اگرچہ روپے کی ضرورت تھی، مگر انہوں نے اقبال کی پونجی لینے سے معذرت کر دی۔ جب اقبال نے اصرار کیا تو یہ طے پایا کہ اقبال یہ روپیہ اپنے پاس رکھیں اور نادر شاہ کو جب اشد ضرورت پڑے گی وہ منگوا لیں گے۔ نادر شاہ کو اس روپے کی ضرورت نہ پڑی ۳۰۔ دوسری روایت یہ ہے کہ گاڑی کی روانگی سے قبل اقبال نے نادر شاہ کو علیحدگی میں لے جا کر کہا: تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ میں ایک فقیر آدمی

ہوں۔صرف دعاؤں ہی سے تمہاری خدمت کر سکتا ہوں۔اتفاق سے اس وقت میرے پاس پانچ ہزار روپے موجود ہیں۔اگر یہ حقیری رقم تمہارے کسی کام آ سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔اس پر نادرشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے فقیر کی اس دین کو نیک شگون سمجھتے ہوئے بڑے احترام سے قبول کر لیا[۳۱]۔خدا جانے یہ روایتیں کہاں تک درست ہیں۔نادرشاہ نے افغانستان کی تباہ حالی کے متعلق ہندوستانیوں سے ہر قسم کی امداد و اعانت کی اپیل کر رکھی تھی اور راقم کی معلومات کے مطابق تو اقبال نے انہیں اپنی جیب سے پانچ سو روپے کی رقم پیش کی تھی جو انہوں نے اس وقت لوٹا دی۔بعد میں اقبال نے کئی طریقوں سے ان کی امداد جاری رکھی۔نادرخان ہلال احمر فنڈ کھولا اور مالی امداد فراہم کرنے کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کی غرض سے جلسے بھی منعقد کیے۔یہ سب اس لیے کیا گیا کہ اقبال کے نزدیک افغانستان کی سالمیت اور آزادی مسلمانانِ ہند اور وسطی ایشیا کی بقا کے لیے اشد ضروری تھی۔[۳۲]

ستمبر ۱۹۳۳ء میں نادرشاہ نے تعلیمی امور کے بارے میں مشورے کے لیے اقبال، سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔تعلیمی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ہندوستان سے ان تین شخصیتوں کا انتخاب نہایت موزوں تھا، کیونکہ ان مین ایک تو مفکر تھا، دوسرا منتظم امور تعلیمی اور تیسرا عالم۔افغان قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ وہ تینوں ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ تیار ہونے کا امکان نہ تھا۔بالآخر ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال اور سید راس مسعود کے پاسپورٹ مل گئے اور ان دونوں نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے پشاور روانگی کا پروگرام بنا لیا۔روانگی سے قبل ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے ایک بیان میں اپنے سفر افغانستان کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہو سکتا ہے۔کابل میں ایک نئی

یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیان علاقے میں آباد ہوشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔ شاہ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیر تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ ہم نے اس دعوت کو قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کابل میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں سے پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے دین وتمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہشمند ہے۔ افغان فطرتاً بہت خلیق لوگ ہیں اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربے کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں خالص سیکولر تعلیم سے خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج درآمد نہیں ہوئے۔ بہر حال کسی نظام تعلیم کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور ان ضروریات کی روشنی ہی میں اس کے نظام تعلیم کا تعین کیا جا سکتا ہے۔۳۳

اقبال اور سید راس مسعود پشاور میں ٹھہرتے ہوئے ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے اور انہیں کابل کی نئی آبادی دار الامان کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سید راس مسعود کے ہمراہ پروفیسر ہادی حسن بطور سیکرٹری آئے تھے اور اقبال کے ساتھ سیکرٹری کی حیثیت سے غلام رسول خان بیرسٹر آئے تھے۳۴۔ علی بخش بھی ان کی خدمت کے لیے ہمراہ تھا۔ دو تین روز میں تعلیمی معاملات کے متعلق مشورے کے سلسلے میں چند اجلاس ہوئے جن میں اقبال سید راس مسعود اور حکومت افغانستان کے بعض سرکردہ نمائندوں نے شرکت کی اور سید راس مسعود نے تمام کارروائی کے

نوٹس بھی لیے، لیکن بدقسمتی سے ان حضرات کی تجاویز کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ کابل میونسپلٹی نے ان کے لیے ایک دعوت چائے کا اہتمام کیا ۳۵۔ اقبال، سرور خان گویا کی معیت میں بابر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی گئے۔ بابر کا مقبرہ کابل سے باہر ایک ویران سی پہاڑی کے دامن میں ہے۔ چھوٹی سی عمارت ہے اور قبر پر ایک بے گنبد سقف سی کھڑی کی ہوئی ہے ۳۶۔ بعد ازاں اقبال اور سید راس مسعود کی ایک ملاقات نادر شاہ سے قصر دلکشا میں ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال نے نادر شاہ کو قرآن کریم کی ایک جلد تحفے کے طور پر دی۔ اسی دوران میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی مگر بقول ظہیر الدین، اقبال نے کہا کہ:

نادر! میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔ ۳۷

۲۶ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی رات کو سید سلیمان ندوی ان سے آ ملے۔ اس شب سردار ہاشم خان صدر اعظم کے ہاں کھانا تھا۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں کہ سردار ہاشم خان ہندوستانی مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ کھانا میزوں پر لگا تھا اور ہر چیز یورپین طریقے سے آراستہ تھی۔ میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں۔ سرور خان گویا نے سید سلیمان ندوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا پوچھ رہے ہیں کہ افغانستان کے ارباب کمال کے حالات تو رسالہ ''کابل'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن جس شخص نے سب سے پہلے اہل کابل کو اسلام کی دعوت دی، اس کا ذکر ابھی تک نہیں کیا گیا۔ سب نے پوچھا کہ وہ کون بزرگ تھے؟ سید سلیمان ندوی نے بتایا، خراسان کے مقاتل بن حیان، بعد ازاں سردار فیض محمد

خان وزیر خارجہ نے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع کی اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا۔ سید راس مسعود نے اپنے جاپان کے سفروں کی روئیداد سنائی اور اقبال نے فلسفہ و سیاست کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔ ۳۸

کھانے سے فارغ ہو کر مہمان ملاقات کے پہلے کمرے میں اکٹھے ہوئے اور چائے، کافی، سگریٹ وغیرہ سے ان کی تواضع کی گئی۔ سردار ہاشم خان نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ بلا ساز کوئی مضائقہ نہیں، لیکن سردار ہاشم خان نے لفظ ساز کو سمجھے بغیر ارشاد کیا۔ ہمارے یہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی، مرد گاتے ہیں۔ اقبال نے ان کی تائید کی۔ اسی اثنا میں گویوں کا ایک دستہ آداب بجالا کر قالین پر بیٹھ گیا اور نغمہ طرازی شروع کی۔ انہوں نے حافظ اور بیدل کی غزلیں سنائیں۔ رات کے گیارہ بجے تک محفل سماع گرم رہی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء جمعہ کا دن تھا۔ نادرشاہ معمول کے مطابق مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنے جایا کرتے تھے، مگر اس روز شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد پل خشتی میں نماز پڑھنے آرہے تھے۔ اقبال اپنے رفقا سمیت اسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ نمازی مسجد کے صدر دروازے سے لے کر محراب تک بھرے ہوئے تھے اور غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی۔ منبر پر ایک مولوی فارسی میں وعظ فرما رہے تھے، مہمانوں کو مقصورہ یعنی مسجد کے اُس حفاظتی حصے میں لے جایا گیا جو بادشاہ کے نماز پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادرشاہ نہایت سادگی کے ساتھ مقصورہ میں داخل ہوئے اور مہمانوں سے مصافحہ کیا۔ وعظ کے اختتام پر اذان کے بعد جب سب سنتیں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا۔ آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خان کا نام لیا تو

نادرشاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تواضع کے طور پر اپنے سر کو جھکا دیا۔ خطبے کے بعد دوگانہ جمعہ اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں۔ دعا کے بعد نادرشاہ نے مہمانوں سے کہا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے اور اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو میرے ساتھ چل کر کھانا تناول کریں مگر دیگر ضروری کاموں کے سبب سب نے معذرت چاہی اور اس کے بعد نادرشاہ ان سے مل کر رخصت ہوئے۔

واپسی پر اقبال اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ کار میں ایک اور شخص بیٹھ گئے جن سے چینی ترکستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران اقبال نے فرمایا:

یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمدورفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انہی جہازوں کے ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کی بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں اور لاریوں ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس لئے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا۔ اس لیے ابھی سے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔[۳۹]

کھانا سب نے دارالامان پہنچ کر سردار فیض محمد خان، اللہ نواز خان اور سرور خان گویا کے ساتھ کھایا۔ چار بجے شام مجددی سلسلے کے روحانی پیشوا ملا شور بازار نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ملا شور بازار کا اصلی نام فضل عمر تھا اور کابل شہر، قبائل اور فوج میں بکثرت ان کے مرید تھے۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ افغانستان

میں وہ جرنیل محمد نادر خان کے ساتھ شریک جہاد رہ چکے تھے، لیکن جب امان اللہ خان نے اصلاحات کے اجراء کے معاملے میں حد اعتدال سے تجاوز کیا تو وہ افغانستان چھوڑ کر ہندوستان آ گئے۔ محمد نادر خان کی کامیابی کے بعد وہ واپس افغانستان گئے اور انہیں وزیر عدالت مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کچھ عرصے تک وزارت عدل کا کام انجام دیا لیکن پھر اسے اپنی درویشی یا صوفیانہ مسلک کے خلاف تصور کرتے ہوئے عملاً اس سے دست کش ہو گئے۔ اقبال کے ساتھ سید سلیمان ندوی بھی انہیں ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ ملا شور بازار ایک بار اقبال سے لاہور میں مل چکے تھے۔ ان کا مکان ایک تنگ گلی کے اندر تھا اور ہر قسم کے تزک واحتشام اور ظاہری آراستگی سے خالی تھا۔ باہر نشست گاہ بھی نہ تھی۔ زنانہ مکان تھا۔ جہاں پردہ گرا کر ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ انہیں ایک لمبے کمرے میں لے جایا گیا، جس میں ایک طرف ایک پلنگ اور باقی زمین پر سادہ فرش بچھا تھا۔ پلنگ پر ملا شور بازار تشریف رکھتے تھے۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی فرش پر جا کر بیٹھ گئے۔ ملا شور بازار کے پاؤں میں کوئی تکلیف تھی، جس کے سبب وہ چلنے سے معذور تھے۔ ہندوستان کے حالات اور افغانستان میں بچہ سقّہ کے ہنگامے کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ چائے نوشی کے بعد انہوں نے اقبال کو خشک میوے (بادام اور انجیریں) تحفے کے طور پر پیش کیے۔

ملا شور بازار کی قیام گاہ سے اقبال اور سید سلیمان ندوی، اللہ نواز خان کے مکان پر گئے، جہاں افغانستان میں مقیم برصغیر کے تقریباً ڈیڑھ سو باشندوں نے ان کے اعزاز میں دعوت چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ سید راس مسعود وہیں پہنچ گئے۔ یہ دعوت باغ میں دی گئی تھی، کسی نے باغ کا فوارہ کھول دیا۔ چونکہ خاصی سردی تھی اور سید راس مسعود کو زکام تھا، اس لیے ان کے کہنے پر وہ بند کر دیا گیا۔ اس موقع پر سردار فیض محمد خان نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

گوہر شہوار می سازو نثارِ قدمت
ورنہ از فوارّہ مقصود دگر کے دارد آب

پہلا مصرع کسی اور شاعر کا تھا، لیکن دوسرا مصرع ان کا اپنا تھا۔ اقبال نے احباب کے اصرار پر پہلے مصرع میں تبدیلی کر دی۔ مگر سید سلیمان ندوی کو پورا مصرع یاد نہ رہ سکا۔ فرماتے ہیں کہ شاید یوں تھا۔

......می شمارد قدر احسانِ شما
ورنہ از فوارہ مقصودِ دگر کے دارد آب

چائے سے فراغت کے بعد تصویریں اتاری گئیں اور تقریریں ہوئیں۔ میز بانوں کی طرف سے مولانا محمد بشیر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں مدعو کرنے پر حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا۔ نیز ہندوستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ مصیبت کے بعد راحت آتی ہے۔ مہمانوں کی طرف سے سیّد سلیمان ندوی نے تقریر کی اور کہا کہ تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملے میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اب وقت ہے کہ ہمارے بھائی اپنے حسن خدمت سے ان گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ اس کے بعد اقبال نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اسی پر جلسہ برخاست ہوا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سردار محمد ہاشم خان صدر اعظم مہمانوں کو ملنے کے لیے شاہی مہمان خانے میں آئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سید راس مسعود نے معدنیات اور سڑکوں کی تعمیر کی اہمیت کا ذکر کیا اور اسی طرح اقبال نے بھی افغانستان میں سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ آئندہ تجارتی آمد و رفت کے سلسلے میں وسطی ایشیا اور افغانستان کی مرکزیت یقینی ہے۔ سردار محمد ہاشم خان نے کھانا ان کے ساتھ کھایا۔

سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور اللہ نواز خان تقریباً ہر روز انہیں ملنے کے

لیے آتے تھے اور افغانستان کے انتظامی و تعلیمی امور پر گفتگو ہوتی تھی۔ اقبال اور سید راس مسعود تو ایک مرتبہ اکٹھے نادر شاہ سے قصر دلکشا میں مل آئے تھے۔ سید سلیمان ندوی بھی ان سے ملاقات کی خاطر قصر دلکشا گئے۔ نادر شاہ نے زیادہ گفتگو اردو میں کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ ''معارف'' کو ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے مسئلہ تعلیم کے متعلق انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور نوجوان افغانوں میں مذہبی شیفتگی و پابندی کے فروغ کے سلسلے میں کابل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسی درسگاہ کے قیام کا مشورہ دیا۔ نادر شاہ نے آخر میں ان سے گذارش کی کہ وہ ہندوستان جا کر مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق اور اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی بجائے ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا:

میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کردوں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں، جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں ...... میں دین وملت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں...... میرے بھائیوں کو کہہ دیجیے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعدادی، اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے لیے پہلے سے تیار کر لیں۔[۴۰]

سید سلیمان ندوی، نادر شاہ کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ نہایت شیریں اخلاق، منکسر مزاج، پُر محبت او رقیق القلب تھے۔ اور ان کی آنکھیں مولانا محمد علی کی طرح اشکباری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔[۴۱]

اسی روز یعنی ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو چار بجے شام شاہ محمود خان وزیر جنگ کے

ہاں چائے کی دعوت تھی، جس میں چیدہ چیدہ حضرات بلائے گئے تھے۔ چائے پر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں مذہبی عربی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا۔

ساڑھے سات بجے رات کابل کی انجمن ادبی یا یہاں کی رائل اکادمی نے ان کے اعزاز میں کابل ہوٹل میں ڈنر کا انتظام کیا ہوا تھا۔ سو سب کابل ہوٹل پہنچے۔ ادبی انجمن سے منسلک کابل کے ارباب علم، اہل قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان یہاں موجود تھے۔ انجمن کے سیکرٹری شہزادہ احمد علی خان درانی تھے جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ تھے اور شاہی سیکرٹیریٹ میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ یہی انجمن ماہنامہ ''کابل'' بقول سید سلیمان ندوی، بہت آب و تاب سے شائع کرتی تھی۔ اور اقبال کے قیام کابل کے دوران میں اس ماہنامے میں ایک نظم بعنوان ''پیام اقبال بملت کوہسار'' بھی چھپی تھی۔[۴۲]

جب سارے مہمان تشریف لے آئے تو صدر انجمن نے فارسی میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں ہندوستان کے فضلاء اور سخنوروں کی تعریف و توصیف کے بعد اقبال کی علمی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

ان کے قیمتی آثار و تالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق، سعی و عمل، اجتماع، جذبات شرق و دوستی اور احساساتِ اسلام پرستی کی، اہل ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے۔[۴۳]

خطبۂ استقبالیہ کے بعد افغانستان کے معروف شاعر عبداللہ خان نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک طویل نظم پڑھی، جس میں بہت سے اشعار اقبال سے متعلق تھے۔[۴۴] پھر مہمانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن نے فارسی میں تقریر کی۔ بعد ازاں سید راس مسعود اٹھے اور اپنی برجستہ تقریر میں سید سلیمان ندوی کا بحیثیت عالم ذکر کرنے کے بعد اقبال کے متعلق فرمایا:

میرے معزز دوست علامہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں، جس نے قدیم وجدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک روح پرور معجون تیار کیا ہے۔ میں نہ تو علماء کی جماعت سے ہوں اور نہ ہی شعراء کے فرقہ سے، بلکہ میں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے، لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمتِ احترام سے سرشار اور لبریز ہے...... افغانستان کے نوجوانوں کو چاہیے کہ سفید بال والوں کی عزت و احترام کا ہر وقت خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے ان کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس میں نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ رہے ہیں۔[۴۵]

سید سلیمان ندوی نے اپنی جوابی تقریر میں ارشاد کیا:

سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں، لیکن علمی اور ادبی تعلقات دائم اور برقرار رہتے ہیں، سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا کہ ٹوٹ گئی اور اس کی فتوحات کے اوراق صدیوں میں بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے اور ان کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے...... اہل سیاست کو ان کی شعبدہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجیے۔ اور آیئے کہ ہم علم وفن کے نام سے پیمان محبت و دوستی کو تازہ اور عہد رفاقت و آشنائی کو مستحکم کریں اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم و ادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں۔[۴۶]

سید سلیمان ندوی کے بعد اقبال نے تقریر کی جو بہت پر اثر ثابت ہوئی، فرمایا:

میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں

افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے، اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔تو اس وقت وہ سخت خوفناک اور بربادکن ہو جاتا ہے۔اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

......شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر برا اثر مرتب کرتا ہے۔کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل وصورت نہیں ہیں۔ بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں۔جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشوونما پا کر مرجاتی ہیں۔پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشا پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے ،اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے،مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعے سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بلاآخر اپنی خودی کو پا کر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں:

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا
فساں کشیدہ بروئے زمانہ آخت مرا
من آن جہان خیالم کہ فطرت ازلی
جہان بلبل و گل راشکست و ساخت مرا

نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرم
تواں ز گرمئ آواز من شناخت مرا

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑپتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلوسیکسن اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے، یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتا لگائے، اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے۔[۴۷]

تقریروں کے بعد کھانا کھایا گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد مجلس کچھ مدت تک قائم رہی۔ مہمانوں کی تواضع بھنے ہوئے بادام اور پستے سے کی گئی۔ چائے کے دور چلے جو بمطابق رواج پہلی پیالی میٹھی اور پھر دوسری پیالیاں بے شکر یا تلخ پر مشتمل تھیں۔ اقبال کا حقہ ان کا رفیق سفر تھا اور وہ اسے دعوت میں بھی اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے۔ رات گئے دارالامان واپس آئے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کی شام کو اقبال دوسری اور آخری بار سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ کی معیت میں نادر شاہ سے ملنے کے لیے قصر دلکشا گئے۔ اس ملاقات پر کیا گفتگو ہوئی؟ اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ اقبال کے رفقاء کابل سے اٹھارہ میل دور پغمان کی سیر کے لیے چلے گئے۔ رات کو کئی لوگ رخصتانہ ملاقات کے لیے آئے۔ کیونکہ اگلے روز اقبال، سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی کابل سے غزنین کو روانگی تھی۔[۴۸]

سوموار ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے وہ سرور خان گویا کی معیت میں غزنین روانہ ہوئے۔ حکومت افغانستان نے مہمانوں کے قیام و انتظام کے لیے متوقع

رہائش گاہوں میں احکام بھجوا رکھے تھے۔سواری اور بار برداری کے لیے دو موٹروں اور دو لاریوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ایک موٹر میں اقبال، سید سلیمان ندوی اور غلام رسول بیرسٹر اور دوسری میں سید راس مسعود، پروفیسر ہادی حسن، سرور خان گویا اور عبدالمجید نمائندہ سفارت خانہ افغانستان دہلی سوار تھے۔ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھلانے والے ملازموں کے لیے تھی اور دوسری لاری میں مہمانوں کا سامان و اسباب تھا۔اس کے علاوہ مہمانوں کی حفاظت کے لیے دس بارہ سپاہی اور ان کے افسر بھی انہی لاریوں پر سوار تھے۔کابل سے غزنین بیاسی میل ہے۔راستہ بہت حد تک صاف تھا اور سڑکیں اچھی حالت میں تھیں۔زمین زیادہ تر ہموار تھی۔گو دور دور پہاڑ بھی نظر آتے تھے۔موٹریں ایک بجے دوپہر غزنین پہنچ گئیں۔مہمانوں کو سرکاری مہمان خانے میں اتارا گیا، لیکن پہلے سب بازار کی سیر کو گئے اور مسلم، ہندو اور سکھ دکانداروں سے ملے۔واپس آ کر کھانا کھایا۔کچھ دیر آرام کیا۔اور پھر چار بجے شام غزنین کے مزارات اور بقیہ عمارات کی زیارت کو نکلے۔

پرانا غزنین جسے علاؤ الدین جہانسوز نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا، اس کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں۔علاءالدین نے غزنین پر قبضے کے بعد قتل عام کا حکم دیا تھا اور شہر کو آگ لگا دی تھی۔شہر سات دن تک لگاتار جلتا رہا۔تاریخ کی کتب میں درج ہے کہ جب شہر میں قتل عام ہو رہا تھا اور عمارتیں جل کر خاک ہو رہی تھیں تو علاء الدین جو تیغ زن کے ساتھ سخنور بھی تھا، مجلس عشرت میں بیٹھا قوالوں کی زبان سے اپنا فخریہ سن رہا تھا:

جہاں داند کہ من شاہ جہانم
چراغ دودۂ عباسیانم
علاء الدین حسین بن حسینم
کہ دائم باد ملک خاندانم

نیا غزنین احمد شاہ ابدالی کے جانشین تیمور شاہ نے تعمیر کرایا تھا، جو دراصل مٹی کا ایک بلند حصار ہے، جس کے اندر موجودہ شہر آباد ہے۔ قدیم غزنین جو سلطان محمود کا پایۂ تخت تھا، اس سے چند میل دور ہے۔ موجودہ شہر کی دوسری سمت غزنین کا پرانا قبرستان اور بعض کھنڈر ہیں۔ شاہی عمارتوں میں صرف چند مینار کھڑے نظر آتے ہیں۔ مزارات میں جو باقی رہ گئے ہیں وہ حکیم سنائی، سلطان محمود، سلطان مسعود، سلطان ابراہیم، حکیم بہلول دانا اور غالباً بعض دوسرے بزرگوں کے ہیں۔ غزنین کے آثار قدیمہ کی سیر کے واسطے سرور خان گویا نے ایک نوے سالہ بزرگ ملا قربان کو بلایا جو غزنین کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے واقف تھے اور بقول سید سلیمان ندوی، اس خضر کی رہنمائی میں وہ قدیم غزنین کی سیر کو نکلے۔۴۹

اقبال، حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔ اس لیے وہ رفقا سمیت مہمان خانے سے پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ مقبرہ قریب ہی ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر تھا۔ قبر پختہ تھی اور اوپر گنبد تھا۔ اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ سب اندر داخل ہوئے اور مسنون دعا پڑھی۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں۔ ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔۵۰

سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق فقیروں کے جھونپڑے سے نکل کر قافلے نے قریب کھڑی موٹروں میں بادشاہوں کے محل یعنی سلطان محمود کے مزار کا رُخ کیا۔ رستے میں ملا قربان کی نشاندہی پر مختلف ٹیلوں پر انہوں نے بہلول دانا، سلطان ابراہیم اور سلطان محمود کے والد سلطان سبکتگین کے مزار دیکھے۔ سلطان محمود کا

مزار ایک چھوٹے سے باغ میں ہے۔ سب اندر داخل ہوئے۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

اندر داخل ہوئے تو سلطان کی قبر نظر آئی۔ آہ! یہ اس سلطان کی قبر ہے جو دیوار چین سے لیکر سومنات گجرات تک کے ملکوں پر فرمانروا تھا۔ جس کی ہیبت و جلالت سے بڑے بڑے گردن کش سر اطاعت جھکا دیتے تھے...... آج وہ سلطان کس بیکسی و بیچارگی کے عالم میں ایک سنسان باغ کے اندر یکہ و تنہا بسترِ خاک پر دراز ہے۔ ۵۱

سلطان محمود کے مزار سے واپسی پر اقبال کو لاہور کی مناسبت سے حضرت علی ہجویریؒ یعنی حضرت داتا گنج بخش کے والد ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ ملا قربان نے بتایا کہ انہیں مزار کا علم ہے۔ چنانچہ اقبال کی ہدایت پر ملا قربان نے قدیم غزنین کے ویرانوں میں قبر تلاش کی اور اقبال دعائے مسنونہ پڑھ کر وہاں سے لوٹے۔

بعد ازاں ملا قربان سب کو مجذوب فقیر لائے خوار کی تربت پر لے گئے جو بازار کی ایک گلی کے اندر تھی۔ لائے خوار کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے حکیم سنائی کو دیکھ کر حقارت سے کہا تھا کہ سنائی سے بڑھ کر بے وقوف کون ہوگا جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدح و ستائش میں خرافات نظم کرتا ہے اور ان کو جا کر سناتا ہے۔ مجذوب کے اس فقرے سے حکیم سنائی بے حد متاثر ہوئے اور توبہ کی۔ شام کو ان سب مقامات کی زیارت کے بعد اقبال اور ان کے رفقا مہمان خانے میں پہنچے۔ سردی خاصی تھی اس لیے انگیٹھیاں جلانی پڑیں۔ رات بقول سید سلیمان ندوی، سلطان محمود کے غزنین میں بسر کی۔

۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے غزنین سے آگے روانہ ہوئے اور نوے میل کا فاصلہ طے کر کے گیارہ بجے دوپہر کو مقر پہنچے۔ افغانوں کے نزدیک مقر دراصل پرانا تاریخی شہر بہق ہے۔ مقامی سرکاری افسروں کو مہمانوں کی آمد کی

اطلاع پہلے ہی سے تھی۔ سو جونہی موٹریں رکیں، انہیں اعزازی سلامی دی گئی۔ سرکاری مہمان خانہ کی دو منزلہ عمارت میں کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ اس کے بعد ایک بجے موٹروں نے قلات غلوئی کی سمت حرکت کی اور چار بجے شام وہاں پہنچے۔ تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کیونکہ قلات غلزئی کابل سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ رات مہمان خانہ میں کٹی۔

یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے ناشتا کے بعد پھر سفر شروع ہوا۔ سردی کا وہی عالم تھا۔ تقریباً بارہ بجے قندھار پہنچے۔ یہاں موسم نسبتاً گرم تھا۔ شاہی قیام گاہ میں اترے شہر کے بعض ممتاز افراد ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں قابل ذکر عبدالحیٔ خان تھے جو قندھار میں وزارت خارجہ افغانستان کے نمائندے، یہاں کی ادبی انجمن کے ناظم اور پشتو رسالہ "طلوع افغان" کے مدیر تھے۔ وہ سندھ اور کراچی میں مقیم رہ چکے تھے۔ اس لیے اردو خاصی روانی سے بولتے تھے۔ وہ اس تحریک کے، کہ افغانوں کی قومی زبان پشتو کو ترقی دے کر تعلیمی، علمی و سرکاری زبان بنایا جائے، علمبردار تھے۔ انہوں نے آتے ہی اقبال کے ساتھ اس موضوع پر بحث شروع کی۔ اقبال نے زبانوں کی نشو و نما اور ترقی کے اصولوں پر اظہار خیال کیا اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور موثر ذریعہ ہے لیکن اگر اس تحریک سے قوم میں اتحاد کی بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا ترانۂ جنگ ہے۔ ابھی گفتگو جاری تھی کہ گورنر قندھار اپنے عملے سمیت مہمانوں کی ملاقات کے لیے تشریف لائے اور دیر تک مختلف امور پر باتیں کرتے رہے۔

چار بجے شام کے قریب جب ملنے والے رخصت ہو گئے تو وہ قندھار کی سیر کے لیے نکلے۔ خرقہ شریف کی زیارت گاہ اور احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ قریب ہی تھا۔ اس لیے قیام گاہ سے پیدل ہی روانہ ہوئے اور موٹروں کو مقبرے کے دروازے پر

لے جانے کی ہدایت کی۔ پہلے خرقہ شریف کی زیارت کی۔اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ملبوس اقدس ہے۔ غالباً احمد شاہ ابدالی بخارا سے حاصل کر کے بڑے ادب و احترام سے اپنے دارالسلطنت لایا تھا اور اس نے قصر شاہی کے پاس ہی اس کے لیے خصوصی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ یہاں سے فراغت کے بعد سلطان احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر گئے۔احمد شاہ ابدالی دیندار، انصاف پسند اور پُر جوش مجاہد تھے اور تاریخ اسلام کے آخری حصے میں اس کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔قبر پر عظیم الشان مقبرہ اس کے بڑے فرزند تیمور شاہ نے بنوایا۔ افغانوں میں اس مقبرے کا اس قدر احترام تھا کہ خونی مجرم بھی اگر بھاگ کر اس میں پناہ لیتا تو امان پاتا۔قبر کے سرہانے قدرے بلندی پر قرآن مجید کا وہ نسخہ رکھا تھا جو خاص احمد شاہ ابدالی کی تلاوت کا تھا۔

مقبرے سے نکل کر وہ سب موٹروں پر سوار ہوئے اور قندھار کا سب سے دلکش طبعی منظر ارغنداب دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔موٹریں ایک پہاڑی پر چڑھیں اور تنگ تر مقام پر پہنچ کر رک گئیں۔ یہاں سے اتر کر پیدل چلے اور پھر ایک کشادہ مقام پر آ گئے۔اب وہ قندھار کے سب سے بلند مقام پر کھڑے تھے۔نیچے میدان میں دریائے ارغنداب بہہ رہا تھا، جس کے تھوڑے فاصلے پر دو تین ندیاں بہہ رہی تھیں۔ان کے کناروں کے برابر تیس میل تک انار اور دوسرے میووں کے باغ در باغ کا سلسلہ نگاہ کے سامنے تھا۔اس بلندی کے قریب ہی بابا ولی قندھاری کا مزار ہے جہاں پر سب نے فاتحہ پڑھی۔واپسی پر ایک اونچی پہاڑی دیکھی جس کی قدرتی شکل ایسی تھی۔ جیسے سیکڑوں گز لمبا چوڑا ہاتھی سامنے بیٹھا ہوا۔ پہاڑی سے اتر کر قندھار کی دوسری سمت میں گئے اور ایک اور پہاڑی پر پہنچے جس کی چوٹی پر بابر نے اپنی ہندی فتوحات کا کتبہ نصب کرایا تھا۔حکومت افغانستان نے اس پہاڑی تک سڑک بنا دی ہے اور دامن سے پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے پتھر کاٹ کر

زینے بنائے گئے ہیں۔ جن کی تعداد چالیس مشہور ہے، اس لیے اسے چہل زینہ کہا جاتا ہے۔ صرف سید سلیمان ندوی اور پروفیسر ہادی حسن پہاڑی پر چڑھے۔۵۲

چہل زینہ سے واپسی پر مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ انہوں نے سڑک کے ساتھ اس کے پہلو بہ پہلو پتلی سی نہریں ہر طرف رواں دیکھیں۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

اسلامیت کا یہ کس درجہ پرُ اثر منظر تھا کہ ہر راہرو، ہر مسافر، ہر دکاندار، جس کا جہاں موقع تھا اس نہرِ رواں پر بیٹھ کر وضو کر رہا تھا، اور چادر بچھا بچھا کر اگر جماعت کی صورت نہ تھی تو تنہا کھڑا رو بقبلہ نماز ادا کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ایسے چبوترے بھی ملے، جن پر نماز باجماعت ادا ہو رہی تھی۔ آباد مسجدیں بھی ملیں۔ بازار پر گزر ہوا تو دیکھا کہ دکاندار سے لے کر خریدار تک نہر پر وضو کر رہا تھا یا مصروف نماز تھا کوئی اپنی دکان ہی پر اور کوئی دکان سے نیچے کپڑا بچھا کر کھڑا تھا۔ یہ روح پرور نظارہ قندھار کے سوا اس ملک میں مجھ کو اور کہیں نظر نہیں آیا۔۵۳

سید راس مسعود کو واپسی کی سخت جلدی تھی اور وہ رات ہی کو قندھار سے رخصت ہو کر چمن پہنچنا چاہتے تھے تاکہ کوئٹہ سے دوپہر کی گاڑی پکڑ کر جلد سے جلد علی گڑھ پہنچ جائیں۔ اتفاق سے قندھار میں انگریزی حکومت ہند کی طرف سے قونصل سیّد صدیق حسن تھے، جو اقبال کے پرانے دوست سید غلام بھیک نیرنگ کے بھائی تھے۔ وہ عصر کے وقت انہیں ملنے آئے اور سید راس مسعود نے ان سے اپنے سفر کی مشکل کے حل کرنے میں مدد چاہی۔ سید صدیق حسن نے ان کی مشکل آسان کردی۔ سو سید راس مسعود اپنے شبینہ سفر پر روانہ ہوگئے اور باقی رفقاء نے رات قندھار ہی میں گزاری۔

۲ رنومبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے ناشتے سے فارغ ہوئے اور روانگی سے قبل گورنر قندھار نے خشک میووں اور قندھاری انار کے ٹوکرے مہمانوں کو تحفے طور پر

پہنچے۔نو بجے کے قریب قندھار سے چمن کی طرف روانہ ہوئے۔بارہ بجے قلعہ جدید پہنچے، جو افغانستان کی آخری چوکی تھی۔دوپہر کا کھانا یہیں کھایا۔یہاں سرور خان گویا اور دیگر شاہی ملازمین نے اقبال اور ان کے رفقا کو الوداع کہی اور موٹریں چند منٹ کے اندر افغانستان کی سرحد کو پار کر کے انگریزی علاقے میں داخل ہو گئیں۔

چمن میں اقبال اور ان کے رفقا کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ شہر کے دروازے پر ہی مسلمانوں نے ان کا استقبال کیا اور ایک ریستوران میں لا کر بیٹھایا۔اہالیان شہر کا تقاضا تھا کہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ایک شب چمن میں قیام کریں اور مسلمانوں کے سامنے تقریریں کریں، لیکن ان حضرات نے معذرت کی۔ریستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع تھے، جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے۔وہ اقبال اور سید سلیمان ندوی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔اگرچہ چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے لیکن انہوں نے ایک دن بچانے کی خاطر چمن سے کوئٹے تک موٹروں پر سفر کیا۔وہ چار بجے شام چمن سے روانہ ہوئے۔رستہ پہاڑی نشیب وفراز کے سبب بڑا دشوار گزار تھا اور موٹر کے پہیے خود بخود پھسلے جاتے تھے، ڈرائیور موٹر کو بے تکان دوڑا رہا تھا تاکہ رات ہونے سے قبل وہ دشوار راہ کے خطروں سے باہر ہو جائے۔اس جلدی پر بھی شام ہو ہی گئی۔سیّد سلیمان ندوی کچھ خوفزدہ سے تھے اور اقبال نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات وتجارب اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی۔انہوں نے مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کی باتیں کرتے ہوئے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمی کے عہد کا ذکر چھیڑا۔ پھر اپنے والد ماجد کا تذکرہ کیا اور ان کی زندگی کے واقعات بیان کرتے رہے۔ پہاڑی رستہ اب ختم ہو چکا تھا اور میدان میں سے گزر رہے تھے۔رات کی تاریکی خوب پھیل چکی تھی اور بجلی کے چراغوں کی روشنی دور سے قطار و قطار نظر آنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ کوئٹہ میں تھے۔کوئٹہ میں خاصی سردی تھی۔انہیں ڈاک بنگلہ میں اتارا

گیا۔ کھانا یہیں کھایا اور رات ڈاک بنگلے میں بسر کی۔

۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے گیارہ بجے صبح کی گاڑی پکڑی۔ ریل دن بھر اور رات بھر چلتی رہی۔ ۴؍نومبر ۱۹۳۳ء کو بارہ بجے صبح ملتان پہنچے۔ یہاں تک سید سلیمان ندوی اور اقبال کا ساتھ رہا۔ سید سلیمان ندوی ملتان ٹھہر گئے۔۵۴ اقبال ملتان سے لاہور کی گاڑی میں بیٹھے اور اسی روز رات کو اپنے گھر پہنچ گئے۔ افغانستان کے نادر شاہ اور دیگر زعما نے انہیں بہت سے تحفے دیے تھے۔ سروے، انگور، انار اور خشک میووں کی پیٹیوں کے علاوہ افغانی پتھر کی بنی ہوئی اشیا، قالین اور خدا جانے کیا کیا کچھ ساتھ لائے تھے۔ راقم کے لیے نادر شاہ نے ایک سونے کی گھڑی بھیجی تھی۔ کابل سے سردوں، انگوروں، اناروں اور خشک میووں کی پیٹیاں تو ان کے لیے کئی سالوں تک آتی رہیں۔

۶؍نومبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی معیت میں سفر افغانستان کے متعلق ایک اخباری بیان دیا جس میں فرمایا:

حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوبصورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میڈیکل شعبہ قائم کیا گیا اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیر غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہو گا...... افغانستان آج ایک متحد ملک ہے، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ و بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک و شبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے۔۵۵

اس بیان کے اگلے ہی روز یعنی ۷ نومبر ۱۹۳۳ء کو یہ المناک خبر ہندوستان پہنچی کہ نادر شاہ کو کابل میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ کسی شخص کی انتقامی حرکت تھی۔ افغانستان پر امن رہا اور نادر شاہ کے فرزند محمد ظاہر شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اقبال نادر شاہ سے محبت کرتے تھے، اس لیے انہیں نادر شاہ کی اچانک موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو محمد ظاہر شاہ اور وزیر اعظم افغانستان کے نام تعزیتی پیغامات بھیجے۔ محمد ظاہر شاہ کو تحریر کیا:

اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے قتل کی خبر سے مجھے ذاتی حیثیت سے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ اعلیٰ حضرت شہید کی خدمت میں گذشتہ کئی سال سے مجھے نیاز حاصل تھا اور میں ان کی شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ شہید کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے لیے اس جلیل القدر شہید کی یاد ہمیشہ موجب رہنمائی ہو۔۵۶

افغانستان کے اس مختصر دورے کے متعلق سید سلیمان ندوی نے تو اپنے تاثرات سیر افغانستان میں قلمبند کیے، جب کہ اقبال نے افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار اپنی تالیف ''مسافر'' میں کیا جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی مثنوی، ایک غزل کے سوا، زیادہ تر مثنوی معنوی کی بحر میں ہے اور بقول سیّد سلیمان ندوی خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر اقبال کے آنسو ہیں اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں۔ اس کا آغاز نادر شاہ کے مناقب سے اور اختتام محمد ظاہر شاہ سے اظہار توقعات پر ہے۔۵۷

افغانستان سے واپس آتے ہی اقبال ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کے معاملات کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں فلسطین کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر خصوصاً بڑی تشویش تھی۔ نوآبادیات کے نائب وزیر نے حکومت برطانیہ کی پالیسی کی وضاحت

کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کردی جائے گی۔ اس پر اقبال نے ۶ رنومبر ۱۹۳۳ء کو وائسرائے کے نام اپنے برقیے میں تحریر کیا:

فلسطین کی صورت حال نے مسلمانان ہند میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا کردیا ہے نائب وزیر نوآبادیات کی تقریر نے مسلمانوں کے شبہات کو زیادہ عمیق بنا دیا ہے کہ برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ عربوں کے مفاد کے خلاف عمل پیرا ہوکر فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم کردی جائے۔ نائب وزیر نوآبادیات نے برطانیہ کی جو پالیسی بیان کی ہے، وہ صریحاً مخالفانہ ہے۔ فلسطین میں حال ہی میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ فوراً تحقیقات کی جائے اور فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ جلد از جلد روک دیا جائے۔ برطانیہ کے بہترین مفاد کا اقتضا یہ ہے کہ "اعلان بالفور" کو واپس لیا جائے۔ مسلمانوں کو توقع ہے کہ وائسرائے اس نازک صورت حالات کی طرف ملک معظم کی حکومت کی توجہ دلائیں گے اور برطانیہ اور مسلمانوں کے تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچالیں گے۔ ۵۸

اسی طرح ۲۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک تار نیشنل لیگ لندن کے صدر کو ارسال کیا جس میں لکھا:

مسلمانوں کے درمیان مسئلہ فلسطین پر بہت جوش پایا جاتا ہے، اور ناخوشگوار نتائج رونما ہونے کا خطرہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آپ مزید نقل و حرکت روکنے میں کامیاب ہوں گے اور مسلمانوں اور انگلستان کے درمیان کشیدگی پیدا نہ ہونے دیں گے۔ ۵۹

لیکن جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ جدے سے مکے کے درمیان ریلوے لائن بنائے جانے کا امکان ہے، تو اپنے ایک بیان مورخہ ۱۲ رنومبر ۱۹۳۳ء میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک ہندوستانی اسلامی کمپنی کا جدہ اور مکہ کے درمیان

ریلوے لائن بنانے کا کام اپنے ذمے لینا بڑی مسرت کی بات ہے اور اس کمپنی کی کامیابی عربوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بے حد فائدہ کا موجب ہوگی ۶۰۔ مگر یہ اسکیم کامیاب نہ ہوئی۔

۴ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اوائل دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک بیان میں گول میز کانفرنسوں میں مسلم وفد کے ارکان کے روّیے پر شدید نکتہ چینی کی۔ انہیں انٹی نیشنلسٹ کہا اور الزام لگایا کہ مہاتما گاندھی تو سارے مسلم مطالبات تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے، بشرطیکہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کی حمایت کریں، لیکن مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف محض تعصب کی بنا پر یہ شرط قبول نہ کی۔ اقبال نے اپنے اخباری بیان مورخہ ۶ر دسمبر ۱۹۳۳ء میں اُن کے ہر ایک الزام کا جواب دیا اور مہاتما گاندھی کا پول کھول کر رکھ دیا۔ اقبال نے واضح کیا کہ ہندو وفد کے ارکان اور اقبال کے سامنے سر آغا خان نے مہاتما گاندھی کو یقین دلایا تھا کہ اگر ہندو یا کانگرس مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرلیں تو ساری کی ساری مسلم قوم سیاسی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کے پیچھے چلنے کو تیار ہوگی، لیکن مہاتما گاندھی نے صرف اتنا جواب دیا کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت سے مسلم مطالبات کو تسلیم کریں گے اور بغیر کسی گارنٹی دینے کے کوشش کریں گے کہ کانگرس بھی ان مطالبات کو تسلیم کرے۔ اس پر انہیں اقبال نے مسز سروجنی نائیڈو کے سامنے کہا تھا کہ کانگرس کی ایگزیکٹو کو تار دے کر ان کی طرف سے ہاں حاصل کی جاسکتی ہے، مگر مہاتما گاندھی کا جواب تھا کہ اس معاملے میں کانگرس ان کو اپنا ایجنٹ یا وکیل بنانے کے لیے تیار نہ ہوگی۔

مہاتما گاندھی کانگرس تو کیا وفد کے ہندو اور سکھ ارکان کو بھی جو لندن میں موجود تھے، اپنا قائل نہ کرسکے۔ بعد میں انہوں نے ایک اور نہایت غیر منصفانہ شرط عائد کرنے کی کوشش کی اور وہ یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے علیٰحدہ نیابت کے مطالبے

کی مخالفت کریں۔ مسلم وفد کے ارکان کا موقف یہ تھا کہ جب مسلمان اپنے لیے جداگانہ انتخاب برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو وہ اچھوتوں کے ایسے ہی مطالبے کی مخالفت کیونکر کر سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے مہاتما گاندھی کو یقین دلایا کہ اگر اچھوتوں اور مہاتما گاندھی کے مابین اس معاملے میں کسی مفاہمت کے ہونے کا امکان ہوا تو مسلمان اس میں دخل انداز نہ ہوں گے۔ اقبال نے کہا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت میں ہندو یا کانگرس اگر آج بھی مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو تو ساری کی ساری مسلم قوم ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کے پیچھے چلے گی۔

انہوں نے آخر میں فرمایا:

آخر میں مَیں ایک سیدھا سا سوال پنڈت جواہر لعل سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے، جبکہ اکثریتی فرقہ نہ تو آٹھ کروڑ انسانوں پر مشتمل اقلیتی فرقے کے حقوق کے لیے کم سے کم تحفظات دینے کو تیار ہے اور نہ اس معاملے میں تیسرے فریق کا فیصلہ قبول کرتا ہے، لیکن لگاتار ایک ایسے نیشنلزم کی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ جو صرف اسی کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت سے نپٹنے کے لیے تو صرف دو ہی رستے ہیں: یا تو ہندوستان میں اکثریتی فرقہ مشرق میں برطانوی استعمار کے ایجنٹ کی حیثیت سے دائمی طور پر کام انجام دیتا رہے یا ملک کو مذہبی تاریخی اور تمدنی وابستگیوں کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے تاکہ جدید شکل میں فرقہ وارانہ یا انتخاب کے مسئلے کا خاتمہ ہو سکے۔[٦١]

اقبال عموماً علیل رہنے لگے تھے اور ان کی آنکھوں میں موتیا اترنے کے آثار بھی پیدا ہو رہے تھے[٦٢]۔ گزشتہ آٹھ برس سے وہ عملی سیاسیات میں الجھے رہے۔ لیکن مسلم سیاست کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اقبال اپنی خواہش کے مطابق مسلمانوں کی مختلف سیاسی تنظیموں میں اتحاد یا نظم وضبط پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ شاید اسی

سبب وہ مسلم کانفرنس کی صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔ پچھلے دو سالوں میں طویل مدت کے لیے گول میز کانفرنسوں میں شمولیت کے سلسلے میں ہندوستان سے باہر بھی رہنا پڑا۔ جس کے سبب ان کی جو تھوڑی بہت پریکٹس تھی وہ تباہ ہو گئی اور انہیں مالی نقصان اٹھانا پڑا۔[63] راقم کی یادداشت کے مطابق غالباً انہیں ایام میں ایک مرتبہ اقبال اور سردار بیگم کا آپس میں خرچ کے معاملے پر جھگڑا بھی ہوا۔ شام کا وقت تھا۔ راقم خدا جانے کس غرض سے اقبال کے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ سردار بیگم بیٹھی رو رہی ہیں اور ان سے نہایت تلخ لہجے میں کہہ رہی ہیں کہ میں اس گھر میں سارا دن غلاموں کی طرح کام کرتی ہوں، لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ راقم کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ بہر حال سردار بیگم کے مطالبات جائز تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ اقبال یا تو کوئی ملازمت کر لیں یا دل جمعی کے ساتھ وکالت کریں، تا کہ مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو۔ اس زمانے میں اگر کوئی راقم سے پوچھ بیٹھتا کہ تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں تو اس کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ سردار بیگم کی یہ خواہش بھی تھی کہ کرائے کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر تعمیر کر لیں اور اس میں رہائش اختیار کریں، لیکن اقبال کے پاس ان مطالبات کے جواب میں ایک کھسیانی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

مسلمانوں کا جماعتی انتشار و افتراق ختم ہونے میں نہ آتا تھا، اور اس کے باعث اقبال بے حد آزردہ اور دل شکستہ ہو گئے تھے۔ غالباً اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۷ ستمبر ۱۹۳۳ء میں سید سلیمان ندوی کو لکھا:

میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد دردمند ہوں اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے۔[64]

اسی طرح جب عبدالماجد دریابادی نے ان سے پٹنہ اور کانپور میں ہونے والے قومی اجتماعات میں شمولیت کے بارے میں پوچھا تو اپنے خط محررہ ۲۴ ستمبر

۱۹۳۳ء میں انہیں جواب دیا:

گذشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے دردمند کر دیا ہے، اس لیے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ نہ پٹنہ، نہ کانپور۔ ۶۵

بہر حال ان کی آزردگی یا دل شکستگی مسلم سیاست کے باعث تھی، فلسفہ و شاعری سے نہ تھی۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں انہوں نے روڈز لیکچرز کی دعوت قبول کر لی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی پسند کے کسی فلسفیانہ موضوع پر لیکچر دینے کی یہ دعوت انہیں لارڈ لوتھیان نے روڈز ٹرسٹیز کی طرف سے دی تھی۔ اقبال کا خیال تھا کہ اس بہانے انہیں اپنے پسندیدہ موضوع ''فلسفہ اسلام کی تاریخ میں زمان و مکاں'' پر تحقیق کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ دنیا کو دکھا سکیں گے کہ آئن سٹائن کا نظریہ مغرب کے لیے کوئی نئی بات ہو تو ہو، مسلم صوفی اور ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اقبال اپنے ایک خط محررہ ۸ نومبر ۱۹۳۳ء بنام سیّد نذیر نیازی میں فرماتے ہیں:

روڈز لکچرز کا موضوع زمان و مکاں فلسفہ اسلام کی تاریخ میں ہو گا۔ میں نے دعوت قبول کر لی ہے، مگر ابھی یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۳۴ء میں جاؤں گا یا ۱۹۳۵ء میں۔ مضمون مشکل اور دقیق سا ہے۔ وقت لکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو گا کیا جائے گا۔ ۶۶

اقبال نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس موضوع پر تحقیق کا کام شروع کر دیا تھا۔ بقول عبدالمجید سالک ان کی علمی مصروفیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں انہوں نے سید سلیمان ندوی اور دیگر احباب کو جو خطوط لکھے، ان سب میں زمان و مکاں کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی گئی اور ملک بھر میں زمان و مکاں کے بارے میں اکابر اسلام کی کتب کا تجسس جاری رہا۔ کیونکہ ہر حال میں ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر شعبۂ علم میں مسلمانوں کی برتری ثابت کی جائے ۶۷۔

لیکن دشمنانِ اقبال اب تک ان کی روڈز لیکچرز میں خصوصی دلچسپی سے یہی پہلو نکالنے کے قابل ہو سکے ہیں کہ وہ اس دعوت نامے کو حاصل کرنے کے لیے محض اس لیے بیتاب تھے کہ انگلستان یا آکسفورڈ یونیورسٹی کا ایک چکر لگ جائے گا۔ خیر آئندہ دو برسوں میں شدید علالت کے باعث اقبال کو یہ دعوت منسوخ کرنا پڑی اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

اللہ کو کچھ ایسا ہی منظور تھا، ورنہ اسلامی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان کی تاریخ فکر میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ تاریخ فلسفہ کے لحاظ سے تو یہ مسئلہ جیسا اہم ہے، ظاہر ہے۔ لیکن اسلامی فکر بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ خطبات (خطبہ پنجم) میں ایک جگہ حضرت علامہ نے لکھا ہے کہ زمان و مکاں کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہے اور پھر اپنے اس خیال کی تھوڑی سی وضاحت بھی کر دی ہے۔ لہٰذا یہ مضمون ذرا تفصیل سے بیان ہو جاتا اور منکرین اسلام کے گوناگوں خیالات و نظریات بھی سامنے آ جاتے تو کیا خوب ہوتا۔ ۶۸

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ''جاوید نامہ'' کی تکمیل کے بعد اقبال کے دل و دماغ، بقول ان کے نچڑ گئے تھے، اس لیے وقتی طور پر نہ فارسی میں کچھ کہنا ممکن تھا اور نہ اردو میں اور ویسے بھی فارسی کو چھوڑ کر اردو میں کہنا ان کی نگاہ میں سنگ مرمر کی بجائے گارے کی عمارت بنانا تھا، مگر اس کے باوجود مناسب ماحول میں ان کا میلان اردو کی طرف ہو سکتا تھا اور رہا۔

غالباً انہی ایام میں محمد دین تاثیر اور چند احباب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسالہ ''کارواں'' کے لیے غیر مطبوعہ اردو کلام کا مطالبہ شروع کیا۔ اقبال پہلے تو انہیں ٹالتے رہے مگر ان کے اصرار سے مجبور پر کر محمد دین تاثیر سے کہا تم اس وفد کے سرغنہ ہو اور شاعر ہو۔ اپنے اشعار سناؤ، شاید طبیعت کو بہانہ مل جائے۔ محمد

دین تاثیر نے جی کڑا کر کے ایک مطلع پڑھا۔ پھر دوسرا اقبال نے اس مصرع:

تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں

کو دہرایا۔ محمد دین تاثیر نے آخری شعر پڑھا:

زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

اقبال کو شعر پسند آیا۔ فرمایا: زمین اچھی ہے خدا کا قافیہ کیوں چھوڑ دیا؟ اس کے بعد خاموش ہو گئے اور سر جھکا لیا۔ پھر بولے۔ اگر قافیہ بدل دیا جائے تو؟ محمد دین تاثیر نے جواب دیا۔ تو بہتر ہو گا۔ فرمایا، لو سنو:

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

محمد دین تاثیر لکھتے ہیں:

یہ شعر کہہ کر علامہ کچھ رکے، دو تین منٹ تک اور پھر یہ حالت تھی کہ میں نقل نہیں کر چکتا تھا کہ ایک اور شعر تیار ہوتا۔ دوسرا شعر "جاوید نامہ" کی کیفیات کا حامل تھا:

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

جوں جوں شعر ہوتے جاتے، علامہ کی حالت بدلتی جاتی۔ بستر ہی میں اٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گئے آواز میں لرزش سی آ گئی۔ جھوم جھوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اٹھا کر انشاد کرتے تھے اور اس شعر پر:

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

وہ بھی رو رہے تھے اور ہم بھی! نہ جانے یہ غزل کتنی لمبی ہو جاتی مگر یہ سلسلۂ فیضان ایک اجنبی ملاقاتی کی آمد سے منقطع ہو گیا۔ ۶۹

کتنی انوکھی اور حیرت کی بات ہے کہ یہی شخص جو بستر میں اٹھ کر پاؤں کے

بل بیٹھ جاتا، جھوم جھوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اٹھا کر انشا د کرتا اور شعر کہتے ہوئے روتا چلا جاتا، اسلامی تمدن کی برتری ثابت کرنے کے لیے زمان و مکاں کے مشکل اور دقیق مسئلے پر تحقیق کے لیے بیتاب تھا یا مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اپنی گوشہ نشینی سے نکل کر لاہور سے دہلی، شملہ یا لندن کی نہ صرف خاک چھانتا بلکہ ایک ایک نکتے کی خاطر لڑتا جھگڑتا تھا، جس کی تشویش، آزردگی یا دل شکستگی کا باعث خرچ کی تنگی یا آمدنی کا فقدان نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کا انتشار اور افتراق تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ہمت نہ ہارتا تھا۔

مآخذ

باب ۱۹

۱۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحہ ۲۲۵۔ اسی تاریخ کو انہوں نے اپنے سفر یورپ کے متعلق بھی بیان دیا تھا۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۶۔ غالباً انہی موضوعات پر ایک بیان ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء کو نمائندہ مسلم نیوز سروس کو دیا گیا۔ دیکھیے ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۶۷، ۱۶۸

۲۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۶۸، ۱۶۹

۳۔ مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحات ۹۳ تا ۱۰۱

۴۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۲۷، ۲۲۸، ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۳۹۹، ۴۰۰

۵۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۱، ''ذکر اقبال'' میں عبدالمجید سالک نے ان سب واقعات کو ۱۹۳۲ء میں جگہ دی ہے جو غلط ہے، دیکھیے صفحہ ۱۷۶

۶۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۷۰ تا ۱۷۳

۷۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحہ ۲۲۸ تا ۲۳۰

۸۔ ایضاً، صفحات ۲۳۰، ۲۳۱

۹۔ ایضاً، صفحات ۲۳۱، ۲۳۲

۱۰۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۷۳ تا ۱۷۷

۱۱۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحہ ۲۳۵

۱۲۔ ایضاً، صفحات ۲۳۴، ۲۳۵

۱۳۔ ''سرگزشتِ اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحات ۲۳۳، ۲۳۴ بحوالہ ''شیر کشمیر''
صفحات ۱۴۱، ۱۴۲

۱۴۔ ''میاں فضل حسین کے خطوط'' مرتبہ وحید احمد (انگریزی) دیکھیے خط بنام سرظفر اللہ خان، مورخہ ۲۶ جون ۱۹۳۳ء جس میں اقبال پر الزام لگایا ہے کہ وہ اور دیگر مسلم لیڈر اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مسلمانوں میں مذہبی فرقہ پرستی کو ہوا دے رہے ہیں۔ نیز دیکھیے خط بنام سرظفر اللہ خان مورخہ ۳ جولائی ۱۹۳۳ء جس میں اقبال پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کو اندر سے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، صفحات ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۷

۱۵۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۸۲، ۱۸۳

۱۶۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۴۰۰، ۴۰۱ بحوالہ ''فضل حسین، ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، صفحہ ۲۸۰

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۲

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۸۲

۱۹۔ ''میاں فضل حسین کے خطوط'' مرتبہ وحید احمد (انگریزی)، صفحات ۲۸۰، ۲۸۱

۲۰۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی)۔ صفحہ ۲۸۵۔ نیز دیکھیے ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۴۰۲، ۴۰۳

۲۱۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' (انگریزی)، صفحہ ۲۶۲

۲۲۔ ''اقبال کی تقریریں تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۳۶، ۲۳۷، ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۴۰۴

۲۳۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحہ ۴۰۵

۲۴۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۷۷

۲۵۔ ''اقبال کی تقریریں ، تحریریں اور بیانات ''مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)صفحات ۲۳۷، ۲۳۸

۲۶۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۷۷ تا ۱۷۹

۲۷۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں''مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحہ ۱۰۔
''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۱۰۸

۲۸۔ ایضاً۔ صفحات ۳۱، ۳۲

۲۹۔ ''سیر افغانستان'' از سید سلیمان ندوی، صفحات ۶۲، ۶۳، نیز دیکھیے'' ملفوظات اقبال'' مرتبہ ابواللیث صدیقی، صفحات ۱۴۶، ۱۴۷

۳۰۔ ''سرگذشت اقبال''۔ از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۴۴۲

۳۱۔ ''یادِ اقبال'' از صابر کلوروی، صفحہ ۲۰

۳۲۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحہ ۳۰

۳۳۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شروانی ، (انگریزی)، صفحہ ۲۳۸۔

۳۴۔ ''اقبال ریویو'' جنوری ۱۹۷۶ء، مضمون ''علامہ اقبال کا سفر افغانستان'' از اختر راہی صفحہ ۳۱۔

۳۵۔ ''سیر افغانستان'' از سید سلیمان ندوی، صفحہ ۸۷۔

۳۶۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر حصہ دوم نومبر، دسمبر ۱۹۷۷ء مضمون ''علامہ اقبال مزار بابر پر'' ڈاکٹر عبدالغنی، صفحہ ۲۴

۳۷۔ ''اقبال ریویو'' جنوری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۳۹، بحوالہ ''اقبال کی کہانی'' از ظہیر الدین، صفحات ۹۶، ۹۷

۳۸۔ ''سیر افغانستان''، صفحات ۳۱ تا ۳۸

۳۹۔ ایضاً، صفحات ۴۰ تا ۴۸، ۴۵ تا ۵۶

۴۰۔ ایضاً، صفحات ۵۸ تا ۶۲

۴۱۔ ایضاً صفحہ ۶۳

۴۲۔ نظم کے متن کے لیے دیکھیے ''اقبال ریویو'' جنوری ۱۹۷۶ء، صفحات ۴۴، ۴۵ بحوالہ ''اسلامی تعلیم'' اقبال نمبر، صفحہ ۵

۴۳۔ ''سیر افغانستان'' از سید سلیمان ندوی، صفحات ۶۸، ۶۹

۴۴۔ ایضاً صفحات ۷۱ تا ۷۳

۴۵۔ ایضاً صفحہ ۷۴

۴۶۔ ایضاً، صفحات ۷۸ تا ۸۰

۴۷۔ ایضاً صفحات ۸۲ تا ۸۴، ''مقالاتِ اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی، صفحات ۲۱۸ تا ۲۲۰

۴۸۔ ایضاً، صفحات ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۱۶

۴۹۔ ایضاً، صفحات ۱۱۶ تا ۱۲۷

۵۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۹

۵۱۔ ایضاً صفحات ۱۲۹، ۱۳۱ تا ۱۳۴

۵۲۔ ایضاً صفحات ۱۳۴ تا ۱۵۸

۵۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۹

۵۴۔ ایضاً، صفحات ۱۶۰ تا ۱۸۵

۵۵۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شروانی، صفحات ۲۳۹، ۲۴۰

۵۶۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات، ۱۸۰، ۲۸۱

۵۷۔ ''سیر افغانستان'' صفحہ ۲۰۳

۵۸۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۷۹، ۱۸۰

۵۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۲

۶۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۰

۶۱۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' لطیف احمد شروانی (انگریزی)، صفحہ ۲۴۳

۶۲۔ ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک، صفحہ ۱۸۴

۶۳۔ ''اقبال ۔ ان کے سیاسی نظریات چوراہے پر'' مرتبہ اے۔ حسن علی گڑھ (انگریزی) صفحہ ۲۷

۶۴۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۱۶۹

۶۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۳

۶۶۔ ''مکتوباتِ اقبال''، صفحات ۱۱۸، ۱۱۹

۶۷۔ ''ذکر اقبال'' صفحات ۱۸۴، ۱۸۵

۶۸۔ ''مکتوبات اقبال'' صفحہ ۱۱۹

۶۹۔ ''ملفوظاتِ اقبال'' مرتبہ ابواللیث صدیقی، صفحات ۱۲۶ تا ۱۲۹

باب: ۲۰

علالت

۱۹۳۴ء کا سال علالت کے آغاز اور دیگر مصائب کے سبب ایک لحاظ سے اقبال کی سیاسی زندگی کے عملی طور پر خاتمے کا سال ہے۔ لیکن بقول محمد احمد خان، بستر علالت پر لیٹے لیٹے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ سازی میں جو کام انجام دیا۔ اسے اس خطۂ زمین کے مسلمانوں کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔۱

انہوں نے گزشتہ برس لندن میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران میں محمد علی جناح سے کئی ملاقاتیں کیں۔ تیسری گول میز کانفرنس میں محمد علی جناح کو مدعو نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ حکومت برطانیہ کے خیال میں وہ اس وقت برصغیر کی سیاست میں کوئی خاص اثر نہ رکھتے تھے اور نہ کسی اہم گروہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتے تھے۲۔ سر ظفر اللہ خان اپنی کتاب ''تحدیث نعمت'' میں تحریر کرتے ہیں کہ انہوں نے بحیثیت قائم مقام ممبر وائسرائے کونسل محمد علی جناح کا نام تیسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے تجویز کیا تھا، لیکن وزیر ہند نے ان سے اختلاف کیا اور محمد علی جناح کے متعلق لکھا:

وہ ہر بات پر تنقید تو بہت کڑی کرتے ہیں لیکن کوئی اثباتی حل پیش نہیں کرتے۔ اب انہوں نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے معاملات کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق نہیں رہا۔۳

اقبال نے اپنی ملاقاتوں میں محمد علی جناح پر واضح کیا کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اور آئندہ کے سیاسی پروگرام ترتیب دینے کے لیے ان کا ہندوستان واپس آنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح دیگر مسلم قائدین بھی وقتاً فوقتاً ان کی واپسی پر اصرار کرتے تھے۔ بالآخر محمد علی جناح نے ہندوستان واپس آنے کا مصمم ارادہ

کر لیا۔ وہ دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں بمبئی پہنچے اور ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور یوں ان کے ہاتھوں لیگ کا احیاء عمل میں آیا۔

اقبال مسلم سیاسی لیڈروں کے نفاق اور فتنہ تراشیوں یا مسلم عوام کے انتشار سے بڑے برگشتہ خاطر تھے۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی ہم آہنگی، سالمیت یا اس کی اساسی تنظیم کے نصب العین کی تحصیل کے لیے ان کی کوششیں اب تک کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی تھیں۔ اس دور میں برصغیر میں مسلم سیاسی جماعتوں کی تعداد بیس سے اوپر جا چکی تھی اور ہر مسلم سیاسی جماعت کا مسلک دوسری جماعت سے مختلف تھا۔ خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کا آپس میں اختلاف تھا۔ اس لیے یہ سیاسی جماعت دو حصوں میں منقسم تھی۔ جمعیت العلماء ہند، کانگرس کی ہمنوا تھی اور اس کا خالصتاً مسلم سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کا مقصد بھی مسلمانوں کو کانگرس کے دام میں لانا تھا اور یہ سیاسی جماعت بالآخر کانگرس میں مدغم ہو گئی۔ پنجاب کی مجلس احرار جمعیت العلمائے ہند سے وابستہ تھی۔ کشمیر ایجی ٹیشن کے دنوں میں پنجاب میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن بعد میں اس جماعت پر لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد کروانے کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ خان عبدالغفار خان نے صوبہ سرحد میں ایک سیاسی جماعت خدائی خدمت گار قائم کر رکھی تھی اور یہ بھی مجلس احرار کی طرح جمعیت العلمائے ہند اور نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے زیر اثر تھی یا کانگرس کی ہمنوا تھی۔ لکھنؤ میں کانگرس کی شہ پر شیعہ مسلمانوں نے شیعہ پولیٹیکل کانفرنس قائم کر رکھی تھی، جو شیعہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کی طلب گار تھی۔ بلوچستان میں علاقائی بنیادوں پر وطن پارٹی قائم تھی۔ کشمیر میں بھی مسلمان مختلف دھڑوں یا سیاسی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور شیخ محمد عبداللہ کی جموں اور کشمیر مسلم کانفرنس بالآخر کانگرس کی ہمنوا بن کر ابھری۔ عنایت اللہ مشرقی نے پنجاب میں خاکسار پارٹی کی بنیاد رکھی جو ایک نیم عسکری قسم کی تنظیم تھی۔ ان مسلم سیاسی جماعتوں کے علاوہ کئی اور علاقائی

یا فرقہ وارانہ بنیاد پر جماعتیں بھی موجود تھیں۔ مثلاً کلکتے میں مومن کانفرنس، بنگال میں مسلم کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مولوی فضل حق کی مسلم پرجا پارٹی اور اس کے برعکس پنجاب میں زمینداروں کے حقوق کے لیے سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی دیگر مسلم سیاسی جماعتوں کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے، مگر اس کی تعداد سے ظاہر ہے کہ اس دور کے مسلم سیاسی رہنماؤں کے ذہنی انتشار کی کیا کیفیت تھی اور ایسی صورت میں مسلم عوام ان سے کیا توقع رکھ سکتے تھے۔ اقبال نے مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور مورّخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں اپنے صدارتی خطبے میں درست کہا تھا:

وہ لوگ جنہیں مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل ہے اور جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں، ابھی تک ان کے ذہنوں میں انتشار ہے...... گو مسلم عوام میں قربانی کے جذبے کا فقدان نہیں ہے۔ پچھلے چند سالوں کے واقعات شاہد ہیں کہ قوم کی رہنمائی کسی قابلِ قبول اصول کے ماتحت نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر اختلاف اور تضاد کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔[۴]

مستقبل میں اس مسئلے کے حل کی خاطر اقبال نے اپنے خطبے میں کئی تجاویز پیش کیں اور ان میں سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو جس کی شاخیں ملک کے سارے صوبوں اور ضلعوں میں پھیلا دی جائیں۔ اس کا نام خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اس کے آئین میں اتنی لچک ضرور ہو کہ ہر سیاسی مکتبہ فکر کے حامی اس کی رکنیت اختیار کر سکیں اور کسی بھی مکتبہ فکر کے حامیوں کے لیے ممکن ہو کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے اس میں برسر اقتدار آ کر اپنی صوابدید، نظریے یا طریق کار کے مطابق قوم کی رہنمائی کے لیے پالیسی مرتب کر سکیں، لیکن ایسی سیاسی تنظیم کو وجود میں لانا اقبال کے بس میں نہ تھا۔ یہ کام قدرت نے مستقبل قریب میں محمد علی جناح کے ہاتھوں آل انڈیا مسلم لیگ کے احیاء کے ذریعے کروانا تھا۔

راقم کے بچپن میں رمضان کا مہینہ سردیوں میں آیا کرتا اور عید بھی سردیوں ہی میں آتی تھی۔ رمضان کا مہینہ خوب اہتمام سے منایا جاتا۔ سردار بیگم اور گھر میں موجود تمام خواتین اور ملازم باقاعدہ روزے رکھتے۔ قرآن مجید کی تلاوت ہوتی اور نمازیں پڑھی جاتیں۔ راقم کو سحری کے وقت اٹھنے اور سحری کھانے کا بے حد شوق تھا اور ایک آدھ بار اقبال کے ساتھ سحری کا کھانا بھی یاد پڑتا ہے۔ جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ راقم عموماً اقبال کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ اگرچہ راقم کو نہانے سے شدید چڑ تھی، لیکن اس شب گرم پانی سے سردار بیگم اسے نہلاتیں اور وہ بڑے شوق سے نہاتا، نئے کپڑے اور جوتوں کا نیا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے، عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے، سردار بیگم راقم کو عید کے موقع پر پہناتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی ہوتی اور کلائی پر باندھنے کے لیے ایک سنہری گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے راقم کے لیے بطور تحفہ بھیجی تھی۔ سج دھج کر راقم اقبال کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے موٹر کار میں جاتا۔ ان کی انگلی پکڑے ہوئے بادشاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز ادا کرتا۔ علی بخش، شیخ مختار احمد یا چوہدری محمد حسین بھی ساتھ ہوتے۔ نماز سے فارغ ہو کر بارود خانے میں میاں نظام الدین اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد گھر واپسی ہوتی۔ اقبال اپنے والد کی تقلید کرتے ہوئے عید کے روز سویوں پر دہی ڈال کر کھاتے۔ سارا دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور راقم کا دن گھر کی پچھلی طرف شاہ ابو المعالیؒ کے مزار سے ملحق میدان میں لگے ہوئے میلے پر کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو سردار بیگم سنہری گھڑی اور اچکن اتروا لیتیں اور پھر اگلی عید تک راقم کو ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

۱۹۳۴ء میں عید الفطر ۱۰ جنوری کو آئی۔ اقبال، چوہدری محمد حسین، علی بخش اور

راقم کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر حسب معمول بادشاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کی غرض سے گئے۔ اس روز خوب سردی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اقبال نے شلوار اور اچکن پہن رکھی تھی، سر پر ٹوپی تھی لیکن پاؤں میں موزے شاید باریک تھے۔ مسجد کے یخ بستہ فرش پر جوتوں کے بغیر چلنے سے انہیں سردی سی محسوس ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر سوئیوں پر دہی ڈال کر کھایا۔ اگلے روز انفلوائنزا ہو گیا، جو مختلف دوائیں کھانے کے باوجود دو تین ہفتوں تک جاری رہا۔ پھر ایک شب تین چار گھنٹے کھانسی کا دورہ پڑا۔ علاج کیا گیا۔ چند دنوں بعد انفلوائنزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہو گئی لیکن گلا بیٹھ گیا اور ایسا بیٹھا کہ ایلوپیتھک، یونانی اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود تکلیف رفع نہ ہوئی۔ اقبال کو دیگر عارضوں کے ساتھ یہ عارضہ آخری دم تک رہا، جس کے نتیجے میں کھل کر یا بلند آواز سے بول نہ سکتے تھے۔ اس لیے سیاسی جلسوں میں تقریروں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ جہاں تک وکالت کے کام کا تعلق ہے، اسے تو پہلے ہی ان کی سیاست میں دلچسپی اور گول میز کانفرنسوں میں شمولیت کے سبب ہندوستان سے طویل عرصوں کے لیے غیر حاضری سے شدید نقصان پہنچ چکا تھا اور اگر وہ اس سال سے اسے ازسرنو شروع کرنے کا ارادہ رکھتے بھی تھے تو بھی ایسے ارادے کی تکمیل کے اب امکانات ختم ہو چکے تھے۔

صحت کے نقطۂ نظر سے اقبال اگرچہ اپنے سرخ و سپید چہرے کی بدولت ہمیشہ تندرست و توانا دکھائی دیتے تھے، مگر انہیں جوانی ہی سے مختلف قسم کے عوارض نے آ گھیرا تھا۔ مزاج بلغمی تھا۔ تبخیر معدہ کی تکلیف رہتی۔ پھر مدت تک درد گردہ کی شکایت رہی۔ یہ مرض انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا[5]۔ احباب کے مشورے سے حکیم نابینا کا علاج کرایا، جس سے بہت فائدہ ہوا۔ اس کے بعد درد نقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کے دورے پڑتے تو لگاتار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں۔ ترش چیزیں کھانے کی عادت کے سبب گلا

اکثر خراب رہتا۔ تمباکو نوشی سے کھانسی کی شکایت بھی تھی، جس نے رفتہ رفتہ دمہ قلبی کی صورت اختیار کرلی۔ کھانستے کھانستے بے ہوش ہو جایا کرتے۔ ایک آنکھ بچپن ہی سے تقریباً بیکار تھی، لیکن اب ان کی دوسری آنکھ میں بھی موتیا اترنے لگا۔ آخر کار بحیثیت مجموعی کمزوری اور ضعف کے باعث دل بڑھ گیا اور وہ پوری طرح خون پمپ کرنے کے قابل بھی نہ رہا، جس کے نتیجے میں معمولی محنت کرنے سے ان کا دم پھول جاتا۔ علاج کے معاملے میں بڑی بے پروا طبیعت پائی تھی۔ بدذائقہ دوا پینے سے یا ناگوار شے کھانے سے انکار کرتے تھے۔ ملنے والوں میں سے کسی نے کوئی ٹوٹکا بتا دیا تو اسے بھی استعمال میں لے آتے۔ پرہیز کی پابندی سے کتراتے اور ایک طریق علاج میں دوسرا اور دوسرے میں تیسرا داخل کر دیتے۔

ایلوپیتھک طریق علاج کے اس لیے خلاف تھے کہ ڈاکٹروں کی دوائیں بدذائقہ ہوتی ہیں اور انہیں تجویز کرتے وقت مریض کی نفاست طبع کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، لیکن ایک بار جب حکیم نابینا نے انہیں آواز کے لیے چڑے کا مغز یا خرگوش کا مغز کھانے کو کہا تو نذیر نیازی کو تحریر کیا:

پرندوں اور نر خرگوش کا مغز میں نے آج تک استعمال نہیں کیا...... مغز خرگوش کا کھانا میرے لیے ناممکنات سے ہے...... خرگوش کا مغز یا چڑے کا مغز کھانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ ان کی جگہ کوئی اور دوا تجویز فرمائیں۔[6]

پھر نذیر نیازی سے پوچھا کہ کیا حکیم نابینا اپنے طبی ذوق کی گہرائیوں سے آواز کی خاطر کوئی ایسی اکسیر ایجاد کر سکتے ہیں، جو بہت جلد اور نمایاں اثر کرے؟ یعنی کیا خرگوش نر کے دماغ کا جوہر کسی کیمیاوی طریق مثلاً عرق یا ماء اللحم کی صورت میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ نذیر نیازی لکھتے ہیں:

آواز کے لیے (انہیں) اکسیر کی طلب تھی اور اصرار یہ تھا کہ حکیم صاحب اسے اپنے

طبی ذوق کی گہرائیوں سے پیدا کریں۔ یہ اس لیے کہ حضرت علامہ کے نزدیک زندگی سرتاسر ایجاد ہے۔ اس میں خلاقی ہے طباعی ہے۔ یہ اس کا اپنا ذوق ہے جو اسکی رہنمائی کرتا اور اس کو منزل مقصود تک لے جاتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک اس قسم کی اکسیر کی ایجاد نا ممکن نہیں تھی۔ حکیم صاحب مسکرائے۔ فرمایا اللہ ڈاکٹر صاحب کو صحت دے ہم تو اپنی دانست میں جو دوا بھیجتے ہیں، اکسیر ہی سمجھ کر بھیجتے ہیں۔ اب کے پھر دواؤں میں تھوڑا بہت ردّوبدل کر دیا گیا۔ رہا دماغ خرگوش کا معاملہ سو اس سلسلے میں کسی کیمیاوی طریق پر عمل نہیں ہو سکا۔ ۷

کسی کا مجرب یا آزمودہ نسخہ یا ٹوٹکا استعمال میں لانے کے بارے میں دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں، نذیر نیازی کو اپنے ایک خط مورّخہ ۱۶ جولائی ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں:

مجھ کو بعض تجربہ کار لوگوں نے ہدایت دی ہے کہ گلے کے دونوں طرف جونک لگوائی جائے۔ جراحوں کا ایک پرانا خاندان لاہور میں ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک لیپ ہے جو اس مرض کے مریضوں کے گلے پر لگایا جاتا ہے۔ میں نے ان سے لیپ کے اجزا دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ چار قسم کے گوندوں سے بنا ہے، جن کے اثر سے بلغم جل کر کافور ہو جاتی ہے۔ جراح کا یہی خیال ہے کہ آواز کی خرابی نزلے کی وجہ سے ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پانچ روز تک متواتر لگانے سے آواز میں بے حد ترقی ہوگی، بلکہ ممکن ہے کہ بالکل اچھی ہو جائے اور پھر کسی دوا لگانے یا کھانے کی ضرورت نہ رہے۔ غرضیکہ اس کو بہت دعویٰ اس پر ہے۔ شہر کے لوگ جو ہمارے ہمدرد ہیں مجبور کر رہے ہیں۔ میں نے سب کو یہی جواب دیا ہے کہ حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔ ۸

نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں کہ حکیم نابینا نے لیپ لگانے پر کوئی اعتراض نہ کیا، البتہ جونکیں لگوانے سے سختی سے منع کر دیا۔ نیز فرمایا کہ اقبال سے کہیے تسلی رکھیں او

رلوگوں کے چٹکلوں کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ خیر جراح کا لیپ استعمال کیا گیا، لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ۹

۱۸ ستمبر ۱۹۳۴ء کو نذیر نیازی کے نام خط میں تحریر کیا:

ایک شخص جو خود اس بیماری کا مریض رہ چکا ہے، عراق میں اسے ایک ترک طبیب نے تمباکو میں چرس رکھ کر پلائی تھی اور اس کے ساتھ لپٹن چائے جس میں شکر کی جگہ گڑ ڈالا جائے۔ اس نسخے سے اسے فائدہ ہوا اور تین چار روز کے عرصے میں اس کی آواز صاف ہوگئی۔ کہتا ہے شرطیہ علاج کرتا ہوں۔ آپ حکیم صاحب سے اس کا ذکر کریں کہ آیا چرس کا استعمال آواز کے لیے مفید ہے۔ ۱۰

بقول نذیر نیازی، چرس اور گڑ اور لپٹن کی چائے کا سن کر حکیم نابینا نے کہا کہ معاذ اللہ میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مزید فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے سادہ مزاج ہیں، ہر ٹوٹکے پر اعتبار کر لیتے ہیں۔

ان کی بد پرہیزی کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ ۲۳ر جون ۱۹۳۴ء کے خط میں نذیر نیازی کو تحریر کرتے ہیں کہ تجربے سے معلوم ہوا، دہی اور لسی کا گلے پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح فالودے کا اثر بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن اس سے اگلے ہی روز اپنے خط میں انہیں لکھا:

دوسرے ہفتے کی دوا نے، پہلے ہفتے سے ترقی جو آواز میں ہوئی تھی، کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ ترقی معکوس میں ہوئی۔ اس کے وجوہ جہاں تک سوچ سکتا ہوں، تین ہو سکتے ہیں:

(۱) میں نے دہی کھایا اور لسی بھی پی۔

(۲) فالودہ پیا (برف ڈال کر

(۳) آپ نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ دوا کی مقدار دگنی کر دی گئی ہے۔ شاید ڈوس (خوراک) کے بڑھ جانے کی وجہ سے آواز نے ترقی معکوس کی۔ ۱۱

خیر گلے کا عارضہ لاحق ہونے کے تقریباً تین ماہ بعد یعنی اپریل ۱۹۳۴ء میں جب نذیر نیازی دہلی سے لاہور پہنچ کر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں علیل پا کر گھبرا گئے۔ اسی تکلیف کی بنا پر اقبال جامعہ ملیہ میں ترکی رہنما بہجت وہبی کے توسیعی خطبات میں کسی ایک کی صدارت کی خاطر دہلی نہ جا سکے تھے، گو اس حالت میں بھی جامعۂ ملیہ کو ایک ایسا ادارۂ طبع و نشر قائم کرنے کا مشورہ دیا جو بقول نذیر نیازی، عصر حاضر کے جدید افکار اور رجحانات کے پیش نظر مطبوعات کے ذریعے اسلام کی ترجمانی نئے علمی تقاضوں کے علاوہ اس کے عمرانی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح کرے کہ عالم اسلام میں ذہناً اور عملاً جو انتشار پھیل رہا ہے اس کا ازالہ ہو جائے، لیکن اس انداز میں کہ قدیم و جدید کی غلط بحث کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔۱۲

نذیر نیازی کو بتایا گیا کہ سینے وغیرہ کے ایکس ریز فوٹو کی بنیاد پر ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دل کے اوپر کی طرف ایک نئی گروتھ (رسولی) ہو رہی ہے۔ جس کے دباؤ سے ووکل کارڈ (آلۂ صوت) متاثر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج یا تو ریڈیم سے ہوگا یا ایکس ریز سے اور یہ دونوں علاج یورپ ہی میں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انہیں لندن یا وی آنا (آسٹریا) چلے جانا چاہیئے تا کہ علاج مذکور سے گروتھ کی نشوونما روکی جا سکے یا اسے ایکس ریز یا ریڈیم سے تحلیل کیا جا سکے۔ ان کی رائے میں اگر گروتھ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، کیونکہ ممکن ہے یہ گروتھ بڑھ کر پھیپھڑوں پر بھی اپنا دباؤ ڈالے۔ نذیر نیازی نے عرض کیا کہ حکیم نابینا کے علاج سے اقبال کی درد گردہ رفع ہوئی تھی، اس لیے اس معاملے میں بھی کیوں نہ ان سے رجوع کیا جائے۔ اقبال کا ذاتی رجحان طب ہی کی طرف تھا۔ اور ویسے بھی انہیں یقین تھا کہ ایلوپیتھک طریق علاج کو دوسرے طریقوں پر وہ برتری حاصل نہیں جس کا عموماً دعویٰ کیا جاتا ہے۔ پس انہیں نذیر نیازی کی تجویز پسند

آئی اور حکیم نابینا کا علاج شروع ہوا۔ حکیم نابینا نے اقبال کو دہلی آنے کے لیے کہا۔ نتیجتاً وہ ۱۱ر جون ۱۹۳۴ء کو دہلی پہنچے۔ حکیم نابینا نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے ان کا حال سنا۔ پھر نبض دیکھی، نسخہ تجویز کیا، دوائیں منگوائیں اور ضروری ہدایات دیں۔ ۱۲ جون ۱۹۳۴ء کو اقبال واپس لاہور آ گئے۔ [۱۳]

حکیم نابینا کے علاج سے چند ماہ میں ان کی عام صحت تو خاصی بہتر ہو گئی لیکن آواز میں کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ اُدھر ان کے عارضے کے متعلق ڈاکٹروں کا آپس میں اختلاف رائے بڑھتا چلا گیا۔ چھ سات ماہ گزرنے کے بعد بالآخر ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ گروتھ، ٹیومر یا رسولی کی تھیوری غلط ہے، کیونکہ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو ان کی عام صحت اس قدر جلد ترقی نہیں کر سکتی تھی بلکہ روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی۔ سو اب اُن کے خیال میں اقبال کا مرض صرف شاہرگ کا پھیلاؤ یا ورم تھا جو خون کے سمی مادوں یا نفس کے زیادہ استعمال کے سبب پیدا ہو سکتا تھا اور یہ عارضہ بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی لاحق ہوتا ہے۔ پس مرض خطرناک تو نہ تھا مگر آواز کے نارمل حالت میں عود کر آنے کے امکانات کم تھے، اس لیے علاج کی یہی ایک صورت تھی کہ موجودہ آواز پر اکتفا کیا جائے اور شاہرگ کے پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعے روکنے کی کوشش کی جائے۔ [۱۴]

اسی دوران میں اقبال کو جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ اُن کے ملک کا دورہ کریں۔ اسی طرح ان کے بعض قدردان انھیں جرمنی میں دیکھنا چاہتے تھے اور ترکی کے بعض حلقے انھیں وہاں بلانے کے آرزومند تھے، لیکن اقبال کو اپنی علالت کے سبب بیرون ملک جانے کے تمام منصوبے ترک کرنے پڑے۔ [۱۵] نذیر نیازی کی وساطت سے جامعۂ ملیہ کے ساتھ اپنے انگریزی خطبات مع اردو ترجمہ از نذیر نیازی اور زیر کتابت شعری تصانیف ''مسافر'' اور ''بالِ جبریل'' کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں بھی بات چیت ہوئی، مگر اس کا

کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آواز کی اچانک خرابی اقبال کے لیے ایک نفسیاتی دھچکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس مصیبت سے جتنی جلد ممکن ہو سکتا ہے، چھٹکارا حاصل ہو اور وہ معمول کے مطابق اپنی مصروفیات کی طرف متوجہ ہوں۔ ڈاکٹروں، حکیموں اور جراحوں کے علاج نے ان پر مایوسی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ غالباً اسی سبب وہ ٹوٹکوں یا چٹکلوں پر اتر آئے تھے یا کسی معجزے کے منتظر تھے۔ بیماری کے باعث ملکی سیاست میں ان کی دلچسپی کچھ محدود سی ہو گئی، لیکن بالکل ختم نہ ہوئی۔ اس زمانے کے اخبارات بالخصوص ''انقلاب'' میں ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہم مسائل پر وہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے تھے مثلاً کشمیر میں ایجی ٹیشن ہنوز جاری تھی اور ریاستی پولیس سیاسی مظاہرین کو وحشیانہ سزائے بید زنی دینے یا ان پر گولی چلانے سے باز نہ آتی تھی۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۲۲ فروری ۱۹۳۴ء کو نہ صرف وائسرائے کو تار بھیجا بلکہ ۳ مارچ ۱۹۳۴ء کو ایسی انسانیت سوز سزاؤں کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے جمعیتِ اقوام کے نام ایک برقی پیغام بھی ''لندن ٹائمز'' میں شائع کرایا۔ ۱۶

۲۴ مئی ۱۹۳۴ء کو کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) کے متعلق انہوں نے نمائندہ ایسوسی ایٹڈ پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ کانگرس کو کمیونل ایوارڈ کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے بجائے ہندو مسلم رہنماؤں کو باہمی سمجھوتے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان ایام میں کانگرس کے اندر سوشلسٹ پارٹی بن چکی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو بھی سوشلزم کے حامی سمجھے جاتے تھے، بہر حال سوشلسٹ پارٹی کو پٹنہ میں شکست ہوئی۔ اس خیال سے کہ شاید سوشلسٹ پارٹی کے لبرل ہندو لیڈر کانگرسی سوراجی یا مہاسبھائی ہندو لیڈروں کے مقابلے میں مسلم رہنماؤں کے ساتھ زیادہ آسانی سے سمجھوتا کر لیں، اقبال نے ان کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

امیروں کے خلاف ملک میں عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے وہ محسوس کر رہے ہیں کہ نازک مرحلوں پر امیر طبقہ ہمیشہ ان سے غداری کرتا ہے۔ جو حکومتیں کبھی سرمایہ پرستی کی پوجا کرتی تھیں آج مزدوروں اور کسانوں کے رحم پر جی رہی ہیں۔ سب طرف بے چینی کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں اور کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیں کہ ایک زبردست آگ بن کر دنیا کے موجودہ نظام کو بھسم کر دیں۔ جب ساری دنیا میں مساوات کی لہر چل رہی ہے تو ہندوستان کب تک اس کے اثر سے خالی رہ سکتا ہے؟ یہاں کے غریبوں میں اب بیداری پیدا ہو رہی ہے...... سوشلسٹ خیالات محض روسی پروپیگنڈا ہی کی وجہ سے نہیں پھیل رہے ہیں، بلکہ اور بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ملک کی اقتصادی حالت میں تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کو اگرچہ پٹنہ میں شکست ہوئی ہے لیکن ان کے سامنے مستقبل ہے۔ گو اس کا انحصار زیادہ تر کانگریس سے علیحدگی پر ہے۔ ۱۷

کانگرس نے اپنے بعد کے ایک اجلاس میں کمیونل ایوارڈ کے متعلق رائے کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اسے نہ تو منظور کرتی ہے اور نہ مسترد۔ اس پر ۱۹ جون ۱۹۳۴ء کو اقبال نے کانگرس کے رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے بیان میں واضح کیا کہ یہ تاثر دیتے ہوئے کہ کمیونل ایوارڈ پر ہندوستان میں اختلاف رائے ہے کانگرس نے اعلان کیا ہے کہ وہ اسے نہ تو قبول کرتی ہے اور نہ مسترد کرتی ہے۔ حالانکہ کمیونل ایوارڈ ایک ایسا فیصلہ ہے جو وزیر اعظم برطانیہ نے انہی لوگوں کے ایماء پر صادر کیا ہے جو اب اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگرچہ کمیونل ایوارڈ ان کے تمام مطالبات پورے نہیں کرتا، وہ اسے قبول کر لیں کیونکہ عملی تقاضوں کے پیش نظر انہیں صرف یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ۱۸

۲۹ جون ۱۹۳۴ء کی شام کو اقبال سرہند تشریف لے گئے اور شیخ احمد (حضرت

مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ۔ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو واپس لاہور آ گئے ۔ چوہدری محمد حسین، حکیم طاہر الدین، علی بخش اور راقم ان کے ہمراہ تھے۔ غلام بھیک نیرنگ، ان کے پرانے دوست، انبالے سے سرہند پہنچے اور انہوں نے اقبال کے ساتھ مزار پر حاضری دی۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ وہ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پروقار ماحول نے اس پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ اقبال تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور راقم کو بھی پاس بٹھا لیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی رندھی ہوئی مدھم آواز گونج رہی تھی ۔ راقم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر حاضری دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راقم کی پیدائش پر اقبال نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر بارگاہ میں حاضر ہوں گے ۔ دوسری وجہ کے متعلق انہوں نے نذیر نیازی کو اپنے ایک خط مورخہ ۲۹ رجون ۱۹۳۴ء میں تحریر کیا:

چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا:

ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان (شام کے معروف دروزی رہنما، اتحاد ممالک اسلامیہ اور احیائے اسلام کے بہت بڑے داعی) کے متعلق دیکھا تھا، وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔ پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کون ہے۔ اس خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ ۱۹

اقبال کو سرزمین سرہند بہت پسند آئی اور اس کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے نذیر نیازی کو بعد کے خطوط میں تحریر کیا:

نہایت عمدہ اور پُر فضا جگہ ہے۔ ان شاء اللہ پھر بھی جاؤں گا...... مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ بڑی پاکیزہ جگہ ہے۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے۔ شہر کے کھنڈرات دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا جس کی بنا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رکھی تھی۔ اگر سرہند کی کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے میں بحال تھا اور موجودہ لاہور سے آبادی وسعت کے لحاظ سے دگنی تھی۔ ۲۰

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بھی ایک نہایت اہم مسئلہ تھا جس پر اُن دنوں اقبال نے اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھا۔ ۱۹۲۵ء میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے مطالبے پر ملازمتوں کی ایک خاص تعداد کو فرقہ وار توازن درست کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، لیکن یہ پالیسی موثر ثابت نہ ہوئی اور عدم توازن بدستور رہا۔ ۱۹۳۴ء کے وسط میں مرکزی حکومت نے قرارداد پاس کی کہ براہ راست پُر ہونے والی اسامیوں میں پچیس فیصد نیابت مسلمانوں کو دی جائے اور اگر مقابلے کے امتحان کے ذریعے پر ہونے والی آسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب کم رہ جائے تو اس کمی کو بذریعہ نامزدگی پُر کیا جائے۔ اقبال نے مسلم کانفرنس کے سیکرٹری حاجی رحیم بخش کے ہمراہ اپنے ایک بیان مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۴ء میں اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ یہ تناسب پچیس فیصد کی بجائے تینتیس فیصد ہونا چاہیے، کیونکہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے تینتیس فیصد نیابت ہی طے ہوئی ہے ، بلکہ ملازمتوں میں پرانی کمی کو دور کرنے کے لیے نئی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے۔ پھر ۹ جولائی ۱۹۳۴ء کو انہوں نے ایک اور بیان دیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ صوبائی حکومتیں بھی مرکزی حکومت کی اس قرارداد کی تائید کریں۔ نیز قرارداد پر صحیح طریقے سے عمل درآمد کروانے کی خاطر ایک موثر مشینری وجود میں لائی جائے۔ ۲۱

۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو اقبال نے بحیثیت صدر، انجمن حمایت اسلام کے دفتر میں اس کی جنرل کونسل کے اجلاس میں شرکت کی اور آنریری سیکرٹری نے ان کی تحریر شدہ تقریر ممبران کے سامنے پڑھی۔ اس تقریر میں اقبال نے انجمن کے ارباب بست و کشاد کی توجہ تین اہم امور کی طرف مبذول کرائی۔ اوّل یہ کہ انجمن کے کالج او راسکولوں میں مسلم نوجوانوں کے لیے دینی اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ دوم یہ کہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انجمن اپنا نصاب تجویز کرے اور اس کے مطابق ایک امتحان لینے والا ادارہ ان کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی اسناد تقسیم کیا کرے۔ رفتہ رفتہ اس امتحان لینے والے ادارے کو مسلم خواتین کی آزاد یونیورسٹی کی صورت میں منتقل کر دیا جائے، بلکہ لڑکیوں کا مجوزہ صنعتی اسکول بھی اسی یونیورسٹی کی ایک شاخ قرار پائے۔ سوم یہ کہ اسلامیہ کالج کے انتظام کے لیے ایک ایسا پرنسپل مقرر کیا جائے جو علم و فضل کے علاوہ صاحب اثر و بارسوخ ہو، مسلمانوں کی آرزوؤں سے ہمدردی رکھتا ہو۔ اور ان کے بچوں کو ان تمام امور میں تربیت دے سکے جو ملک کے آئندہ سیاسی تغیرات کی وجہ سے قومی زندگی کے لیے اب بے انتہا ضروری ہو گئے ہیں [۲۲]۔ انہوں نے ۳۰ اگست ۱۹۳۴ء کو پھر انجمن کی جنرل کونسل کے سالانہ بجٹ سے متعلق اجلاس کی صدارت کی۔

اگست ۱۹۳۴ء میں اقبال کی پریشانیوں میں ایک اور پریشانی کا اضافہ ہو گیا۔ یہ سردار بیگم کی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ سردار بیگم، جن کی عمر تب تقریباً چالیس برس تھی، [۲۳] چند سالوں سے علیل تھیں۔ ان کا جگر اور تلی دونوں بڑھ گئے تھے اور ایک مدت سے ڈاکٹر ان کا علاج کر رہے تھے، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ ان کے خون میں سرخ ذرات نہیں رہے یا ان کی بہت کمی ہو گئی ہے۔ اقبال نے ان کا علاج بھی حکیم نابینا سے کرانا شروع کر دیا۔

اپنی صحت اور سردار بیگم کی علالت کی پریشانیاں تو بدستور رہیں، مگر بعض ایسے

خانگی امور بھی تھے جو مدت سے ٹل رہے تھے اور جوان کی فوری توجہ کے مستحق تھے۔ سواسی ماہ انہوں نے راقم کی بنک میں جمع شدہ رقم میں کچھ رقم اپنی طرف سے ڈال کر ، سردار بیگم کی خواہش کے مطابق ، نیلامی میں ایک قطعہ اراضی میوروڈ (حال علامہ اقبال روڈ) پر خرید کیا تا کہ اس پر کوٹھی تعمیر کی جا سکے ۔کوٹھی کی تعمیر پر سردار بیگم کی روزمرہ خرچ سے بچائی ہوئی رقم ، ان کے زیورات کی فروخت سے حاصل کردہ رقم اور بنک میں ان کے نام جمع شدہ رقم استعمال کی گئی ۔کوٹھی کی تعمیر کے لیے اقبال نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو سیالکوٹ سے بلوایا اور ان کی زیر نگرانی ایک ٹھیکے دار کے ذریعے نومبر ۱۹۳۴ء کے دوسرے یا تیسرے ہفتے میں ''جاوید منزل'' کی تعمیر شروع ہوئی ۔اقبال کو کوٹھی کی تعمیر کے لیے مزید روپوں کی ضرورت تھی اور ان کی خواہش تھی کہ اگر جامعۂ ملیہ ان کے خطبات کی طباعت پر رضا مند ہو جائے تو انہیں اس ایڈیشن کی رقم یکمشت اور فوراً ادا کر دی جائے ۔''بال جبریل'' کی کتابت ہی کے دوران میں اس کے پہلے ایڈیشن کی فروخت کا انتظام ہو گیا تھا،لیکن جامعۂ ملیہ کی اپنی مالی مشکلات کے باعث یہ مسئلہ اقبال کے حسب منشا طے نہ ہوگا۔ ''جاوید منزل'' کی تعمیر پانچ ماہ بعد یعنی اپریل ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی اور اقبال مع اہل و عیال ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو اس میں منتقل ہوئے ۔چونکہ قطعۂ اراضی راقم کی عطا کردہ رقوم سے خریدا گیا تھا اور کوٹھی کی تعمیر پر سردار بیگم کا روپیہ استعمال ہوا تھا، اس لیے ابتدا میں زمین اور کوٹھی اقبال اور سردار بیگم دونوں کی ملکیت تھیں، مگر سردار بیگم کی وفات سے دو روز قبل دونوں نے یہ جائداد راقم کے نام کر دی ۔اب اس مکان میں اقبال اور سردار بیگم کی حیثیت محض کرایہ داروں کی تھی اور اقبال ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ''جاوید منزل'' کے ان کمروں کا جوان کے زیر استعمال تھے، کرایہ راقم کو ادا کرتے تھے ۔ستمبر ۱۹۳۴ء میں مثنوی ''مسافر'' شائع ہوئی اور اس سے ایک ماہ پیشتر اقبال نے اس وقت تک کی شائع شدہ اپنی تمام کتب کا حق تصنیف بھی راقم کے نام کر کے دستاویز رجسٹری کرا دی

۴۴۔اقبال کے گوشوارہ آمدنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلے کی خرابی کے عارضے کے بعد کے سالوں میں ان کی آمدنی بحیثیت مجموعی کم ہوگئی۔وکالت سے آمدنی بہت ہی تھوڑی رہ گئی۔ان کی انکم ٹیکس فائل کے مطابق ۱۹۳۵ء سے وکالت تو بالکل بند ہوچکی تھی اوراس شعبے سے آمدنی صفر تھی۔یہی صورت ان کی وفات تک قائم رہی۔ گزارہ یونیورسٹیوں کے امتحانات کے پرچوں سے آمدنی، رائلٹی یا کتابوں کی فروخت پر تھا، یا اس پانچ صدروپے ماہوار وظیفے پر جو نواب بھوپال نے مقرر کر رکھا تھا۔اس کے علاوہ گوشواروں میں بنک کے منافع سے بھی دو تین صد روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اقبال کی آمدنی کا نقشہ ۲۵-۱۹۲۴ء تک اسی کتاب کے سابقہ صفحات پر میں دیا گیا ہے۔باقی حصہ ان کے سال وفات تک درج ذیل ہے:-

مالی سال	آمدنی	ٹیکس
۱۹۲۵-۲۶	۵۳۳۸ روپے	۱۶۶ روپے
۱۹۲۶-۲۷ء	۱۲۰۶۲ روپے	۵۶۵ روپے
۱۹۲۷-۲۸ء	۹۳۶۲ روپے	۲۹۲ روپے
۱۹۲۸-۲۹ء	۱۵۶۷۹ روپے	۷۳۴ روپے
۱۹۲۹-۳۰ء	۱۳۴۱۰ روپے	۶۲۸ روپے
۱۹۳۰-۳۱ء	۱۶۸۹۴ روپے	۱۴۰۷ روپے
۱۹۳۱-۳۲ء	۳۷۵۶ روپے	۱۴۶ روپے
۱۹۳۲-۳۳ء	۴۶۵۷ روپے	۱۸۱ روپے
۱۹۳۳-۳۴ء	۴۱۰۶ روپے	۱۶۰ روپے
۱۹۳۴-۳۵ء	۴۶۰۹ روپے	۱۶۸ روپے
۱۹۳۵-۳۶ء	۷۸۶۰ روپے	۳۹۹ روپے

۱۹۳۶-۳۷ء	۶۰۶۵ اروپے	۴۵۰ اروپے
۱۹۳۷-۳۸ء	۸۰۶۲ روپے	۴۰۹ روپے

صفدر محمود تحریر کرتے ہیں:

اس سال (حیات اقبال کے آخری سال) کی آمدنی ۸۰۶۲ روپے تشخیص کی گئی۔ بیماری کے باوجود اس سال پرچوں سے ۵۴۹ روپے آمدنی ہوئی تھی۔ ممکن ہے علامہ اقبال کو آخری برسوں میں بیماری کے اخراجات کے سبب کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑا ہو...... فنی نقطۂ نظر سے انکم ٹیکس کے فیصلوں کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہندو انکم ٹیکس افسران اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر علامہ اقبال سے زیادتی بھی کرتے رہے اور ایسے فیصلوں کی قانونی بنیادیں اس قدر کمزور ہیں کہ اگر علامہ اقبال مرحوم نے اپیل کی ہوتی تو یقیناً ان کو فائدہ ہوتا۔ انکم ٹیکس سال ۱۹۳۵-۳۶ء کے فیصلے میں افسر نے خود تسلیم کیا ہے کہ علامہ اقبال صاحب کافی عرصے سے علیل ہیں اس کے باوجود ان کی بیان کردہ آمدنی میں ۱۴۰ روپے کا اضافہ کر کے انہیں وہ تمام اخراجات بھی نہ دیے گئے ہیں جو بہر حال ان کا استحقاق تھا۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں بھی کئی جائز اخراجات تسلیم نہ کیے گئے۔ نتیجے کے طور پر وہ آمدنی میں شامل ہوئے۔ اور ٹیکس بڑھ گیا، لیکن آپ نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ ۲۷

ستمبر ۱۹۳۴ء ہی میں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک خدا دشمن مجلس کے وجود کے متعلق سنا، جس نے وطنیت اور اشتراکیت کے آڑ لے کر اسلامیت کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اقبال کو یہ سن کر اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز میں گریہ وزاری کی کوئی حد نہ رہی۔ ۲۸ نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں کہ یہ مجلس اگرچہ توڑ دی گئی اور اس کے منتظمین کو علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا، مگر یہ امر کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے مدرستہ العلوم میں ہوا، اقبال کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ (جناب مختار مسعود کی رائے میں ایسی کسی خدا

دشمن مجلس کا ذکر علی گڑھ کے حالات سے متعلق کتابوں میں نہیں ملتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے)۲۹

۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو سر تیج بہادر سپرو اقبال کو ملنے آئے۔ سر تیج ہندوؤں کے ایک لبرل لیڈر تھے، اور سپرو ہونے کے ناتے سے اقبال کے ہم ذات، نیز اردو اور فارسی ادب کے اسکالر ہونے کے سبب اقبال کے مداح اور عقیدت مند تھے۔ اقبال بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ ان دنوں وہ حکیم نابینا کے زیر علاج تھے اور انہیں ان کی دوا سے فائدہ پہنچا تھا، اس لیے اقبال سے حکیم نابینا کے کمالات کا ذکر کرتے رہے۔ ۳۰

علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات کے پیش نظر دسمبر ۱۹۳۴ء کے آخری حصے میں اقبال دو ایک روز کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی رکے اور حکیم نابینا سے سردار بیگم کی علالت کے بارے میں مشورہ کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کی صبح لاہور پہنچے۔ ۳۱

سردار بیگم کی طویل علالت کے سبب گھر کے ماحول پر افسردگی سی چھائی رہتی۔ سردار بیگم کا تو بیشتر وقت بسترِ علالت ہی پر پڑے گزرتا۔ اس لیے وہ منیرہ او رراقم کی صحیح دیکھ بھال نہ کر سکتی تھیں۔ منیرہ کی عمر تب تقریباً ساڑھے چار برس تھی اور راقم کی ساڑھے دس برس۔ منیرہ کو محلے کی لڑکیاں سارا دن گود میں اٹھائے لیے پھرتیں، لیکن وہ کسی سے نہ بہلتی تھی اور دن بھر منہ آسمان کی طرف اٹھا کر روتی رہتی، جس سے سردار بیگم بہت کڑھتیں۔ اصل میں منیرہ کو ماں کی توجہ یا محبت کی ضرورت تھی جو بد قسمتی سے اسے میسر نہ آئی۔ سردار بیگم اسے پانچ برس سے کم عمر کی چھوڑ کر فوت ہوئیں۔ لہٰذا بڑی ہونے پر اسے ماں کی صورت بھی یاد نہ تھی۔ اقبال بھی صاحب فراش تھے اور راقم کو یاد پڑتا ہے کہ اس نے انہیں بسا اوقات شدید پریشانی اور بے بسی کے عالم میں دیکھا تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات معلوم ہوتی ہے، جب وہ

گرمیوں کے موسم میں دریائے راوی کنارے میاں نظام الدین کے آموں کے باغات میں راقم کو ساتھ لے کر جاتے۔ ایک بڑے حوض کے قریب محفل جمتی۔ نل کے ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے حوض میں صبح ہی سے ڈھیروں چوسنے والے آم ڈال دیے جاتے۔ اقبال کی پسندیدہ قسم ٹیپو آم تھا جس کا نام انہوں نے خود ہی رکھا تھا۔ راقم کپڑے اتار کر حوض میں اتر جاتا اور ڈبکی لگا کر آم نکالتا۔ خود بھی کھاتا اور انہیں بھی پیش کرتا۔ میاں نظام الدین، میاں امیر الدین، میاں صلاح الدین، ایم اسلم، محمد دین تاثیر، چوہدری محمد حسین اور ماسٹر عبداللہ چغتائی موجود ہوتے۔ سینکڑوں کی تعداد میں آم کھائے جاتے اور ان سب کے قہقہوں کی گونج دریائے راوی کے کنارے دور دور تک سنی جاتی۔

مگر اب اقبال کے ہنستے کھیلتے گھر پر بیماریوں کا سایہ آپڑا تھا۔ گذشتہ چند سالوں میں راقم کی تکلیفوں سے ان کے چہرے پر دو مرتبہ تشویش کے آثار ضرور نظر آئے۔ ایک دفعہ جب راقم کو میعادی بخار چڑھا تھا اور دوسری دفعہ جب راقم کی گردن کی دائیں طرف ایک گلٹی سی نمودار ہوئی تھی، جسے ڈاکٹر یعقوب بیگ نے آپریشن کر کے نکالا تھا۔ اقبال راقم کو خود ریلوے روڈ پر واقع ڈاکٹر یعقوب بیگ کے کلینک میں لے گئے تھے اور آپریشن کے دوران شدید پریشانی کے عالم میں ان کے دفتر میں بیٹھے رہے۔

ماں اور باپ دونوں کو بستر علالت پر پڑے دیکھ کر بعض اوقات راقم اور منیرہ ایک دوسرے کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ دونوں کی عمر میں چھ برس کا فرق تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، کیونکہ آپس میں کھیل بھی نہ سکتے تھے۔ منیرہ تو ایک نہایت ہی تنہا بچی تھی، کیونکہ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہ تھا۔

سردار بیگم کا علاج صرف ایلو پیتھک یا یونانی طریق ہی سے نہ ہوتا تھا۔ جس طرح اقبال اپنے عارضے کے لیے ٹوٹکے یا چٹکلے استعمال میں لانے سے گریز نہ

کرتے، اسی طرح سردار بیگم کی جاننے والی بیوی صاحبہ اور ان کی خادمہ رحمت بی ان کی بیماری کو رفع کرنے کی خاطر کوئی نہ کوئی جادو ٹونا کرتی رہتی تھیں۔ یہ شاید اس نسل کی مسلمان عورتوں پر ہندو تہذیب کا اثر تھا۔ راقم کے میعادی بخار کے ایام میں بھی ایک مرتبہ رحمت بی نے اپنی چادر میں سے کالے بکرے کی سری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی اور راقم کو اسے چھونے کے لیے کہا تھا۔ راقم نے حکم کی تعمیل کر دی۔ پھر رحمت بی نے سری کا منہ کھول کر اس کی زبان پر ایک پیسہ رکھا اور راقم کی قمیض اتروا کر اس میں سری کو لپیٹا۔ بعد میں غالباً کسی عامل سے اس پر کچھ پڑھوایا گیا اور بالآخر وہ اسے صبح سویرے بازار میں کسی اندھے فقیر کی جھولی میں ڈال آئی تھیں۔

نو سال کی عمر میں راقم کو سیکرڈ ہارٹ اسکول سے اٹھوا کر ایک سال کے لیے انارکلی بازار کے قریب سینٹ فرانسس اسکول میں ڈالا گیا۔ جہاں ماسٹر تاراچند اسے پڑھاتے تھے۔ اس اسکول سے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۴ء میں سنٹرل ماڈل اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں اقبال کا معروف اردو مجموعۂ کلام ''بال جبریل'' لاہور سے شائع ہوا۔ پہلے انہوں نے اس تصنیف کا نام ''نشان منزل'' تجویز کیا تھا، بعد میں اس کی جگہ ''بال جبریل'' رکھا۔۳۲

نومبر ۱۹۳۴ء سے سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم وصحت و امور عامہ کے فرائض انجام دے رہے تھے، انہوں نے گلے کی تکلیف کے بارے میں اقبال کو بھوپال آ کر بجلی کا علاج کرانے کی دعوت دی۔ اقبال کے بعض دیگر احباب نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔ بھوپال کے حمیدیہ ہسپتال میں اس وقت بجلی کے علاج سے متعلق جدید ترین مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ بالآخر سر راس مسعود کے اصرار پر اقبال نے بھوپال جا کر بجلی کا علاج کرانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

ان ہی ایام میں ترکی کی مشہور صحافیہ خالدہ ادیب خانم جو ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی رکن اور مصطفےٰ کمال پاشا کی شریک کار رہ چکی تھیں، لیکن اس وقت پیرس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملّیہ میں توسیعی خطبات دینے کی غرض سے دہلی آئی ہوئی تھیں۔ جامعہ ملّیہ کی فرمائش تھی کہ اقبال دہلی آ کر ان کے کسی خطبے کی صدارت کریں۔ اقبال نے بوجہ علالت معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس دوران میں خالدہ ادیب خانم کے چند لکچر جامعہ ملّیہ میں ہوئے جن کا ہندوستان کے اخبارات میں خوب چرچا بھی ہوا، کیونکہ ان کا زاویہ نگاہ خالصتاً سیکولر تھا۔ اقبال کی رائے ان کے متعلق یہ تھی کہ مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادّیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار خالدہ ادیب خانم نے اپنے لکچروں میں کیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ بہت محدود ہے۔[۴۳]

بہر حال بھوپال جانے کی غرض سے اقبال، علی بخش کے ساتھ ۲۹ رجنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچے۔ دن بھر قیام سردار صلاح الدین سلجوقی کے ہاں افغان قونصل خانے میں رہا۔ شام کو جامعہ ملّیہ میں خالدہ ادیب خانم سے بات چیت ضرور ہوئی، مگر ان کے خیالات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بعد میں رات کی گاڑی سے بھوپال روانہ ہو گئے اور ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کی صبح وہاں پہنچے۔

اسٹیشن پر سر راس مسعود، ان کے پرسنل سیکرٹری ممنون حسن خان اور نواب بھوپال کے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد خان استقبال کے لیے موجود تھے۔ ممنون حسن خان فرماتے ہیں:

جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اترے۔ سر راس مسعود کی نظر ان پر پڑی تو اس تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے منہ کے اس قدر بوسے لیے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔[۴۴]

اقبال کا قیام سر راس مسعود کی رہائش گاہ ''ریاض منزل'' میں تھا۔ جب وہاں پہنچے تو بیگم امت المسعود نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ممنون حسن خان کو اقبال کی پیشی میں مقرر کیا گیا تھا تا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اقبال انہیں اطلاع دیں۔ ممنون حسن خان کہتے ہیں:

کھانے کے بعد علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لیے بچھوایا تھا، اسے ان کے ملازم (علی بخش) نے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر پر ہی سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے قریب ہی ایک پنجابی حقہ رکھا ہوا تھا۔ ۳۵

دوسرے دن اقبال، سر راس مسعود کے ساتھ نواب بھوپال کو ملنے گئے اور قصر سلطانی میں ان کی معیت میں کچھ وقت گزارا۔ گفتگو اقبال کی بیماری اور علاج کے بارے میں ہوتی رہی یا قرآن مجید سے متعلق ان کی مجوزہ تصنیف پر۔ فارغ ہو کر وہ حمیدیہ ہسپتال پہنچے جہاں خصوصی طبی معائنوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالباسط ان کے معالج تھے۔ ۵ر فروری ۱۹۳۵ء سے بنفشی شعاعوں کے غسل سے ان کے علاج کا پہلا کورس شروع ہوا، جو ۶ مارچ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔

''ریاض منزل'' میں اقبال کا بیشتر وقت مطالعہ یا اشعار لکھنے میں صرف ہوتا۔ ''ضرب کلیم'' میں شامل سات نظمیں یہیں تحریر کی گئی تھیں۔ روز صبح بجلی کے علاج کے لیے حمیدیہ ہسپتال جاتے۔ واپس آ کر دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لکھتے پڑھتے رہتے یا آرام کرتے اور ہر شام سر راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ موٹر کار میں سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے۔

بیگم امت المسعود جو اپنے عظیم شوہر کی طرح اقبال کی قدر شناس اور ان کی ذات سے عقیدت اور محبت رکھتی تھیں، ''ریاض منزل'' کے شب و روز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ اقبال، سر راس مسعود کو اکثر کہا کرتے کہ تمہارا دماغ انگریز کا اور دل سچے مسلمان کا ہے۔ سر راس مسعود نے جن کی رگ رگ میں ظرافت بھری ہوئی تھی، ایک بار جواب دیا: اقبال غنیمت ہے کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں ایک دن بیگم امت المسعود اور اقبال کے درمیان بحث چھڑ گئی کہ لڑکے لڑکیوں کی شادی سے قبل فریقین میں محبت اور پیار کی کسی نہ کسی حد تک آمیزش ہونی چاہیے یا نہیں۔ اقبال نے کہا: شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ بیگم امت المسعود بولیں: آج کل والدین لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اپنی پسند اور مرضی کے رشتوں کا جس طرح انتخاب کرتے ہیں، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اقبال نے جواب دیا: عموماً ان تمام ضروری باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی رشتے طے کرتے ہیں۔۳۶

اقبال ۷ر مارچ ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۸ر مارچ ۱۹۳۵ء کو دہلی پہنچے۔ حسب معمول افغان قونصل خانے میں قیام فرمایا۔ اگلے روز صبح حکیم نابینا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبض دکھائی۔ نیز سردار بیگم کی علالت کے متعلق مشورہ کیا۔ رات کو واپس لاہور روانہ ہوئے اور ۱۰ر مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح لاہور پہنچے۔

لاہور پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ سردار بیگم کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ ان کا جگر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس پہلو پر جس طرف جگر ہے، لیٹنا یا سونا ناممکن ہو گیا تھا۔ شدید کھانسی کے دورے پڑتے تھے۔ پاؤں پر ورم تھا اور نہایت کمزور اور لاغر ہو گئی تھیں۔ اپنی بیماری سے بے پروا وہ اقبال کی علالت کے بارے میں فکرمند رہتی تھیں۔ مئی ۱۹۳۵ء کے ابتدائی دنوں میں ان کی حالت مزید تشویش ناک ہو گئی۔ معدے میں پانی بھر گیا، ران پر ایک خوفناک پھوڑا نکلا جس کا

آپریشن کیا گیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو جب وہ نئے گھر ''جاوید منزل'' میں منتقل ہوئیں تو بیماری کی حالت میں گاڑی میں وہاں لائی گئیں۔ انہیں چارپائی پر اندر لایا گیا۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اراضی اور مکان دونوں سردار بیگم اور اقبال کی ملکیت تھے، لیکن شاید اقبال کو احساس ہو گیا تھا کہ سردار بیگم کا آخری وقت آن پہنچا ہے اس لیے ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء کو وہ کچھ کاغذات ہاتھ میں اٹھائے اندر تشریف لائے اور سردار بیگم سے کہا کہ ''جاوید منزل'' راقم کے نام ہبہ کر دو۔ مگر سردار بیگم نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گی، آپ فکر نہ کریں۔ اقبال نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر انہوں نے خاموشی سے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں اس تاریخ سے ''جاوید نامہ'' راقم کے نام منتقل ہوئی۔ اور اقبال نے ایک کرایہ نامہ بھی تیار کرایا جس کی رو سے وہ راقم کے کرایہ دار کی حیثیت سے اس مکان میں رہنے لگے۔

۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو سردار بیگم پر صبح ہی سے غشی کا عالم طاری تھا، کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب راقم ان کے پاس گیا تو وہ بستر پر بیہوش پڑی تھیں۔ راقم نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا اماں جان، میری طرف دیکھو۔ انہوں نے لحظہ بھر کے لیے آنکھیں کھولیں، راقم کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں ۔ چند لمحوں بعد اسی حالت میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جب ان کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگی ۔ تو راقم ننھی منیرہ کا ہاتھ پکڑے روتے ہوئے اقبال کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ راقم اور منیرہ ان کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے دونوں کو قریب آنے کے لیے کہا اور جب ہم قریب پہنچے تو ایک پہلو میں راقم کو اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے ہاتھ پیار سے دونوں کے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے راقم سے گویا ہوئے: تمہیں یوں نہ رونا چاہیے،

تم تو مرد ہو اور مرد رویا نہیں کرتے۔ اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار انہوں نے راقم اور منیرہ کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

سردار بیگم کو "جاوید منزل" کے نزدیک بیبیاں پاک دامن کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اقبال، راقم اور اقبال کے چند احباب جنازے میں شریک تھے۔ انہیں دفناتے وقت اقبال انتہائی پریشانی کے عالم میں قریب کی ایک پختہ قبر کے تھڑے پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھے رہے۔ ان کے سنگ مزار پر حاجی دین محمد کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اقبال کا درج ذیل قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید

لالے کا خیاباں ہے مرا سینہ پر داغ

ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار

اقبال نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"[۴۷]

۱۳۵۴ھ

سردار بیگم کی بے وقت موت نے اقبال کو پژمردہ سا کر دیا۔ وہ انہیں وصیت کر گئی تھیں کہ بچوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرنا[۴۸]۔ اس لیے وہ دونوں کا بے حد خیال رکھنے لگے تھے۔ اس سے پیشتر، جہاں تک راقم کی ذات کا تعلق ہے، انہوں نے اسے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا ہوگا، جس سے وہ ان کی محبت یا الفت کا اندازہ کر سکتا۔ والدین بچوں کو پیار سے بھینچتے ہیں، گلے لگاتے ہیں یا چومتے ہیں، مگر اقبال کے خدوخال سے راقم کو کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ اگر راقم کو گھر میں منہ اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے، لیکن اکثر اوقات تو راقم انہیں اپنی آرام کرسی پر بیٹھے یا چارپائی پر دراز آنکھیں بند کیے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اب تو منیرہ نے بھی لڑکیوں کے اسلامیہ اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ خیر نیا حکم جاری

ہوا کہ بچے ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا کرتے، مگر رفتہ رفتہ اس بوسے میں معمول کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ گویا وہ بچوں کو محض اس لیے چومتے ہیں کہ کہیں وہ یہ تصور نہ کرنے لگیں کہ ماں کی عدم موجودگی میں انہیں باپ کی محبت میسر نہیں ہے۔

بچوں بالخصوص منیرہ کی نگہداشت کے لیے کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ سردار بیگم کے رشتے داروں میں سے تو صرف ان کے بھائی خواجہ عبدالغنی تھے جو راقم اور منیرہ سے بہت محبت رکھتے تھے، لیکن وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر لاہور سے باہر رہتے اور تھوڑے عرصے کے لیے لاہور آتے تھے۔ اقبال کی رشتہ دار خواتین کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر لاہور آ کے منیرہ کے پاس رہنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی ان میں سے مخصوص مدت کے لیے آ کر ٹھہرتی۔ شیخ عطا محمد اور ان کی اہلیہ آ جاتیں۔ نیز اقبال کی چھوٹی بہنوں کریم بی یا زینب بی میں سے کوئی ایک آ کر رہتیں۔ کچھ عرصہ کے لیے شیخ عطا محمد کے بیٹے امتیاز احمد اور ان کی اہلیہ یہاں مقیم رہے، مگر یہ بندوبست چونکہ عارضی ہوتا اور مستقل نہ تھا، اس لیے منیرہ کسی سے صحیح طور پر مانوس نہ ہوتی تھی۔

البتہ منیرہ کو اقبال کا قرب حاصل تھا اور وہ رات کو عموماً انہی کے بستر میں سو جایا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل و حجت کے پوری کر دی جاتی اور اگر راقم کبھی اسے جھڑکتا یا اس پر ہاتھ اٹھاتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ انہیں بہن بھائی کے جھگڑے سے بہت رنج ہوتا تھا۔ وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا او راحباب کے کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں، وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ راقم سے بارہا جل کر کہا کرتے: تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

سر راس مسعود کو اقبال کی ذہنی اور مالی پریشانیوں کا بخوبی علم تھا اور وہ خاموشی سے ان کی امداد کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اقبال کی خاطر کسی ایسے مستقل وظیفے کی فراہمی کے لیے تگ و دو میں مصروف تھے جس سے انہیں اپنی مالی پریشانیوں سے نجات مل جائے اور وہ یکسوئی کے ساتھ اپنا تخلیقی کام جاری رکھ سکیں۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۵ء میں تحریر کیا:

میری خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں تاکہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہو گی اور ان کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہو گی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں جب یہ کہتا ہوں کہ میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں۔ ۳۹

سر راس مسعود کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور انہوں نے اسی ماہ کے آخر میں اقبال کو اطلاع دی کہ نواب بھوپال نے ان کے لیے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا ہے اقبال نے انہیں اپنے ایک دوسرے خط مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء میں جواب دیا:

میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں۔ انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ چاروں طرف سے میں آلام و مصائب میں محصور تھا...... باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے۔ بالخصوص آپ کے خاندان کی۔ ۴۰

لیکن سر راس مسعود ابھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ وہ کوشاں تھے کہ بھوپال کے علاوہ حیدر آباد، بہاولپور اور آغا خان بھی اقبال کے لیے وظیفے مقرر کریں، تاکہ وہ قرآن مجید پر عہد حاضر کی روشنی میں اپنے خیالات آسودگی سے قلم بند کر سکیں۔ اس

سلسلے میں اقبال نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء میں تحریر کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے، ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔[41]

مصائب و آلام اور طرح طرح کی الجھنوں کے باوجود اقبال ان مہینوں میں بھی اپنی علمی و شعری کاوشوں، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے وقت نکالتے رہے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی خاطر انہوں نے نواب بھوپال کو صدارت کے لیے لاہور بلوانے کی کوشش کی[42]۔ ''زبور عجم'' مع اردو ترجمہ (جو حواشی کی شکل میں تھا) کی اشاعت کا ارادہ کیا۔[43] ''صور اسرافیل'' (جو ۱۹۳۶ء میں ''ضرب کلیم'' کے نام سے شائع ہوئی) کے لیے اشعار کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی طرح انہی ایام میں احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا انگریزی بیان بعنوان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' تحریر کیا۔ یہ بیان برصغیر کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً ''ایسٹرن ٹائمز''، ''ٹریبیون''، ''سٹار آف انڈیا'' کلکتہ، دکن ٹائمز'' وغیرہ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی چھپا۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو ''سٹیٹسمین'' نے اسے شائع کیا اور ساتھ اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا۔

قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان میں مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ

مسلمانوں کی ملّی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر استوار ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا موقف قبول نہیں کرتے وہ کافر ہیں، تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملت اسلامیہ کے استحکام کے لیے ایک خطرہ قرار دے گا اور یہ بات اس لیے بھی جائز ہوگی کہ مسلم معاشرے کو ختم نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیاء نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا، ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے، لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق بروز ''حلول'' اور ''ظل'' کی اصلاحات مسلم ایران میں اسلام سے منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں۔[۴۴]

اس بیان پر احمدی اخباروں نے کئی اعتراض کیے اور اقبال پر مختلف قسم کے الزام لگائے۔ ہفتہ وار ''لائیٹ'' کے نمائندے نے ان کی توجہ ایک اور احمدی ہفتہ وار ''سن رائز'' کی طرف مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اس اخبار کے مطابق انہوں نے اپنے کسی گذشتہ خطبے میں احمدیت کے متعلق مختلف رائے کا اظہار کیا تھا۔ سوال کے اب کے بیان اور اس خطبے میں تناقص کیوں ہے؟ اقبال کا جواب تھا کہ وہ یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ اب سے ربع صدی پیشتر انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی، لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی، بلکہ اپنے مکمل اظہار کے لیے کئی عشرے لیتی ہے، اس تحریک کے

دوگرہوں کے درمیان اندرونی اختلافات بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جو لوگ بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر تحریک نے کیا صورت اختیار کرنا ہے۔ درخت کو جڑ سے نہیں، اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس اگر ان کے رویے میں کوئی تناقص ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے۔[۴۵]

اقبال نے ''سٹیٹسمین'' کے لیڈنگ آرٹیکل میں اپنے بیان پر تبصرے کا جواب ایک خط کے ذریعے دیا جو ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو ''سٹیٹسمین'' میں شائع ہوا جواب کے اہم نکات یہ تھے۔ اوّل یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انگریزی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے، جیسے کہ سکھوں کو ۱۹۱۹ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا، مگر بعد میں بغیر ان کی طرف سے کسی عرض داشت کی وصولی کے انہیں ایسا تصور کیا گیا، باوجود اس کے کہ ہائی کورٹ لاہور کے فیصلے کی رو سے سکھ کوئی علیحدہ مذہبی فرقہ نہیں بلکہ ہندو تھے۔ دوم یہ کہ احمدیوں کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو بہائیوں کی طرح مسلمانوں سے اپنے آپ کو خود مذہباً الگ کر لیں یا مسئلہ ختم نبوت کے متعلق اپنی تمام تاویلات مسترد کر کے اسلامی موقف قبول کریں۔ آخر دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے ان کا اسلام کے منافی تاویلات اپنانے میں اور کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔ سوم یہ کہ (اور یہ نکتہ خصوصی اہمیت رکھتا تھا) احمدیوں کو علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے میں اگر انگریزی حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانان برصغیر یہ شک کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انگریزی حکومت جان بوجھ کر اس مذہبی فرقے کو اس وقت تک مسلمانوں سے الگ

نہ کرے گی جب تک کہ احمدیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو جاتا، کیونکہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بننے کے قابل نہ تھے، لیکن اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو وہ پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔ پس اگر انگریزی حکومت ۱۹۱۹ء میں سکھوں سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انہیں ہندوؤں سے الگ مذہبی فرقہ تسلیم کر سکتی ہے تو اس ضمن میں اسے احمدیوں کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیوں ہے۔[۴۶]

پندرہ روزہ اخبار ''اسلام'' کے نمائندے نے اقبال کی توجہ مرزا بشیر الدین محمود کے ایک خطبہ جمعہ کی طرف دلائی جس میں ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے احمدیوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جیسے رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے حوالے کر دیا اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ اقبال نے اپنے جواب مورخہ ۲۲ جون ۱۹۳۵ء میں جو اس اخبار میں شائع ہوا، واضح کیا کہ ان کے گذشتہ بیان میں ایسا کوئی فقرہ موجود نہ تھا، البتہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں جتنی یہود کو رومی سلطنت میں حاصل تھی، کیونکہ رومی اس بات کے پابند تھے کہ یہود کی مجلس امور مذہبی میں جو فیصلہ ہو گا وہ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیل قطعی طور پر ہو جاتی ہے۔[۴۷]

''طلوع اسلام'' بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں نذیر نیازی نے بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جن میں انہوں نے نبوت کے دو اجزا پر بحث کی تھی۔ یعنی نبوت روحانیت کے ایک خاص مقام کی حیثیت سے اور نبوت ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے جو نئی اخلاقی فضا تخلیق

کر کے انسانوں میں سیاسی اور معاشرتی تغیر کا سبب بنے۔ بقول اقبال اگر دونوں اجزا موجود ہوں تو وہ نبوت ہوگی اور اگر صرف پہلا جزو موجود ہو، تو تصوف یا ولایت۔ اقبال نے تحریر کیا:

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔[۴۸]

بالآخر احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس بحث میں کود پڑے اور انہوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بعنوان ''اتحاد اسلام'' اقبال کے مضمون پر تبصرہ میں جو کلکتے کے رسالے ''ماڈرن ریویو'' میں نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے، اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے ان کے مضامین کا ایک نہایت جامع جواب بعنوان ''اسلام اور احمدیت'' تحریر کیا جو ''اسلام'' مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس طویل جوابی مضمون میں بھی، جو کئی بار چھپ چکا ہے، انہوں نے مسئلہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی۔ نیز ثابت کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب ملائیت، تصوف اور مطلق العنان سلطنت ایسی منفی قوتیں تھیں۔ پھر جدید ترکی میں سیکولر قسم کی اصلاحات کی مدافعت میں تحریر کیا کہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہیں۔ آخر میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس ریمارک کے جواب میں کہ ان کے خیال میں سر آغا خان بھی صحیح العقیدہ مسلمان نہیں سمجھے جاتے، اقبال نے آغا خان ہی کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ تم سب مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ لہٰذا اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کو مساجد میں نماز ادا کرو، روزے باقاعدہ رکھو، اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق شادیاں کرو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اس مضمون کا پورا احاطہ

کرنا تو یہاں ممکن نہیں لیکن اقبال کا درج ذیل نکتہ یقیناً خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

ظاہر ہے کہ ایک ہندوستانی قوم پرست (یعنی پنڈت نہرو) جس کے سیاسی آئیڈیلزم نے اس کی حقیقت کو پرکھنے کی حس کا خاتمہ کر رکھا ہے، یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حق خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کے فروغ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتی وحدتوں کو مکمل طور پر کچل دیا جائے۔[۴۹]

بالآخر اپنے خط بنام پنڈت جواہر لعل نہرو مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء میں اقبال نے احمدیوں کے سیاسی رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا۔ میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔[۵۰]

گذشتہ سالوں میں احمدی تحریک کے بارے میں اقبال کا نظریہ کیا تھا؟ احمدیت کی تردید کی ضرورت انہیں کیوں پڑی یا اس تحریک کے خلاف ان کے بیانات کس پس منظر میں دیے گئے؟ احمدیوں نے ان پر کیا کیا اعتراض کیے یا کیا کیا الزام لگائے؟ ان تمام سوالات پر علیحدہ بحث آگے چل کی جائے گی۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بل جب برطانوی پارلیمنٹ میں زیر بحث آیا تو اس میں کمیونل ایوارڈ کی وہ دفعہ شامل نہ کی گئی تھی جس میں درج تھا کہ مجالس قانون ساز متعلقہ اقوام (ہندو اور مسلمان) کی منشا کے بغیر کوئی ترمیم نہ کریں گی۔ اس پر اقبال نے سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا شفیع داؤدی اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر یکے بعد دیگرے دو بیان ۳ جولائی ۱۹۳۵ء اور ۱۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو جاری کیے اور مطالبہ کیا کہ کمیونل ایوارڈ کو عہد کے مطابق، دس برس کی مدت کے لیے بعینہٖ برقرار رکھا جائے اور اس کے بعد جو بھی تبدیلی عمل میں لائی جائے، اس میں مسلم قوم کی منشا دریافت کی جائے اور بین الاقوامی رضامندی معلوم کرنے کے لیے طریق کار وضع کیا جائے۔ مثلاً دس سال بعد جو صوبہ کمیونل ایوارڈ کی ترمیم کا طالب ہو، وہ

جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے سوال پر ایک ایک انتخاب عام (ریفرینڈم) کرائے اور بعد میں جو نئی مجلس آئین ساز مرتب ہو، اس کے اندر اسی سال کا دوبارہ فیصلہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے اور مسلم قوم کی تین چوتھائی اکثریت کی حمایت ترمیم کے حق میں حاصل کرنا ضروری اور لازمی تصور کیا جائے۔ ان بیانات کا مدعا یہ تھا کہ دس برس کی مدت گزر جانے کے بعد کمیونل ایوارڈ کا اگر کوئی نعم البدل ہو گا تو وہ ہندو اور مسلم اقوام کے درمیان، ایک مستند بین الاقوامی راضی نامہ ہو گا۔ ۵۱

جولائی ۱۹۳۵ء میں لاہور کے حالات خاصے تشویشناک ہو گئے کیونکہ مسجد شہید گنج کے قضیئے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ گذشتہ دو ایک ماہ میں پنجاب کے مختلف حصوں سے سکھوں کے جتھے لاہور پہنچ رہے تھے۔ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۳۵ء کی ایک رات کو سکھوں نے مسجد کا انہدام شروع کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مسلمان، نظم و ضبط برقرار نہ رکھ سکے اور مسجد تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ لاہور میں مارشل نافذ کر دیا گیا اور فوج کے بار بار گولی چلانے سے متعدد مسلمان شہید یا زخمی ہوئے۔ مسجد شہید گنج کا مسئلہ آخری دم تک اقبال کی توجہ کا مرکز بنا رہا، لیکن مسجد پر سکھوں کا قبضہ بدستور رہا اور وہ واگزار نہ ہو سکی۔

برقی علاج کا دوسرا کورس پورا کرنے کی خاطر اقبال کو پھر بھوپال جانا تھا۔ سو وہ ۱۵ جولائی ۱۹۳۵ء کو مع علی بخش اور راقم لاہور سے روانہ ہوئے۔ راقم کو اس لیے ہمراہ لے گئے کہ کہیں ان کی عدم موجودگی میں وہ منیرہ سے لڑتا نہ رہے۔ ۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچے اور اقبال راقم کو ساتھ لیے تمام دن تاریخی مقامات کی سیر کرتے رہے۔ پہلے لال قلعہ لے گئے۔ پھر نظام الدین اولیاء گئے۔ ہمایوں کا مقبرہ دیکھا اور بالآخر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب مینار پہنچے۔ راقم کا دل قطب مینار کے اوپر چڑھنے کو چاہا اور انہیں بھی ساتھ آنے کو کہا، لیکن وہ بولے کہ تم جاؤ۔ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا، کہیں دہشت

سے گر نہ پڑو۔

اسی رات گاڑی پر سوار ہو کر بھوپال روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا، بڑا لمبا سفر ہے۔ رات کو علی بخش راقم کو اوپر کی برتھ پر سلا دیتا اور اقبال نیچے کی برتھ پر سوتے۔ ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا وہیں منگوا کر کھایا گیا۔ ۷ جولائی ۱۹۳۵ء کو جب بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر شعیب قریشی اور چند دیگر اصحاب استقبال کے لیے موجود تھے۔ موٹر کار پر سب لوگ شیش محل لے جائے گئے، جہاں اقبال کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع وعریض عمارت تھی۔ شمعدانوں، جھاڑوں، غالیچوں اور دیگر ساز و سامان سے لدے ہوئے اتنے بڑے بڑے کمرے اور برآمدے تھے کہ راقم کو رات کے وقت ان میں سے گزرتے ہوئے خوف آیا کرتا۔

بھوپال پہنچنے کے بعد اگلے روز حمیدیہ ہسپتال میں ڈاکٹر عبدالباسط کی نگرانی میں اقبال کا معائنہ ہوا اور برقی علاج کا کورس شروع ہو گیا۔ وہ روز صبح حمیدیہ ہسپتال جاتے اور دوپہر کو واپس آتے۔ راقم کو ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا اور اسے پڑھانے کے لیے ایک استاد علی حسین بھی شیش محل آیا کرتے۔ شیش محل میں اقبال عموماً راقم کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے، اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں لکھ پڑھ کر وقت گزارتے یا آرام کرتے۔ شیش محل میں انہوں نے پانچ نظمیں تخلیق کیں جو ''ضربِ کلیم'' میں شامل ہیں۔ شام کو انہیں ملنے کے لیے بہت سے لوگ آ جاتے۔ رات کا کھانا عموماً باہر ہوتا، لیکن اگر شیش محل میں کھانا کھاتے تو راقم کو بھی ساتھ میز پر بٹھا لیتے اور سکھایا کرتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا چاہیے اور کانٹا یوں۔ راقم فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا، اس لیے جب کبھی انہیں وہاں لوگ ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو اسے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنا چاہیے۔ بہر حال راقم کا وقت زیادہ تر ان کی نگاہوں

کے سامنے گزرتا تھا یا ڈاکٹر عبدالباسط کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالباسط شیش محل کے تقریباً سامنے قدسیہ محل میں رہتے تھے۔ ان کے گھر کے قریب بھوپال کا مشہور جھیل نما تالاب تھا اور ساتھ ایک وسیع میدان بھی تھا۔ جسے کھرنی والا میدان کہتے تھے۔ راقم ان کے بچوں کے ساتھ اسی تالاب کے کنارے کھیلا کرتا۔

اسی طرح ہر دوسرے تیسرے روز راقم، اقبال کے ساتھ سر راس مسعود کے ہاں ''ریاض منزل'' بھی جاتا تھا۔ وہ راقم کی زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے، جو انہیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے۔ سر راس مسعود قد میں علامہ اقبال سے بہت اونچے، قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ راقم سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ اقبال اور راقم ہفتہ میں دو تین بار رات کو کھانا سر راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ ''ریاض منزل'' میں کھاتے۔ اکثر اوقات اور جگہوں پر بھی کھانے پر بلائے جاتے۔ ایک مرتبہ کسی کھانے سے واپسی پر موٹر کار میں اقبال کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ راقم کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آئیں۔ بعد میں اقبال نے اسے بتایا کہ وہ ہندوستان کی معروف شاعرہ سروجنی نائیڈو تھیں۔ اسی طرح ایک شام بیگم بھوپال کے ہاں چائے پر راقم کو اپنے ساتھ لے گئے، کیونکہ بیگم بھوپال نے کہہ رکھا تھا کہ اسے بھی ساتھ لائیں۔ سر راس مسعود بھی ان کے ہمراہ گئے۔ جب دونوں بزرگوں نے بیگم بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کیا تو راقم اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ انہی ایام میں محمد دین تاثیر نے راقم کے پڑھنے کے لیے ''الف لیلہ'' کا ایک اردو نسخہ بھیجا تھا جسے راقم بڑے شوق سے ہر رات سونے سے پہلے پڑھا کرتا۔

۲۸ اگست ۱۹۳۵ء کو برقی علاج کا کورس ختم ہونے پر اقبال بھوپال سے روانہ ہوئے اور اگلے روز دہلی پہنچے۔ حکیم نابینا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبض

دکھائی۔ باقی وقت ریلوے اسٹیشن پر قیام کیا۔ رات کو گاڑی پکڑی اور ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء کی صبح واپس لاہور پہنچ گئے۔

برقی علاج سے بھی اقبال کی تکلیف میں کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تھا۔ اسی دوران میں ان کے ایک دوست وی آنا سے ذیابیطس کا علاج کرا کے واپس آئے۔ انہوں نے وی آنا میں اپنے معالج سے اقبال کے عارضے کا ذکر کیا اور انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ مریض وی آنا آ جائے تو بالکل تندرست ہو سکتا ہے۔ اس پر اقبال نے بھوپال کے ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر عبدالباسط کی وساطت سے اپنے سینے کے ایکس ریز اور دیگر رپورٹیں وی آنا بھجوائیں، مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اقبال نے وی آنا جانے کا ارادہ اس لیے ترک کر دیا کہ ان کے نزدیک اس عمر میں اپنے علاج پر کثیر رقم صرف کرنا بچوں کا حق مارنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اپنی صحت کی مکمل طور پر بحالی کے سلسلے میں مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وصیت نامے کے ذریعے بچوں کے لیے گارڈین مقرر کر دیے جائیں جو ان کی وفات کے بعد نابالغان کی ذات اور جائداد کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ وصیت نامہ جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا گیا جو حسب ذیل ہے:

منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاٗ لاہور کا ہوں۔ اس وقت بہ قائمی ہوش و حواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چونکہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائداد اور ذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ خواجہ عبدالغنی، ماموں حقیقی نابالغان

۲۔ شیخ اعجاز احمد، سب جج برادرزادہ من مقر

۳۔ چوہدری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور

۴۔منشی طاہرالدین، جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور ان کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔

اس وصیت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات و جائداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔تمام امور متعلقہ ذات و جائداد نابالغان کا انتظام اولیاء مذکورہ کثرت رائے سے کیا کریں گے، لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائداد و ذات کے متعلقہ انتظامات خود بطور ولی کرے گا۔اگر ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے، یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے۔تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کرلیں۔اگر کسی معاملہ میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو، اسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

کتب فلسفہ ولٹریچر وغیرہ۔ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ مسودات، مثنوی مولانا روم، فارسی و انگریزی، مرتبہ ڈاکٹر نکلسن، دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی، مراۃ المثنوی (مولانا روم، مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف باقی اور مسودات وکاغذات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔باقی میرا اسباب مثلاً دو قالین بر رنگ سرخ و دری وصوفہ وکرسیاں وبکس اور پہننے کے کپڑے ہیں، ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا، لاہور۔بقلم خود ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مکرر آنکہ:

اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائداد کے انتظام یا کسی اور جائداد کی خرید وغیرہ کے لیے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔

دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیاء مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں

محمد اقبال بیرسٹر

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء ۵۲

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال مع چوہدری محمد حسین، راجہ حسن اختر، نذیر نیازی، علی بخش اور راقم مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات میں شرکت کے لیے پانی پت پہنچے اور دو دن وہیں قیام کیا۔ سر راس مسعود بھی بھوپال سے تشریف لائے۔ نیز ہندوستان کے مختلف حصوں سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائی پانی پت پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال نے پانی پت پہنچتے ہی حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کے مزار پر حاضری دی۔ اگلے روز یعنی ۲۶/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو نواب بھوپال کی زیر صدارت حالی مسلم اسکول میں تلاوت قرآن مجید سے جلسے کا آغاز ہوا۔ مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین نے سپاس نامہ پڑھا۔ حفیظ جالندھری نے اپنی نظم سنائی۔ اس کے بعد خواجہ غلام السیدین نے اعلان کیا کہ گلے کی خرابی کے سبب اقبال اپنے اشعار خود نہ سنائیں گے۔ بلکہ کوئی اور صاحب ان کے اشعار سنائیں گے۔ اقبال سے درخواست کی گئی کہ شعر خوانی کے دوران وہ ڈائس پر تشریف لے آئیں ان کے اس

موقع پر لکھے ہوئے اشعار جو انہوں نے پہلے ہی خواجہ سجاد حسین کو بھیج رکھے تھے، حالی مسلم اسکول کے ایک استاد نے خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھ کر سنائے:

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم ۵۳

اس کے بعد جمیل نقوی، غلام السیدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا حالی سے متعلق اپنے اپنے مقالات پڑھے۔ پھر سر راس مسعود کا تحریر کردہ ''مسدس حالی'' صدی ایڈیشن کا دیباچہ پڑھا گیا۔ آخر میں نواب بھوپال نے خطبہ صدارت پڑھا اور جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ اقبال حبس صوت کے سبب نہ تو اپنے اشعار خود پڑھ سکے اور نہ تعریفی کلمات کے جواب میں بطور تشکر ہی کچھ کہا جو نواب بھوپال اور دیگر حضرات نے ان کی شان میں کہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر سب لوگ مزار حالی پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ شام کے اجلاس میں اقبال ضعف و اضمحلال کے باعث شریک نہ ہوئے اور اگلے روز یعنی ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء واپس لاہور پہنچ گئے۔

اقبال نے اپنی علالت اور دیگر وجوہ کے پیش نظر ۲۲ر نومبر ۱۹۳۵ء کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل سے استدعا کی تھی کہ صدارت انجمن سے ان کا استعفا قبول کر لیا جائے، لیکن جنرل کونسل نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۵ کو انجمن کا مفاد سامنے رکھتے ہوئے ان کا استعفا نامنظور کیا اور چھ افراد پر مشتمل ایک وفد اقبال کی خدمت میں بھیجا گیا تاکہ وہ اپنا استعفا واپس لے لیں۔ ۵۴

جنوری ۱۹۳۶ء کے ابتدائی ہفتوں میں اقبال اپنے مضمون ''اسلام اور احمدیت'' کی تکمیل میں مصروف تھے، اس لیے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ۵۵۔ ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو ایڈیٹر اخبار ''لائیٹ'' نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کو بہانہ بنا کر اپنے افتتاحیہ کالم میں اقبال کی ذات پر حملہ کیا ۵۶۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ احمدی عقیدہ رکھتے تھے اور انجمن حمایت اسلام

کے ایک اہم رکن تھے۔ چونکہ اس زمانے میں احراری قادیانی نزاع نے پنجاب بھر کے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی تھی، اس لیے اقبال نے بحیثیت صدر انجمن کو مشورہ دیا کہ اسے احمدیت کے متعلق اپنی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ ۲ فروری ۱۹۳۶ء کو انجمن کی جنرل کونسل نے زیر صدارت خلیفہ فضل حسین عبدالمجید کی تحریک پر ایک قرارداد پیش کی، جس میں ختم نبوت کے مسئلے پر انجمن کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر انجمن کی طرف سے ایک اعلان اس مضمون کا بھی تیار کیا گیا تھا جو بعد میں اخبارات میں شائع ہوا کہ عقائد نبوت، وحی اور خاتمیت میں انجمن عامۃ المسلمین کی ہم نوا ہے اور کونسل اس امر کا اعلان ضروری سمجھتی ہے کہ مسئلہ ختم نبوت اسلام کا ایک اساسی اصول ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں نہیں آ سکتا۔ پس انجمن کا مسلک یہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ شیخ اکبر علی وکیل اور مولانا احمد علی نے قرارداد کی تائید کی۔ پھر انجمن کے ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے نہ صرف قرارداد کی تائید کی۔ بلکہ ارشاد فرمایا:

جس صاحب کو جنرل کونسل کا رکن منتخب کرنا ہو اس سے پہلے اس اعلان (جو اخبارات میں شائع ہوا) کے مطابق ختم نبوت کے عقیدے کا عہد لیا جائے کہ وہ اسی مسلک پر کاربند ہے اور رہے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے سیکرٹری انجمن کی حیثیت سے صدر انجمن (یعنی اقبال) کے مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں قرارداد کی تائید کی:

صدر محترم نے یہ محسوس کیا ہے کہ انجمن دن بدن مسلمانوں میں اپنا وقار کھو رہی ہے۔ جب تک احمدیت کے متعلق انجمن کی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح طور پر پبلک کے سامنے نہ کی جائے تب تک مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے اور ایک بڑی بات جس

پر کہ مسلمانوں میں ہیجان تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں آ سکتا ہے یا نہیں اس ریزولیوشن میں اس کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جوش میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چلا کر بولے:

جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے جو تشریح کی وہ غلط ہے بلکہ مجازی رنگ میں نبی آ سکتا ہے۔

مولوی غلام محی الدین ایڈووکیٹ نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا:

انجمن عامتہ المسلمین پر اپنی جنرل کونسل کے ذریعے واضح کرنا چاہتی ہے کہ انجمن عامتہ المسلمین کے ساتھ ہے۔ مرزا صاحب کو اختلاف پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اصول مندرجہ بالا کے علاوہ ان کا کوئی عقیدہ ہے تو وہ اسے اپنے تئیں رکھیں اور انجمن میں ذریعہ اختلاف نہ بنائیں اور میں اس اعلان کی پرزور تائید کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ غصے میں میٹنگ سے واک آوٹ کر گئے۔ نو دن کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا اور ۱۱ر فروری ۱۹۳۶ء کو رات کے گیارہ بجے فوت ہو گئے۔

انجمن کی اس کارروائی کے متعلق اخبار ''لائیٹ'' کے ایڈیٹر نے تحریر کیا کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کا باعث انجمن کا وہ اعلان تھا جو اقبال کے مطالبے پر جنرل کونسل نے احمدیت کے بارے میں ۲ فروری ۱۹۳۶ء کو تیار کر کے اپنے اخبار ''حمایت اسلام'' مورخہ ۶ر فروری ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ مزید لکھا کہ اقبال نے انہیں کافر کہا تھا اور انجمن سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو انجمن کی رکنیت سے الگ نہیں کیا جاتا، وہ صدارت قبول نہ کریں گے۔ بعد ازاں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے کونسل میں محولہ بالا اعلان کی بابت قرارداد پاس کرتے

وقت ان کے خلاف متشددانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ اپنی طبعی موت نہیں مرے بلکہ وہ انجمن سے حق کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیٹر نے اقبال کے بارے میں تحریر کیا:

ایک بہترین صبح کو ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ خیال کیا کہ مرزا یعقوب بیگ کافر ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے انجمن حمایت اسلام کو چیلنج بھیج دیا کہ مرزا یعقوب بیگ کو الگ کر دیا جائے، جیسا کہ وہ اس احسان فراموش اور بے ضمیر کتوں کی جماعت میں بوجہ اپنی شرافت کے رہنے کے قابل نہ تھا، خدا نے اس کو اپنی طرف بلا لیا۔ ہم ڈاکٹر محمد اقبال اور اس کے رہزن گروہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اب گندہ آدمی دنیا میں نہیں رہا اور ڈاکٹر صاحب انجمن کی کرسی صدارت کو زینت بخشیں۔

سیکرٹری انجمن خلیفہ شجاع الدین کے متعلق لکھا:

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی بابت یہ رپورٹ ملی ہے کہ انہوں نے خاص طور پر جنرل کونسل میں متشددانہ رویہ اختیار کیا ہے اور جونہی کہ وہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اس میٹنگ سے باہر آئے ان پر فالج گرا اور ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء کو رات کے گیارہ بجے مر گئے۔ پس ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اسلام کے شہید ہیں۔

اقبال نے ''لائیٹ'' کے لگائے گئے الزامات کا نوٹس نہ لیا۔ البتہ ہفت روزہ ''حمایت اسلام'' نے جنرل کونسل کی کاروائی کی تفصیل پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سراسر غلط ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جونہی میٹنگ سے باہر نکلے اور مر گئے۔ پس شہید اسلام ہیں۔ دراصل کونسل کا اجلاس ۲ فروری ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوا تھا اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء کو فوت ہوئے اور یہ بھی ایک کھلا ہوا دروغ ہے کہ اقبال نے مرزا یعقوب بیگ کو کافر کہا۔ ''حمایت اسلام'' نے تحریر کیا

:

کارروائی پڑھنے کے بعد ذرا معقولیت سے کام لیں کہ مرزا یعقوب بیگ کو کونسا جہاد کرنا پڑا اور جناب آنریری سیکرٹری انجمن نے کون سے پتھر مارے ہیں اور جناب صدر محترم نے کونسا اور کب یہ مطالبہ کیا ہے کہ ڈاکٹر یعقوب بیگ کافر تھے اور ان کا اخراج انجمن کے لیے نہایت لازمی ہے۔ باقی وہ مرض فالج کے حملے سے فوت ہو گئے ہیں۔ آپ ان کو ستر شہدا کا مرتبہ دے سکتے ہیں اور ان کی شان میں سارا قرآن لکھ سکتے ہیں۔ قلم کاغذ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک ان کے چندے اور خدمات کا ذکر ہے نہ انجمن ان کی منکر ہے، نہ ہی کسی کو شبہ ہے۔ اگر انہوں نے نیک نیتی اور خلوص سے چندے دیے اور خدمت کی ہے تو اس کا بہترین اجر خدا کے ہاں پائیں گے۔ جناب صدر انجمن یا سیکرٹری انجمن کے خلاف بے بنیاد اتہامات یا اراکین انجمن کے متعلق تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ کا استعمال مرزا یعقوب بیگ صاحب کی شان میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔

برقی علاج کا تیسرا کورس پورا کرنے کے لیے اقبال ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء کو لاہور سے بھوپال روانہ ہوئے۔ علی بخش اس سفر میں بھی ہمراہ تھا۔ یکم مارچ ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے اور دن بھر کے لیے وہیں رکے رہے۔ قیام بمطابق معمول کچھ ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ سردار صلاح الدین سلجوقی کے ساتھ افغان قونصل خانے میں رہا۔ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچے اور شیش محل میں ٹھہرے۔ اگلے ہی روز ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر عبدالباسط نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا اور بجلی کے علاج کا تیسرا کورس شروع ہو گیا۔

بھوپال میں اس مرتبہ بھی ان کا روزمرہ کا معمول وہی پرانا تھا۔ صبح کا بیشتر حصہ حمیدیہ ہسپتال میں گزرتا، دوپہر کو مطالعہ اور آرام فرماتے۔ شام کو ہوا خوری کے لیے بھوپال کی معروف تفریح گاہوں کملاپتی پارک، یادگار سلطانی وغیرہ کی طرف نکل جاتے اور رات کو سر راس مسعود کے ہاں تشریف لے جاتے، جہاں گیارہ بارہ

بجے تک محفل جمی رہتی یا شیش محل میں کھانا کھا لیتے حبس صوت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی اب عادت سی پڑ گئی تھی۔ گلے کے بیٹھ جانے کے متعلق پہلی سی بے چینی نہ رہی تھی۔ آواز میں ترقی کے بارے میں مایوس تھے۔ ۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو شیش محل میں سو رہے تھے کہ سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ وہ پوچھتے ہیں: تم کب سے بیمار ہو! جواب دیا: دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا: حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو۔ اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ اسی عرض داشت نے بالآخر ان کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی صورت اختیار کی۔ ۵۷

سر سید کو خواب میں دیکھنے کا ذکر انہوں نے سر راس مسعود کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲۹ جون ۱۹۳۶ء میں بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

۳/ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمہارے دادا کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمد اللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اس کا نام ہو گا "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔ ۵۸

۸/ اپریل ۱۹۳۶ء کو برقی علاج کا آخری کورس ختم ہوا اور اقبال اسی روز بھوپال سے روانہ ہو کر ۹ اپریل ۱۹۳۶ کو لاہور واپس پہنچ گئے۔ سردار بیگم کی وفات کے بعد گھر کا سارا نظام تہ و بالا ہو چکا تھا۔ رشتہ دار خواتین تھوڑے عرصے کے لیے آ کر منیرہ کے پاس رہتیں، لیکن اس کی تربیت اور دیکھ بھال کا کوئی مستقل

بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح راقم بھی جو جی میں آئے کرتا اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا، مارچ ۱۹۳۶ء میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سالانہ امتحان سر پر آیا ہوا تھا، مگر اسے کوئی پروانہ تھی۔ اگر کوئی شوق تھا تو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش)، حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے مگر الف لیلہ نے اسے اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ امتحان کی تیاری کے بجائے رات گئے تک الف لیلہ پڑھتا رہتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ راقم ساتویں جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ بھوپال سے واپسی پر جب اقبال کو یہ معلوم ہوا کہ راقم الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے فیل ہوا ہے تو خفا نہ ہوئے۔ صرف اتنا کہا کہ اگر تم امتحان میں پاس ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو اور بھی لطف آتا۔

گھر کے نظام کو صحیح طور پر چلانے اور بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت کے لیے انہیں کسی ایسی خاتون کی تلاش تھی جو بیوہ اور بے اولاد ہو، ادھیڑ عمر کی ہو، کسی شریف گھرانے کی ہو، دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو یعنی قرآن مجید اردو پڑھا سکتی ہو اور اگر عربی فارسی بھی جانے تو اور بھی بہتر تھا، سینا پرونا وغیرہ جانتی ہو اور کھانا پکانا بھی سکھا سکتی ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے پچھلے سال ''تہذیب نسواں'' میں اشتہار بھی دیا اور خواجہ غلام السیدین کو خط تحریر کیا کہ علی گڑھ میں کسی ایسی استانی کے متعلق دریافت کریں، ۵۹ لیکن کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ لاہور کی ایک خاتون کو چند ہفتوں کے لیے تجرباتی طور پر گھر کا چارج دیا گیا، مگر منیرہ ان سے قطعی مانوس نہ ہوئی۔ لہٰذا انہیں رخصت کر دیا گیا، ایک نوجوان خاتون جو خاصی تعلیم یافتہ اور دینی تعلیم بھی رکھتی تھیں، اس شرط پر اتالیقی قبول کرنے پر تیار ہوئیں کہ اقبال ان سے نکاح کر لیں، لیکن چونکہ اقبال کے لیے یہ ممکن نہ تھا، اس لیے ان سے گفت وشنید بند کرنا پڑی۔ ۶۰ دراصل اس قسم کی کسی مسلم خاتون کا ملنا محال تھا، لہٰذا کسی یورپین

خاتون کی خدمات حاصل کرنے کی کوششیں شروع کی گئیں۔

لاہور پہنچنے کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو اقبال نے آخری بار انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور ان کی تازہ ترین اردو نظم بعنوان ''نغمہ سرمدی'' (جو لا الٰہ الا اللہ کے عنوان سے ''ضرب کلیم'' میں شامل ہے) مسلمان مردوں اور عورتوں کے ایک بہت بڑے اجتماع کے سامنے پڑھی گئی۔ ۶۱ عبدالحمید سالک تحریر کرتے ہیں:

علاّمہ اقبال ۱۹۳۶ء میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ ان کی وہ آواز بیٹھ چکی تھی، جس کے شیریں نغمے سالہا سال تک فرزندان توحید کے لیے فردوس گوش رہے تھے۔ سٹیج پر ایک کرسی بچھا کر اس پر علامہ اقبال بٹھا دیے گئے تاکہ مسلمان ان کی زیارت سے شادکام ہوں اور علاّمہ اقبال کے ارشاد پر محمد صدیق اور محمد امین نے ان کے وہ چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے:

خودی کا سرّ نہاں لآ الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لآ الٰہ الا اللہ'' ۶۲

اپریل ۱۹۳۶ء تک تحریک بازیابی مسجد شہید گنج وقتی طور پر معطل ہو گئی تھی۔ شہید گنج کے مسئلے کا پس منظر یہ تھا کہ لنڈے بازار کے قریب شاہجہاں کے عہد میں لاہور کے کوتوال عبداللہ خان نے اسے تعمیر کیا اور اس میں باقاعدہ نماز ادا ہونے لگی۔ اس مسجد کے نزدیک سکھوں کا ایک مقدس بزرگ تارو سنگھ مغل صوبہ دار نواب معین الملک کے ہاتھوں مارا گیا۔ سکھوں نے اس کی یاد میں اس مقام پر سمادھ تعمیر کر لی اور اس کا نام شہید گنج رکھ دیا۔ بعد میں جب پنجاب میں سکھوں کا راج آیا تو انھوں نے سمادھ کے قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسجد پر بھی قبضہ جما لیا۔ چنانچہ اس تمام رقبے پر کئی سالوں سے سکھ متولّی قابض چلے آتے تھے۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں انگریزی حکومت نے یہ رقبہ گردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دیا جو قانون کی

رو سے سکھوں کے اوقاف کی نگران تھی۔ کمیٹی نے مسجد کو مسمار کرنا چاہا کیونکہ سکھوں کا دعویٰ تھا کہ مسجد پر ان کا قانونی حق ہے۔ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ ایک دفعہ جہاں مسجد بن جائے، اسے منہدم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر پنجاب سے ملا۔ ابھی بات چیت جاری تھی کہ پولیس اور فوج کے پہرے میں ۷؍جولائی ۱۹۳۵ء کی رات کو سکھوں نے مسجد کا انہدام شروع کر دیا۔ اس پر مسلمان جوش میں آ گئے [۶۳]۔ ۱۴؍جولائی ۱۹۳۵ء کو بیرون موچی دروازہ باغ میں مجلس اتحاد ملت کے زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں سول نافرمانی کی تیاری کا اعلان کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجلس احرار نے اس جلسے میں شرکت سے انکار کر دیا، جس کے سبب اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی جو اُسے تحریک کشمیر اور بعد میں تحریک ختم نبوّت کے دوران میں حاصل ہوئی تھی، ختم ہوگئی۔ مجلس اتحاد ملت کے لیڈروں اور کارکنوں کو راتوں رات گرفتار کر لیا گیا اور جب مسلمانوں کے احتجاجی جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو انگریزی حکومت نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ مسلمان جوق در جوق مسجد تک پہنچنے کے لیے بڑھتے تھے اور فوج ان پر گولی چلاتی تھی۔ بیسیوں شہید اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ ان دنوں اقبال بھوپال میں تھے۔ ۲۹؍اگست ۱۹۳۵ء کو دہلی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر ہی قیام تھا۔ مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود ملنے آئے۔ مسجد شہید گنج کے انہدام کے متعلق گفتگو ہوئی، فرمایا:

آپ مسلمانوں سے مایوس کیوں ہیں؟ آپ نہیں جانتے حکومت اور حکومت کے طرف داروں نے انہیں کس طرح دبا رکھا ہے۔ ورنہ شاید اس ایک مسجد کے بدلے میں کیا کچھ ہو جاتا۔ مسلمانوں میں قربانی کا بڑا مادّہ ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ان کی صفیں منظم نہیں، نہ کوئی ایسا صاحب نظر اور اولوالعزم انسان ہے جو ان کی رہنمائی کرے۔[۶۴]

جب اقبال لاہور آئے تو بظاہر معاملہ سرد پڑ چکا تھا، لیکن اندر اندر آگ سلگ

رہی تھی۔ ہزاروں رضا کار جیلوں میں ٹھونسے گئے تھے اور یہ سلسلہ سارا سال جاری رہا۔ بالآخر بعض مسلمانوں نے محمد علی جناح کو لاہور بلوایا تاکہ وہ کوئی مفاہمت کرا دیں۔ محمد علی جناح ۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے اور اتفاق سے تب بھی اقبال لاہور میں موجود نہ تھے، بلکہ برقی علاج کی خاطر بھوپال گئے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح تقریباً دو ہفتے لاہور میں مقیم رہے اور اس دوران میں انہوں نے تحریک شہید گنج کے قائدین سکھ لیڈروں اور گورنر پنجاب وغیرہ سے ملاقاتیں کیں اور فریقین کو کوئی معقول سمجھوتا کرنے کا مشورہ دیا۔ آخر کار محمد علی جناح نے شہید گنج مصالحتی بورڈ قائم کیا جس میں پنجاب کی دیگر شخصیات کے ساتھ اقبال کو ان کی عدم موجودگی میں ممبر نامزد کر دیا گیا۔ تمام سیاسی قیدی رہا ہوئے اور اس طرح محمد علی جناح کی کوششوں سے پنجاب میں وقتی طور پر صلح و امن کی فضا پیدا ہو گئی، مگر پچھلے برس جب تک تحریک زوروں پر تھی تو شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کی طرف سے مسجد کی بازیابی کی خاطر ڈسٹرکٹ جج لاہور کی عدالت میں ایک دعویٰ بھی دائر کیا گیا تھا، جس کی پیروی ملک برکت علی ایڈووکیٹ اور دیگر وکلا کر رہے تھے۔ شہید گنج مصالحتی بورڈ تو بیکار ثابت ہوا، تاہم ہر مسلمان بے تابی سے فیصلے کا منتظر تھا۔ بالآخر ڈسٹرکٹ جج لاہور نے ۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء کو مسلمانوں کا یہ دعویٰ خارج کر دیا اور مسجد پر سکھوں کا قبضہ بحال رکھتے ہوئے فیصلے میں لکھا کہ مسجد بھی عام غیر منقولہ جائداد کی طرح فریقِ ثانی کے قبضۂ مخالفانہ میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ بہر حال اقبال کے مشورے سے ڈسٹرکٹ جج کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی، اس لیے معاملہ مزید ایک سال تک لٹک گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں کا صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کچھ حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس آئین کے تحت جو اختیارات صوبوں کو دیے گئے، ان میں صوبائی خود مختاری کے اصول کی چند نمایاں خصوصیات موجود

تھیں۔ گورنروں کو صرف ایمرجنسی اختیارات سونپے گئے تھے۔ اسی طرح مرکزی وفاقی حکومت برٹش انڈیا کے صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ اگر چہ اہم شعبہ جات مثلاً دفاع، خارجی اموروغیرہ گورنر جنرل کے کنٹرول میں تھے۔ صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات پہلے ہی سے نافذ ہو چکی تھیں اور پھر سندھ کو بھی بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں سیاسی انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور وہ مختلف سیاسی گروہوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کل ہند بنیادوں پر ان کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم کوئی بھی نہ تھی۔ دوسری طرف مسلم اکثریتی صوبوں یعنی پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد (بلوچستان میں نئی اصلاحات ابھی نافذ نہ ہوئی تھیں) کے مسلم لیڈروں میں صوبائیت یا علاقائیت کا رجحان زور پکڑ رہا تھا۔ پوزیشن یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں مسلمان اپنی تھوڑی سی اکثریت کے بل بوتے پر مستحکم وزارتیں نہ بنا سکتے تھے۔ سندھ میں صورت حال قدرے بہتر تھی، لیکن یہاں بھی اگر مسلمانوں میں اتحاد نہ رہے تو وزارت ختم ہو سکتی تھی۔ صرف صوبہ سرحد کی اسمبلی میں مسلمانوں کو نشستوں کی واضح برتری حاصل تھی اور وہاں مضبوط مسلم وزارت تشکیل دی جا سکتی تھی۔ غالباً انہی حالات کے پیش نظر پنجاب، بنگال اور سندھ کے صوبائی مسلم لیڈروں نے اپنی اپنی غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتیں بنا کر اُن کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے کا قصد کیا تا کہ یوں صوبائی اسمبلیوں میں وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں۔ البتہ صوبہ سرحد میں عبدالغفار خان کی پارٹی خدائی خدمت گار کانگرس کی ہمنوا تھی، اس لیے وہاں انہیں کسی غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت قائم کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

محمد احمد خان کی رائے میں بالخصوص مسلم اکثریتی صوبوں میں صوبائی دائرے کے اندر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنانے کا رجحان افسوسناک بھی تھا اور خطرناک بھی،

اس لیے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری برصغیر کی پوری ملت اسلامیہ کے متحدہ مطالبے اور مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد اگر مسلمان متحد نہ رہیں اور وہ صوبوں میں بٹ کر غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتیں بنالیں تو جو کچھ انہوں نے حاصل کیا تھا اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے اراکین ہی کے ووٹوں سے مرکزی یا وفاقی اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب ہونا تھا۔ ان حالات میں وہ مرکزی اسمبلی میں خالصتاً مسلم نقطۂ نظر پیش کرنے والے مسلم نمائندوں کو کیونکر بھیج سکتے تھے۔۶۵

محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

یہ رجحان صوبوں کے ہندوؤں میں پیدا نہ ہوا تھا۔ انہوں نے اس امر کی کوشش نہیں کی تھی کہ صوبائی سطح پر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنائیں اور ان کے ذریعے انتخاب لڑیں۔۶۶

محمد علی جناح جب سے انگلستان سے واپس آئے تھے، بحیثیت صدر مسلم لیگ کو برصغیر میں مسلمانوں کی واحد متحدہ جماعت بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں نئے آئین کے تحت چونکہ عام انتخابات ہونے والے تھے، اس لیے انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس طلب کیا اور اس میں مسلم لیگ کے علاوہ مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار اسے عوامی جماعت بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ نیز طے پایا کہ صوبائی انتخابات میں حصہ لیا جائے اور انہیں اختیار دیا گیا کہ مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے مشورہ کر کے اس بورڈ کے لیے ممبر نامزد کر دیں اور مختلف صوبوں میں بورڈ کی شاخیں قائم کریں۔

اس کے بعد محمد علی جناح نے مختلف صوبوں کے دورے شروع کیے۔ وہ

۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے۔ سب سے پہلے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین کے گھر گئے، لیکن سر فضل حسین نے ان کی ایک نہ سنی۔ دراصل وہ محمد علی جناح کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ اپنی ڈائری مورخہ پیر ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کے اندراج میں تحریر کرتے ہیں:

جناح آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ آغا خان کے خلاف اور میرے خلاف اور کانفرنس کے خلاف یہ امر افسوسناک ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی ایسے ہی رہے ہیں۔ اس لیے کانگرس یا مسلم لیگ یا کانفرنس گول میز کسی کے ساتھ بھی نباہ نہ کر سکے۔ آج تک کوئی سیاسی جماعت نہ بنا سکے۔ بمبئی میں ان کا کوئی رسوخ نہ تھا اور انہیں اب بھی وہاں کوئی لیڈر تسلیم نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے۔ مجھے ان سے آئندہ اچھی طرح ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۶۷

۶ مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو جناح اقبال سے ملنے "جاوید منزل" آئے۔ فاطمہ جناح ساتھ تھیں۔ راقم کو خوب یاد ہے، ان کے آنے سے پیشتر اقبال نے اسے خاص طور پر بلوا کر کہا تھا کہ ایک مہمان آ رہے ہیں اور جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو راقم کمرے میں داخل ہو اور ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کرے۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے تو راقم اقبال کے حکم کی تعمیل میں کمرے میں داخل ہوا۔ اقبال کے پاس ایک طویل قامت دبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی پھرتی تھی اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ اقبال نے ان سے راقم کا تعارف کرایا اور راقم نے آٹوگراف کی کتاب اور قلم بڑھا دیے۔ مہمان نے انگریزی میں اس سے پوچھا: کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟ راقم نے جواب دیا: جی نہیں، فرمایا: پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟ راقم خاموش رہا۔ اس پر وہ ہنستے ہوئے اقبال سے مخاطب ہوئے، کوئی جواب نہیں دیتا۔ اقبال نے جواب دیا: وہ جواب نہیں دے گا، کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ

اسے بتائیں گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ محمد علی جناح نے انہیں مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کا کارکن بننے کی دعوت دی جو اقبال نے اپنی علالت اور دیگر ذاتی آلام و مصائب کے باوجود قبول کرلی، کیونکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے ملّی اتحاد کی تحصیل کے لیے ضروری تھا کہ برصغیر میں ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو۔ لاہور میں قیام کے دوران میں محمد علی جناح مجلس اتحاد ملت احرار کے رہنماؤں سے بھی ملے اور وہ بھی تعاون پر رضامند ہوگئے۔ ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہرنے کے بعد محمد علی جناح راولپنڈی ہوتے ہوئے کشمیر چلے گئے۔ ۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو اقبال اور چودہ دیگر صوبائی مسلم رہنماؤں نے مسلمانان پنجاب کے نام مسلم لیگ اور محمد علی جناح کی حمایت میں اپیل کی اور ساتھ ہی یونینسٹ پارٹی کے متعلق انہیں خبردار کیا:

آپ لوگوں پر مخفی نہ رہے کہ اس صوبے میں نام نہاد یونینسٹ پارٹی بھی انتخابات میں حصہ لے رہی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ مسلمانان پنجاب کی وحدت کو دیہاتی اور قصباتی تقسیم کے ناپاک اور غیر اسلامی حربے سے پارہ پارہ کرنے کے ذمے دار ہیں اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی عالمگیر اخوت کو اقتصادی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ افسوس! کہ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام دنیا میں مادی بنیادوں پر انسانیت کے بکھرے ٹکڑوں کو جوڑنے نہیں آیا بلکہ آرا و افکار کی یک جہتی پر انسانیت کے قصرِ رفیع کو استوار کرنے کے لیے آیا تھا...... ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کے بلند ترین مقاصد کو پس پشت ڈال کر اپنی خودغرضیوں اور جاہ پرستیوں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے غیر مسلموں کے ہاتھ اپنے اصولوں کو فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کا منشا صرف یہ ہے کہ قابل مسلمان صوبائی اسمبلیوں میں بھیجے جائیں اور سنٹرل لیجسلیچر زمتحدہ آواز سے مسلمانوں کے حقوق کی کما حقہ، حفاظت کرسکیں۔ ۶۸

۱۲ رمئی ۱۹۳۶ء کو میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جس میں اقبال بھی موجود تھے۔ اس اجلاس میں پنجاب مسلم لیگ کی ازسرنو تنظیم کے سلسلے میں عہدے داروں کا تقرر کیا گیا۔ اقبال دوبار صدر اور غلام رسول بیرسٹر سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح نے سرینگر سے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا، جن میں اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ چونکہ تمام ممبران میں سے تین نشستیں مجلس اتحاد ملت اور چار مجلس احرار کو دی گئیں، اس لیے مولانا ظفر علی خان، صدر مجلس اتحاد ملت مطمئن نہ تھے، ۲۸ مئی ۱۹۳۶ء کو اقبال کی زیر صدارت ''جاوید منزل'' میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کے پنجابی ممبروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے اقبال کی زیر صدارت صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا۔ ۶ رجون ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح سری نگر سے واپس لاہور پہنچے اور ۸ رجون ۱۹۳۶ء کو برکت علی اسلامیہ ہال میں مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا انتخابی منشور منظور کیا گیا اور اسی اجلاس میں مجلس اتحاد ملت کے لیڈر مرکزی پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ یہ خبر سن کر سر فضل حسین بڑے خوش ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک خط بنام سر سکندر حیات میں تحریر کیا:

جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نے اس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ اتحاد ملت نے بھی انکار کر دیا۔ باقی رہ گئے احرار۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں۔ ان کا رویہ ہمارے متعلق یکساں رہے گا۔ البتہ اقبال، شجاع، تاج الدین، برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اس بورڈ سے کچھ لے مرنے کی آرزو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ۶۹

۹ رجون ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح کے نام اپنے ایک خط میں اقبال نے اصرار کیا

کہ وہ بورڈ سے متعلق اپنے بیان میں مسلمانانِ برصغیر کو خبردار کریں کہ اگر مسلم لیگ کی موجودہ اسکیم کو اختیار نہ کیا گیا تو گزشتہ پندرہ برس میں جو کچھ بھی انہوں نے سیاسی طور پر حاصل کیا ہے اسے گنوا بیٹھیں گے، بلکہ اپنا شیرازہ اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کردیں گے۔ نیز فرمایا کہ مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ انتخاب نے مسلمانوں کے لیے لازمی کردیا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلم اراکین ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے نمائندے بھیجیں جو وہاں ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے خالصتاً مسلم نقطۂ نظر پیش کرسکیں۔ ۷۰

سر فضل حسین تو سر سکندر حیات کو پنجاب میں محمد علی جناح کی ناکامی کی خبر سنا رہے تھے، لیکن سر سکندر حیات یونینسٹ پارٹی میں ان کے خلاف خفیہ سازشوں میں مصروف تھے اور ساتھ ہی اقبال یا محمد علی جناح سے ساز باز بھی کررہے تھے۔ اقبال کو امید تھی کہ شاید وہ مسلم لیگ میں آجائیں اور اسی پس منظر میں انہوں نے محمد علی جناح کو ایک خط مورخہ ۲۵ جون ۱۹۳۶ء تحریر کیا، مگر بقول عاشق حسین بٹالوی، اقبال کو ان کے متعلق خوش فہمی تھی۔ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر تیار نہ تھے، بلکہ وہ تو ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے یا سر فضل حسین کی موت کا بیتابی سے انتظار کررہے تھے ۷۱ ۔ ۹ر جولائی ۱۹۳۶ء کو سر فضل حسین نے لاہور میں وفات پائی اور سر سکندر حیات کو یونینسٹ پارٹی کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

اقبال کے لیے علالت کے سبب صوبائی پارلیمانی بورڈ کے ہر اجلاس میں شریک ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے ۱۳ اگست ۱۹۳۶ء کو صوبائی پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے استعفا دے دیا، اگرچہ وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بدستور رہے۔ پنجاب میں انتخابی مہم کے آغاز سے پیشتر مجلس احرار بھی مسلم لیگ کو چھوڑ چکی تھی۔ بہر حال انتخابی مہم شروع کرنے کے لیے اقبال نے محمد علی جناح کو لاہور

بلوایا۔ وہ ۹/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو تشریف لائے۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء کی شام کو دہلی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ صدارت اقبال کو کرنا تھی لیکن بوجہ ناسازی طبع نہ کر سکے۔ محمد علی جناح نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف بڑی دھواں دار تقریر کی، مگر بقول عاشق حسین بٹالوی جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا۔ اور حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔[۲۷] مسلم لیگ مسلم حلقوں سے کل سات امیدوار کھڑے کر سکی جن میں سے صرف دو کامیاب ہوئے، ایک ملک برکت علی اور دوسرے راجہ غضنفر علی۔ راجہ غضنفر علی تو یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے اور ملک برکت علی اکیلے رہ گئے۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں "ضربِ کلیم" لاہور سے شائع ہوئی اور دو ماہ بعد یعنی ستمبر ۱۹۳۶ء میں فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی اشاعت ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۶ء ہی میں جنوبی ہند میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے رویے سے تنگ آ کر اچھوت بڑی تعداد میں مسلمان ہونے لگے اور ان سے متعلق خبریں مصر کے اخباروں میں چھپیں۔ اس پر جامعہ ازہر کے شیخ محمد مصطفٰی المراغی نے اقبال کو خط لکھا کہ تبلیغ اسلام کی مہم چلانے کی خاطر وہ مصری علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجنے کو تیار ہیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی غرض سے مصری علما کی جماعت کو ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کام ہندوستان کے علماء انجام دے سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ اگر مصر سے علماء کا وفد آیا تو اس کے سبب ہندو مسلم تعلقات پر ناخوشگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہے بہر حال چونکہ خط و کتابت مسلم اخبارات میں شائع ہوئی اس لیے ہندو پریس نے اقبال کے خلاف زہر اُگلا۔[۲۸]

۱۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اقبال بارود خانے میں محمد دین تاثیر اور کرسٹابل جارج کی شادی میں شریک ہوئے، علی بخش اور راقم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ فریقین کا نکاح نامہ اقبال نے خود تحریر کیا۔ اس کی دو شقیں جو اس زمانے میں بڑی عجیب و غریب

سمجھی گئیں، درج ذیل ہیں:

بر بنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور اقرار کرتا ہے کہ جب تک اس کا نکاح کرسٹابل جارج مذکور سے قائم رہے گا، وہ کسی بھی عورت سے نکاح ثانی نہیں کرے گا، خواہ اس کا کوئی بھی مذہب کیوں نہ ہو (یعنی فریقین کی شادی، ''مونا گمس'' ہوگی)۔

بر بنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزّہ محمد دین تاثیر مذکور شرع اسلامی کے تحت اپنا حق طلاق کرسٹابل جارج مذکور کو تفویض کرتا ہے۔[۷۴]

نومبر ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ ''الحکیم'' کے نمائندے اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ضبط تولید کے مسئلے پر اظہار خیال کرنے کو کہا۔ فرمایا:

شریعت اسلامی نے اجتماعی مسائل میں مصالح امت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کے تصفیے کو اہل علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات و مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کرلیں۔ اس لیے اگر حظ نفس مقصود نہ ہو، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضا مند ہوں تو جہاں تک میرا علم میری رہنمائی کرتا ہے۔ (ضبط تولید) شرعاً قابل اعتراض نہیں ہے۔ اصول شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو اگر وہ اولاد کی خواہش مند نہ ہو، اولاد پیدا کرنے پر با کراہ مجبور نہیں کرسکتا۔[۷۵]

اب احمدیت کی تردید میں اقبال کی تحریروں کے پس منظر پر بحث کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے ان تحریروں کے سبب اقبال احمدیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد، فسادات پنجاب کے سلسلے میں انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک احمدی گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اقبال نے مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء تک اس بیعت کے پابند رہے، لیکن اس کے بعد کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود اور اقبال کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے احمدیت کے خلاف بیانات

دینے شروع کردیے۔ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو کہا کہ یہ بیعت ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی۔ پھر کہا کہ ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصہ میں بتایا کہ اقبال ۱۹۳۰ء تک مرزا غلام احمد کو مجدد مانتے رہے۔ پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے ۷۶۔ اسی طرح بعض احمدی حلقوں کی طرف سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی گئی کہ اقبال کا احمدیت کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کے خاندان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد احمدی تھے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد احمدی ہیں۔ جنہیں اقبال نے وصیت نامے میں اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ پس اگر بعد میں وہ احمدیت کے خلاف ہوگئے تو اس کی وجوہات ذاتی اور سیاسی تھیں۔ ۷۷

اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد احمدی تھے، البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی کے ایک حصے میں احمدی مسلک قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت احمدیہ میں شامل رہے، مگر بقول ان کے فرزند شیخ مختار احمد اور دختران عنایت بیگم و وسیمہ بیگم کے انہوں نے بعد ازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ شیخ عطا محمد، اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انہیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گذشتہ یا مفروضہ

عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اقبال نے وصیت نامے میں ان کا نام برادر زادہ ہونے کی حیثیت سے اور ان کی صالحیت کی بنا پر اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انہوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا، لیکن تقریباً دو سال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ ان کے ایک خط مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہوتا ہے۔ دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت صالح آدمی ہے، مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۷۸

مگر سر راس مسعود نے لاہور سے دور ہونے کے سبب یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے اقبال کو وصیت نامے میں تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اقبال کے خاندان میں صرف شیخ اعجاز احمد ہی کو اپنے دادا شیخ نور محمد کی صفات ورثے میں ملی تھیں۔ وہ ان کی طرح اصول کے پکے، عالی ظرف، بردبار، مخالفوں یا ناحق ایذا پہنچانے والوں کو معاف کرنے والے سادہ، نیک، شفیق، حلیم اور صلح کن طبیعت کے مالک تھے۔ اسی سبب اقبال نے قطع نظر ان کے دینی عقاید کے انہیں ''صالح آدمی'' قرار دیا۔ شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا ان کی اولاد میں سے، جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے، کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا

حامی نہیں، بلکہ ختم نبوت کے مسئلے پر ان سب کا موقف وہی ہے جو مسلمانوں کا موقف ہے، دوسری مثال ان کی صالحیت کی یہ ہے کہ اقبال کے نابالغ بچوں کے ولی کی حیثیت سے انہوں نے اپنے فرائض نہایت دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیے اور راقم اور منیرہ ان کا یہ احسان کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ختم نبوت کے مسئلے کے متعلق ابتداء ہی سے اقبال کا اپنا ذاتی موقف کیا تھا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے راقم، اقبال کی نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' کا حوالہ دینا چاہتا ہے۔ یہ نظم انجمن حمایت اسلامیہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۲ رفروری ۱۹۰۲ء میں پڑھی گئی۔ اس نظم کے نویں بند میں سرور کائنات کی توصیف کی گئی ہے اور درج ذیل شعر میں اقبال فرماتے ہیں:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک

بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردۂ ۷۹

اس شعر کو نظم میں شامل کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں احمدیت نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے، اس کی تردید مقصود تھی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا اقبال کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا۔

اس کے بعد اقبال کی ایک نظم بعنوان خط منظوم، پیغام بیعت کے جواب میں خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ یہ نظم ''مخزن'' بابت مئی ۱۹۰۲ء میں اور پھر محمد دین فوق کے اخبار ''پنجۂ فولاد''، مورخہ ۱۱ جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بقول محمد عبداللہ قریشی، اقبال پر بھی احمدیت قبول کرنے کے لیے ڈورے ڈالے گئے ۸۰۔ اس نظم کو احمدی ہفت روزہ ''الحکم'' قادیان نے اپنی ۱۰، ۱۷، اور ۲۴ رجنوری ۱۹۰۳ء کی اشاعت میں نقل کیا اور ساتھ ہی مرزا غلام احمد

کے ایک مخلص مرید سید حامد شاہ کی طرف سے اس کا منظوم جواب بھی شائع کیا۔محمد عبداللہ قریشی کی رائے میں چونکہ سید حامد شاہ، مولانا سید میر حسن کے عزیزوں میں سے تھے اور اقبال کے دوست اور ہم محلّہ تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ اس قرب کی وجہ سے اُنہوں ہی نے اقبال کو مرزا غلام احمد کی بیعت کے لیے لکھا ہو، جس کا جواب اقبال نے اس نظم کے ذریعے دیا[۸۱]۔ اس نظم کے مطالعے سے عیاں ہے کہ وہ احمدیت کو ملت اسلامیہ میں ایک علیٰحدگی پسند تحریک سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا ان کے ایمان کا لازمی جزو تھا، فرماتے ہیں:

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بہلاوے کو جانتا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
ایک دانہ پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پہ خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پر ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں[۸۲]

ان کی انگلستان سے واپسی کے چند برس بعد اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ ۲۸/ اگست ۱۹۱۰ء میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو روپے حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے احباب و اعزہ کو تعجب ہوا کہ انہوں نے قادیان جا کر احمدیوں سے رشتہ ناطہ جوڑ لیا، جن کے عقائد کے وہ خلاف تھے۔ اقبال کو اس بے سروپا خبر کی تردید چھپوانا پڑی، جو ''پیسہ اخبار'' مورخہ ۱۵/ ستمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی فرمایا:

اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعۂ خطوط استفسار کیا ہے۔ سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب ''الحکم'' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔۸۳

احمدی اخبار ''الفضل'' مورخہ ۹/ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں ایک مضمون بعنوان جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون سیّد انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کا تحریر کردہ تھا اور احمدیوں میں قادیان پارٹی اور لاہور پارٹی کے اختلاف سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں اقبال سے یہ کلمہ منسوب کیا گیا کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں، لیکن مجھے لاہور والوں سے ہمدردی ہے۔ اقبال کو اس کی بھی تردید بذریعہ خط بنام ایڈیٹر کرنا پڑی۔ جو 'پیغام صلح' مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی، اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

اختلاف سلسلۂ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو، وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔۸۴

بہر حال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر وقتاً فوقتاً اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بعد کی تحریروں اور منظومات میں بھی کیا ہے، جن سے احمدی عقائد کی تردید ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ ۱۹۳۵ء ہی میں پہلی بار انہوں نے ختم نبوت کے مسئلے پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ گزشتہ کئی برسوں سے وہ ان کی تردید کرتے چلے آرہے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ ۱۹۳۵ء سے پیشتر انہوں نے اس سلسلے میں کبھی مناظرانہ رویہ اختیار نہ کیا تھا۔ اقبال نے عالم دین ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا نہ ہی وہ مسلمانوں میں موجودہ مختلف فرقوں کے دینی اختلافات پر کسی رائے کا اظہار کرنا پسند کرتے تھے، کیونکہ ان کا نصب العین منتشر ملت اسلامیہ میں اتفاق کے فروغ کے ذریعہ اتحاد و یگانگت کو وجود میں لانا تھا۔ ان کے نزدیک ملائیت ان منفی قوتوں میں سے ایک تھی جو مسلمانوں کے ''من حیث الملت تنزل'' کا باعث بنی۔ ملائیت سے وہ مناظرہ منسوب کرتے تھے اور مناظرہ ملت اسلامیہ میں اتفاق کا نہیں بلکہ نفاق اور انتشار کا سبب بنتا تھا۔ اس ضمن میں ۱۹۰۴ء میں ان کے تحریر کردہ مضمون بعنوان ''قومی زندگی'' کی مثال دی جاسکتی ہے، جس میں اس وقت کے مسلم معاشرے کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا:

مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں وہ جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیات ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا نام کو نہیں۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اُس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔۸۵

سو ۱۹۳۵ء سے پیشتر انہوں نے ختم نبوت اور متعلقہ مسائل پر کبھی احمدیوں سے مناظرہ کرنے کا قصد نہ کیا تھا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ۱۹۰۲ء سے بھی پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔

اقبال کی ولادت سے پیشتر مرزا غلام احمد سرکاری ملازمت کے سلسلے میں چار یا پانچ برس سیالکوٹ میں مقیم رہے اور اس زمانے میں وہ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کے اسلام پر پے در پے حملوں کا جواب دیتے اور ان سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ اسی سبب ایک عالم دین کی حیثیت سے سیالکوٹ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے اور وہاں کے دیگر علماء و فضلا مثلاً مولانا غلام حسن، مولانا سیّد میر حسن وغیرہ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ جہاں تک اقبال کے والد شیخ نور محمد کا تعلق ہے، وہ چونکہ مولانا غلام حسن اور مولانا سیّد میر حسن کے خاص دوستوں اور ہم نشینوں میں سے تھے، اس لیے مرزا غلام احمد کو جانتے تھے۔ سید تقی شاہ فرزند مولانا سید میر حسن فرماتے ہیں کہ جب عیسائی مشنریوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے مناظرے ہوا کرتے تو مولانا سید میر حسن کو ثالث بنایا جاتا تھا۸۶۔ بہر حال مرزا غلام احمد سیالکوٹ سے رخصت ہو گئے۔ خاصی مدت کے بعد انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور ایک دو سال بعد پھر سیالکوٹ تشریف لے آئے۔ یہ اقبال کی طالبعلمی کا دور تھا۔ سیالکوٹ میں مرزا غلام احمد کا قیام اقبال کے گھر کے قریب تھا۔ اس لیے اقبال انہیں گلیوں میں آتے جاتے دیکھتے تھے۔ سیالکوٹ کے علماء نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ شہر کے لوگوں میں ان کی مخالفت روز بروز بڑھنے لگی۔ اس مرحلے پر مولانا سید میر حسن نے سر سید احمد خان کو ایک خط لکھا اور مرزا غلام احمد کی نبوت کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ سر سیّد نے انہیں اپنے خط محررہ ۹ر دسمبر ۱۸۹۱ء میں جواب دیا:

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک

ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر، ہم کو اس سے کیا فائدہ ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا نہ دنیا کے ۔ ان کا الہام ان کو مبارک ہے ۔ اگر انہیں ہوتا ہے اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے، وہ جو ہوں سو ہوں ۔ اپنے لیے ہیں ۔ میں سنتا ہوں آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیز گار ہیں ۔ یہی ان کی بزرگداشت کو کافی ہے ۔ جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے ۔ ان کی تصانیف میں نے دیکھیں ۔ وہ اس قسم کی ہیں جیسا کہ ان کا الہام نہ دین کے کام کا نہ دنیا کے کام کا ۔ مولوی حکیم نورالدین کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی ۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اس کو شارع تسلیم نہ کرلیا جائے کسی کام کا نہیں ۔ ۸۷

اسی طرح سر سیّد نے اپنے ایک خط مورخہ ۴ نومبر ۱۸۹۲ء بنام سید عبدالغنی، برادرِ اصغر مولانا سید میر حسن اور والد سیّد نذیر نیازی میں مرزا غلام احمد کی نبوت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

مرزا صاحب کی نسبت زیادہ کدو کاوش کرنی بے فائدہ ہے ۔ ایک بزرگ زاہد نیک بخت آدمی ہیں، جو کچھ بھی خیالات ان کے ہو گئے ہوں، بہت سے نیک آدمی ہیں جن کو اس قسم کے خیالات پیدا ہو چکے ہیں ۔ ہم کو اُن سے نہ کچھ فائدہ ہے نہ کچھ نقصان ۔ اُن کی عزت اور ان کا ادب کرنا بسبب ان کی بزرگی اور نیکی لازم ہے ۔ ان کے خیالات کی صداقت وغیر صداقت سے بحث محض بے فائدہ ہے ۔ ہمارے لیے مفید اعمال ہیں ۔ ان کے اچھے ہونے پر کوشش کرنی چاہیے ۔ ۸۸

سر سیّد نے مرزا غلام احمد کے بارے میں جو مشورہ مولانا سید میر حسن اور سید عبدالغنی کو دیا، وہ مختصراً یہی تھا کہ ان کے خیالات کی صداقت وغیر صداقت کے بارے میں ان سے جھگڑا، تکرار یا مناظرہ کرنا بے سود ہے ۔ وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے لیے ہیں اور ان کی بزرگی اور نیکی کے سبب ان کا احترام کرنا چاہیے ۔ اب اقبال کے والد شیخ نور محمد جو خود بڑے دین دار اور پارسا مسلمان تھے، ہر دنیوی یا دینی معاملے

میں مولانا سید میر حسن سے رجوع کیا کرتے تھے اور اقبال انہیں اپنا استاد اور مرشد تسلیم کرتے ہوئے ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے، اسی طرح سید عبدالغنی کو بھی چچا جان کہتے اور ان کی بے حد عزت کرتے تھے، تو عین ممکن ہے کہ اس ضمن میں سرسید کے مشورے اور مولانا سیّد میر حسن کے جذبات و احساسات سے شیخ نور محمد اور اقبال دونوں آگاہ ہوں۔ ویسے بھی اقبال ایک لحاظ سے سرسید کے مکتبۂ فکر سے وابستہ تھے۔ پس اقبال کے احمدیوں کے ساتھ ان مسائل پر جھگڑا، تکرار یا مناظرہ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے۔

دوسری وجہ کا تذکرہ اقبال نے خود کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ربع صدی پیشتر انہیں تحریک احمدیہ سے اچھے نتائج کی توقع تھی، اس لیے اس کے خلاف زبان نہ کھولی۔ بالفاظ دیگر انہیں امید تھی کہ قطع نظر احمدیوں کے عقائد کے ہو سکتا ہے وہ مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دیگر مسلم رہنماؤں کے ساتھ ملکر کام کریں۔ اور کچھ عرصہ تک ایسا ہوتا بھی رہا۔ دو ایک احمدی انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے۔ احمدی مقررین انجمن کے جلسوں میں تقریریں کرنے کے لیے مدعو کیے جاتے۔ اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں احمدیوں کی شمولیت پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا اور سر ظفر اللہ خان تو ایک سال مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ پنجاب کونسل کے انتخابات میں احمدیان قادیان اور لاہور نے اپنے اپنے ووٹ اقبال کے حق میں ڈالے تھے۔ پس مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی خاطر اقبال ان سے تعاون کرتے تھے۔ کئی احمدی (قادیان پارٹی اور لاہور پارٹی کے) ان کے قریبی دوست رہے۔ وہ ان کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے اور ان کے ساتھ مل جل کر علمی یا ملکی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بعض فقہی معاملات میں مولانا حکیم نور الدین (سلسلہ احمدیہ کے جانشین اوّل) کی رائے بھی لی۔ وہ مولانا حکیم نور الدین

کی عزت کرتے تھے، کیونکہ وہ مولانا سید میر حسن کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔

کیا یہ کہنا درست ہے کہ ۱۹۳۵ء سے قبل اقبال بقول خود تحریک احمدیہ سے اچھے نتائج کی توقع رکھتے ہوئے، قطع نظر احمدیوں کے عقائد کے، انہیں دائرہ اسلام سے خارج نہ سمجھتے تھے، بلکہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ تصور کرتے تھے؟ شیخ اعجاز احمد کے نزدیک اس سوال کا جواب ہے ''ہاں'' اور اس ضمن میں انہوں نے اپنا ایک تحقیقی نوٹ تیار کرکے راقم کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے جو قابل غور ہے۔ وہ راقم کے نام اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے اس نوٹ میں لکھا ہے اسے ان کی ذاتی رائے سمجھا جائے، نہ کہ جماعت احمدیہ کی۔ ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اقبال نے ۱۹۰۰ء میں ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''نظریہ توحید مطلق'' پیش کردہ شیخ عبدالکریم الجیلی'' تحریر کیا تھا جو بمبئی کے رسالہ ''انڈین انٹی کیوری'' میں شائع ہوا۸۹۔ اس مقالے میں بانی سلسلۂ احمدیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مرزا غلام احمد قادیانی موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے عظیم دینی مفکر ہیں۔

۲۔ ۱۹۰۹ء میں بعض فقہی مسائل کے حل کے سلسلے میں اقبال نے مولانا حکیم نور الدین سے رجوع کیا اور اقبال کے سوالات مع مولانا حکیم نور الدین کے جوابات اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ ۲۱ ؍دسمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئے۔۹۰

۳۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''مسلم کمیونٹی'' (جس کے بیشتر حصے کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے اردو میں ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان کے تحت کیا) ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں پڑھا تھا۔۹۱ اس مقالے میں انہوں نے جماعت احمدیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔

۴۔ ۱۹۱۱ء میں اقبال نے اپنے فرزند اکبر آفتاب اقبال کو، جو سیالکوٹ کے ایک مشن اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، قادیان بھیج کر وہاں کے تعلیم الاسلام اسکول میں داخل کرایا۔

۵۔ ۱۹۱۳ء میں اقبال کو ایک ذاتی معاملے میں شرعی فتویٰ کی ضرورت پڑی۔ ذاتی معاملہ یہ تھا کہ اقبال کا سردار بیگم سے نکاح ۱۹۱۰ء میں ہوا، لیکن رخصتی نہ ہوئی تھی بلکہ وہ دل میں انہیں طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے، مگر تین سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء میں وہ سردار بیگم کو گھر لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مشکل یہ تھی کہ چونکہ انہوں نے ایک مرحلے پر دل میں طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تھا، اس لیے شبہ تھا کہ کہیں طلاق وارد نہ ہو چکی ہو۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اقبال نے مرزا جلال الدین کو مولانا حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مولانا حکیم نورالدین نے کہا کہ شرعاً طلاق واقع نہیں ہوئی، لیکن اگر شبہ ہے تو نکاح کی تجدید کر لی جائے۔ اس پر سردار بیگم سے ازسرنو نکاح پڑھایا۔[۹۲]

۶۔ ۴ر مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مرزا بشیر الدین محمود (سلسلۂ احمدیہ کے دوسرے جانشین) نے ''مذہب اور سائنس'' کے موضوع پر اقبال کے زیر صدارت لیکچر دیا۔ بعد میں اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں قرآن مجید کی آیات سے ان کے استنباط کی خصوصی طور پر تعریف کی۔[۹۳]

۷۔ ۵ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو اقبال نے مرزا بشیر الدین محمود کے سیکرٹری کو ایک خط میں لکھا کہ چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور نیز بہت سے مستعد آدمی اس جماعت میں موجود ہیں۔ آپ بہت مفید کام مسلمانوں کے لیے انجام دے سکیں گے۔ اس خط کا عکس ''تاریخ احمدیت'' جلد ششم صفحہ ۶۵۴ پر شائع شدہ ہے۔

۸۔ ۲۵ر جولائی ۱۹۳۱ء کو نواب سر ذوالفقار علی خان کی کوٹھی واقع شملہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال، مرزا بشیر الدین محمود اور دیگر مسلم رہنما جمع ہوئے

اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اجلاس میں موجود سب اکابرین نے کمیٹی کا رکن بنا منظور کر لیا۔ مرزا بشیر الدین محمود کو اقبال ہی کی تجویز پر کمیٹی کی صدارت کی پیشکش کی گئی، کیونکہ بقول اقبال، ان کے پاس وسائل بھی تھے اور مخلص اور کام کرنے والے کارکن بھی۔۹۴

۹۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب اقبال انگلستان گئے تو ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مولوی فرزند علی امام احمدیہ مسجد لندن نے انہیں اور ان کے رفقا کو مسجد کی ایک تقریب میں مدعو کیا۔ غلام رسول مہر، اقبال کے ساتھ گئے روزنامہ ''انقلاب'' میں چھپی ہوئی تفصیل کے مطابق اقبال نو مسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن مجید سن کر خوش ہوئے۔ وہ خصوصی طور پر ایک نو مسلم انگریز نوجوان عبدالرحمٰن یارڈی کے حسن قرأت اور صحیح تلفظ سے محظوظ ہوئے۔ نیز ایک چھ سالہ انگریز بچی نے جب سورۂ فاتحہ پڑھ کر سنائی تو اقبال نے اسے ایک پاؤنڈ انعام دیا اور پھر مولوی فرزند علی کا شکریہ ادا کیا جن کی توجہ سے انہیں یہ موقع نصیب ہوا تھا۔۹۵

۱۰۔ ۷ر اپریل ۱۹۳۲ء کو انہوں نے چوہدری محمد احسن کے نام اپنے خط میں لکھا:

''باقی رہی تحریک احمدیت۔ سو میرے نزدیک لاہور کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو میں غیرت مند مسلمان جانتا ہوں اور ان کی اشاعت اسلام کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں، کسی جماعت میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ آپ کو خود کرنا چاہیے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے کئی طریقے ہیں، جن طریقوں پر اس وقت تک عمل ہوا، ان کے علاوہ اور طریق بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے عقیدہ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب (مرزا غلام احمد) نے اختیار کیا وہ زمانۂ حال کی طبائع کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہاں اشاعتِ اسلام کا جوش جو ان کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے، قابلِ قدر ہے۔۹۶

۱۱۔ انجمن حمایت اسلام کے ساتھ تقریباً تمام عمر اقبال کی وابستگی رہی۔ وہ اس کی

مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے اور صدر بھی۔ مجلس انتظامیہ میں دو ایک احمدی رکن بھی ہوتے تھے اور انجمن کے جلسوں میں احمدی مقررین بھی آ کر تقریریں کرتے تھے۔ محاذ آرائی سے قبل اقبال نے کبھی ان باتوں پر اعتراض نہ کیا تھا۔ اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں احمدیوں کی شمولیت پر بھی اقبال کی طرف سے کبھی اعتراض نہ ہوا، بلکہ ایک سال تو سر ظفر اللہ خان مسلم لیگ کے صدر رہے، مگر اقبال نے کوئی مخالفت یا احتجاج نہ کیا۔

۱۲۔ ۱۹۲۶ء کی پنجاب کونسل کے انتخابات میں سر ظفر اللہ خان ایک مسلم حلقے سے منتخب ہوئے۔ اسی سال اقبال بھی پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ کونسل میں دونوں نے سر فضل حسین کی قائم کردہ یونینسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کی۔ اقبال کی طرف سے سر ظفر اللہ خان کے ایک مسلم حلقے سے منتخب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

شیخ اعجاز احمد اپنے نوٹ میں تحریر کرتے ہیں:

مندرجہ بالا حقائق اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ ۱۹۳۵ء کے آغاز تک اقبال کے نزدیک احمدی دائرہ اسلام سے خارج نہ تھے۔ مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت کی تحریکوں میں علامہ نہ صرف ان سے تعاون کرتے تھے بلکہ تحریک آزادی کشمیر میں جماعت احمدیہ کے امام کو تحریک کی قیادت بہ اصرار سونپی تھی۔ ان دنوں تو تعصب کا دور دورہ ہے، لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت جو، بقول علامہ اقبال اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی، ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں، دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہوگئی۔

اب تک کی گئی بحث سے دو باتیں صاف عیاں ہیں۔ ایک یہ کہ ۱۹۳۵ء سے قبل بھی اقبال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر احمدی عقائد کو کبھی نہ کبھی اپنی تنقید کا

نشانہ بناتے رہتے تھے۔ دوسری یہ کہ ۱۹۳۵ء سے قبل اقبال احمدیوں کو، قطع نظر ان کے عقائد کے، مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔ احمدیت کے متعلق اپنے گذشتہ رویے کا ان کے پاس یہی جواب تھا کہ وہ اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع رکھتے تھے یا یہ کہ انہیں بحیثیت ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کے احمدیت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لینے کا حق حاصل تھا۔

۱۹۳۵ء میں اقبال نے احمدیت کے متعلق اپنی رائے کیوں تبدیل کی؟ شیخ اعجاز احمد کے نزدیک اس کی وجوہات کچھ تو سیاسی تھیں اور کچھ ذاتی۔ پیشتر اس کے کہ راقم اپنا تجزیہ پیش کرے، اس زمانے کے واقعات کے متعلق شیخ اعجاز احمد کے ذاتی علم، یادداشت اور تحقیق پر مبنی ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے قیام اور اس کی صدارت جماعت احمدیہ کے امام کے سپرد کیے جانے کا مجلس احرار کے قائدین کو بڑا قلق تھا۔ مجلس احرار کانگرس سے ساز باز کرنے کے سبب مسلمانوں میں مقبولیت کھو چکی تھی۔ پس اپنی ساکھ دوبارہ قائم کرنے کے لیے وہ بھی کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی کی حمایت میں آگے بڑھی، لیکن کشمیری لیڈر اور عوام احراریوں کو گھاس نہ ڈالتے تھے۔ اس سلسلے میں احراری لیڈر چوہدری افضل حق اپنی تصنیف ''تاریخ احرار'' میں تحریر کرتے ہیں:

اس دوران میں کشمیر پھر دیوار گریہ بن گیا۔ سرینگر نے خون شہدا کے باعث کربلا کی سی صورت پیش کی۔ ابھی ہماری (یعنی احراریوں کی) سست فکری کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ کچھ عافیت کوش مسلمان شملے کی بلندیوں سے بادل کی طرح گرجے (کشمیر کمیٹی کے قیام کی طرف اشارہ ہے) ان خانہ برباد رؤسا اور امرا (یہ اشارہ برصغیر کے ان مسلم رہنماؤں بشمول اقبال کی طرف ہے جو شملہ کانفرنس میں شامل تھے) نے یہ غضب ڈھایا کہ مرزا بشیر محمود کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ جمعیت العلماء نے ستم یہ کیا کہ

س بشیر کمیٹی سے تعاون کا اعلان کر دیا۔ ۹۷

تحریک آزادی کشمیر کو کامیاب بنانے کی غرض سے کشمیر کمیٹی اور مجلس احرار کے درمیان کوئی سمجھوتا کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں سر سکندر حیات کے مکان پر ایک میٹنگ بھی ہوئی جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ مرزا بشیر الدین محمود اور چوہدری افضل حق، شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں چوہدری افضل حق جوش میں آ گئے۔ اس واقعے کا ذکر وہ اپنی تصنیف ''تاریخ احرار'' میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے کہا مرزا صاحب کوئی الیکشن ایسا نہیں گزرا، جس میں مرزائیوں نے میرے خلاف ایڑی چوٹی کا زور نہ لگایا ہو...... ہمارا بھی خدا کے فضل سے فیصلہ ہے کہ اس جماعت کو مٹا کر چھوڑیں گے۔ ۹۸

شیخ اعجاز احمد کا استدلال یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کی امداد کو پس پشت ڈالتے ہوئے احراریوں کا اوّلیں مشن یہ قرار پایا کہ چونکہ جماعت احمدیہ نے ہر الیکشن میں چوہدری افضل حق کی مخالفت کی ہے، اس لیے اس جماعت کو مٹا دیا جائے اور کشمیر کمیٹی کو ختم کر کے کشمیریوں کی امداد کے لیے برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی جائے۔ اقبال کو چونکہ عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل تھی اور وہ کشمیر کمیٹی کے رکن بھی تھے، اس لیے احراریوں کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ کسی طرح اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں رخنہ اندازی کی جائے۔ اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے پہلے تو اپنی روایتی شورہ پشتی سے اقبال کو ڈرانے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں اقبال مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں انہوں نے اپنا معروف خطبۂ صدارت پڑھا جس میں کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی اور کشمیر کمیٹی کے مساعی کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ اگلے روز جب اقبال مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تو احراریوں نے ان کے پنڈال

میں داخل ہوتے ہی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔اس مظاہرے کی رپورٹ ''انڈین اینول رجسٹر'' مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۳۲ء (انگریزی) میں ان الفاظ میں درج ہے:

آج کانفرنس کا آخری اجلاس شورہ پشتی کے مظاہروں کی نذر ہوگیا۔ اجلاس کی کارروائی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی اور جونہی سر محمد اقبال پنڈال میں داخل ہوئے، ان کے ساتھ احراریوں کے ایک بڑے گروہ نے بھی داخل ہونے کی کوشش کی، جنہیں روک دیا گیا۔اس پر کانفرنس کے والنٹریوں اور احراریوں میں گیٹ پر باقاعدہ رسہ کشی شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں باہم لاٹھیاں چلیں اور خشت باری ہوئی۔ بالآخر پولیس نے مداخلت کر کے مظاہرین کو منتشر کر دیا، لیکن جونہی پولیس ہٹی شورہ پشتی پھر شروع ہوگئی اور کانفرنس کی کارروائی بغیر کسی بحث و تقاریر کے جلد جلد ریزولوشن پاس کرنے کی شکل میں تبدیل ہوگئی اور تمام ریزولوشنز انتہائی عجلت کے ساتھ اس صورت حال میں پاس ہوئے کہ پنڈال کے باہر مجمع (احراریوں کا) پنڈال میں بزور داخل ہونے کے لیے کوشاں تھا اور مختلف قسم کے نعرے لگا رہا تھا۔

شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال کے خلاف شورہ پشتی کے اس مظاہرے کے ذریعے جس سے ان پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ عام مسلمانوں میں آپ کی مقبولیت کے باوجود آپ پر خشت باری بھی کرائی جا سکتی ہے، احراریوں نے ان کے ساتھ مفاہمت کی طرح ڈالی۔ اس ضمن میں مجلس احرار کا ایک ماہنامہ لکھتا ہے:

حضرت امیر شریعت (سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری) ڈاکٹر اقبال کو مرشد اور ڈاکٹر اقبال، حضرت شاہ صاحب کو پیر جی کہا کرتے تھے۔ کشمیر کمیٹی کے سلسلے میں ان دونوں کے درمیان چوہدری افضل حق کی معیت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور طے پایا کہ بشیر الدین محمود احمد اور عبدالرحیم درد کو اگر ان کی موجودہ ذمہ داری سے نہ ہٹایا گیا تو کشمیر کے تیس لاکھ مظلوم مسلمان کفر و ارتداد کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تحریک

آزادیٔ کشمیر کی باگ ڈور مجلس احرار کے سپرد کردی جائے۔۹۹

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق کی اقبال کے ساتھ ملاقاتوں میں جو فیصلہ کیا گیا اس کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں ۴ مئی ۱۹۳۳ء کے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ایک خبر شائع کرائی گئی کہ کشمیر کمیٹی کے ارکان نے صدر کمیٹی کو ایک درخواست بھیجی ہے کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی مسلمان ہونا چاہیئے۔اس خبر کی اشاعت کے بعد اقبال اور دس دیگر اراکین کشمیر کمیٹی کے دستخطوں سے مرزا بشیر الدین محمود کو ایک خط موصول ہوا کہ پندرہ دنوں کے اندر کشمیر کمیٹی کا اجلاس عہدہ داران کمیٹی کے انتخاب کے لیے بلایا جائے۔انہوں نے ۷ مئی ۱۹۳۳ء کو کشمیر کمیٹی کا اجلاس بلوایا اور انتخاب عہدہ داران کے لیے راستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفا پیش کر دیا، جس پر اقبال کو ان کی جگہ عارضی صدر کشمیر کمیٹی منتخب کیا گیا۔پس احراریوں نے اس چال سے مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیٰحدہ کیا۔بہر حال اقبال کے ساتھ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق کی ملاقاتوں کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ اقبال مجلس احرار کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔اس کا اعتراف چوہدری افضل حق نے اپنی تصنیف ''تاریخ احرار'' میں بھی کیا ہے۔فرماتے ہیں:

میں اس پیدا شدہ صورت حال سے گھبرا گیا اور لاہور پہنچا۔میں نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی تانگے پر سوار پریشان جا رہے ہیں۔پوچھا کدھر کا عزم ہے۔کہا کہ مرزا کی قیادت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوگی۔میں شہر کے علماء سے ملکر ان کی قیادت کے خلاف اعلان کرنا چاہتا ہوں...... اسی دن یا اگلے دن علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں محمڈن ہال میں عمائدین شہر کا جلسہ تھا، جس میں کشمیر کی اوس پڑی قسمت زیر غور تھی۔مولانا ظفر علی خان، غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمڈن ہال گئے۔خیال یہ تھا کہ کوئی تدبیر لڑا کر مرزا بشیر کی کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے

حق میں اُن لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقۂ اولیٰ سے متعلق تھے۔ وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ بسورتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہرحال ہم بہ زوری و بہ زاری ان کا اعلان اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہوگئے۔ بس تھوڑی سی کھڑے ہونے کی جگہ ملی تھی۔ بیٹھنے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کرنے کے لیے ہمت درکار تھی۔ [۱۰۰]

مزید لکھتے ہیں:

علامہ سر محمد اقبال کشمیر کمیٹی کے ضرور ممبر ہوگئے تھے، لیکن یہ کیفیت اضطراری تھی۔ وہ فوراً سنبھل کر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں لگ گئے اور احرار کی تنظیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ [۱۰۱]

بقول شیخ اعجاز احمد ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے مجلس احرار کی تحریک احمدیت کی مخالفت میں خالصتاً سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ احراریوں نے نہرو رپورٹ کی تائید یا کانگرس کی حمایت کے سبب مسلمانوں میں اپنی مقبولیت کھو دی تھی اور اس مقبولیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر احمدیت کی مخالفت کرنا ایک آسان اور کارگر ہتھیار تھا۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خان کا مقصد یوں مسلمانوں سے مالی منفعت حاصل کرنا بھی تھا[۱۰۲]۔ مزید برآں سر سکندر حیات کے مکان پر جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں چوہدری افضل حق نے برملا کہہ دیا تھا کہ چونکہ احمدیوں نے ہر الیکشن میں ان کی مخالفت کی ہے اس لیے وہ اس جماعت کو مٹا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ پس احراری اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر حربے سے کام لے رہے تھے۔ اقبال کو استعمال کر کے ان سے احمدیت کے خلاف بیان دلوانا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کی تائید عبدالمجید سالک کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اقبال کے احمدیوں کے خلاف پہلے بیان کے پس منظر کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف

ایک عام تحریک کا آغاز کیا...... خدا جانے علاّمہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا، جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔ ۱۰۳

شیخ اعجاز احمد اپنے نوٹ میں لکھتے ہیں کہ عبدالمجید سالک کو خوب علم تھا کہ اقبال کے یہ عقیدت مند بزرگ کون تھے، لیکن انہوں نے 'خدا جانے' کے الفاظ سے اُن کی پردہ پوشی کر دی ہے۔ اس زمانے میں اقبال کے مصاحبوں میں دو ایک عقیدت مند ایسے بھی تھے جنہیں سلسلۂ احمدیہ سے ذاتی عناد تھا اور اس کی تائید میں ناقابل تردید شہادت اُن کے پاس موجود ہے۔

شیخ اعجاز احمد مزید لکھتے ہیں:

سخت کلامی عام طور پر علاّمہ اقبال کا شیوہ نہ تھا۔ تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر دعا کی تھی کہ میری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے اور حتی الامکان وہ ایسا کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ سوائے اس کے کہ کبھی مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑے۔ سلسلۂ احمدیہ کے خلاف ۱۹۳۵ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی معاملے میں ان کا احساس محرومی کارفرما نہ ہوتا اور اس مرتبہ تو ان کے احساس ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی، کیونکہ دوچار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں سر فضل حسین وائسرائے ہند کی کونسل کے رکن چار ماہ کی رخصت پر گئے، ان کی جگہ علاّمہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا، لیکن وزیر ہند نے چوہدری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل، ۱۹۳۵ء میں ختم ہونے والی تھی، چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ ان کی جگہ کام کر چکے تھے اس لیے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا۔ ان کی تقرری کے خلاف احراریوں اور

روزنامہ ''زمیندار'' نے زبردست پراپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ ''زمیندار'' نے ایک کھلا خط زیرعنوان ''مکتوب مفتوح بنام نائب السلطنت کشورِ ہند شائع کیا جس میں لکھا کہ چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی ہیں اور قادیانیت ہرگز اسلام کا کوئی فرقہ نہیں، بلکہ بالکل علیحدہ مذہب ہے، اس لیے سر فضل حسین کی جگہ ان کو نہ مقرر کیا جائے، بلکہ اور کسی ایسے جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب رفیع سپرد کیا جائے جو مسلمانانِ ہند کے اعتماد کا حامل ہو۱۰۴۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جارہا تھا۔ علاّمہ کے معتقد صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) کی روایت ہے کہ جن دنوں میاں فضل حسین کے جانشین کے تقرّر کا معاملہ زیرِ غور تھا، لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند نے ایک ملاقات میں علاّمہ کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے، سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ ممکن ہے احراریوں اور ''زمیندار'' کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیر ہند سے علاّمہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انہیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی ہو، لیکن وزیر ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ واللہ اعلم۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چودھری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی ۱۹۳۵ء میں انہوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعت احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ علاّمہ اقبال کو اللہ تعالےٰ نے اور تو کئی نعمتوں سے نوازا تھا، لیکن مالی فراغت اور آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں کچھ تو ان کی علالت کے باعث اور کچھ سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے آمدنی اور بھی محدود ہو گئی۔ بس لشتم پشتم گزر ہوتی تھی، تلی میں آیا، گلی میں کھایا والا حال تھا۔ وہ خود تو بڑے قناعت پسند اور تہی کیسہ و خورسند رہنے والے تھے، لیکن آٹے دال کا بھاؤ تو گھر داری کا انتظام کرنے والی خاتون خانہ کو معلوم ہوتا ہے، وہ گاہے گاہے اس بات پر ان سے الجھتی رہتی تھیں کہ یا تو ڈھنگ

سے وکالت کریں یا کہیں ملازمت کرلیں۔علامہ اقبال دل سے ملازمت کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر چاہتے تھے کہ اگر کوئی مناسب انتظام ہو سکے تو ملازمت کرلیں، لیکن کوئی مناسب انتظام نہ ہو سکا۔ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دنوں میں اخبار کے ایک نمائندے نے ان کی ۱۹۱۰ء والی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان سے دریافت کیا کہ آپ تو اس فرقے کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ سمجھتے تھے۔علامہ نے جواب میں اعتراف کیا کہ پچیس سال پہلے انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی امیدیں تھیں، لیکن انہیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانی اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔۱۰۵ بانی سلسلۂ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔نہ کوئی احمدی بانی سلسلۂ احمدیہ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے برتر یقین کرتا ہے۔حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انہیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزو ایمان ہے۔حضور رسالت مآب کی نبوّت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشق رسوؐل کو ایکس پلائٹ کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کرلیا۔اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ علامہ میں بچوں والی معصومیت اور بھولپن بھی تھا۔وہ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کیے یقین کرلیتے۔اس کی ایک مثال جس نے انہیں بڑی مشکل سے دوچار کیا مولانا سالک کی ''ذکر اقبال'' میں بیان کی گئی ہے، (صفحات ٦٧ تا ٧٠) یعنی اقبال کا سردار بیگم سے ۱۹۱۰ء میں نکاح کرنا، لیکن ان کے بارے میں بعض گمنام خطوں پر یقین کرتے ہوئے انہیں گھر نہ لانا۔پھر اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر تین سال بعد از سرِ نو نکاح کر کے انہیں گھر لانا۔۱۹۲۲ء میں کسی حاشیہ نشین نے گپ ہانکی کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد استالین مقرر ہوا ہے۔علامہ نے

باور کرلیا اور بڑے شوق سے یہ خبر اپنے بھائی کو خط میں لکھی ۱۰۶۔ ۱۹۲۶ء میں کسی ملنے والے سے سُنا کہ البانیہ میں مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو کرنا غیر ضروری قرار دے دیا ہے، دوسرے نے ترکی میں نماز میں تبدیلیوں کی خبر سنائی۔ تیسرے نے کہا مصر میں بھی ایسی تحریک جاری ہے۔ علامہ ان خبروں سے دل گرفتہ ہوئے اور بڑے افسوس سے سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے جواباً اطمینان دلایا کہ خبریں غلط اور بے اصل ہیں ۱۰۷۔ معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہر کرتے ہوئے کہہ دیا ہوگا کہ احمدی بانی سلسلۂ احمدیہ کو (نعوذ باللہ) حضور رسالت مآبؐ سے برتر مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا، حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی اور تحقیق کے لیے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح ایک معتقد نے جو آخری ایام میں ان کے بہت قریب تھے غلط قصہ گھڑا کہ جماعت احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہوسکتا ہے، خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں شرط صرف یہ ہے کہ وہ احمدیوں کے خلیفہ کی بیعت کرلے ۱۰۸۔ غرضیکہ ان دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں ان کے حضور بیان کی جاتیں اور باور کرلی جاتیں۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے:

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

اگرچہ شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال اور احمدیت کے موضوع پر جو کچھ بھی انہوں نے تحریر کیا وہ ان کی ذاتی رائے ہے جو اس زمانے کے واقعات کے متعلق ان کے ذاتی علم، یادداشت اور تحقیق پر مبنی ہے، لیکن تقریباً اسی قسم کی رائے کا اظہار احمدی حلقوں، سر فضل حسین یا ان کے فرزند عظیم حسین نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے ۱۰۹۔ پس اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ احمدیت کی طرف اقبال

کے روّیے میں تبدیلی کے متعلق احمدی یا یونینسٹ حلقے صرف یہی نقطۂ نظر پیش کر سکتے تھے کہ اس کا سبب اقبال کی سیاسی اور ذاتی اغراض تھیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تبدیلی کے متعلق اقبال کا اپنا نقطۂ نظر کیا تھا اور وہ قبول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

ایک نکتہ جسے پوری طرح سمجھے بغیر بحث کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا، یہ ہے کہ اقبال نے کبھی بھی سیاست کو دین سے الگ تصوّر نہ کیا۔ ان کے سوانح حیات کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ سیکولر سیاست کے قائل نہ تھے اور نہ کبھی اس میں ملوّث ہوئے۔ ان کے ہاں سیاست سے مراد مسلمانان برصغیر کے مفادات کا بہر صورت تحفظ تھا۔ ملت اسلامیہ کے اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور سالمیت کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے اور یہ جذبہ شروع سے لے کر آخر تک ان کے دل و دماغ پر حاوی رہا۔ پس اقبال کے ضمن میں جب سیاست کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس کے معانی ہوں گے مسلمانانِ برصغیر کے مفادات کا تحفظ، کیونکہ یہی تمام عمر اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض رہی۔

اس مرحلے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء سے قبل ختم نبوّت کے مسئلے پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے کے باوجود اقبال کے جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دینے میں کیا سیاسی مصلحت تھی؟ بالفاظ دیگر اگر بقول اقبال، انہیں تحریک احمدیہ سے اچھے نتائج کی توقع تھی، تو وہ اچھے نتائج کیا ہو سکتے تھے۔ برّصغیر کے بیشتر علماء نے تو ابتداء ہی سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی طرح ختم نبوّت اور دیگر متعلقہ مسائل کے بارے میں بھی احمدی عقائد پر شدید اعتراضات کے باعث ان کا مطالبہ تھا کہ احمدیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں عام مسلمان بھی احمدیوں کو غیر مسلم سمجھنے لگے تھے۔ بقول سید شمس الحسن ۱۹۳۱ء میں جب سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو دہلی کے مسلمانوں نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا کیونکہ وہ

سر ظفر اللہ خان کو احمدی ہونے کی وجہ سے غیر مسلم سمجھتے تھے۔ چنانچہ مزید مظاہروں کے خوف سے لیگ کا سالانہ اجلاس فتح پوری سکول ہال کے بجائے سید نواب علی نامی ایک ٹھیکے دار کے گھر میں منعقد کیا گیا۔۱۰ یہ سب حقایق اقبال کے علم میں تھے، لیکن اس کے باوجود وہ خاموش کیوں رہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال سر سید کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اور چونکہ سر سید احمد خان مولانا سید میر حسن اور اقبال کے والد شیخ نور محمد کے نزدیک احمدیوں سے متنازعہ مسائل پر جھگڑا، تکرار یا مناظرہ کرنا ملت اسلامیہ میں مزید انتشار کا سبب بن سکتا تھا، اس لیے اقبال نے کم از کم مولانا سید میر حسن (وفات ۱۹۲۹ء) یا شیخ نور محمد (وفات ۱۹۳۰ء) کی زندگی میں احمدیوں سے کسی بھی قسم کا مناظرہ کرنے سے احتراز کیا، گو وہ ان مسائل سے متعلق، جب بھی موقع ملا، احمدی عقائد کو ناقص قرار دیتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کرتے رہے۔

تحریک احمدیہ ایک عرصے سے دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، یعنی احمدیانِ قادیان اور احمدیان لاہور۔ احمدیان قادیان بانی سلسلۂ احمدیہ کو نبی اور مسیح موعود تسلیم کرتے ہیں۔ عام مسلمانوں کو جو ان کا موقف قبول نہ کریں، کافر سمجھتے ہیں اور ان کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوتے، نہ ان کے ساتھ رشتے ناطے کرتے ہیں۔ احمدیان لاہور بانی سلسلۂ احمدیہ کو مجدد مانتے ہیں اور عام مسلمانوں کی، جو ان کا موقف قبول نہ کریں، تکفیر کے قائل نہیں ہیں۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے قیام سے پیشتر چونکہ تحریک کی دونوں شاخوں سے تعلق رکھنے والے احمدی، مسلمانان برصغیر کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لیے جدوجہد میں شامل تھے، اس لیے بھی اقبال نے ان پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہی وہ دور تھا جب احمدی انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے، انجمن کے اجلاسوں میں بحیثیت مقرر مدعو کیے گئے۔ مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس ایسی مسلم سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کی یا سر ظفر اللہ خان

ایک مسلم حلقے سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل کے ممبر بنے اور بعد میں مسلم لیگ کے صدر چنے گئے۔

اقبال کو تحریک احمدیہ سے کس قسم کے اچھے نتائج کی توقع تھی کہ انہوں نے ۱۹۰۰ء میں بانی سلسلۂ احمدیہ کے متعلق فرمایا کہ وہ موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے عظیم دینی مفکر ہیں یا ۱۹۱۰ء میں فرمایا کہ فرقہ قادیانی اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ ہے یا ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا کہ ''اشاعت اسلام کا جوش جو جماعت احمدیہ کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے، قابل قدر ہے'' توقع یہی ہو سکتی تھی کہ تحریک احمدیہ جب سن بلوغ تک پہنچے گی، تو ممکن ہے عامتہ المسلمین کی تکفیر کے جوش و خروش سے نکل کر انہی میں واپس آ جائے، انہی کی فلاح و بہبود کو اپنا شعار بنائے اور اس کے رہنما بھی آغا خان کی طرح اپنی جاعت کے اراکین کو ہدایت دیں کہ تم مسلمان ہو، مسلمانوں ہی کے ساتھ مل کر رہو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اپنے کردار کو اسلامی سیرت کا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرو تا کہ اشاعت اسلام کے لیے تمہارے جوش سے ہر کوئی متاثر ہو۔ بہر حال اس خوش فہمی کا وجود بھی اقبال کی ملت اسلامیہ کے ساتھ گہری وابستگی اور نا قابل بیان محبت کا آئینہ دار تھا۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں اقبال کو تحریک احمدیہ کے ارکان کے ساتھ کام کرتے وقت کس قسم کا تجربہ حاصل ہوا؟ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر کیے گئے تھے اور سیکرٹری عبد الرحیم درد (یعنی دونوں اہم عہدے احمدیوں کو سونپے گئے تھے) ان کے علاوہ کمیٹی کے دیگر ارکان مسلمان بھی تھے اور احمدی بھی۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں کمیٹی قائم کرتے وقت چونکہ خیال تھا کہ یہ ایک عارضی تنظیم ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کا دستور وضع کرنے یا قواعد و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ صدر اور سیکرٹری کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ دو ایک برس میں احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور

اس کے ذریعے ان کا اصل مقصد کشمیری مسلمانوں کو احمدی بنانا ہے اب شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ سب احمدیوں کے خلاف احراریوں کا پراپیگنڈا تھا اور ان کے دباؤ یا ڈرانے دھمکانے کے پیش نظر اقبال جیسی شخصیت نے بھی اس الزام کو درست تسلیم کرلیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جماعت احمدیہ کے ممبران اپنے عقیدے کی نشرو اشاعت یا تبلیغ میں جوش وخروش کے اظہار کی وجہ سے مشہور یا بدنام نہیں ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس تہمت پر یقین کرنے والے حق بجانب بھی سمجھے جاسکتے تھے۔

بہر حال کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے، جن میں اقبال بھی شامل تھے، تجویز پیش کی کہ چونکہ کمیٹی کو بحیثیت ایک تنظیم ابھی کچھ مدت تک قائم رکھنا پڑے گا، اس لیے اس کی خاطر دستور اور قواعد وضوابط وضع کر لینے چاہئیں تاکہ ہر کام ان کے مطابق انجام دیا جاسکے اور کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی، کیونکہ ان کی دانست میں اس کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ پس اس مرحلے پر مرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے، لیکن شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احراریوں نے اقبال کے ساتھ سازش کر کے فیصلہ کیا تھا کہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کیا جائے چنانچہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں خبر شائع کرائی گئی کہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی مسلمان ہونا چاہیے اور اس کے بعد مرزا بشیر الدین محمود کو کمیٹی کا اجلاس برائے انتخاب عہدہ داران بلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔ انہوں نے وہ اجلاس بلوایا اور انتخاب عہدہ داران کے لیے رستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا کشمیری مسلمانوں میں احمدی عقیدے کی تبلیغ کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے احمدی ارکان نے کوئی قدم اٹھایا؟ جواب ہے: نہیں۔ اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنا استعفا

پیش کر دیا تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر منتخب کیا گیا، اور جب اقبال نے کمیٹی کے دستور کا مسوّدہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان نے ان کی مخالفت کی، بلکہ دوران بحث اقبال پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں کی اکثریت کی بنا پر وضع کیے ہوئے کسی دستور کے پابند نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ تو وہی کریں گے جو ان کے امیر کا حکم ہوگا۔ بالفاظ دیگر احمدی بظاہر کشمیر کمیٹی کو قائم رکھتے ہوئے اسے اندر سے دو حصوں یعنی مسلمانوں اور احمدیوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صورت حال اقبال کے لیے نا قابل قبول تھی، اس لیے انہوں نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی اور کشمیر کمیٹی بنائیں جو صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو، لیکن شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال احراریوں کے ایماء پر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں مصروف ہو گئے اور احراریوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ خیر یہ بحث تو بعد میں کی جائے گی کہ اقبال کی نگاہ میں احراریوں کی حیثیت کیا تھی اور اگر انہوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی بھی تو وہ کس اضطراری کیفیت یا مصلحت کے تحت کی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعد میں احمدیوں نے "تحریک کشمیر" کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت پیش کی لیکن اقبال نے اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اپنے ایک بیان مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا:

قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں

منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پر لیس ''تحریک کشمیر'' کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار ''الفضل'' مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔[111]

شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے ایام میں جب اقبال سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ تو اس فرقے کو 'اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' سمجھتے تھے، تو جواب میں انہوں نے اعتراف کیا کہ پچیس برس پیشتر انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات تھیں لیکن انہیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانی اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں نے انہیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی تھی، لیکن افسوس ہے شیخ اعجاز احمد نے اس ضمن میں اقبال کا پورا فقرہ درج نہیں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں:

ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے متعلق اس وقت شبہات پیدا ہوئے جب ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا، جو بانی اسلام کی نبوت سے بھی برتر تھی اور تمام عالم اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بعد ازاں میرے شبہات نے اس وقت مکمل بغاوت کی صورت اختیار کر لی جب میں نے اپنے کانوں سے اس تحریک کے ایک رکن کو پیغمبر اسلام کے بارے میں نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔[112]

پس یہ محض احراریوں یا حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے کا نتیجہ نہ تھا۔ اقبال کے اپنے کان بھی تو تھے جنہیں وہ سننے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے بقول شیخ اعجاز احمد، بانی سلسلۂ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو اور نہ کوئی احمدی، بانی سلسلۂ احمدیہ کو سرکار

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے برتر یقین کرتا ہو، مگر کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے میں یہی تو قباحت ہے کہ یوں بعد کی نئی نبوت کی برتری کے اظہار کی طرح ڈالی جاسکتی ہے یا ایسے منفی انداز فکر کے لیے دروازہ کھل جانے کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ شیخ اعجاز احمد یا دیگر احمدیوں کا عقیدہ وہی ہو جو انہوں نے بیان کیا ہے، لیکن جس بدبخت کی باتوں کو اقبال نے اپنے کانوں سے سنا، وہ بھی تو اپنے آپ کو تحریک احمدیہ کا رکن ہی سمجھتا تھا۔

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ اقبال اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کے یقین کر لیتے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبال کے بھولپن کی تین مثالیں پیش کی ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ تحریک احمدیہ کے عقائد کے متعلق بھی انہوں نے سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیا تھا۔ راقم کی رائے میں ایک ایسا شخص جو ہندو رہنماؤں یا انگریز حاکموں کی سیاسی چالوں کو پوری طرح سمجھتا ہو، جن کی یخ بستہ منطق نے واضح کیا ہو کہ مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ نیابت کے مطالبے کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں، جو ایک تجربہ کار وکیل کی حیثیت سے انفرادی یا اجتماعی لین دین کے معاملات میں اپنی فلسفہ دانی یا شاعرانہ تخیل کے باوجود عملی اور کاروباری قسم کا آدمی ہو، اس سے ایسی معصومیت یا بھولپن کی توقع رکھنا یا یہ سمجھنا کہ اس نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے احمدیت کے خلاف بلاوجہ شور مچا دیا، قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد، اقبال کے تمام سوانح حیات میں غالباً یہی تین مثالیں ان کے بھولپن کی پیش کر سکتے تھے، مگر راقم کے نزدیک یہ مثالیں اقبال کے بھولپن کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً سردار بیگم کے ساتھ نکاح کے بعد بعض گمنام خطوں پر ان کا یقین کر لینا اور پھر اپنی غلطی پر پشیماں ہونا، ان کا بھولپن ظاہر نہیں کرتا بلکہ ذہنی اضطراب یا بے چینی کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کیونکہ

ان کی پہلی شادی ناکام رہی تھی اور وہ دوسری بار ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کرتے ہوئے انہوں نے یقین کرلیا کہ روس کا نیا صدر محمد استالین مسلمان ہے، اس سلسلے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انہیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈا کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈا سرحدیں عبور کرکے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔ اقبال نے غالباً اسی پراپیگنڈے سے متاثر ہوکر اپنے بڑے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی ہو، لیکن بعد میں تحقیق پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس زمانے میں مغربی پریس دنیائے اسلام کی اس قسم کی غلط خبروں کی تشہیر بطور پالیسی کیا کرتا تھا کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو اڑا دیا، یا کسی مسلم ملک میں نماز میں تبدیلیاں کردی گئیں یا ایسی تحریک دیگر مسلم ممالک میں بھی جاری ہے۔ اس پراپیگنڈے کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا یا اس میں انتشار پھیلانا تھا اور اس قسم کا طرزِ عمل آج بھی یہودنواز مغربی پریس اختیار کرلیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسی خبروں سے اقبال کا دل گرفتہ ہونا ان کے بھولپن یا معصومیت کا ثبوت فراہم نہیں کرتا بلکہ ملت اسلامیہ کے متعلق ان کی فکرمندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر کمیٹی میں اقبال اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ احمدیوں کے مخالفین نے جن میں احراری بھی شامل تھے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال کو ان کے عقائد کے متعلق بے سروپا باتیں یا غلط قصے گھڑ کر سنائے ہوں۔

شیخ اعجاز احمد سمجھتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے قیام کے دوران میں اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں احراری رخنہ انداز ہوئے اور انہوں نے اقبال کو ڈرا دھمکا کر اپنے ساتھ مفاہمت کرنے کی راہ ہموار کی۔ پس اسی مفاہمت کے پس منظر میں

اقبال اور احراریوں کی سازش کے ذریعے مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے الگ کیا گیا اور بعد میں اقبال مجلس احرار کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ بقول ان کے، احراریوں نے احمدی عقائد کے متعلق بے بنیاد باتیں تراش کر اقبال کے عشق رسول کو ایکس پلائیٹ کرتے ہوئے انہیں احمدیت کے خلاف بھڑکایا اور اقبال نے بغیر تحقیق کیے ان کی باتوں کو درست تسلیم کر لیا۔ اس مرحلے پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا اس معاملے میں اقبال اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کے قابل نہ رہے تھے کہ ان کی موم کی ناک کو احراری یا حاشیہ نشین جس طرف چاہتے موڑ سکتے تھے؟ اور دوسرا یہ کہ اقبال کے نزدیک احراریوں کی حیثیت در حقیقت کیا تھی؟

پہلے سوال کا جواب تو کشمیر کمیٹی میں احمدیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں اقبال کا ذاتی تجربہ تھا اور اس ضمن میں ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال احمدیوں سے من حیث الجماعت ۱۹۳۳ء میں مایوس ہوئے، لیکن انہوں نے تحریک احمدیہ کے خلاف اپنا پہلا بیان دو سال بعد ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ احراریوں کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی اور جب اقبال کشمیر کمیٹی میں احمدیوں سے مایوس ہوئے تو عین ممکن ہے کہ احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ یہ صورت حال دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کا ذریعہ بنتی تھی، مگر اس صورت حال کے صحیح تجزیے کے لیے تین چار دیگر امور بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں، جنہوں نے مستقبل میں بالخصوص پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا۔ یہ امور تھے: کمیونل ایوارڈ، محمد علی جناح کے ہاتھوں ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کا احیاء، ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کا مسئلہ، سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں درپیش خطرات، ان امور کے پس

منظر میں محمد علی جناح ، اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں احراریوں ، یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے ۱۹۳۵ء تک جو شکل اختیار کی، ان کی روشنی ہی میں اقبال کے تحریک احمدیہ کے خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبال اور مجلس احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا۔ مجلس احرار خلافت کمیٹی کی کوکھ سے نکلی تھی اور نظریات کے اعتبار سے جمعیت العلماء ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگرس کی ہم نوا تھی۔ احراری قائدین نے عام طور پر اقبال اور ان کے نظریات کی مخالفت کی تحریک کشمیر اور بعد میں احمدیوں کے خلاف تحریک کے دوران میں احراریوں کو پنجاب میں کچھ مقبولیت حاصل ہوئی، مگر تحریک مسجد شہید گنج کے دوران میں مجلس احرار نے خاموشی اختیار کر کے مسلمانان پنجاب کی ہمدردیاں کھو دیں۔ مجلس احرار پارلیمانی سیاسی جماعت کبھی بھی نہ بن سکی۔ وہ محض ایک ہنگامی سیاسی جماعت کے طور پر ابھری تھی او راسی شکل میں ختم ہوگئی۔ کشمیر کمیٹی کے قیام کے دوران میں ممکن ہے اقبال نے احراری رہنماؤں سے مفاہمت کرنے کے بعد ان کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ اسی طرح بعد میں انہوں نے مجلس اتحاد ملت کے لیڈروں سے بھی وابستگی قائم رکھی، لیکن اقبال کا اصل مقصد ایسی ہنگامی سیاسی جماعتوں کا مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کرانا تھا تا کہ پنجاب میں انہیں یونینسٹ پارٹی کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکے۔ احراری لیڈر جو شعلے مقرر ہونے کے سبب عوام میں مقبول تھے اور انہیں پنجاب کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے کی غرض سے استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں محمد علی جناح کو جب یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر فضل حسین نے ٹکا سا جواب دے دیا تو وہ اقبال سے مشورے کے بعد مجلس اتحاد ملت اور پھر مجلس احرار کے قائدین سے ملے اور ان قائدین نے کچھ پس و پیش کے بعد مسلم لیگ میں شامل

ہونے کی حامی بھر لی۔ مگر یہ تعلق زیادہ مدّت تک قائم نہ رہ سکا۔ مجلس اتحاد ملت کے لیڈر پہلے اور مجلس احرار کے لیڈر کچھ مدت بعد اپنی اغراض حاصل نہ ہوسکنے کے سبب مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ بہر حال مجلس احرار ہمیشہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت ہی رہی اور جمعیت العلماء ہند اور کانگرس کی حمایت کرتی رہی۔ اقبال نے جس طرح تحریک احمدیہ کے عقائد کے خلاف اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ قومیت کے خلاف اظہار رائے کرتے ہوئے کمال جرأت اور بے باکی سے فرمایا تھا:

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیال قومیت کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں، وہ ایک لحاظ سے اسی طرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے انکار کرنے میں قادیانیوں کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قومیت کے علم بردار یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی ضروریات کے پیش نظر مسلمانوں کو ہر زمان و مکاں کے لیے قانون الٰہی کے ساتھ نئی پوزیشن اختیار کرنی چاہیے۔ جس طرح قادیانی ایک نئی نبوت کی اختراع سے قادیانیوں کو فکر و نظر کی ایک نئی راہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں، جس سے بالآخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم المرسلین ہونے سے انکار کی منزل آ جاتی ہے۔ بظاہر قومیت کا یہ تصور ایک سیاسی نظریہ ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے قادیانیوں کا انکار ایک دینی مسئلہ ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک گہرا داخلی تعلق ہے جس کو واضح طور پر اس وقت پیش کیا جا سکے گا جب کوئی خداداد بصیرت سے بہرہ ور مسلمان مورخ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرے گا اور اس میں بعض بظاہر جاندار فرقوں کے مذہبی فکر کو خاص طور پر پیش نظر رکھے گا۔۱۱۳

سو اقبال نے اپنی وفات سے قبل واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک قومیت کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنی کے نظریے پر ایمان رکھنے والوں اور احمدیوں کے

عقائد کے درمیان کس قسم کا گہرا داخلی تعلق ہے۔ اگر وہ احراریوں یا ان کی قسم کے دیگر سیاسی گروہوں یا ٹولوں کی شورہ پشتی سے خائف ہوتے تو کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہ کرتے۔ بعد کے حالات سے واضح ہے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کے سلسلے میں پنجاب میں جس طرح یونینسٹ پارٹی نے مخالفت کی، اسی طرح مجلس احرار نے بھی کی۔ پس اقبال کی نگاہ میں احراریوں کی جو حیثیت تھی، اس سے ظاہر ہے کہ وہ محض ان کے ڈرانے دھمکانے یا اکسانے بھڑکانے سے احمدیت کے مخالف نہ ہوئے تھے، بلکہ ایسا سوچنا اصل حقائق سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر اقبال، احمدیوں سے ۱۹۳۳ء میں مایوس ہو گئے تھے تو انہوں نے دو برس انتظار کے بعد ۱۹۳۵ء میں احمدیت کے متعلق اپنی تبدیلی رائے کا برملا اظہار کیوں کیا؟ ایک طبقۂ فکر کی رائے ہے کہ جب احمدیوں کے سیاسی عزائم واضح طور پر سامنے آ گئے تو اقبال نے احمدیت سے بیزاری کا اعلان کر دیا۔[۱۱۴] آخر احمدیوں کے کوئی سیاسی عزائم تھے تو کیا تھے؟ بالفاظ دیگر اگر اقبال نے عامتہ المسلمین کے لیے تحریک احمدیہ کے سیاسی عزائم سے کوئی خطرہ محسوس کیا تو وہ کیا تھا؟

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کے دور میں بھی تحریک احمدیہ انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ اپنے ابتدائی ایام ہی میں اس نے جہاد کی حرمت کا اعلان کر رکھا تھا اور اس سے مراد یہ لی گئی تھی کہ احمدیوں کے نزدیک انگریز کے ساتھ وفاداری کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اس کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی حرام قرار دیا گیا تھا۔ تحریک احمدیہ کا تعلق خالصتاً پنجاب کی سرزمین سے تھا۔ پنجاب میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھوڑی سی تھی اور اس اکثریت کے بل بوتے پر یہاں کسی مستحکم مسلم وزارت تشکیل دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر مسلمانو

ں میں اتحاد برقرار رکھا جا سکتا تو وہ مخلوط وزارت قائم کر سکتے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں سر فضل حسین نے غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ سر فضل حسین کے والد کے بانی تحریک احمدیہ سے خاندانی مراسم تھے۔ جب سر فضل حسین انگلستان سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس تشریف لائے تو ان کے والد انہیں ساتھ لے کر مرزا غلام احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے لیے دعا کی درخواست کی[115]۔ بعد میں ۱۹۲۶ء میں جب سر ظفر اللہ خان پنجاب کی کونسل کے لیے منتخب ہوئے تو مرزا بشیر الدین محمود (سلسلۂ احمدیہ کے دوسرے جانشین) نے انہیں ہدایت کی کہ کونسل میں اور سیاسی میدان عمل میں سر فضل حسین کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے[116]۔ سر ظفر اللہ خان فرماتے ہیں:

میں تو پہلے ہی میاں صاحب کا مداح اور ممنون احسان تھا اس لیے حضور کے ارشاد کی تعمیل میرے لیے آسان تھی۔[117]

سو پنجاب میں جماعت احمدیہ نے سیاسی میدان عمل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کے ذریعے اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء کی۔ سر ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت کے تحت یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور یہ تعلق آخر تک قائم رہا۔ سر فضل حسین کے بارے میں ان کے فرزند عظیم حسین کی تحریر کردہ کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو قطعی پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اردگرد صرف ایسے لوگوں کو دیکھنے کے خواہشمند تھے، جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں یا ان کی رائے سے اتفاق کرتے رہیں۔ سر ظفر اللہ خان بھی اسی سبب ان کے منظور نظر تھے۔ ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک خط محررہ یکم دسمبر ۱۹۳۰ء میں فرماتے ہیں:

ظفر اللہ ایک اچھا خاموش شخص ہے جو اپنے آپ کو آگے کرنے کی خواہش

نہیں رکھتا اور ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہے جو اسے کرنے کو کہا جائے۔ ۱۱۸

اس زمانے میں احمدی، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں تعلیمی اور دیگر اداروں میں تو ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے، مگر برصغیر کی مسلم سیاسیات میں صرف اسی حد تک حصہ لیتے جس حد تک سر فضل حسین یا یونینسٹ پارٹی کے مفادات اجازت دیتے تھے۔ پس اگر انہوں نے مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کی تو سر فضل حسین کے اشارے پر اور اگر سر ظفر اللہ خان مسلم لیگ کے صدر بنے تو لیگ کے متعلق سر فضل حسین کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر۔ اس سلسلے میں سید شمس الحسن کا تجزیہ بھی قابل غور ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سر محمد شفیع کی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مصروفیات اور بعد میں ان کی علالت اور بے وقت موت نے لیگ کو تباہی کے گڑھے کے کنارے پر لا کھڑا کیا۔ اس مرحلے پر سر فضل حسین اور ان کے حامیوں نے فیصلہ کیا کہ لیگ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے مسلم کانفرنس کے لیے میدان صاف کیا جائے۔ پس دہلی میں لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۶ و ۲۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کو انہوں نے اپنا وار کیا۔ پہلے تو اجلاس کی صدارت کے لیے سر فضل حسین نے سر ظفر اللہ خان کو منتخب کروایا اور پھر انہیں لیگ کا صدر بنوا دیا۔ لیگ کی صدارت کے لیے سر ظفر اللہ خان کے انتخاب کے خلاف مسلمانانِ دہلی نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا، کیونکہ وہ انہیں مسلمان نہ سمجھتے تھے۔ مزید مظاہروں کے خوف سے اجلاس مقرر کردہ جگہ یعنی فتح پوری اسکول ہال کے بجائے ایک ٹھیکے دار خان صاحب سید نواب علی کے مکان پر منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس میں صرف چند ارکان شامل ہوئے۔ لیگ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس میں ضم کر کے ایک نئی تنظیم قائم کرنے کی خاطر سر ظفر اللہ خان کی زیر صدارت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس صورت حال کے متعلق سید شمس الحسن نے محمد علی جناح کو لندن کے پتے پر خط تحریر کیا اور انہوں نے ہدایت کی کہ مسلم لیگ کو ہر قیمت پر بچایا جائے۔ بہر حال بعض اصحاب کی رخنہ اندازی کے

سبب کمیٹی کوئی نئی سیاسی تنظیم قائم نہ کر سکی اور اس کے اجلاس ملتوی ہوتے رہے۔ پھر حالات نے بھی مدد کی۔ جون ۱۹۳۲ء میں سر ظفر اللہ خان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بنا دیے گئے۔ پس وہ لیگ کی صدارت سے مستعفی ہوئے اور یوں مسلم لیگ ان کے ہاتھوں اپنی موت سے بچ گئی۔ ۱۱۹

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ کو، جو اصلاً ایک مذہبی جماعت تھی، سیاسی وابستگی پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔ جواب ہے: سیاسی قوت حاصل کیے بغیر کوئی بھی مذہبی تحریک نہ تو اپنا الگ تشخص برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ اس کے اراکین کی تعداد میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ جماعت احمدیہ نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعلق کس سیاسی مصلحت کے تحت قائم کیا تھا، اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ اول یہ کہ یونینسٹ پارٹی ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت تھی۔ یعنی باوجود اس کے کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ اصولاً ایک سیکولر پارٹی تھی، جس میں احمدی بحیثیت ایک مذہبی فرقے کے مسلمانوں میں رہتے ہوئے بھی انہیں اندر سے تقسیم کر کے اپنی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے تک اپنی علیحدہ حیثیت برقرار رکھ سکتے تھے۔ دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی انگریزی حکومت کی اطاعت کا دم بھرتی تھی اور اس کے ذریعے احمدی (جو عقیدتاً) انگریزی حکومت کے وفادار تھے بظاہر عامتہ المسلمین میں شمار ہوتے ہوئے وہ مناصب حاصل کر سکتے تھے، جو مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ بہر حال اس زمانے میں مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس جیسی سیاسی جماعتیں عوامی نہ تھیں اور جو عوامی تھیں وہ مجلس احرار کی طرح محض ہنگامی جماعتیں تھیں پس مجلس احرار یا علماء کے احتجاج کے زیر اثر اگرچہ عامتہ المسلمین میں احمدیوں کو ان کے عقائد کے سبب معتوب قرار دیا جانے لگا تھا، پھر بھی بیشتر مسلم سیاسی رہنماؤں نے جماعت احمدیہ کی سیاسی مصلحت پر نکتہ چینی کرنا ضروری خیال نہ کیا۔

بہر حال گول میز کانفرنسوں، کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) اور گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی خودمختاری کے حصول کے امکانات نے پنجاب میں مسلم سیاست کا رخ بدل دیا۔ صوبائی خودمختاری مسلمانان برصغیر کے متحدہ مطالبے کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ پنجاب ایک مسلم اکثریتی صوبہ تھا لیکن اس میں سر فضل حسین اور اُن کے حامیوں نے صوبائی اسمبلی میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی خاطر غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی بنا کر اس کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے کا قصد کر رکھا تھا۔ دوسری طرف محمد علی جناح اور اقبال کی کوشش یہ تھی کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد متحدہ جماعت بنا دیا جائے تاکہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلم اراکین ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں اور وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے نمائندے بھیجیں جو وہاں ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے خالصتاً مسلم نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے پنجاب میں کسی نہ کسی مرحلے پر مسلم لیگ کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی سے ہونا تھا۔

اسی دور میں کشمیر کمیٹی میں اقبال کو خالصتاً احمدی قیادت میں کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کشمیر کمیٹی ایک عارضی تنظیم کی صورت میں عجلت میں بنائی گئی تھی۔ اس کا نہ تو کوئی دستور تھا اور نہ قواعد و ضوابط۔ جب احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو کشمیر میں احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں، تو اس قسم کے الزامات کے تدارک کے لیے تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر کمیٹی کے لیے دستور اور قواعدو ضوابط وضع کر لیے جائیں تاکہ کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع مل نہ سکے، لیکن بجائے اس کے کہ الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے قدم اٹھایا جاتا، احمدیوں نے اس تجویز کو اپنے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنے کے لیے ایک چال تصور کیا اور مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ جب اقبال کشمیر کمیٹی کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے تو احمدی اراکین نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور بقول اقبال ان پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے

نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق اگر وہ کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ پس اقبال پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ احمدی اگر مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں یقیناً منقسم ہوں گی۔ یعنی ان کی اولیں وفاداری اپنی جماعت کے ساتھ ہوگی نہ کہ ملت اسلامیہ کے ساتھ۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ بعد ازاں اقبال کے کان میں کسی احمدی کے منہ سے نکلی ہوئی دو ایک ناخوشگوار باتیں پڑیں جن کے سبب وہ جماعت احمدیہ سے بیزار ہوگئے۔ یہ سب ۱۹۳۲ء میں ہوا، لیکن اقبال نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ ۱۹۳۵ء میں احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک چلا رکھی تھی۔ چنانچہ احراریوں یا اپنے کسی احمدیت کے مخالف حاشیہ نشین کے بھڑکانے پر اقبال نے بھی احمدیت کے خلاف مضمون داغ دیا۔ اس ضمن میں وہ اپنے بیان کی تائید میں عبدالمجید سالک کا حوالہ پیش کرتے ہیں، مگر راقم کی رائے میں شیخ اعجاز احمد اور عبدالمجید سالک دونوں کا استدلال درست نہیں۔ اقبال نے احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا بیان کسی کے اکسانے پر محض اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں دیا تھا، بلکہ اس کے چند اہم محرکات تھے جن کا تعلق پنجاب میں مسلم سیاست کے مستقبل سے تھا۔ علاوہ ازیں یہ بیان گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کی تقریر کے جواب میں دیا گیا جس میں اس نے احمدیت کے خلاف احرار کی ایجی ٹیشن کا حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو رواداری کا درس دیا تھا۔

ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اپنے خطبے میں احمدیت کے خلاف مجلس احرار کے مظاہروں کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف

مسلمانوں کورواداری کی تلقین کی تھی، بلکہ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانانِ پنجاب کومشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔ پس تحریک احمدیہ کے خلاف اقبال کا پہلا بیان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' اسی کے جواب میں جاری کیا گیا۔

اس بیان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے ایمرسن کے درس رواداری کومسلمانوں کے تمدّنی نقطۂ نظر سے بے خبری قرار دیا اور فرمایا کہ انگریزی حکومت کواس بات سے غرض نہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہتا ہے یانہیں کیونکہ اس کا مفادتو صرف اسی میں ہے کہ نئے مذہب کا جوبانی بھی ابھرے، وہ برطانیہ کا وفادار رہے۔ اس ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی خاطر انہوں نے اکبرالہٰ آبادی کا درج ذیل شعر بھی پیش کیا:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
''انا الحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ

اقبال نے مزید کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اسلام کے باغی گروہ کوتو اپنے اشتعال انگیزعقائد کی تبلیغ جاری رکھنے کی آزادی ہولیکن اگرملت اسلامیہ کوئی دفاعی تدبیر اختیار کرے تو اسے رواداری کا سبق دیا جائے۔ اگرانگریزی حکومت اس گروہ کی خصوصی خدمات کے سبب اسے پسند کرتی ہے تو اسے اس کی خدمات کا جوبھی چاہے صلہ دے سکتی ہے، مگریہ زیادتی ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنے معاشرے کی سالمیت کے تحفظ کے لیے فکرمند نہ ہوں۔[۱۲۰]

مسلمانوں کے باہمی نفاق کودورکرنے اورانہیں اپنی قوم میں کوئی بلندپایہ لیڈر پیدا کرنے کے لیے ایمرسن کے مشورے کے بارے میں اقبال نے اپنے اسی بیان میں فرمایا:

مسلمانانِ پنجاب کواتحاد کی تلقین کرنے پر حکومت کاشکریہ ادا کرتے ہوئے میں

حکومت کو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کا مشورہ دوں گا۔ میں پوچھتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی جو تفریق قائم ہو چکی ہے اور جس تفریق نے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، وہ کس نے قائم کی ہے؟ اس تفریق نے دیہاتی مسلمانوں کو بھی کئی ٹولیوں میں بانٹ رکھا ہے۔ جو ایک دوسری کے خلاف مسلسل بر سر پیکار رہتی ہیں۔ سر ہربرٹ ایمرسن نے پنجاب کے مسلمانوں میں لیڈر شپ کے فقدان پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اے کاش سر ہربرٹ ایمرسن کو اس بات کا احساس ہوتا کہ پنجاب میں شہری اور دیہاتی کی تفریق حکومت نے خود ہی پیدا کی ہے اور اسے خود غرض اور طالع آزما سیاسی مہم جوؤں کے ذریعے قائم رکھا جا رہا ہے۔ جن کی نگاہیں پنجاب میں اتحاد اسلام کے بجائے اپنی ذاتی اغراض کی تحصیل پر مرتکز ہیں۔ اسی سبب مسلمانان پنجاب کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کرنے کی صلاحت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ حکومت نے یہ طرز عمل شاید اختیار ہی اس لیے کیا تھا کہ پنجاب میں کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ ہو سکے۔ سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس کے برعکس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرز عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس نے اس صوبہ میں اصلی اور پائیدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام امیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔ ۱۲۱

اپریل ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے ریٹائر ہو کر واپس لاہور پہنچے اور اپنی صحت کی خرابی کے باوجود انہوں نے پنجاب میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے اور مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کا ارادہ کیا۔ سر فضل حسین نے شہری اور دیہاتی کا امتیاز پیدا کر کے پنجاب میں شہری مسلم قیادت پنپ سکنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ اب وہ خود تو بستر مرگ پر لیٹے تھے، لیکن مستقبل میں

پنجاب میں صحیح الخیال مسلم لیڈر شپ پیدا ہونے کے امکانات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اقبال نے ان کے کردار پر بھی اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں فرمایا:

یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے، اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لیے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ صوبے میں مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا، تا کہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے درجے کے لوگ جو اپنے موجودہ عروج کے لیے فضل حسین کے ممنون ہیں، خود ادنیٰ صلاحیت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی، کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح لیڈر شپ مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔۱۲۲

اقبال کے نزدیک شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی بہتری کے لیے پنجاب کے مسلمانوں نے نہایت اہم کردار ادا کرنا تھا، بلکہ اس خطے کے مسلمانوں کو اپنے تحفظ کی خاطر جو لڑائیاں آئندہ لڑنا تھیں، وہ پنجاب کے میدانوں ہی میں لڑی جانا تھیں۔ اس خیال کا اظہار اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء بنام بابائے اردو مولوی عبدالحق میں یوں کیا ہے:

مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی، ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی، مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔[۱۲۳]

سو پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی اور ان کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے اقبال کی انتہائی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان بھر کے علماء کو پنجاب میں آباد ہونے کی ترغیب دی جائے، لیکن اس اتحاد کو سیاسی طور پر توڑنے کی ذمہ داری اقبال کی رائے میں سر فضل حسین اور ان کی یونینسٹ پارٹی پر عائد ہوتی تھی، جسے مغلوب کرنے کے لیے پنجاب کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے اور مسلم لیگ کو ایک عوامی سیاسی تنظیم کی صورت میں مضبوط بنانے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف مذہبی طور پر اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ذمے داری اقبال کے نزدیک جماعت احمدیہ پر عائد ہوتی تھی۔ اقبال کو احساس تھا کہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بننے کے قابل نہ تھے، لیکن انہیں خدشہ تھا کہ اگر ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تو وہ انگریزی حکومت کے اشارے پر یا یونینسٹ پارٹی کے اثر و رسوخ کے ذریعے مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں، بلکہ صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت کو (جنہیں وہ من حیث الملت کافر سمجھتے تھے) اقلیت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب پنڈت جواہر لعل نہرو احمدیوں کی حمایت میں اس بحث میں کودے تو اقبال نے اسی خدشے کے پیش نظر صاف صاف کہہ دیا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو برداشت نہیں کر سکتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حق خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں کوئی گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ بارہ برس بعد انگریز برصغیر سے رخصت ہو جائے گا اور مسلمانوں کے وطن کی صورت میں اقبال کی خواہش کے مطابق محمد علی جناح کے ہاتھوں شمال مغربی ہند میں ایک مقتدر اور آزاد مسلم مملکت قائم ہو جائے گی۔ اس مرحلے پر صوبہ سرحد، سندھ یا بلوچستان میں مسلم لیگ اکثریت کو بروئے کار لانے میں بظاہر کوئی خطرہ درپیش نہ تھا، لیکن انگریز کی مضبوط ایڑی کے نیچے پنجاب کی صورت حال مختلف تھی، اس لیے اقبال کو یہی فکر دامنگیر تھا کہ مسلمانانِ پنجاب کے سیاسی اور مذہبی اتحاد کو نقصان پہنچانے والے عناصر کی نشاندہی کر کے ان کا قلع قمع کیا جائے۔ سو یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے تو انہوں نے سیاسی طریق کار اپنانے کی تلقین کی، مگر تحریک احمدیہ کے عقائد کو باطل ثابت کرنے یا احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے کی خاطر اقبال کو مناظرانہ رویہ اختیار کرنا پڑا، جو ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا اور شاید اسی سبب اقبال نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو تحریر کیا کہ دینیات میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں، لیکن احمدیوں کے ساتھ ان کے اپنے میدان میں نبرد آزما ہونے کے لیے انہیں اس موضوع سے تھوڑی بہت مدد لینا پڑی۔[۱۲۴]

شیخ اعجاز احمد، احمدی حلقوں، سر فضل حسین یا عظیم حسین کے خیال میں اقبال نے احمدیت کی مخالفت اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر کی تھی، لیکن اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض مسلمانان برصغیر کے مفادات کا تحفظ تھی۔ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک سب سے بڑا گناہ ہے، کیونکہ مشرک اللہ تعالیٰ کی توحید، یکتائیت اور خودی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کی پاداش میں دوزخ میں جھونکا جاتا ہے، لیکن اقبال کے ہاں امت محمدیہ یا ملتِ اسلامیہ کے اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والا تو اس

کی اجتماعی خودی کا منکر ہے لہٰذا ایسا گنہگار ہے جسے دوزخ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

کیا اقبال نے اپنی کسی ذاتی غرض کی تحصیل کی خاطر یا احساس محرومی کے سبب تحریک احمدیہ کی مخالفت کی تھی؟ شیخ اعجاز احمد یہ تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں چونکہ انگریزی حکومت نے اقبال کے بجائے سر ظفر اللہ خان کو مستقل طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیا تھا، اس لیے اقبال نے تحریک احمدیہ کی مخالفت میں بیان جاری کرنے شروع کر دیے۔ یہ عذر کچھ اسی قسم کا ہے جو ہندو اخبار ''ٹریبیون'' نے اقبال کے خطبۂ الہ آباد ۱۹۳۰ء کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یعنی اقبال نے برصغیر میں علیٰحدہ مسلم ریاست کا تصوّر انتقاماً دیا، کیونکہ حکومت برطانیہ نے انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا تھا۔ اقبال کو اگر انگریزی حکومت کی ملازمت ہی کرنا تھی تو سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے یا ان کی یونینسٹ پارٹی سے آخری دم تک وابستگی قائم رکھتے۔ انگریز حکمران سر فضل حسین پر بہت اعتماد کرتے تھے، اس لیے ۱۹۳۲ء میں جب وہ چار ماہ کی رخصت پر گئے تو سر فضل حسین کی سفارش پر ہی سر ظفر اللہ خان کو عارضی طور پر وائسرائے کی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا[۱۲۵]۔ اسی طرح جب اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مستقل طور پر سر ظفر اللہ خان کے اس منصب پر تقرر کا اعلان ہوا تو اسے بھی سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار، ویکلی میل'' اور 'مجاہد' میں تندو تیز بیانات یا احراریوں کی ایجی ٹیشن صرف سر ظفر اللہ خان کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ اسی اثنا میں سر ہربرٹ ایمرسن کے خطبے کے جواب کی صورت میں اقبال کو بھی یونینسٹ احمدی گٹھ جوڑ پر کھل کر تبصرہ کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے احمدیت کی تردید کے ساتھ ساتھ سر فضل حسین کے کردار پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔ سر فضل

حسین پر الزام لگایا گیا کہ وہ انگریز حاکموں کے اشارے پر شہری دیہاتی تفریق کے ساتھ احمدیوں کو آگے بڑھا کر پنجاب میں مسلمانوں کے اتحاد پر ضرب کاری لگا رہے ہیں۔ سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر پر مسلمانوں میں اضطراب سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۴ء بنام سر ظفر اللہ خان میں اس اضطراب کی وجوہات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، لیکن ساتھ ہی تحریر کیا:

اب انہوں نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مبذول کرلی ہے اور کہتے ہیں کہ زیادہ عرصے تک اونچے منصب پر فائز رہنے کے سبب میں مسلم رائے عامہ سے بے پروا ہوگیا ہوں اور میں نے آمرانہ رویہ اختیار کرلیا ہے خیر مجھے توقع ہے کہ اب تک آپ کے تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ گو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تقرر کے اعلان سے مخالفت ختم ہو جائے گی، بلکہ کچھ بڑھ ہی جائے گی۔ بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس کے خاتمے کے لیے کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔ ۱۲۶

اقبال کی اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی تھی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا کہیں ذکر ملتا یا عظیم حسین کی تصنیف میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہوتا۔ دراصل عظیم حسین کا تو گلہ ہی یہی ہے کہ ان کے والد سر فضل حسین، اقبال کو انگریزی حکومت میں کسی بلند عہدے پر فائز کروانے کے لیے بار بار کوشش کرتے تھے، مگر اقبال ہر بار انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کر کے حکومتی حلقوں کا اعتماد کھو دیتے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انگریز حکمران اتنے کمزور نہیں تھے کہ احراریوں کی ایجی ٹیشن پر یا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے اخبارات میں اقبال کا نام لینے پر انہیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیتے۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر سر ظفر اللہ خان کی متوقع تقرری کے خلاف 'زمیندار' اور دیگر اخباروں میں سخت احتجاج ہو رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ ایک

احمدی کے بجائے کسی جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب دیا جائے، اور اس ضمن میں اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال اس منصب کے لیے امیدوار تھے، درست نہیں۔ انگریز حکمرانوں کو اس قسم کے تقرر کرتے وقت سب سے پہلے ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی تھی جو ان کے اطاعت گذار اور وفا دار ہوں، نہ کہ ان کے نقاد۔ اس لیے یہ بات پنجاب میں ہر کوئی جانتا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کے لیے اسی شخص کا تقرّر ہوگا جو انگریز حاکموں کی توقعات کے مطابق سر فضل حسین کا صحیح جانشین ہو، جسے سر فضل حسین یا انہی کی طرح کی کسی شخصیت کی حمایت حاصل ہو اور اگر یہ محسوس کیا جاتا کہ مسلم ایجی ٹیشن کے سبب سر ظفر اللہ خان کا تقرّر مناسب نہ رہے گا تو اس منصب کے لیے سر فضل حسین کو کسی اور جانشین کی سفارش کرنے کے لیے کہا جاتا، لیکن اقبال جیسی شخصیت کے تقرر کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، جس نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد، میاں محمد شفیع (م۔ش) کے بیان کو سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن ایام میں سر فضل حسین کے جانشین کے تقرّر کا معاملہ زیرِ غور تھا، وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ایک ملاقات میں اقبال کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے، سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ راقم کو اس روایت کی صحت پر کئی اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے اقبال کے کسی قسم کے روابط قائم نہ ہوئے تھے، بلکہ اس زمانے میں وہ میاں محمد شفیع (م۔ش) کو جانتے تک بھی نہ تھے۔ دوم یہ کہ ان دو سالوں میں ایسی کوئی شہادت راقم کی نظر سے نہیں گزری جس سے ثابت ہو سکے کہ اقبال کی لارڈ ولنگڈن سے ملاقات ہوئی تو کہاں ہوئی تھی۔ سوم یہ کہ جس روایت کا شنید پر انحصار ہو اور جس کی تائید کسی واقف حال ہمعصر شخصیت کے بیان یا کسی معتبر تحریری ذریعے سے نہ ہوتی ہو، وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے قابل اعتماد نہیں سمجھی

جاسکتی۔

مئی ۱۹۳۵ء میں جب احمدیت کے خلاف اقبال نے اپنا پہلا بیان جاری کیا تو گلے کا عارضہ لاحق ہوئے ڈیڑھ برس کی مدت گزر چکی تھی۔ بھوپال سے برقی علاج کا پہلا کورس مکمل کر کے واپس لاہور آئے تھے۔ آواز بہت نحیف تھی۔ صحت مسلسل گر رہی تھی اور مستقل طور پر صاحب فراش ہو چکے تھے بلکہ انہی ایام میں سردار بیگم کی تشویش ناک بیماری، پھر ناگہانی موت اور نابالغ بچوں کی نگہداشت وغیرہ ایسے مصائب و آلام نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ آواز کی خرابی کے سبب تقریباً ڈیڑھ برس سے وکالت بھی چھوٹ چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ اقبال کو مالی فراغت یا آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی، لیکن ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں تو بوجہ علالت وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت قبول کرتے۔ اسی زمانے میں سر فضل حسین نے اپنے ایک خط مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۴ء بنام میاں امیر الدین میں تحریر کیا:

اقبال کا کیا حال ہے، کچھ عرصہ ہوا میں نے سنا تھا کہ وہ علیل ہیں اور مالی مشکلات سے دوچار۔ مجھے بڑی مسرت ہو گی اگر آپ مجھے بصیغۂ راز اطلاع دیں کہ صحیح پوزیشن کیا ہے۔ میں کالج کے ایام سے ان کا بڑا مداح رہا ہوں اور ایک بار پھر ان کی امداد کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو سکے کہ صحت اور مالی اعتبار سے وہ کس حال میں ہیں اور اگر واقعی پریکٹس کر رہے ہیں تو فی الحال اس سے آمدنی کی کیا صورت ہے۔[127]

میاں امیر الدین نے انہیں جواب دیا کہ اقبال علالت کے سبب ایک مدت سے وکالت ترک کر چکے ہیں۔ ان کی صحت اور مالی حالت دونوں خراب ہیں اور ان کی آواز بڑی سرعت کے ساتھ بیٹھی چلی جا رہی ہے[128]۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے یا اس منصب پر تقرری

کے خواب دیکھ رہے تھے اور جب ان کی بجائے یہ منصب وزیر ہند نے سر ظفر اللہ خان کو سونپ دیا تو وہ انتقاماً احمدیت کی مخالفت میں بیانات جاری کرنے لگے، اصل حقائق سے بے خبری ہے یا انہیں تعصب کی عینک سے دیکھنے والوں کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔۱۲۹

مآخذ

باب ۲۰

۱۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحہ ۴۴۹

۲۔ ''محمد علی جناح'' از بولائتھو (انگریزی)، صفحات ۱۵۹، ۱۶۰۔

۳۔ ۱۹۷۱ء ایڈیشن، صفحہ ۳۱۴۔

۴۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحات ۵۰، ۵۱۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس میدان میں نہ رہی تھی اور مسلم لیگ ایک مردہ سیاسی جماعت ہو کر رہ گئی تھی۔

۵۔ ''روزگارِ فقیر'' از فقیر سید وحید الدین، جلد دوم، صفحہ ۶۰۷۔

۶۔ ''مکتوباتِ اقبال''، صفحہ ۲۱۰۔

۷۔ ایضاً، صفحات ۲۱۵ تا ۲۱۷۔

۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۳۔

۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۷۷۔ جس جرّاح کا ذکر کیا گیا ہے وہ لاہور میں فلیمنگ روڈ پر محمد عاشق جراح تھے۔ اقبال ان کے بڑے معتقد تھے اور گھر میں کسی کو پھوڑا پھنسی نکلتا تو انہی کا علاج ہوتا یا وہی چیر پھاڑ کرتے تھے۔ اقبال نے انہیں ایک سند بھی دی تھی، جس میں اُن کے متعلق تحریر کیا تھا کہ وہ فنِ جراحی میں فوق العادہ دسترس کے مالک ہیں۔ دیکھیے ''انوارِ اقبال''، مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۱۳۔

۱۰۔ ''مکتوباتِ اقبال''، صفحات ۱۹۹، ۲۰۰۔

۱۱۔ ایضاً، صفحات ۱۵۵ تا ۱۵۶۔

۱۲۔ ایضاً، صفحات ۱۲۶ تا ۱۲۹۔

۱۳۔ ایضاً، صفحات ۱۳۰ تا ۱۴۲۔

۱۴۔ ایضاً، صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۹۔

۱۵۔ ایضاً، صفحات ۱۵۲، ۱۵۳۔

۱۶۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۸۲، ۱۸۳۔

۱۷۔ ''اوراقِ گم گشتہ'' مرتبہ رحیم بخش شاہین، صفحات ۴۴، ۴۵ بحوالہ ہفت روزہ ''منادی'' مورخہ یکم جون ۱۹۳۴ء۔

۱۸۔ ''اقبال کی تقریریں تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات ۲۴۳، ۲۴۴۔

۱۹۔ ''مکتوباتِ اقبال'' صفحات ۱۶۱۔

۲۰۔ ایضاً، صفحات ۱۶۲، ۱۶۴۔

۲۱۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۸۵ تا ۱۸۸۔

۲۲۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' مرتبہ محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۲۶ تا ۱۲۹۔

۲۳۔ ''مکتوباتِ اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۳۔ نیز دیکھیے، صفحات ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰۔

۲۴۔ ایضاً، صفحات ۱۹۷، ۱۹۸۔

۲۵۔ ''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۲۴۵ خط بنام خواجہ عبدالرحیم، مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں سود ہر صورت میں حرام ہے، مگر یہ آئیڈیل صورت سوسائٹی کی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ ہے کہ بینک سے سود لینا جائز ہے۔ اسی فتویٰ کی بنا پر اقبال بینک کا سود منافع سمجھ کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی کی رائے بھی یہی تھی کہ بینک کا سود منافع ہے اور اسے لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۲۶۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر حصہ اوّل مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، دیکھیے مضمون ''علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی'' (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں) از صفدر محمود، صفحات ۱۷ تا ۲۱۔

۲۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۔

۲۸۔ ''مکتوباتِ اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۰۲۔

۲۹۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۳۔ اقبال کی مسلمانوں کے ساتھ من حیث القوم ہمدردی، دیانت او رامانت کے سبب ان کے سب عقیدت مند ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۴ء کے پنجاب کونسل کے انتخابات میں میاں عبدالعزیز اور سیّد امجد علی دونوں ایک ہی حلقے سے کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سوچا کہ آپس میں محاذ آرائی کے بجائے اقبال اور ملک فیروز خان نون بطور ثالث فیصلہ کریں کہ ان دو میں سے کونسا کھڑا رہے اور کون اپنا نام واپس لے لے۔ ثالثوں نے فیصلہ میاں عبدالعزیز کے حق میں دیا اور سید امجد علی نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۱۸۹۔

۳۰۔ ''مکتوباتِ اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۴۳۔

۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۴۔

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۸۷۔

۳۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۵۰۔

۳۴۔ ''اقبال اور بھوپال'' از صہبا لکھنوی، صفحہ ۵۴۔

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۵۵۔

۳۶۔ ''روزگارِ فقیر'' از محمد فقیر سیّد وحید الدین، جلد اوّل، صفحات ۱۵۴، ۱۵۶۔

۳۷۔ ''باقیاتِ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۴۹۵۔

۳۸۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۵۵۔

۳۹۔ ایضاً، صفحہ ۴۸۔

۴۰۔ ایضاً، صفحات ۵۳، ۵۴۔ اس سلسلے میں نواب بھوپال کا جو خط موصول ہوا تھا، اسے اقبال نے فریم میں لگوا کر رکھا تھا، لیکن ان کی وفات کے بعد فریم کا شیشہ ٹوٹنے کے سبب وہ خط ضائع ہو گیا۔ ایضاً صفحہ ۵۶۔

۴۱۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، جلد اوّل، صفحہ ۴۷۔

۴۲۔ ایضاً، صفحہ ۴۵۔

۴۳۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۷۰۔ یہ کبھی بھی شائع نہ ہوا۔

۴۴۔ بیان کے انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحات ۹۱ تا ۹۸۔

۴۵۔ ایضاً، صفحات ۹۹ تا ۱۰۴۔

۴۶۔ ایضاً، صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۸۔

۴۷۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۱۷۴ تا ۱۷۶۔

۴۸۔ ''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۴۵، ۴۶

۴۹۔ ''اسلام اور احمدیت'' کے انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''اقبال کی تقریریں تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۱۷۶ تا ۱۹۹۔ اقتباس صفحہ ۱۷۷ سے لیا گیا ہے۔

۵۰۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۰

۵۱۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۱۹۱ تا ۲۰۲۔

۵۲۔ ''روزگارِ فقیر'' از فقیر سید وحید الدین، جلد دوم، صفحات ۵۶ تا ۵۹۔ اس وصیت میں ملکیت کی جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تمام کی تمام علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہیں۔ سوائے ان کتب کے جو اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دی گئیں۔ اقبال کی ایک یادداشت کی کتاب کے پہلے صفحے پر انہوں نے تحریر کر رکھا ہے کہ ''جاوید اقبال کو لازم ہے کہ بالغ ہونے پر اس تمام تحریر کو جو اس کتاب میں درج ہے ،بغور پڑھ لے۔ محمد اقبال ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء۔ اسی کتاب میں ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اندراج میں اپنی وصیت کا ذکر کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ ''باقی جاوید کو میری

عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے...... جو لوگ میرے احباب ہیں ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔

۵۳۔ ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحات ۲۳۸ تا ۲۴۰۔ مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی پوری روداد کے لیے دیکھیے ''اقبال اور بھوپال'' از صہبا لکھنوی، صفحات ۱۰۹ تا ۱۴۳

۵۴۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۳۰ تا ۱۳۱۔

۵۵۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۳۱۵۔

۵۶۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۳۱ تا ۱۳۶۔

۵۷۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، خط بنام پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنی مورخہ ۱۳؍جون ۱۹۳۶ء، صفحہ ۲۱۴۔

۵۸۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۶۵۔

۵۹۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحات ۳۱۳، ۳۱۴۔

۶۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۷۔

۶۱۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۸۹، ۹۰۔

۶۲۔ ''ذکر اقبال''، صفحہ ۱۹۸۔

۶۳۔ عبدالسلام خورشید تحریر کرتے ہیں کہ ۸؍جولائی ۱۹۳۶ء کی رات سکھوں نے مسجد گرانا شروع کی تھی۔ ''سرگذشت اقبال'' صفحہ ۵۰۴ نیز دیکھیے ''مفکر پاکستان'' از محمد حنیف شاہد، صفحہ ۳۵۷۔

۶۴۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۸۸۔

۶۵۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحہ ۴۵۳۔

۶۶۔ ایضاً، صفحہ ۴۵۷۔

۶۷۔ ''میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس'' مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی)، صفحہ ۲۰۱۔

۶۸۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۰۲ تا ۲۰۶۔

۶۹۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، صفحہ ۳۰۹۔

۷۰۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' ناشر محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۷، ۸۔

۷۱۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' صفحہ ۳۲۴۔

۷۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۵۲۔

۷۳۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۳۶ تا ۱۴۱۔

۷۴۔ 'صحیفہ' اقبال نمبر، حصہ اوّل مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، صفحات ۲۳۶، ۲۳۷ ''روزگار فقیر'' از فقیر سید وحید الدین، جلد اوّل، صفحات ۲۷ تا ۳۰۔

۷۵۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر، حصہ اوّل مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ ۲۲۸۔

۷۶۔ مضمون ''قادیانیت اور علامہ اقبال''۔ ''نوائے وقت'' مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۵۴ء

۔

۷۷۔ دیکھیے کتابچہ مشتملبر چودہ صفحات بعنوان ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' مرتبہ عبدالمالک خان ناظر اصلاح و ارشاد صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ۔ نیز دیکھیے اس کتابچہ پر تبصرہ ہفت روزہ ''چٹان'' مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۴ء، صفحات ۱۷، ۲۴، ۲۵۔

۷۸۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر بھوپال، صفحات ۷۶، ۷۷۔ یہ خط ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحات ۳۸۶، ۳۸۷ پر بھی موجود ہے، لیکن علامہ اقبال کے خط کی فوٹو کاپی کے مطابق عبارت یوں ہے: ''تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں۔ دیکھے ڈاکٹر وحید عشرت کا مقالہ ''قصہ ایک خط کا'' ''اقبالیات'' جلد ۲۸ شمارہ

۲رجولائی ۱۹۸۷ء۔

۷۹۔ ''باقیات اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۱۲۹۔

۸۰۔ ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، صفحہ ۲۳۲۔

۸۱۔ ایضاً، صفحات ۲۳۲ تا ۲۴۱۔

۸۲۔ ''باقیاتِ اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۵۔

۸۳۔ ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۴۱، ۲۴۲۔

۸۴۔ ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحات ۱۲۴ تا ۱۲۶۔

۸۵۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال، جلد دوم، صفحات ۱۸۳، ۱۸۴۔

۸۶۔ ''روایات اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ چغتائی، صفحہ ۴۵۔

۸۷۔ خط کے اقتباس کے لیے دیکھیے مضمون ''سر سید احمد خان، شمس العلماء مولوی میر حسن، سیالکوٹی اور مرزا غلام احمد قادیانی'' از کلیم اختر ہفت روزہ ''چٹان'' مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء، صفحہ ۲۷۔

۸۸۔ ایضاً، صفحہ ۳۱۔

۸۹۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی، (انگریزی) صفحہ ۳۷۔

۹۰۔ ماہنامہ ''الفرقان'' ربوہ بابت اگست ۱۹۷۵ء، صفحات ۲۹، ۳۰۔

۹۱۔ مقالہ کا اصل انگریزی مسودہ علامہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے جس میں یہ فقرہ درج ہے۔

۹۲۔ ''روایات اقبال'' مرتبہ محمد عبداللہ چغتائی، صفحہ ۱۲۶۔

۹۳۔ روزنامہ ''الفضل'' قادیان مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء نیز دیکھیے ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۰۹، ۱۱۰۔ اس تفصیل میں اقبال کے تعریفی

کلمات کا ذکر نہیں ہے۔

۹۴۔ ''تاریخ احمدیت'' جلد ۶ صفحہ ۴۹۷۔

۹۵۔ ''سفر نامہ اقبال'' از محمد حمزہ فاروقی، صفحات ۴۳ تا ۴۹۔ نیز دیکھیے روزنامہ ''انقلاب'' مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۹۳۱ء۔

۹۶۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم صفحہ ۲۳۲۔

۹۷۔ صفحہ ۳۷ کتاب مذکورہ۔

۹۸۔ ایضاً صفحات ۷۵، ۷۶۔

۹۹۔ رسالہ ''تبصرہ'' بابت اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ''تاریخ احمدیت''، جلد ششم، صفحہ ۶۰۸۔ (حاشیہ)۔

۱۰۰۔ صفحہ ۳۸ کتاب مذکور۔

۱۰۱۔ ایضاً صفحہ ۱۶۳۔

۱۰۲۔ روزنامہ ''زمیندار'' مورخہ ۱۲/اگست ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۸ کالم اوّل۔

۱۰۳۔ ''ذکر اقبال''، صفحہ ۲۱۰۔

۱۰۴۔ روزنامہ ''زمیندار'' مورخہ ۲۸/اگست ۱۹۳۴ء۔

۱۰۵۔ ''اقبال کے خیالات وافکار'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی (انگریزی)، صفحہ ۲۹۷۔

۱۰۶۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال جلد دوم، صفحہ ۲۲۴۔

۱۰۷۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۱۴۴۔

۱۰۸۔ ''اقبال کے حضور'' از سیّد نیازی، جلد اوّل، صفحات ۱، ۳۔

۱۰۹۔ دیکھیے کتابچہ ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' مرتبہ عبدالمالک خان، صفحہ ۱۴، میاں فضل حسین کے خطوط'' مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی)، صفحات ۳۱۰، ۳۱۱، ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین، صفحہ ۳۱۴۔

۱۱۰۔ ''صاف گو مسٹر جناح'' (انگریزی)، صفحہ ۵۳۔

۱۱۱۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شروانی (انگریزی)، صفحات ۲۳۴، ۲۳۵۔

۱۱۲۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے آر طارق (انگریزی)، صفحہ ۱۰۱۔

۱۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۴۵۔

۱۱۴۔ ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحہ ۱۲۴، ''اقبال اور قادیانی'' از نعیم آسی ''اقبال اور قادیانیت'' از شورش کاشمیری، اقبال نے انہیں اپنے مقالے مسلم کمیونٹی'' کے انگریزی مسودے کے حاشیے میں ذہناً ''میگین'' قرار دیا ہے۔

۱۱۵۔ ''تحدیث نعمت'' از سر ظفر اللہ خان، صفحہ ۱۰۔

۱۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۷۔

۱۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۷۔

۱۱۸۔ ''میاں فضل حسین کے خطوط'' مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی)، صفحہ ۱۱۰۔

۱۱۹۔ ''صاف گو مسٹر جناح'' (انگریزی) صفحات ۵۳، ۵۴۔

۱۲۰۔ ''اقبال کی تقریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی) صفحات ۹۵، ۹۶۔

۱۲۱۔ ایضاً، صفحہ ۹۷۔

۱۲۲۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، ۳۱۵، نیز دیکھیے ،اقبال کے آخری دو سال'' از عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۲۷۰، ۲۷۱۔

۱۲۳۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطا اللہ، حصہ دوم، صفحہ ۹۷۔

۱۲۴۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام خط مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۳۶ء، دیکھیے ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی، (انگریزی)، صفحہ ۲۰۰۔

۱۲۵۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بیاگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴، ''میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس'' مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی)، اندراجات

ڈائری مورخہ ۷ مئی و ۲۲ مئی ۱۹۳۲ء، صفحات ۱۳۸ تا ۱۴۰۔

۱۲۶۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، صفحہ ۳۱۴، ''میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس'' مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی)، صفحہ ۱۵۴۔

۱۲۷۔ ''فضل حسین ایک سیاسی بائیوگرافی'' از عظیم حسین (انگریزی)، صفحہ ۳۲۰۔

۱۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۰۔

۱۲۹۔ احمدیوں کو چونکہ ہندو اور سکھ، مسلمان سمجھتے تھے اس لیے قیام پاکستان پر احمدیوں نے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لی اور قادیان کے بجائے سرگودھا کے نزدیک ربوہ کو اپنا مرکز بنایا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران ۱۹۷۴ء میں آئین کی ترمیم کے ذریعے انہیں غیر مسلم یا ایک علیٰحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا گیا اور ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے تعزیرات پاکستان میں ایک ترمیم کے ذریعے ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کا استعمال جرم قرار دے دیا۔

باب: ۲۱

آخری ایّام

اقبال کی حالت روز بروز بگڑتی چلی جارہی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں حکیم نابینا کا علاج جاری رہا۔ سید نذیر نیازی کے دہلی سے لاہور چلے آنے کے بعد کچھ مدت تک تو اقبال کے برادر نسبتی خواجہ عبدالغنی جو دہلی میں مقیم تھے، حکیم نابینا سے دوائیں لے کر بھیجتے رہے۔ بعد ازاں اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بھی دہلی پہنچ گئے اور دوائیں بھجوانے کا اہتمام کرنے لگے۔ اقبال براہ راست خط و کتابت کے ذریعے حکیم نابینا کو اپنے عوارض کی تفصیل بتاتے رہتے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے دو ایک مرتبہ دہلی کا سفر بھی کیا اور حکیم نابینا سے مل کر علاج کے متعلق اپنی تسلی کر لی، مگر دہلی سے ادویات کا سلسلہ تب ٹوٹا جب حکیم نابینا، نظام کی ملازمت اختیار کر کے حیدر آباد تشریف لے گئے تھے۔ پھر بھی کچھ عرصہ تک ڈاکٹر مظفر الدین قریشی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے توسط سے دوائیں لاہور پہنچتی رہیں، لیکن ۱۹۳۸ء کے آغاز سے یہ سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہو گیا اور اس کی اصل وجہ حکیم نابینا کی اپنی ضعیف العمری تھی۔ سو علاج مقامی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔!

اقبال اپنے علاج معالجے کے بارے میں بڑا تردّد کرتے تھے، کیونکہ وہ زندگی کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے ہوئے ہر لحظہ اس کے طلب گار تھے۔ ان کے تردد کا حقیقی متحرک زندگی کے لیے حرص یا موت کا خوف نہ تھا۔ دراصل وہ اس غرض سے صحت یاب اور تندرست ہونے کی خواہش رکھتے تھے تاکہ ان ارادوں کی تکمیل کر سکیں جو اسلامی فقہ کی تشکیل جدید یا تعلیمات قرآنی کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو چکے تھے۔ مزید براں انہیں یہ احساس بھی تھا کہ یہ کام ان کے سوا اور کوئی انجام نہیں دے سکتا، جیسے کہ انہوں نے سر راس مسعود کو تحریر کیا تھا کہ میں شیخی نہیں بگھار رہا

ہوں۔ جب یہ کہتا ہوں کہ دنیائے اسلام میں مَیں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں۔[۲]

سیّد نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

یہ حالات تھے جن میں اگر کوئی انہیں دیکھتا جیسا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں، تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ ایک زندہ انسان ہیں اور اس لیے زندگی سے انہیں جو ذوق و شوق ہے، اس میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوا۔ نہ طرح طرح کے عوارض اور مرض کی روز افزوں شدت سے ان پر یاس و نا امیدی کی کوئی کیفیت طاری ہوئی نہ اس سے گھبرا کر انہوں نے کسی تلخی اور افسردگی کا اظہار کیا۔ وہ ہر لحظہ ''زندہ'' تھے اور اس سے کہیں بڑھ کر یہ کہ ان کا دل زندہ تھا۔ دوران علالت میں بھی ان کے افکار میں وہی تازگی، جذبات میں وہی نزاکت اور طبیعت میں وہی شگفتگی قائم رہی جو شروع ہی سے ان کے اندر چلی آ رہی تھی۔ مگر پھر ان سب باتوں کے باوجود اس زمانے میں ان کا بدن جس طرح ایک لاعلاج بیماری کی نذر ہو رہا تھا، ویسے ہی دوسری بیماری نے جس کا علاج ممکن بھی تھا اور مطلوب بھی، ان کے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس بیماری کا تعلق ان کے جسد خاکی سے نہیں تھا، بلکہ اس جسد سے (ملی اسلامی) جس کا وہ خود بھی ایک حصہ تھے۔ اور جس کے علاج کی فکر انہیں شب و روز دامنگیر رہتی تھی۔ یہ شعر انہوں نے علالت ہی میں کہا تھا:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اللہ اکبر! یہ کیا دل تھا اور کیا دماغ کہ جسے یہ کہہ کر بھی، مجھے فکر جہاں کیوں ہو۔ سارے جہان کی فکر تھی۔[۳]

مختلف نوع کے عوارض کے سبب ملک سے باہر جا کر لیکچر دینے کے تمام ارادے منسوخ کیے جا چکے تھے۔ جنوری ۱۹۳۷ء کے اوائل میں لاہور میں انتخابات

کی گرم بازاری تھی اور پنجاب میں تو اس سلسلے میں دو تین قتل کی وارداتیں بھی ہو چکی تھیں۔ اقبال نے آنکھوں کا معائنہ کرایا اور چونکہ موتیا اترنے کے آثار تھے، اس لیے ڈاکٹر نے لکھنا پڑھنا بند کروا دیا۔ اب صرف ایک قصد باقی رہ گیا تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط محرّرہ ۱۵/ جنوری ۱۹۳۷ء بنام سر راس مسعود میں یوں کیا ہے:

ان شاء اللہ امید کہ سال (آئندہ) حج بھی کروں گا اور دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری بھی دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے۔[۴]

یہ تحفہ کیا ہونا تھا؟ ان کی کتاب ''ارمغان حجاز'' جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی اور جو ان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے چوہدری محمد حسین تحریر کرتے ہیں:

دیار حبیبؐ اور روضہ حبیبؐ کی زیارت کا شوق برسوں سے روح اقبال کو جذب کیے ہوئے تھا۔ دن بھر میں بہت کم لمحے ایسے گزرتے ہوں گے۔ کہ محمدؐ (فداہ روحی) کی باتوں سے وہ دل غافل ہوتا ہو۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں آ کر یہ شوق اس مقام پر پہنچا جسے عشق و شغف کی انتہائی منازل کہنا چاہیے۔ عقل و فلسفہ سب عشق محمدؐ کے تابع ہو چکے تھے...... کئی سال حج کے موقع پر حجاز جانے کی تیاریاں ہوئیں، لیکن طویل علالت کی وجہ سے حالات نے مساعدت نہ کی پچھلے سال انہی دنوں دسمبر ۱۹۳۷ء میں ایک جہاز راں کمپنی سے بہت طویل خط و کتابت ہوئی لیکن چند دن کے بعد علالت نے پھر وہ صورت اختیار کر لی کہ روانگی نہ ہو سکی۔ چونکہ نیت پختہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ حاضر ضرور ہونا ہے اور وہاں معروضات بھی ضرور پیش کرنی ہیں، اور ملّت کی نمائندگی کرنی ہے، اس لیے ان معروضات کی تحریر و تسوید شروع ہو گئی۔ اور اضطراری طور پر شروع ہو گئی اور چونکہ مدینہ جانے سے

پہلے مکہ یعنی خدا کے گھر بھی جانا تھا اور دونوں گھروں میں حاضری اور پیش کش گزارنے کے بعد وہاں سے قوم وملت کے لیے تحفے لانا تھے۔ اس لیے تصنیف نے یہ صورت اختیار کی کہ پہلے حضورِ حق گزارشات پیش ہوں اور اس کے بعد حضورِ رسالت اور پھر حضورِ ملت ...... اگر اقبال کو حجاز جانا نصیب ہوتا اور وہاں یا وہاں سے آ کر ارمغان لکھتے تو خدا جانے کیا چیز ہوتی۔ لیکن یہ بھی خیال آتا ہے کہ جو چیز حجاز کے شوق اور اس کے عشق میں زبان سے نکل گئی ہے شاید یہی بہترین تھی اور اس سے بہتر دوسری صورت میں نہ ہوتی۔ ۵

پچھلے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ جامعۂ ازہر کے شیخ محمد مصطفےٰ المراغی اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی مہم جاری کرنے کی خاطر مصری علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن باوجود اس کے کہ اقبال نے انہیں تحریر کر دیا تھا کہ یہ کام ہندوستان کے علماء انجام دے سکتے ہیں، علمائے مصر کا وفد ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بمبئی پہنچ گیا اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء سے دہلی میں چند یوم گزارنے کے بعد اوائل جنوری ۱۹۳۷ء میں لاہور آیا، وفد کے معتمد شیخ حبیب احمد آفندی اور نائب معتمد شیخ صلاح الدین التجار (جو انگریزی زبان سے شناسا تھے) اہم مسلم شخصیتوں اور تبلیغی انجمنوں کے ذریعے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی خاطر مناسب مواقع پیدا کرنے کے سلسلے میں معلومات جمع کرتے رہے۔ وفد کے اراکین نے اقبال سے بھی ملاقات کی، مگر اقبال نے ان کی توجہ عالم اسلام کے حقیقی مسائل کی طرف مبذول کرائی اور ان پر واضح کیا کہ یہ مسائل محض تبلیغ اسلام کے ذریعے حل نہیں کیے جا سکتے[۶]۔ ۲۷ر جنوری ۱۹۳۷ء کی دوپہر کو اقبال نے مصری وفد کے اعزاز میں اسپنسر ہوٹل منٹگمری روڈ لاہور میں ایک دعوت طعام بھی دی جس میں دیگر شخصیات کے ساتھ راقم بھی شریک تھا۔ کھانے کے بعد شرکائے دعوت کا گروپ فوٹو لیا گیا۔ اس فوٹو میں اقبال کی صورت دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دنوں وہ کس قدر نحیف اور کمزور ہو گئے تھے۔

یہ غالباً زندگی میں ان کی آخری تصویر تھی۔ وفد مارچ ۱۹۳۷ء میں واپس مصر چلا گیا۔

۱۵ فروری ۱۹۳۷ء کو انجمن اردو پنجاب کی طرف سے لاہور کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں یوم غالب منایا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے سیکرٹری میاں بشیر احمد، مدیر ''ہمایوں'' نے اقبال کا ارسال کردہ تحریری پیغام پڑھ کر سنایا۔ پیغام تھا:

مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں...... اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کرلیں تو ان کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ عالم شعر میں میرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں تعلق ہے۔ دوم یہ کہ میرزا بیدل کا فلسفہ حیات غالب کے دل و دماغ پر موثر کہاں تک ہوا اور مرزا غالب اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس نقطۂ نگاہ سے مرزا غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے۔ ۷

چودھری محمد حسین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے ہاں عقل و فلسفہ سب عشق رسولؐ کے تابع ہو چکے تھے۔ اسی عالم میں مندرجہ ذیل رباعی کہی گئی:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفٰی پنہاں بگیر

رباعی غالباً ''ارمغان حجاز'' میں شامل ہونا تھی، لیکن عین ممکن ہے اقبال نے اسے اپنے بعض احباب کے سامنے پڑھا ہو۔ چنانچہ مولوی ابراہیم سب جج گوجرانوالا نے یہ رباعی محمد رمضان انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی

خان کے روبرو پڑھی۔محمد رمضان صوفی مزاج کے آدمی تھے۔رباعی نے ان کے دل پر اس قدر گہرا اثر کیا کہ سنتے ہی اچانک گر پڑے، چوٹ کھائی اور بے ہوش ہوگئے۔بعد ازاں اقبال کی خدمت میں خط تحریر کیا، جس میں التجا کی کہ رباعی انہیں بخش دی جائے تاکہ مرنے کے بعد یہ رباعی ان کے ماتھے پر لکھ کر انہیں دفن کیا جائے۔اقبال نے انہیں رباعی عطا کرتے ہوئے اپنے ایک خط مورخہ ۱۹رفروری ۱۹۳۷ء میں تحریر کیا:

شعر کسی کی ملکیت نہیں۔آپ بلا تکلف، وہ رباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے۔اپنے نام سے مشہور کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۸

اقبال نے اس رباعی کے بجائے اسی موضوع سے متعلق ایک اور رباعی کہی جو"ارمغان حجاز"میں موجود ہے:

به پایاں چو رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ مارا
حساب من ز چشم اونہاں گیر

اسی دور میں کسی نے خط میں تحریر کیا کہ خواب میں رسول اللہ کی سخت جلالی رنگ میں زیارت نصیب ہوئی ہے۔اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اقبال نے جواباً فرمایا:

عام مسلمانوں کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضورؐ رسالت مآب کی زیارت خیرو برکت کا باعث ہے۔گذشتہ دس پندرہ سال میں لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کو جلالی رنگ میں یا سپاہیانہ لباس میں خواب میں دیکھا ہے۔میرے خیال میں یہ علامت احیائے اسلام کی ہے۔۹

فروری ۱۹۳۷ء میں انتخابات کے نتائج بھی نکل آئے۔پنجاب میں یونینسٹ

پارٹی خاصی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی۔ مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خان۔ ان میں سے راجہ غضنفر علی خان نے کامیاب ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ نتیجتاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی ہی نے سر سکندر حیات کی سرکردگی میں مخلوط کابینہ ترتیب دی۔ اقبال صاحب فراش تھے اور آنکھوں میں موتیا بھی اتر رہا تھا، لیکن اس کے باوجود انتخابات کے نتائج سے مایوس نہ ہوئے، بلکہ صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم اور مقامی شاخوں کے قیام کا کام جاری رکھا۔ انتخابات میں ہندوستان بھر کے ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اگرچہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بہرحال کانگرس نے فتح وقوت کے نشے سے سرشار ہو کر دہلی میں ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو اپنے آٹھ سو کامیاب ممبران کی ایک آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقد کی۔ اس کنونشن میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کے لیے پنڈت جواہر لعل نہرو نے بڑے جوش و خروش سے تجویز پیش کی کہ ہندو قائدین سے بات چیت کرنے کی بجائے مسلم عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ یوں پنڈت جواہر لعل نہرو کی تجویز کے مطابق کانگرس کی تحریک رابطۂ مسلم عوام کا آغاز ہوا۔

اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اس مرکزیت سے محروم ہیں، جو ہندوؤں کو کانگرس کی انتخابات میں کامیابی کے سبب حاصل ہو گئی تھی۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں کسی آل انڈیا مسلم سیاسی تنظیم کے بجائے ہر صوبے میں علیحدہ علیحدہ غیر فرقہ وارانہ جماعتیں، برسراقتدار تھیں جن کا آپس میں کوئی تعلق واسطہ نہ تھا اور مسلم اقلیتی صوبوں میں تو ویسے ہی مسلمانوں کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ہندو لیڈروں کو توقع تھی کہ مسلم اقلیتی اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی منتشر ٹولیاں بالآخر کانگرس میں جذب ہو جائیں گی۔ اسی اندیشے کے پیش نظر

اقبال نے محمد علی جناح کو اپنے ایک خط محررہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء میں مشورہ دیا:

مجھے توقع ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کا وہ خطبہ ملاحظہ فرما لیا ہوگا، جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے اور اس خطبے میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا، اسے بھی آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک ایسا نادر موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا میں رونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیشِ نظر، اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں، لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی قوت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندی مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری رائے میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک موثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن ۱۰ کا انعقاد کریں، جس میں شرکت کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر اہم مسلم قائدین بھی مدعو کیے جائیں۔ اس کنونشن میں آپ پوری وضاحت اور پورے زور کے ساتھ یہ حقیقت بیان کریں کہ ہندی مسلمانوں کا ایک جداگانہ سیاسی ہستی کی حیثیت سے کیا سیاسی مطمحِ نظر ہے۔ یہ امر بے حد ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی ساری دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مسلم نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانانِ ہند کے لیے ان کے کلچر کا مسئلہ کہیں زیادہ اہم ہے۔ بہر حال کلچر کا مسئلہ اقتصادی مسئلہ سے کسی طرح بھی کم اہم نہیں ہے۔ اگر اس قسم کا کنونشن منعقد ہو سکے تو اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ یوں ان مسلم ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا، جنہوں نے مسلمانانِ ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں بنا رکھی ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح

واضح ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی اور وہ اپنی جداگانہ کلچرل ہستی کو کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روز میں دہلی آ رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس اہم موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو ہو گی۔۱۱

اقبال غالباً اپریل ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں حکیم نابینا کو نبض دکھانے کی خاطر دہلی گئے۔ افغان قونصل صلاح الدین سلجوقی کے ہاں قیام کیا، لیکن محمد علی جناح سے ملاقات نہ ہو سکی۔ واپس لاہور آئے تو کانگرس کی نیشنل کنونشن ابھی تک ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ ۲۲ راپریل ۱۹۳۷ء میں انہوں نے محمد علی جناح کو تحریر کیا:

مجھے معلوم نہیں کہ میرا وہ خط جو میں نے دو ہفتے ہوئے لکھا تھا آپ تک پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو نئی دہلی کے پتے پر بھیجا تھا اور جب میں نے دہلی پہنچ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے جا چکے ہیں۔ اُس خط میں میں نے تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کر کے حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں اور بعض ایسے وجوہ سے، جن کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بڑی سرعت کے ساتھ کانگرس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ جلد از جلد غور فرما کر میری تجویز کے بارے میں فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو آئندہ اگست تک ملتوی ہو چکا ہے، لیکن حالات ایسے ہیں کہ مزید انتظار کیے بغیر مسلمانوں کی قومی پالیسی کا دوبارہ اعلان کر دینا بے حد ضروری ہے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پیشتر چند اہم مسلم لیڈر ملک کا دورہ کر لیں تو کنونشن یقیناً کامیاب رہے گی۔ مہربانی کر کے میرے اس خط کا جواب جتنی جلد ممکن ہو سکے

دیں۔۱۲

کانگرس نے اپنی واضح اکثریت والے صوبوں میں بالآخر وزارتیں بنائیں اور ساتھ ہی پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت میں تحریک رابطۂ مسلم عوام بڑے زور شور سے شروع کی گئی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلم قائدین کو نظر انداز کر کے ملک بھر میں مسلم عوام تک کانگرس کا پیغام پہنچایا جائے اور انہیں کسی نہ کسی طرح کانگرس کے دام میں لایا جائے۔مئی ۱۹۳۷ء میں تحریک رابطہ مسلم عوام پنجاب میں داخل ہوئی۔ یہاں مرکزی اسمبلی کی ایک خالی نشست کے لیے ضمنی انتخاب میں مولانا ظفر علی خان کھڑے ہوئے ،لیکن کانگرس نے ان کے مقابلے میں ایک غیر معروف شخص میاں عبدالعزیز کو کھڑا کر دیا۔اقبال نے اس امیدوار کے والد سے بارہا کہا کہ اپنے بیٹے کو مولانا ظفر علی خان کے مقابلے سے دستبردار کرائے۔چنانچہ معاملہ ایک ایسے ثالثی بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے اقبال بھی رکن تھے۔بالآخر میاں عبدالعزیز دستبردار ہوئے اور مولانا ظفر علی خان اس نشست کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

اقبال کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ مسلم لیگ ابھی تک حقیقی معنوں میں مسلم عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔لہٰذا وہ اسے جلد از جلد ایک عوامی تنظیم بنانے کے خواہش مند تھے۔عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں کہ اس ضمن میں اقبال کی زیر ہدایت صوبائی مسلم لیگ کے ایک اجلاس منعقدہ ۲۵ اپریل ۱۹۳۷ء میں ملک زمان مہدی خان کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ذمے پنجاب میں مسلم لیگ کی ضلع وار اور مقامی شاخیں قائم کرنے اور مسلم عوام کے ساتھ لیگ کا ربط وضبط بڑھانے کا کام سونپا گیا۔کمیٹی نے مئی کے پہلے ہفتے میں اپنی اسکیم مرتب کی ، جسے اقبال نے منظور کیا۔چنانچہ مئی کے دوسرے ہفتے سے صوبائی مسلم لیگ کے کارکنان نے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔۱۳

کانگرس پنجاب میں اپنی مہم کی کامیابی کی خاطر ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔

مثلاً اگر اقبال نے بعض مسلم نوجوانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اسلام کے اقتصادی پہلوؤں کے متعلق پُر جوش ذہنی انہماک پیدا کرنے کے لیے ایک مسلم انڈیا سوسائٹی قائم کی جائے، تو افواہ اڑا دی گئی کہ اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے بجائے کوئی دوسری جماعت بنانے کے آرزومند ہیں۔ یہ غلط فہمی دور کرنے کی خاطر اقبال کو اپنا بیان مورخہ ۷رمئی ۱۹۳۷ء جاری کرنا پڑا جس میں واضح کیا:

آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑنے کا خیال میرے دماغ سے اس قدر بعید ہے جس قدر کہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی سب سے پرانی سیاسی جماعت ہے جسے تمام مسلمانوں کا مکمل اعتماد حاصل ہونا چاہیے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اس کی عنان قیادت مسٹر محمد علی جناح ایسے رہنما کے ہاتھ میں ہے، جنہیں تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔[۱۴]

کانگرس کی رابطہ مسلم عوام مہم کا اصل جواب تو یہی تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو نہ صرف صحیح معنوں میں ایک عوامی تنظیم بنا دیا جائے بلکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے معاشی مسائل کا حل بھی پیش کیا جائے۔ ان امور کے بارے میں اقبال کی رائے صاف اور واضح تھی اور اس کا دوٹوک اظہار انہوں نے محمد علی جناح کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں کیا۔ انہوں نے فرمایا:

لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ کیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ بنی رہے گی یا مسلم عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے گی۔ جنہوں نے اب تک بجا طور پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی سیاسی جماعت جو عامۃ المسلمین کی بہبودی کی ضامن نہ ہو، عوام کے لیے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔ نئے آئین کے تحت اعلیٰ اسامیاں تو امیروں کے بیٹوں کو مل جاتی ہیں اور چھوٹی وزیروں کے دوستوں یا رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دیگر معاملات میں بھی ہماری سیاسی تنظیموں نے عامۃ المسلمین کی

اصلاح حال کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ گذشتہ دو سو سال سے اس کی حالت مسلسل گرتی چلی جارہی ہے۔ عام طور پر وہ سمجھتا ہے کہ اس کے افلاس کی وجہ ہندو کی ساہو کاری یا سرمایہ داری ہے، مگر اسے یہ احساس ابھی نہیں ہوا کہ اس کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے۔ بہر حال ایک نہ ایک دن یہ احساس بھی ضرور پیدا ہوگا۔ جواہر لعل کی دہریہ سوشلزم مسلمانوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جا سکتی ہے؟ لیگ کا تمام مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ مسلمانوں کو افلاس سے چھٹکارا دلانے کا وعدہ نہیں کرتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اب بھی اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں اس کے ارتقاء کے ذریعے ایسے تمام مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ کے طویل اور عمیق مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقاء اس ملک میں اتنی دیر تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ سال ہا سال سے یہی میرا پختہ عقیدہ رہا ہے، اور میں اب بھی اسی عقیدے کو مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ اگر ہندوستان میں ایسا کرنا ناممکن ہے تو پھر صرف ایک ہی راہ رہ جاتی ہے اور وہ باہمی خانہ جنگی ہے، جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی صورت میں کئی سالوں سے جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہند میں فلسطین جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ ہندو سیاست میں جواہر لعل کی سوشلزم کا ورود بجائے خود ہندوؤں میں کشت و خون کا

موجب ہو سکتا ہے۔سوشل ڈیما کریسی اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع، براہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجہ نزاع سے مختلف نہیں۔آیا سوشلزم کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا یا نہیں، میں اس کے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا، البتہ میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندو دھرم کا سوشل ڈیما کریسی اختیار کرلینا خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے۔ اسلام کے لیے سوشل ڈیما کریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید حاصل ہو، درحقیقت کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس لیے مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مسلم ہند میں ان مسائل کے حل آسانی رائج کرنے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد مسلم ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟ شاید جواہر لعل کی دہریہ سوشلزم کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔ [15]

۱۹ر مئی ۱۹۳۷ء کو اقبال کے برادر نسبتی خواجہ عبدالغنی کا انتقال ہوگیا۔خواجہ عبدالغنی کو اقبال نے اپنی وصیت میں راقم اور منیرہ کا گارڈین مقرر کیا تھا۔ ان کی ناگہانی موت سے اقبال بے حد پریشان ہوئے اور اپنے ایک خط مورخہ ۳رجون ۱۹۳۷ء میں انہوں نے سر راس مسعود کو لکھا:

نہایت نیک اور مخلص انسان تھا۔میرے دونوں بچوں سے بہت محبت رکھتا تھا اور مجھے اس پر بھروسا تھا۔اس کی ناگہانی موت نے مجھ کو بے حد پریشان کیا ہے۔ماں کی طرف سے ان دونوں بچوں کا یہی بازو تھا۔باپ کی طرف سے جو رشتہ دار اُن کے ہیں ان سے کسی قسم کی کوئی توقع نہیں ہے۔اگرچہ میں نے تمام عمر اپنے مقدور سے زیادہ ان کی خدمت کی ہے۔اس ساری پریشانی میں ایک خیال مجھے تسکین دیتا رہا اور وہ یہ کہ جو میری زندگی میں ان بچوں کا محافظ پرورش کرنے والا ہے، وہی

میرے بعد بھی ان کی حفاظت اور پرورش کرے گا۔ اس کے علاوہ میں اپنے حقیقی عزیزوں سے زیادہ تم پر بھروسا رکھتا ہوں۔ خدا تعالیٰ تم کو عمر نوح عطا کرے اور میں اپنی زندگی میں تم کو اس سے بھی زیادہ با اقبال دیکھوں۔ ۱۶

انہی ایام میں اقبال نے راقم اور بالخصوص منیرہ کی نگہداشت کی خاطر اور گھر کے عام انتظام کے لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور چند دیگر احباب کے ذریعے علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو بلوانے کا فیصلہ کیا جو اردو بول سکتی تھیں اور اسلامی معاشرت سے واقف تھیں۔ ان کا نام مسز ڈورس احمد تھا۔ وہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن تھیں اور کچھ مدت سے علی گڑھ ہی میں مقیم تھیں۔

اقبال کے دل میں اپنی معذوری کے باوجود حج کے لیے جانے کی خواہش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط بنام سر اکبر حیدری مورخہ ۱۳ر جون ۱۹۳۷ء میں ان الفاظ میں کیا ہے:

میں یورپ سے سیر ہو چکا ہوں اور وہاں کی شدید سردی نے ایک معذور شخص کی سی زندگی میرا مقدر کر دی ہے، جسے میں گذشتہ تین سال سے بسر کر رہا ہوں۔ بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے۔ مزید برآں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہو گی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سالوں میں، جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے، میں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں۔ ایک ہی خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستیؐ کی تربت پر حاضری دوں جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سر چشمۂ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچا کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی انسانی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے

ممکن نہیں۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلام کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ذرہ ذرہ آنحضورؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک ایسے بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آنحضورؐ کے روضہ مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔۱۷

اسی طرح عبداللہ چغتائی کو بھی اپنے ایک خط مورخہ ۱۳ر جون ۱۹۳۷ء میں تحریر کیا:

بحیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ انشاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔ قصد تو یہ تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزاروں، مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑوں، خصوصاً جب کہ میں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا ہوں کہ جب تک یہ بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنی نظر سے اوجھل نہ کروں۔ ان حالات میں یورپ کا سفر اور وہاں کی اقامت ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ ایسے گنہگار کے لیے آستان رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے۔۱۸

مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگرس نے اپنی وزارتیں ترتیب دیتے وقت یہ اصول وضع کیا تھا کہ کسی غیر کانگرسی کو وزارت میں نہیں لیا جائے گا، مگر بعد میں صوبہ سرحد میں کانگرسیوں کے ساتھ چند غیر کانگرسی اراکین شامل کر کے ایک کانگرسی وزارت بنائی گئی۔ پس کانگرس کے روّیے سے ظاہر تھا کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی کسی نہ کسی طرح اقتدار پر متمکن ہونے کی کوشش کرے گی اور اس مقصد کی تحصیل کے لیے اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کو پاؤں تلے روندنے سے باز نہیں رہے گی۔ مسلمان اکثریتی اور اقلیتی صوبوں میں بدستور انتشار کا شکار تھے۔ ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہ تھا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر اقبال بار بار محمد علی

جناح کو تحریر کرتے تھے اور اپنے خدشات کا اظہار ان کے سامنے کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء میں انہیں لکھا:

میں جانتا ہوں کہ آپ ایک انتہائی مصروف شخص ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرے بار بار لکھنے پر آپ برا نہ منائیں گے۔ دراصل اس وقت مسلم قوم کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہند اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی میں مبتلا ہیں، اور اگر فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں عالمگیر ہو جائے۔ گزشتہ چند ماہ سے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ صرف شمال مغربی ہند میں، ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں۔ توہین رسول کی ان چاروں وارداتوں میں مجرم قتل کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن مجید کے نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ صورتِ حال کا نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان واقعات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ معاشی، بلکہ خالصاً سیاسی ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کرنا ہے۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کا انحصار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان صوبوں میں مسلم وزارت کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی، بلکہ اسے تو مسلمانوں ہی کے ساتھ ناانصافی برتنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ لوگ جن کی امداد سے وزارت قائم ہے، خوش رہ سکیں اور دوسروں پر ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب ہے۔ پس ظاہر ہے کہ ہمارے پاس اس آئین کو رد کرنے کے لیے خاص وجوہ ہیں۔ مجھے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئین ہندوؤں ہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع

کیا گیا ہے۔ ان صوبوں میں جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے، ہندوؤں کو حکومت میں قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر رکھا گیا ہے۔ اب میرے ذہن میں ذرہ بھر بھی شک نہیں رہا کہ یہ آئین ہندی مسلمانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ مزید براں یہ اس معاشی تنگ دستی کا علاج بھی پیش نہیں کرتا جو مسلمانوں میں شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ صرف ایک چیز جو کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) نے مسلمانوں کی دی ہے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کا اعتراف ہے، لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لیے بے سود ہے۔ کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت ہی سے انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت یعنی ہندو مہا سبھا، جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا وجود ہندوستان میں نا قابل قبول ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے ہندوستان میں امن نسلی، مذہبی اور لسانی میلانات کی بنا پر ملک کی تقسیم مکرر ہی پر موقوف ہے۔ اکثر برطانوی مدبر بھی اس بات کو محسوس کرتے ہیں اور ہندو مسلم فسادات جو اس آئین کے جلو میں پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں یقیناً ان پر یہ حقیقت نا قابل تردید طور پر واضح کر دیں گے۔ مجھے یاد ہے انگلستان سے میری روانگی کے وقت لارڈ لوتھیان نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا حل تو تمہاری اسکیم میں موجود ہے، لیکن اس کے بار آور ہونے کے لیے پچیس سال کی مدت درکار ہوگی۔ پنجاب کے بعض مسلمان تو پہلے ہی شمال مغربی ہند کی ایک مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پر غور کر رہے ہیں اور یہ خیال پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ میں اس امر میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ ہماری قوم ابھی تک نظم و ضبط سے محروم ہے اور

شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبے میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے، جو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو انجام کار مجبوراً اختیار کرنا ہی پڑے گا۔ میرے خیال میں نیا آئین ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ۔یعنی مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام۔ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم کیا جا سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اس طریق سے وابستہ ہے۔ لہٰذا لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میری رائے میں آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے، لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیے[19] پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور لیگ کے آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے از حد مفید ہوگا۔[20]

جولائی ۱۹۳۷ء کے اوائل میں اقبال نے گرمیوں کے چند ماہ کشمیر میں گزارنے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات کے لیے راقم کا اسکول بند ہونے پر (راقم ان ایام میں سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتا تھا) ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء کے بعد سری نگر روانہ ہو جائے۔ اقبال کے ایک عقیدتمند سید مراتب علی نے سفر کے لیے اپنی اسٹیشن ویگن جس میں سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے، دینے کا وعدہ کیا تھا[21]،

لیکن کشمیر میں اقبال کا داخلہ تحریک کشمیر کے ایام سے ممنوع تھا۔ چنانچہ ریاستی حکام سے اس سلسلے میں اجازت حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی گئی۔ پہلے تو خاصی مدت تک اقبال کو کوئی جواب موصول نہ ہوا، مگر بالآخر جب ریاستی حکام نے سفر کشمیر کی اجازت دی، تو موسم گرما گزر چکا تھا۔ یوں وہ زندگی میں آخری بار اپنے آبائی وطن کی زیارت کرنے سے بھی محروم رہے۔

اسلامی علوم کے احیاء اور تعلیمات کی وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق تعبیر کے سلسلے میں اقبال کی بہت سی تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ بھی تھی کہ کسی مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، تاریخ، فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں اور یوں نہ صرف ان میں جدید مذہبی، سیاسی اقتصادی، قانونی، علمی، سائنسی اور فنی مسائل کی اہمیت کو سمجھنے کا احساس بیدار کر دیا جائے بلکہ ان میں مسلمانان عالم کی ہر شعبے میں صحیح رہنمائی کی اہلیت بھی پیدا ہو جائے۔ اس خواہش کا اظہار اقبال نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ علوم اسلامیہ کی تشکیل کے زمانے میں کیا تھا اور اپنا ایک منصوبہ بھی نوٹ کی صورت میں تحریر کر کے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمت میں بھیجا تھا، لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بہر حال ایک دردمند اور مخلص مسلم زمیندار چوہدری نیاز علی خان کو خیال آیا کہ موضع جمال پور نزد پٹھان کوٹ میں خدمت دین کے لیے ایک ایسا ہی ادارہ قائم کیا جائے۔ وہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ اقبال نے ان کے سامنے اپنی دیرینہ اسکیم کا ذکر کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ایک قطعہ اراضی تعلیم قرآن کے لیے وقف کر دیا اور اس میں ضروری عمارات یعنی مسجد، مکتب، کتب خانہ، دارالاقامت رہائشی مکانات وغیرہ کی تعمیر شروع کر دی

۔جنوری ۱۹۳۷ء کے اوّائل میں جب مصری علماء کا وفد لاہور پہنچا اور اقبال سے ملاقات ہوئی تو وفد کی اس خواہش کے اظہار پر کہ وہ ہندوستان کے اسلامی اداروں کی مناسب طریق پر امداد کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں مشورہ دیا گیا کہ اس کا ایک طریق یہ ہے کہ وہ جامعہ ازہر مصطفیٰ المراغی کو ایک خط اقبال کی طرف سے لکھا جائے اور انہیں اس ادارے کی خاطر ایک ایسا روشن خیال اور قابل مصری عالم اپنے خرچ سے مقرر کرنے کے لیے فرمائش کی جائے جو انگریزی خواں بھی ہو اور حالات حاضرہ یا علوم جدیدہ سے خوب واقفیت بھی رکھتا ہو۔ چنانچہ چوہدری نیاز علی خان نے اپریل ۱۹۳۷ء میں ایک خط مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو تحریر کیا جس میں عرض کی کہ وہ مجوزہ خط کا ڈرافٹ عربی میں تحریر فرمادیں ۲۲۔ اسی طرح انہوں نے اقبال کو بھی خط تحریر کیا اور اپنے ادارے کے متعلق مزید گفتگو کرنے کے لیے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اقبال نے انہیں اپنے خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا:

آپ ضرور تشریف لائیں۔ میں ادارے کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے، جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ ان شاء اللہ آپ کا ادارہ اس مقصد کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے بھی ڈرتا ہے۔ صوفیہ اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خودغرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں عوام میں جذبہ موجود ہے، مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔ ۲۳

اگست ۱۹۳۷ء کے اوائل میں چودھری نیاز علی خان پھر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مولانا مودودی کا عربی میں تیار کردہ ابتدائی مسودۂ خط بنام شیخ مصطفیٰ المراغی دکھایا۔ اقبال نے اسے پسند فرمایا اور بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۳۷ء کو عربی

میں تحریر کردہ یہی خط اقبال کے نام سے شیخ مصطفیٰ المراغی کو ارسال کیا گیا۔ خط کا مندرجہ ذیل حصہ قابل توجہ ہے:

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایک اہم ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور انشاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہو گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو، جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو۔ جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو اپنا وقت دین اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں اور ہم اِن لوگوں کے لیے نئی تہذیب او رجدید تمدن کے شور و شغب سے دور ایک دار الاقامت بنا دیں جو ان کے لیے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے اور اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتب موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل اور صالح گائیڈ (رہبر) کا تقرر کیا جائے، جسے قرآن حکیم پر بصیرت تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو، تا کہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت اور اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انہیں مدد دے سکے تا کہ یہ لوگ اپنے علم اور قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے کوشاں ہو سکیں۔ آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں تا کہ وہ اس کام میں ہمیں مدد دے سکے۔ لازم ہے کہ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ تمدن اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔[۲۴]

شیخ مصطفیٰ المراغی کے جوابی مکتوب مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۳۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعۂ ازہر میں اقبال کے حسب منشا کوئی ایسا مصری عالم نہ تھا، جسے جامعۂ ازہر کی طرف سے ہندوستان روانہ کیا جا سکتا۔۲۵ بعد ازاں بقول چوہدری نیاز علی خان، اس سلسلے میں چونکہ ان کی خط و کتابت مولانا مودودی سے جاری تھی، اس لیے اقبال کی نظر بھی آخر مولانا مودودی ہی پر پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا مودودی ۱۹۳۷ء کے آخری حصے میں حیدر آباد دکن سے پٹھان کوٹ میں اس ادارے کا موقع محل دیکھنے کی خاطر تشریف لائے اور اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر تین صحبتوں میں ان سے مفصل گفتگو کے بعد اس کا نام "دارالسلام" تجویز کیا اور نقل مکانی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۲۶ مگر چوہدری نیاز علی خان کا قائم کردہ ادارہ بھی اقبال کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ اس ادارے کے متعلق اقبال کے کیا کیا بلند ارادے تھے، ان کا اب اپنی بے بضاعتی کے پیش نظر ذکر کرنا بھی زیب نہیں دیتا۲۷۔ دراصل اقبال کے حسب منشا تمدن اسلام کے احیاء کے لیے ادارہ آج تک دنیائے اسلام کے کسی بھی ملک میں وجود میں نہیں لایا جا سکا۔

جولائی ۱۹۳۷ء ہی میں فلسطین سے متعلق حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ رائل کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اقبال اس تجویز سے بے حد مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ فی الفور لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کرے، جس میں اس تجویز کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ انہوں نے رائل کمیشن کی تجویز تقسیم فلسطین کے خلاف ایک زبردست بیان انگریزی میں تیار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیان لیگ کے جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا جائے۔ چنانچہ ۲۶ رجولائی ۱۹۳۷ء کو مسلم لیگ کا جلسۂ عام زیر صدارت ملک برکت علی موچی دروازے کے باغ میں منعقد ہوا۔ جلسے میں غلام رسول خان نے اقبال کے بیان کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا اور تقسیم فلسطین کے متعلق حکومت برطانیہ کے رویے کی

مذمت کی گئی۔ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری سال کی اس اہم تحریر میں واضح کیا:

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں اس جلسہ عام میں جو مسلمانان لاہور آج فلسطین رپورٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے منعقد کر رہے ہیں، شمولیت سے قاصر ہوں۔ لیکن میں مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے۔ مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورت حالات سے واقف کسی بھی شخص کو ہو سکتا ہے، مجھے قوی امید ہے کہ اہل برطانیہ کو اب بھی اس وعدہ کے ایفا پر مائل کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی طرف سے عربوں سے کیا گیا تھا۔ قضیۂ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا۔ مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود کا تیرہ صدیاں ہوئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یروشلم میں داخلے سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا بلکہ...... یہود اپنی مرضی اور ارادے سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدوّن ہوا۔ مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا...... بالفرض اگر یہ اعتراف بھی کر لیا جائے کہ حروب صلیبیہ فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کی کوشش تھی تو اس کوشش کو صلاح الدین کی فتوحات نے ناکام بنا دیا۔ لہٰذا میں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہوں۔ مشرق و مغرب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے کبھی بھی اس طرح سے بے نقاب نہ ہوئے تھے جیسے رائل کمیشن رپورٹ نے انہیں رسوا کر دیا ہے، فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے لیے ایک مقام کی متلاشی ہے۔ بقول ایک ممبر

پارلیمنٹ کے یہ ایک خطرناک تجربہ ہے اور اس سے برطانیہ کو بحیرۂ روم میں جو مشکلات درپیش ہیں، رفع نہ ہوسکیں گی، بلکہ ان مشکلات کو رفع کرنے کے بجائے یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لیے بہت سے نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ عربوں کو جس جس طریقہ سے تنگ کرکے اپنی ارض مقدس، جس پر مسجد عمر رضی اللہ عنہ قائم ہے، فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، ایک طرف تو مارشل لاء جاری کردینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری طرف عربوں کی قومی فیاضی اور ان کی روایتی مہمان نوازی کے جذبات لطیف کو برانگیختہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ عمل گویا اس بات کا ثبوت ہے کہ برطانوی تدبر کا اب دیوالیہ نکل چکا ہے۔ یہودیوں کو زرخیز اراضی کی پیش کش کرکے اور عربوں کو پتھریلی زمین کے ساتھ کچھ نقد رقم دے کر راضی کرنے کی کوشش قطعاً کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنیٰ درجے کی حقیر سودا بازی ہے۔ جو یقیناً اس عظیم الشان قوم کے لیے موجب ننگ اور باعث شرم ہے جس کے نام پر عربوں سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ ان کے درمیان ایک مشترکہ متحدہ وفاق قائم کردیا جائے گا۔ میں اس مختصر سے بیان میں رائل کمیشن کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں، تاہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانہ حال کی تاریخ سے بعض بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہئیں۔ تجربے نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کردی ہے کہ مشرق قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی بقا صرف اس راز میں مضمر ہے کہ ترکوں اور عربوں کا اتحاد جلد از جلد قائم ہوجانا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ ترکوں کو عالم اسلام سے جدا کردینے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے اس قسم کی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں کہ ترک اسلام سے منحرف ہورہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا گیا ہوگا۔ اس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پراپیگنڈے کا شکار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں،

جنہوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی اصول قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ عرب ہی تھے جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا۔ جس نے آگے چل کر ایشیا کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی، اس لیے عربوں کو چاہیے کہ وہ ان نتائج کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ابتلا اور مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ دوسرا سبق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ عربوں کو چاہیے کہ اپنے مسائل پر غور وفکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں، کیونکہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر اور ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیت و غیرت کا امتحان ہے خواہ وہ ممالک عرب میں ہیں یا غیر عرب۔ منصب خلافت کی تنسیخ کے بعد عالم اسلام کے لیے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اس اینگلو فرانسیسی ادارے سے، جسے غلطی سے جمعیت اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بدگمان اور برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت ۲۸ قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ ۲۹

مسئلہ فلسطین کے بارے میں اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دو مکتوب مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء اور ۶ ستمبر ۱۹۳۷ء نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی مس فارقوہرسن کو بھی تحریر کیے، ان خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانانِ لاہور کے علاوہ دہلی میں تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں کے اجتماع نے تقسیم فلسطین کے خلاف صدائے

احتجاج بلند کی اور کانپور میں اسی سلسلے میں کئی مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔۳۰

۲۸/اپریل ۱۹۳۷ء کو اقبال اپنی زندگی میں آخری بار انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے تھے، لیکن تقریباً تین ماہ بعد یعنی ۲۱/جولائی ۱۹۳۷ء کو بوجہ خرابی صحت صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔۳۱

جولائی ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتے میں جرمن خاتون مسز ڈورس احمد، علی گڑھ سے لاہور تشریف لائیں ۳۲۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کے لیے میاں محمد شفیع، علی بخش اور منیرہ موجود تھے۔ وہ میاں محمد شفیع اور منیرہ کے ساتھ تانگے پر ''جاوید منزل'' تشریف لائیں اور وہاں پہنچتے ہی اقبال سے ملیں جو معمول کے مطابق تہبند اور بنیان پہننے کے بجائے ان کی تعظیم کی خاطر شلوار اور قمیض زیب تن کیے صوفے پر بیٹھے ان کے منتظر تھے۔ اقبال نے انہیں گھر کے انتظام اور منیرہ و راقم کی نگہداشت کی ذمہ داریاں سونپیں اور یوں مسز ڈورس احمد نے ''جاوید منزل'' میں مستقل رہائش اختیار کی۔۳۳

۳۰/جولائی ۱۹۳۷ء کو راس مسعود فوت ہو گئے۔ اُن کے انتقال کی خبر اقبال نے اخباروں میں پڑھی۔ یہ صدمہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ سر راس مسعود کی موت کا انہیں یقین نہ آتا تھا۔ مفصل حالات سے آگاہی کے لیے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری ممنون حسن خان کو تار اور خط ارسال کیے۔ جب خبر کی سرکاری تصدیق ہو گئی تو سخت پریشانی کے عالم میں لیڈی امت المسعود کو تحریر کیا:

میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیونکر کروں جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔ مرحوم سے جو میرے قلبی تعلقات تھے ان کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اس بنا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس

کے دل میں مرحوم نے اپنی دل نوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔ مسعود اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا۔ اس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا اور جب تک جیا، اس دل و دماغ سے ملک وملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریق رحمت کرے۔ ۳۴

سر راس مسعود کی میت علی گڑھ لائی گئی اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔ کتبہ مزار کے لیے رباعی ارسال کرتے ہوئے اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۷/اگست ۱۹۳۷ء بنام ممنون حسن خان میں تحریر کیا:

مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لیے میں نے مندرجہ ذیل رباعی انتخاب کی ہے:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
زبند ایں و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

یہ رباعی میں نے اپنے کتبہ مزار کے لیے لکھی تھی لیکن تقدیر الٰہی یہ تھی کہ مسعود مرحوم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو جائے، حالانکہ عمر کے اعتبار سے مجھ کو ان سے پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ اُن کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے، لیکن اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا:

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب رامرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

باقی خیریت ہے۔ مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں''۔ ۳۵

۱۹۳۷ء کے آخری چند مہینوں میں اقبال نے مسلم طلبہ کے نام دو پیغام بھیجے۔

پہلا پیغام ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا۔ اس پیغام میں مسلم طلبہ کو محمد علی جناح کی زیر قیادت آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک محاذ پر جمع ہونے اور مستقبل کا بوجھ اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھانے کی تلقین کی گئی تھی ۳۶۔ دوسرا پیغام آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کلکتہ کی صدارت قبول کرنے کی درخواست کے جواب میں انگریزی کے ایک خط کی صورت میں دیا گیا۔ یہ خط مسز ڈورس احمد سے لکھوایا گیا ۳۷، اور اس کا اردو ترجمہ ''انقلاب'' مورخہ ۹ /اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس پیغام میں اپنی مسلسل علالت اور کمزوری نظر کے پیش نظر صدارت قبول کرنے سے معذرت کی گئی تھی، لیکن اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نوجوان نسل اس نازک سیاسی دور کی اہمیت کو سمجھے گی، جس میں سے مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں۔ آخر میں فرمایا:

مخالف قوتوں سے ہرگز مت ڈرو۔ جدوجہد جاری رکھو، کیونکہ جدوجہد ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔ ۳۸

مسلسل علالت کے سبب اقبال تعلیمات قرآنی یا فقہ اسلامی کی تدوین نو کے بارے میں اپنی کتاب بھی تحریر نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے انگریزی میں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض تحریریں، جنہیں ان کی تصنیف کا خاکہ یا پلان سمجھنا چاہیے، میاں محمد شفیع کو دیں۔ یہ نوٹس، بقول میاں محمد شفیع ۱۹۳۵ء میں تحریر کیے گئے تھے، اور اقبال انہیں کتابی شکل میں ڈکٹیٹ کرانا چاہتے تھے، مگر اب صرف اس تصنیف کے خاکے ہی کے طور پر محفوظ ہیں۔ ۳۹

اقبال کی بصارت کی کمزوری کے سبب ان کے احباب یا اعزہ و اقارب ہی انہیں روزانہ اخبار یا خطوط پڑھ کر سنایا کرتے اور اقبال انہی سے خطوط کے جوابات اپنے اشعار یا دیگر نثری مضامین بھی لکھواتے تھے۔ میاں محمد شفیع اور سید نذیر نیازی

کے سپرد یہی کام تھا، لیکن ان کی عدم موجودگی میں بعض اوقات مسز ڈورس احمد یا راقم بھی یہ خدمت انجام دینے کے لیے حاضر ہوتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جو کوئی بھی پاس بیٹھا ہوتا اس سے پڑھوا یا لکھوا لیتے۔ مثلاً ایک عقیدت مند نصر اللہ خان، جو ان دنوں ''زمیندار'' سے وابستہ تھے، کبھی کبھار ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' یا ''ٹریبیون'' کے لیڈرز پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نصر اللہ خان اپنے کسی دہریے دوست کو ساتھ لے کر اقبال کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ یہ خدا کو نہیں مانتے انہیں سمجھایئے۔ اس پر اقبال کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ جسکو اللہ نہ سمجھا سکا اس کو میں کیا سمجھا سکوں گا۔[40]

''جاوید منزل'' میں اقبال کی زندگی سے متعلق چند یادیں راقم کے ذہن میں محفوظ ہیں[41]۔ اس زمانے میں علی بخش کے علاوہ رحمٰن اور دیوان علی بھی گھر کا کام کاج کرتے تھے۔ عبدالمجید خانساماں کھانا پکاتا تھا اور رحمت بی منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھیں۔ رحمٰن کے سپرد مالی کا کام بھی تھا۔ سودا سلف علی بخش لاتا اور رحمٰن بھی اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے علاوہ علی بخش، رحمٰن اور دیوان علی باری باری اقبال کے پاؤں، پیٹھ یا شانے دابتے تھے، علی بخش منیرہ کو تانگے پر اسکول چھوڑنے یا لینے جاتا۔ راقم علیحدہ تانگے پر اسکول جایا کرتا۔ ان دنوں موٹر کار بہت کم استعمال میں لائی جاتی تھی۔ دیوان علی اچھا خاصا گا لیتا تھا۔ کبھی کبھار اقبال کو ہارمونیم کے ساتھ خواجہ غلام فرید، سلطان باہو، بلھے شاہ اور دیگر شعراء کا کلام سنایا کرتا۔ آخری ایام میں اقبال کی خدمت میں اکثر و بیشتر موجود رہنے والے عقیدت مند میاں محمد شفیع، سیّد نذیر نیازی، چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر اور ڈاکٹر عبدالحمید تھے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ بھی بسا اوقات انہیں دیکھنے کے لیے آ جاتے۔ بعض اوقات راجہ حسن اختر اپنے ساتھ سجّاد سرور نیازی کو لاتے اور سجاد سرور نیازی، اقبال کو غالب، حالی یا ان کا اپنا کلام ہارمونیم کے ساتھ گا کر سناتے۔ اسی طرح کبھی کبھار اقبال کی

فرمائش پر فقیر نجم الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں ستار یا شاید طاؤس بجا کر سناتے۔ انہی ایام میں ایک عرب بھی روزانہ اقبال سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جو انہیں قرآن مجید پڑھ کر سناتے۔ راقم نے بھی ان سے چند ماہ قرآن مجید پڑھا ہے، وہ نہایت خوش الحان تھے۔ اقبال جب کبھی ان سے قرآن مجید سنتے، راقم کو بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۂ مزمل پڑھی تو اقبال اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو انہوں نے سر اٹھا کر راقم کی طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح راقم کو ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کے لیے کہا، اور خاص طور پر وہ بند...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو اقبال سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ راقم نے سردار بیگم کی وفات پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا، مگر قرآن مجید سنتے وقت، اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں امنڈ آیا کرتیں۔

سردیوں میں تو اقبال اپنے کمرے میں سوتے، لیکن گرمیوں میں باہر دالان میں سویا کرتے۔ راقم کی چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ پنکھا لگانا پسند نہ کرتے تھے۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے، کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ بے چین ہو جایا کرتی۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ بسا اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے

آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو علی بخش کو اس غرض کے لیے بھی بلواتے کہ پائنتی پر پڑی چادر ان کے اوپر ڈال دے۔ اقبال کی عادت سر کے نیچے بازو رکھ کے بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں عموماً ہلتا رہتا، جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ کر سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں، بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ مگر جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے جس کے سبب نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار ان کے خراٹوں سے راقم ڈر جایا کرتا۔

ان ایام میں راقم نے اقبال کو بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں دالان میں رکھے ہوئے تخت پوش ہی پر نیت باندھ لیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ سردیوں میں دھوتی اور قمیض پر دھسا اوڑھ لیا کرتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی۔ دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑ جاتا مثلاً دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس، تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے۔ اس لیے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں عموماً دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے مطمئن تھے۔ بارہا دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کے سبب بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟ شام کو ''جاوید منزل'' کے دالان ہی میں دو تین چکر پیدل لگا لیا کرتے۔

سردار بیگم کی وفات کے بعد اقبال شاید صرف ایک بار زنانہ میں آئے اور وہ بھی اس وقت جب راقم کو بخار ہو گیا تھا۔ انہیں تب پہلی بار معلوم ہوا کہ زنانہ حصے میں کمروں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بھی خوش ہوئے کہ ایک کمرے میں سردار بیگم کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح سردار بیگم کی وفات کے بعد اقبال نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن راقم نے انہیں از سر نو خضاب لگانے کو کہا تو مسکرا کر بولے: میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ راقم نے دوبارہ کہا: لیکن ہم سب تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے ان کے سفید بالوں کو دیکھ کر انہیں ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ماہ بعد پھر چھوڑ دیا اور راقم کو ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کے لیے کہے۔

آخری چند سالوں میں غالباً رمضان کے مہینے میں ایک بار ایک چور ''جاوید منزل'' میں گھس آیا، لیکن سحری کے وقت ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ اس زمانے میں شیخ عطا محمد کے منجھلے فرزند شیخ امتیاز احمد اپنے اہل و عیال سمیت یہاں مقیم تھے۔ شیخ امتیاز احمد نے چور کو تین چار تھپڑ رسید کیے اور اس کی شلوار کی جیبوں میں سے چوری کی ہوئی اشیاء جو کہ معمولی سی تھیں اور جن میں راقم کی کھلونا پستول بھی تھی، برآمد کر لیں، انہوں نے چور کو رسّی سے باندھ رکھا تھا اور تھانے میں اطلاع بھی بھجوا دی تھی۔ چور ایک دبلا پتلا نحیف اور مسکین سا نوجوان تھا، جو اقبال کی خواب گاہ سمیت گھر کے تمام کمروں میں پھرتا رہا تھا۔ جب اقبال کو یہ سب معلوم ہوا تو چور کی حالت پر ترس کھا کر حکم دیا کہ اسے روٹی کھلوا کر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اسے سحری کے وقت پکے ہوئے پراٹھے اور سالن کھلوایا گیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی اور چور کو پکڑ کر لے گئی۔

مسز ڈورس احمد کے گھر میں آنے سے ''جاوید منزل'' کے سب مکینوں کی گھر

یلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ اِن کے اصرار پر کچھ مدت کے لیے اقبال بھی بچوں کے ساتھ کم از کم دوپہر کا کھانا کھانے والے کمرے میں کھانے لگے۔ راقم اور منیرہ کو احساس ہوا کہ سب ایک خاندان کے رکن ہیں۔ منیرہ چند ہی دنوں میں مسز ڈورس احمد سے مانوس ہو گئی۔ ان کی خواہش کے مطابق ہر کوئی انہیں "آپا جان" کہتا تھا۔ منیرہ اور آپا جان ہر شام اقبال کے پاس بیٹھا کرتیں۔ اقبال راقم اور منیرہ کو بچپن ہی سے ببا اور ببی کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ جرمن زبان سے بھی شناسا تھے۔ اس لیے کبھی کبھی آپا جان سے جرمن میں گفتگو کرتے اور منیرہ سے بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ اُن دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرنے کی کوشش کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔ آپا جان، راقم اور منیرہ کے ساتھ شام کو بعض اوقات گھر کے عقب میں ریلوے کالونی میں سیر کے لیے نکل جاتیں۔ انہوں نے لان میں بیڈمنٹن کورٹ بھی بنوا رکھا تھا اور راقم اور منیرہ کی شامیں آپا جان کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے گزرتیں۔

ہر ماہ گھر کے اخراجات کے لیے رقم منشی طاہر الدین آپا جان کو دے جایا کرتے، کیونکہ آمدنی اور خرچ کا حساب وہی رکھتے تھے۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ وفات سے چند ہفتے پیشتر ایک شام اقبال نے منشی طاہر الدین کو بلوایا اور انہیں ٹین کی تین چار صندوقچیاں کھولنے کو کہا، جن میں مختلف قسم کے مسودات، تصویریں، خطوط اور کاغذوں کے پرزے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے کمرے میں اور کوئی موجود نہ تھا۔ منشی طاہر الدین صندوقچیوں میں سے ہر کاغذ نکال کر اس کی تفصیل انہیں بتاتے جاتے اور پھر اسے اقبال کی منشا کے مطابق یا تو سنبھال کر ایک طرف رکھ لیتے یا سامنے انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیتے تھے۔ راقم اتفاق سے کمرے میں داخل ہوا اور انگیٹھی میں مختلف قسم کے کاغذات وغیرہ کو جلتے

ہوئے پایا۔ پس وہی مسودات اور کاغذات بچے جو اقبال محفوظ رکھنا چاہتے تھے[42]
۔باقی سب تصویروں سمیت نذر آتش کر دیے گئے۔

راقم کو مصوری سے بھی دلچسپی تھی، لیکن اقبال کو راقم کے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ راقم نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے اچھی خاصی بن گئی۔ ان دنوں شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے اور جاوید منزل میں مقیم تھے۔ شیخ عطا محمد نے جب راقم کی بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر اقبال کو دکھانے کے لیے ان کے کمرے کی طرف چلے۔ راقم بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ اقبال کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر راقم نے بنائی ہے، لیکن جب یقین آ گیا کہ تصویر راقم نے بنائی ہے، تو راقم کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنے احباب کے ذریعے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے راقم کے لیے خاص طور پر آرٹ کی کتابیں منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکار دیکھ کر راقم کا مصوری کے لیے شوق بڑھے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ مصوری کے شاہکار دیکھ کر راقم نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر وہ ساری عمر بھی کوشش کرے تو ایسی خوب صورت تصویریں نہیں بنا سکتا۔

اقبال کی بڑی خواہش تھی کہ راقم تقریر کرنا سیکھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ راقم کشتی لڑا کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں راقم کے لیے گھر کے عقب میں ایک اکھاڑا بھی کھدوا دیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹ باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ پھر بڑی عید کے روز راقم کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت وہاں موجود ہو لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اقبال میں قوت برداشت کی انتہا تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی

خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

آخری ایام میں انہیں انگریزی لباس سے نفرت ہوگئی تھی۔ راقم کو ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے: اپنے بال اس طرح مت گوندھا کرو۔ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے اور اگر راقم کبھی غلطی سے قمیض یا شلوار کے لیے بڑھیا قسم کا کپڑا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے اور کہتے: تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو، تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔ راقم کے لیے بارہ آنے گز سے زائد قمیض کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کے بوٹ خریدنا جرم تھا جس کی سزا کافی کڑی تھی، لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ راقم آج پلنگ پر سونے کے بجائے زمین پر سویا ہے یا اسے کبھی نماز پڑھتے دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا تو بے حد متاثر ہوتے۔

اپنی زندگی میں صرف دو بار انہوں نے راقم کو سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ دونوں انگریزی فلمیں تھیں۔ ایک میں فرانسیسی ادیب ایمائیل ذولا کے حالات زندگی کی تفصیل تھی اور دوسری نپولین کی فتوحات کے متعلق تھی۔ اقبال دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے عقیدت رکھتے تھے۔ راقم کو اکثر فاروق اعظمؓ، حضرت علیؓ، خالد بن ولیدؓ اور طارقؒ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے راقم کو بتایا کہ نپولین کے اجداد سرزمین عرب سے آئے تھے اور واسکوڈے گاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا راستہ دکھایا تھا۔

آخری ایام میں اقبال کی نظر بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ اس لیے راقم انہیں کبھی کبھار صبح اخبار پڑھ کر سناتا تھا۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا ہو جاتا تو بہت خفا ہوتے۔

اسی طرح رات کو راقم انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں راقم کو ان کی صرف ایک غزل یاد تھی:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اقبال کے سامنے وہ غزل پڑھنا راقم کے لیے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھا جاتا تو بہت ناراض ہوتے اور کہتے: شعر پڑھ رہے ہو یا نثر!

انہیں لوگ گھر ہی پر ملنے آتے تھے۔ ہر شام احباب کی محفل جمتی جو رات گئے تک قائم رہتی۔ ان کی چارپائی کے گرد کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر آ کر بیٹھ جاتے۔ وہ چارپائی پر لیٹے یا گاؤ تکیے کا سہارا لیے ان سے باتیں کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ گفتگو نہایت سنجیدہ موضوعات پر ہوتی یا کبھی کبھی علی بخش کی چوہدری محمد حسین کے ساتھ نوک جھوک سے محظوظ ہوتے۔ چوہدری محمد حسین بلا ناغہ شام کو ان کے پاس آیا کرتے، بالعموم اس وقت جب اقبال تنہا ہوتے۔ اقبال، چودھری محمد حسین کو اپنا تازہ کلام سناتے۔ ایک پرانے لیمپ کی ماندسی روشنی میں چودھری محمد حسین فارسی یا عربی لغت کی موٹی موٹی جلدوں کے صفحے الٹتے: اشعار میں مضمون کی یک جہتی، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث و تمحیص ہوتی، اتنے میں اور لوگ بھی آ جاتے۔ بعض اوقات اسلام، فلسفہ یا سیاسیات پر گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چودھری محمد حسین بہت کھل کر ہنستے تھے اور ان کے قہقہوں کی آواز اکثر اقبال کے کمرے میں گونجا کرتی۔

چودھری محمد حسین اچھے کھانے کے نہ صرف شوقین تھے، بلکہ خوب کھاتے تھے۔ اقبال مرغن کھانے خود تو نہ کھا سکتے تھے، مگر بعض اوقات بریانی قورمہ، مرغ مسلم اور کباب خاص طور پر بنوانے کا حکم دیتے اور اپنے روبرو چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی یا دیگر احباب کو کھلواتے اور انہیں کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے۔ چوہدری محمد حسین کو اقبال کی طرح آموں سے بڑی رغبت تھی۔ گرمیوں کے موسم

میں اقبال کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آموں کے ٹوکرے آیا کرتے اور اُن سے چوہدری محمد حسین کی تواضع کی جاتی۔ سردیوں کے موسم میں شاہ افغانستان کی بھیجی ہوئی سردوں، انگوروں اور خشک میووں کی پیٹیاں آیا کرتیں اور ان میووں کو کھاتے وقت گفتگو برصغیر کی حدوں سے نکل کر مشرق وسطیٰ تک پہنچ جاتی۔ قندھار، غزنی، کابل، تہران اور تبریز سے ان پھلوں کا ذکر اقبال اور چوہدری محمد حسین کو سلاطین، اساتذہ اور صوفیائے کرام تک لے جاتا۔ غرضیکہ عجب سماں بندھتا۔ بات کہاں سے چلتی اور کہاں پہنچ جاتی۔ پھر علی بخش سے مذاق ہونے لگتا اور چودھری محمد حسین کبھی اس کی خضاب زدہ مونچھوں پر پھبتی کستے، کبھی اسے بیاہ رچانے کو کہتے اور کبھی اسے سرکار سے مربعے دلوانے کی حامی بھرتے۔ ایک عرصے تک علی بخش کی مونچھوں کے رنگ کے تعین کے سلسلے میں بحث جاری رہی۔ اقبال کی رائے میں اس کی مونچھوں کا رنگ ''مونچھئی'' تھا۔ انھی ایام میں چوہدری محمد حسین نے ایک نیلے رنگ کا اوورکوٹ بھی سلوایا تھا جو عرصے تک موضوع مذاق بنا رہا۔

اقبال رات کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے یا کبھی کبھار آپا جان کا تیار کردہ شوربا یا یخنی پی لیتے۔ رات گئے تک علی بخش، رحمٰن، دیوان علی یا میاں محمد شیخ ان کے پاؤں اور شانے دباتے اور اگر راقم کبھی دبانے کے لیے بیٹھتا تو منع کر دیتے۔ کہتے: تم ابھی چھوٹے ہو۔ تھک جاؤ گے۔

راقم کو خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی اقبال کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی علمی بحث و مباحثہ ہو رہا ہو تو راقم وہاں ضرور موجود رہے۔ مگر راقم کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی، کیونکہ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو وہ عموماً موقع پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا، جس سے انہیں بہت رنج ہوتا اور وہ اپنے احباب سے شکایتاً کہتے: یہ لڑکا نہ جانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے۔ دراصل اب

وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے اور اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے: سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں، میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا۔

اُن ایام میں دو ایک بار اقبال کے پرانے دوست میاں شاہ نواز بھی انہیں ملنے کی خاطر آئے۔ میاں شاہ نواز مفلوج تھے اور موٹر کار کی پچھلی سیٹ ہی پر بیٹھے رہتے۔ ان کی آمد پر یا تو اقبال ان کے ساتھ جا کر بیٹھ جاتے یا اقبال کی چارپائی ان کے قریب رکھ دی جاتی اور یوں دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کر کے پرانی یادیں تازہ کر لیتے۔ اس زمانے میں میاں شاہ نواز نے اقبال سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اور ایک چچا کی حیثیت سے راقم کو اپنی اراضی میں سے دس مربعے عطا کیے جن کی قیمت روپوں کی صورت میں ان کی وفات کے کئی برس بعد بیگم شاہنواز نے راقم کے انکار کے باوجود اسے ادا کر دی۔

آخری ایام میں اقبال کو اکثر دم کشی کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات جب ایسے دورے پڑتے تو ضعف اور نقاہت کے سبب ان پر غشی کا عالم طاری ہو جاتا اور ہوش میں آ جانے کے بعد چند لمحوں تک ایک قسم کی مدہوشی کی کیفیت چھائی رہتی۔ راقم نے انہیں دو بار ایسی ہی حالت میں دیکھا ہے۔ ایک بار راقم نے یوں محسوس کیا جیسے وہ میرزا اسد اللہ خان غالب کے ساتھ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہوں اور دوسری بار انہیں مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ اسی انداز میں محو گفتگو پایا۔ راقم نے اقبال کی وفات کے بعد اپنے ان مشاہدات کا ذکر چودھری محمد حسین سے کیا تھا، لیکن انہوں نے ایسے مشاہدات کی تشہیر منع کر دی۔ ان کی رائے میں اس قسم کی ذہنی کیفیات اقبال کی بیماری یا علالت کے سبب ان پر طاری ہوتی تھیں اور ان کا کسی قسم کی روحانیت سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ ایسی کیفیات اقبال کی تعلیمات کے برعکس اور منافی تھیں۔

مسز ڈورس احمد نے اقبال سے متعلق ایک کتابچے میں اپنے ذاتی تاثرات

قلمبند کیے ہیں، جن میں سے بعض خاصے دلچسپ ہیں[۴۳]۔ مثلاً وہ فرماتی ہیں کہ ان کے آنے پر منیرہ لڑکیوں کے اسلامیہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کی زیر نگرانی قائم شدہ اس اسکول میں شہر کے غریب مسلمانوں کی بیٹیاں اور یتیم بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ یہ اسکول جاوید منزل سے خاصا دور تھا اور پھر اسکول کی حالت اچھی نہ ہونے کے سبب منیرہ کے بالوں میں جوئیں بھی پڑ گئیں۔ آخر کار مسز ڈورس احمد کی تحریک پر اسے اس اسکول سے اٹھوا کر قریب ہی لڑکیوں کے ایک عیسائی مشنری اسکول (کنیرڈ اسکول) میں داخل کروا دیا گیا۔ مگر جب مسز ڈورس احمد کو پتا چلا کہ اس اسکول میں داخل ہر بچی کے لیے عیسائی مذہبی تعلیم کی جماعتوں میں شامل ہو کر انجیل کے سبق لینا لازمی ہے تو وہ فوراً یہ بات اقبال کے نوٹس میں لائیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ انہیں منیرہ کے ایسی کلاسوں میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یوں اس کے علم میں اضافہ ہوگا اور اقبال نے خود بھی انجیل کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ البتہ فرمایا کہ اس کے لیے گھر پر قرآن مجید اور ابتدائی اسلامی دینیات پڑھوانے کا انتظام کر دیا جائے اور چوہدری محمد حسین کی وساطت سے ایسا انتظام کروا دیا گیا۔

ایک شام منیرہ اور مسز ڈورس احمد حسب معمول اقبال کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ منیرہ نے ان سے کہا: آپا جان مہربانی کر کے کہیے لا الٰہ الا اللہ۔ مسز ڈورس احمد نے یہ الفاظ دہرائے۔ اس پر منیرہ نے تالیاں بجاتے ہوئے شور مچا دیا: آپ نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ مسلمان ہو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی: میں نے آپ کا نام فاطمہ رکھ دیا ہے۔ منیرہ کی اس شرارت سے اقبال بے حد محظوظ ہوئے۔

مسز ڈورس احمد تحریر کرتی ہیں کہ منیرہ ابھی سات برس کی تھی کہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اس کے لیے سیالکوٹ سے برقع سلوا کر بھجوایا اور ہدایت کی کہ چونکہ اب وہ جوان ہو رہی ہے اس لیے گھر سے باہر نکلتے وقت برقع پہنا

کرے۔ مسز ڈورس احمد سخت پریشان ہوئیں۔ برقع ہاتھ میں پکڑے اقبال کے پاس پہنچیں اور کہا کہ وہ کسی حالت میں بھی اسے منیرہ کو نہ پہنائیں گی۔ اس وقت راقم بھی وہیں موجود تھا۔ اقبال نے کہا مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ منیرہ بے شک برقع نہ پہنے۔ دیہات اور قصبوں میں تو عورتیں عموماً چادر اوڑھتی ہیں۔ میری والدہ بھی کبھی گھر سے باہر نکلتی تھیں تو چادر اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ مگر جب منیرہ بڑی ہوگی تو شاید زمانہ بالکل بدل جائے۔ سو ہمیں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مسز ڈورس احمد لکھتی ہیں کہ اقبال اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بے حد احترام کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے نہ بولتے تھے، لیکن اگر کسی بات پر ان سے اختلاف ہوجاتا تو ان کو ناراض کیے بغیر خاموشی سے کرتے وہی تھے، جو ان کے خیال کے مطابق درست ہوتا۔

اقبال کی چھوٹی بہن زینب بی کی ضعیف الاعتقادی کے متعلق مسز ڈورس احمد بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے انتقال سے چند ہفتے پیشتر وہ انہیں دیکھنے کے لیے جاوید منزل آئیں اور چند روز یہیں قیام کیا۔ زینب بی نے اصرار کیا کہ ان کے جاننے والے ایک عامل کو بلوایا جائے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اس کے عمل سے اقبال کی تکلیفیں دور ہوجائیں گی مسز ڈورس احمد نے اجازت دے دی، عامل آیا اور اس نے چند اشیا طلب کیں۔ چنانچہ زینب بی نے علی بخش کو ہدایت کی کہ تین گز سیاہ رنگ کا کپڑا، مختلف قسم کی دالیں شکر، سرسوں کا تیل، آٹا اور ایک کالا مرغ خرید کر لائے۔ علی بخش باقی اشیا تو آسانی سے خرید لایا۔ البتہ اسے کالا مرغ خرید کرتے وقت ذرا دقت پیش آئی۔ بہرحال جب تمام اشیا جمع ہوگئیں تو زینب بی نے مسز ڈورس احمد سے کہا کہ عامل کی خواہش کے مطابق اب کالے مرغ کو ساری رات اقبال کی خواب گاہ میں رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔ اقبال کی حالت کے پیش نظر مسز ڈورس احمد نے ایسی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ آخر کار دونوں میں بے حد بحث کے

بعد یہ طے پایا کہ علی بخش صبح چار بجے کالے مرغ کو ہاتھ میں اٹھائے اور اس کی چونچ کو انگلیوں میں دبائے اقبال کی خواب گاہ میں پھرا لائے۔ علی بخش نے ایسا ہی کیا۔ خوش قسمتی سے اقبال اس وقت گہری نیند سو رہے تھے اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔ اس کے بعد کالے مرغ سمیت تمام اشیاء عامل کو دے دی گئیں جو کچھ دیر اپنا عمل پڑھنے کے بعد انہیں لے کر رفو چکر ہو گیا۔

مسز ڈورس احمد تحریر کرتی ہیں کہ اقبال نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد اتنی مدت منیرہ اور راقم کے پاس ضرور رہیں جب تک کہ وہ بڑے نہیں ہو جاتے، کیونکہ ان کے آنے سے بچوں کو ایک بار پھر صحیح معنوں میں گھر کا سکون نصیب ہوا تھا۔ پس اقبال کے انتقال کے بعد مسز ڈورس احمد تقریباً پچیس برس تک جاوید منزل میں مقیم رہیں اور بعد ازاں واپس برلن (جرمنی) چلی گئیں۔

پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ کے کارکن دو محازوں پر اپنی سیاسی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایک طرف تو انہیں یونینسٹ پارٹی کے خلاف تقریریں کرنا پڑتیں، جس نے گزشتہ کئی برسوں سے پنجابی مسلمانوں کو سیاسی بیداری سے محروم کر رکھا تھا اور دوسری طرف کانگرس کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانا پڑتا۔ کانگرس کی یلغار کے سامنے سر سکندر حیات کی اپنی یونینسٹ پارٹی یا مخلوط وزارت کا بھی زیادہ دیر تک قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ سر سکندر حیات کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی غیر فرقہ وارانہ علاقائی جماعت کے ہندو ممبر اگر کانگرس کے ساتھ مل جائیں تو یونینسٹ پارٹی کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر سرحد یا دو ایک مسلم اکثریتی صوبوں کی طرح ان کی جماعت کے مسلم ممبران میں سے چند کانگرس کی حمایت کرنے لگیں تو بھی یونینسٹ پارٹی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیش نظر یونینسٹ پارٹی کے بعض مسلم لیڈروں نے اپنی توجہ محمد علی جناح کی طرف مبذول کی اور اپنی جماعت کے بچاؤ کی

خاطر ۱۵ را کتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں شریک ہونے کا قصد کیا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں سے محمد علی جناح مسئلہ فلسطین پر ایک مناسب قرارداد منظور کروائیں اور ساتھ ہی مسلم عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی خاطر کوئی ایسی راہ اختیار کی جائے، جس سے لیگ کو مسلم عوام میں ہر دلعزیزی حاصل ہو سکے، وہ خود تو اپنی علالت کے سبب اجلاس میں شرکت نہ کر سکتے تھے، اسلیے انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۷ را کتوبر ۱۹۳۷ء بنام محمد علی جناح میں تحریر کیا:

پنجاب سے ایک بہت بڑی جمعیت مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے لکھنؤ پہنچ رہی ہے۔ یونینسٹ مسلم نمائندے بھی سر سکندر حیات کی زیر قیادت اجلاس میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں...... لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لیے میں اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے مسٹر غلام رسول کو دے دوں گا۔ وہ یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بڑے غور سے ان کا انتخاب کریں گے۔ ہمارے آدمی ۱۳ رتاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔ مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے۔ لیگ کے مقاصد کی خاطر مسلم عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لیے یہ ایک نادر موقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ لیگ اس مسئلہ پر ایک مناسب قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی، بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسی راہ عمل بھی متعین کی جائے گی، جس میں مسلم عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں [۴۴]۔ یوں ایک طرف تو لیگ کو ہر دلعزیزی حاصل ہو گی اور دوسری طرف شاید فلسطین کے عربوں کو بھی کچھ فائدہ پہنچ سکے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کی خاطر جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک ایسی مغربی چھاؤنی کا قیام اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے پر خطر ہے۔ [۴۵]

لیگ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں سر سکندر حیات اور ان کے رفقا شریک تو ہوئے اور سکندر جناح میثاق بھی وجود میں آیا، جس کے مطابق سر سکندر حیات نے عہد کیا کہ یونینسٹ پارٹی کے ان تمام مسلم ممبران کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں تھے، مسلم لیگ میں شامل ہو جانے کی ہدایت کر دی جائیگی، مگر سر سکندر حیات کی نیت درست نہ تھی۔ وہ دو رخی چال چلنا چاہتے تھے، یعنی کانگرس کے وار کو مسلم لیگ کی ڈھال پر روکا جائے اور ساتھ ہی صوبائی مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کے کنٹرول میں لا کر اپنے آلہ کار کے طور استعمال کیا جائے۔

میثاق کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۲۲ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اقبال کے حسب الحکم غلام رسول خان سیکرٹری صوبائی مسلم لیگ نے سر سکندر حیات کی خدمت میں مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم اس درخواست کے ساتھ ارسال کیے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ممبران سے ان پر دستخط کروا لیے جائیں۔ مگر سر سکندر حیات نے انہیں فارموں پر دستخط کرنے سے منع کر دیا[۴۶]۔ اس پر اقبال نے اپنے خط مورخہ ۳۰ / اکتوبر ۱۹۳۷ء بنام محمد علی جناح میں تحریر کیا:

عام افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سر سکندر حیات اور ان کی جماعت نے اب تک اس پر دستخط نہیں کیے اور مجھے آج صبح معلوم ہوا ہے کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک اسی طرح ٹال مٹول کرتے رہیں گے۔ خود یونینسٹ پارٹی کے ایک رکن نے مجھے بتایا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ بہر حال میں چند دنوں تک آپ کو پورے کوائف سے مطلع کروں گا، اور پھر آپ کی رائے درکار ہوگی کہ آئندہ ہم کس طرح کام جاری رکھیں۔ مجھے امید ہے کہ لاہور میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد سے بیشتر آپ کم از کم دو ہفتوں کے لیے پنجاب کا دورہ کر سکیں گے۔[۴۷]

۳۱/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سر سکندر حیات اپنے چند رفقا سمیت اقبال سے ملنے آئے، اور اس ملاقات میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر گفتگو ہوئی۔ سکندر جناح میثاق کے متعلق سر سکندر حیات کا موقف یہ تھا کہ محمد علی جناح اس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ، یونینسٹ پارٹی کی نگرانی میں کام کرے اور اس بنا پر ان کا مطالبہ تھا کہ بورڈ کے ممبران میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ صوبائی مسلم لیگ کے تمام عہدے داروں بالخصوص سیکرٹری کو بدلنے کے درپے تھے اور لیگ کی آمدنی اور خرچ کو بھی یونینسٹ پارٹی کے کنٹرول میں لانا چاہتے تھے۔ اقبال نے ان سے اتفاق نہ کیا، بلکہ اپنے ایک خط مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح سے پوچھا:

سر سکندر حیات خان اپنی جماعت کے چند اراکین کے ساتھ کل مجھ سے ملنے آئے تھے اور ہمارے درمیان لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ دونوں فریقوں کی طرف سے اخباری بیانات شائع ہو چکے ہیں، جس میں ہر فریق نے سکندر جناح میثاق کے بارے میں اپنی اپنی تاویل پیش کی ہے۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے آپ کو لکھ چکا ہوں، میں چند دنوں تک آپ کو ان تمام بیانات کی نقول بھیج دوں گا۔ فی الحال میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر مجھے فی الفور اس معاہدے کی نقل ارسال کر دیجئے جس پر سر سکندر کے دستخط ثبت ہیں اور جو میری اطلاع کے مطابق آپ کے پاس موجود ہے۔ ایک اور امر جو وضاحت طلب ہے یہ ہے: کیا آپ نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ صوبائی لیگ کا پارلیمانی بورڈ یونینسٹ پارٹی کے کنٹرول میں چلا جائے، سر سکندر۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اس ضمن میں اپنی منظوری دے چکے ہیں اور اسی بنا پر وہ اصرار کرتے ہیں کہ بورڈ کے ارکان میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیے۔ جہاں تک میرا خیال ہے سکندر جناح میثاق میں ایسی کوئی شق

موجود نہیں۔ مہربانی کر کے اس خط کا جواب جلد از جلد عنایت فرمائیے۔ ہمارے آدمی بدستور صوبے کے دورے میں مصروف ہیں اور جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ گزشتہ رات ہم نے لاہور میں ایک بہت بڑا کامیاب جلسہ کیا۔ جلسوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔[۴۸]

اقبال کے یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین سے تعلقات ان کی ہٹ دھرمی، انگریز کے ساتھ ذلت آمیز وفاداری، مسلمانوں کے بجائے احمدیوں کو ترجیح دینے یا انہیں زندگی میں آگے بڑھانے اور پنجاب میں اپنی لیڈری کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر مسلم لیگ یا محمد علی جناح کی مخالفت کے باعث خراب ہوئے تھے، اسی طرح سر عبدالقادر کی ابن الوقتی اور سرکار پرستی کے سبب اقبال ان سے دور ہٹ گئے اور اگر ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق رہا تو محض رسمی تھا۔ سر عبدالقادر بھی ساری عمر پبلک پلیٹ فارم پر منافقانہ طور پر اقبال سے دوستی کا دم بھرتے رہے، مگر اپنے خاص حلقۂ احباب میں یا ہندوؤں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت اقبال کے متعلق کذب گوئی سے کام لینے یا ان کے خلاف بہتان تراشنے سے باز نہ آتے تھے۔ اس کی ایک مثال گوپال متل نے اپنی تصنیف ''لاہور کا جو ذکر کیا'' میں پیش کی ہے، جو قابل توجہ ہے۔ وہ سر عبدالقادر سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ملاقات میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور ایسے کئی نکات بیان فرمائے جو شارحین اقبال کی نگاہوں سے اس وقت بھی مخفی تھے، اور اب بھی۔ مثال کے طور پر اقبال کے اس قطعے کو جس کا آخری شعر یہ ہے:

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی تکیہ نہ تھا اس شہر میں سرمایہ داروں کا

عام طور پر جمہوری نظام کا فکری استرداد قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ قطعہ انہوں نے

کونسل کے انتخاب میں شکست کھانے کے بعد لکھا تھا اور انتخاب میں ان کا کھڑا ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فکری سطح پر انتخابات اور جمہوریت کے مخالف نہیں تھے (کونسل کے انتخاب میں اقبال کا شکست کھانا سراسر جھوٹ ہے۔ انہوں نے صرف ایک مرتبہ پنجاب کونسل کا انتخاب لڑا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ راقم) اسی طرح اقوام متحدہ (مصنف کی مراد غالباً جمعیت اقوام سے ہے۔ راقم) کے متعلق ان کا ایک فارسی قطعہ ہے جس کے آخری دو مصرعے ہیں:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اس پر بھی شارحین اقبال نے استدلال کی ایک عمارت کھڑی کر لی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انجمن میں ہندوستانی نمائندہ نامزد ہونے کے لیے اقبال نے بڑی ہی کوشش کی تھی۔ قرعۂ فال ان کی بجائے سر عبدالقادر کے نام نکلا تو انہیں اس پر کفن چوروں کی انجمن کا گمان گزرنے لگا (حیات اقبال کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے جمعیتِ اقوام میں ہندوستانی نمائندہ نامزد ہونے کے لیے اپنی زندگی کے کسی بھی حصے میں کبھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ راقم) ان کے اس شعر:

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

کے پیچھے بھی ایک حکایت ہے۔ یہ نماز لندن میں پڑھی گئی تھی۔ اقبال امامت کی آس لگائے بیٹھے تھے، لیکن یہ آئی سر عبدالقادر کے حصے میں (راقم کے خیال میں اقبال نے زندگی بھر میں شاید کبھی بھی نماز کی امامت نہیں کی۔ اس لیے اس ضمن میں ان کا سر عبدالقادر کو اپنا رقیب سمجھنا بے معنی ہے) اقبال کے دو ترانے بہت مشہور ہیں، ایک وطنی اور ایک ملّی:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

ان دونوں ترانوں کی نظریاتی اہمیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن سر عبدالقادر کا ارشاد تھا کہ یہ دونوں ہی ترانے فرمائشی تھے۔ پہلا ترانہ انہوں نے قوم پرستوں کی فرمائش پر لکھا تھا اور اس کا پہلا مصرع جرمن قومی ترانے کا لفظی ترجمہ ہے۔ صرف جرمنی کی جگہ ہندوستان کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔ اس ترانے کو شہرت ہوئی تو ملت پرست دوستوں کی طرف سے ترانۂ ملّی کے تقاضے شروع ہوئے۔ اقبال نے انہیں بھی پورا کر دیا۔ (متذکرہ تاویل پیش کرنے سے غالباً یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ اقبال تو محض ایک فرمائشی شاعر تھا، جس قسم کا تقاضا ہوتا تھا، اسی قسم کے اشعار کہہ دیتا تھا۔ یعنی اس کا اپنا کوئی موقف نہ تھا۔ راقم)"۴۹

نواب سر ذوالفقار علی خان سے بھی ان کی وفات سے پیشتر اقبال کے تعلقات قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ پرانے احباب میں سے مرزا جلال الدین سمیت صرف چند باقی رہ گئے تھے، جو ان کے زاویۂ نگاہ میں تغیّر کے سبب شاذ و نادر ملنے آتے تھے۔ دراصل آخری عمر میں اقبال اپنے سیاسی نظریات کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی تمدنی یک جہتی، ہندی مسلمانوں کے اتحاد و مستقبل، مسلم لیگ کے ساتھ ان کی وابستگی کی اشد ضرورت یا محمد علی جناح کی قیادت اور مشن کی کامیابی کے بارے میں کسی قسم کے اختلاف رائے کو قبول یا برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

سو یکم نومبر ۱۹۳۷ء سے لے کر ۹ نومبر ۱۹۳۷ء تک اقبال کی سر سکندر حیات

اور ان کے رفقاء کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں، مگر باہمی مصالحت کی کوئی صورت نہ بنی۔ اقبال، سر سکندر حیات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور ان کی شاطرانہ سیاست کے سبب ان پر اعتماد بھی نہ کرتے تھے۔ بالآخر اقبال کو یقین ہو گیا کہ سر سکندر حیات اور ان کے احباب صوبائی مسلم لیگ میں شریک ہونا نہیں بلکہ اس پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء بنام محمد علی جناح میں تحریر کیا:

سر سکندر اور ان کے احباب سے کئی ملاقاتوں کے بعد میں قطعی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سر سکندر مسلم لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس میں درج ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی از سر نو تشکیل کی جائے گی اور اس میں یونینسٹ پارٹی کے آدمیوں کو اکثریت حاصل ہو گی۔ میں نے کچھ مدت ہوئی آپ کو تحریر کر کے پوچھا تھا کہ واقعی آپ پارلیمانی بورڈ میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں؟ اب تک آپ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ مجھے ذاتی طور پر سر سکندر کی خواہش کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اس معاہدے کی شرائط سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لیگ کے تمام عہدہ داروں میں ان کے حسب منشا ردو بدل کیا جائے۔ خصوصاً وہ موجودہ سیکرٹری (غلام رسول خان) کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں، حالانکہ سیکرٹری نے لیگ کے لیے بہت کام کیا ہے۔ سر سکندر کی یہ بھی خواہش ہے کہ لیگ کا سار فنڈ اور حساب کتاب ان کے آدمیوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس تمام کارروائی سے میرے خیال کے مطابق، ان کا مقصد یہ ہے کہ لیگ پر قابض ہو کر اسے ختم کر دیا جائے۔ میں صوبے کی رائے عامہ کو جانتے ہوئے لیگ کی باگ ڈور سر سکندر اور ان کے احباب کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری لینے پر بالکل تیار نہیں ہوں۔ سکندر جناح میثاق نے پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت نقصان

پہنچایا ہے اور اگر یونینسٹ پارٹی کے موجودہ ہتھکنڈے جاری رہے تو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یونینسٹ پارٹی کے ممبروں نے ابھی تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کیے اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ دستخط کرنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس لاہور میں فروری کے بجائے اپریل میں منعقد کروانا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس لیت و لعل سے ان کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ صوبے میں ان کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ لکھنؤ سے واپس آکر سر سکندر نے پنجاب میں ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے اور اب اس زمیندارہ لیگ کی شاخیں صوبے کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ براہ کرم مجھے اطلاع دیجیے کہ ان حالات ہمیں کرنا چاہیے۔۵۰

اقبال کی رائے میں سکندر جناح میثاق صوبائی لیگ کے لیے ایک نقصان دہ معاہدہ تھا۔ یہی رائے صوبائی لیگ کے دیگر قائدین کی تھی۔ مثلاً ملک برکت علی کے خیال میں اگر محمد علی جناح، سر سکندر حیات سے مفاہمت نہ کرتے تو بھی پنجاب میں مسلم لیگ کو عوامی سیاسی تنظیم بنانے کی خاطر یونینسٹ پارٹی کے خلاف جدوجہد جاری رہتی۔ وہ فرماتے ہیں:

یہ صحیح ہے کہ لیگ کی مالی حالت سخت مخدوش تھی۔ دیہاتی آبادی کو یہ کہہ کر کہ لیگ شہری مسلمانوں کی ایک جماعت ہے، ہم سے بدگمان کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں زمیندارہ لیگ قائم کر کے گاؤں کے لوگوں کو بہکانے کی کوششیں بھی شروع ہو گئی تھیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود کانگرس کی یلغار سے شہری اور دیہاتی مسلمان دونوں پریشان ہو رہے تھے اور ان کی پریشانی کا مداوا صرف مسلم لیگ کے پاس تھا۔ مسٹر جناح کو انجام کار یونینسٹ پارٹی کے خلاف لڑنا ہی پڑا، اگرچہ یہ لڑائی چھ سال بعد ہوئی اور میری رائے میں نامناسب موقع پر نامناسب اسباب اور نامناسب حالات میں ہوئی۔ تاہم یہ سب کچھ اس بات کو ثابت کرنے

کے لیے کافی ہے کہ سکندر جناح پیکٹ ایک غلط اور نقصان دہ معاہدہ تھا۔۵۱

یہ قابل اعتراض معاہدہ کیوں کیا گیا؟ عاشق حسین بٹالوی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

میری ذاتی رائے ہے کہ مسٹر جناح اس وقت دو مختلف محاذوں پر لڑنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ کانگرس اس شدت سے مسلمانوں کی قومی جمعیت تہس نہس کرنے پر تلی ہوئی تھی اور اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اپنے گھر کے اندرونی اختلافات کو کسی نہ کسی طرح طے کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے۔ مسٹر جناح نے یہی کیا۔۵۲

عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں کہ اقبال کی ہدایت کے مطابق سکندر جناح میثاق کے قضیئے سے آنکھیں بند کر کے کارکنان صوبائی مسلم لیگ نے اپنی مہم جاری رکھی۔ لیگ کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے لیگ کا دفتر غلام رسول خان بیرسٹر کے گھر پر قائم کیا گیا۔ سرمایہ کی کمی اور دیگر نامناسب حالات میں جس جاں فشانی کے ساتھ کارکنان لیگ نے پنجاب کے مختلف اضلاع میں اپنا کام جاری رکھا، وہ یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی زندگی میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔۵۳

دسمبر ۱۹۳۷ء کے آغاز ہی سے اقبال نے حج پر جانے کے لیے مختلف جہاز راں کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کر دی، لیکن ان کی صحت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی اور اب کسی قسم کا سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ بینائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر متھرا داس نے معائنہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مارچ ۱۹۳۸ء تک ممکن ہے، آنکھ آپریشن کے لائق ہو جائے، لیکن بعد میں دمے کے شدید دوروں کے پیش نظر آپریشن ملتوی کرنا پڑا۔ ایک دن حج پر جانے کی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ عراق ہو کر بھی لوگ حجاز جاتے ہیں، مگر دریافت کروانے پر معلوم ہوا کہ اس راستے میں اور دشواریاں ہیں۔ قریب ہی ان کی بہن زینب بی بیٹھی تھیں۔ بولیں: عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اتر رہا ہے، ایسی

حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر سے رکھے۔ اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔ اس پر بڑے درد انگیز لہجے میں فرمایا: آنکھوں کا کیا ہے۔ آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں۔ اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں، گویا کہہ رہے ہوں:

نسیما جانب بطحا گذر کن
زاحوالم محمدؐ را خبر کن ۵۴

دسمبر ۱۹۳۷ء ہی میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں یوم اقبال کی تقریب منانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اِس موقع پر سر سکندر حیات نے اپنے ایک اخباری بیان مورخہ ۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہندوستانیوں کو بالعموم اور پنجابیوں کو بالخصوص یوم اقبال کی تقریب کو ایک مقدس مذہبی فریضہ سمجھ کر اس میں سرگرمی سے حصہ لینے کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے، وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ شاعر اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی کو چاہیئے کہ امپیریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبال کے نیاز مندوں اوران کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہ راست بنک کو ارسال کر دیں جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ ۵۵

اقبال نے اپنی زندگی میں یوم اقبال کی تقریب منانے کے بارے میں رضا مندی کا اظہار اس لیے کیا تھا کہ نوجوانان ملت میں ان کے افکار و نظریات کی تشہیر ہوتا کہ وہ مستقبل میں عالم اسلام کی رہنمائی کرتے ہوئے اس نئے اسلامی معاشرے کو وجود میں لا سکیں جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ مگر سر سکندر حیات نے اسے ''شاعر اعظم'' کی ذاتی ضروریات کے لیے روپیہ اکٹھا کرنے کا ایک ذریعہ

قرار دیتے ہوئے دراصل اقبال کی غریبی کا مذاق اڑایا۔ پس اقبال نے فوراً ان کی تجویز کے جواب میں ایک بیان مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو جاری کیا جس میں فرمایا:

سر سکندر حیات خان نے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے نام اپنے پیغام میں میرے متعلق جن پر خلوص جذبات کا اظہار کیا ہے میں ان کا ممنون ہوں، لیکن میں ان کی پیش کردہ تجویز کہ میرے کلام اور افکار میں دلچسپی رکھنے والے سب مل کر مجھے تھیلی پیش کریں، کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں قوم کی اجتماعی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں ایک شخص کی انفرادی ضرورت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اگرچہ اس شخص کی شاعری نے کئی انسانوں کی روح کو جلا ہی کیوں نہ بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے، لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی جدید طریقوں کے مطابق تحقیق کے لیے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ اسلامی تاریخ، دینیات، فقہ اور تصوف کے بارے میں مروجہ لاعلمی اور جہالت سے، جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے، اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلامی فکر اور طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے عوام کو بتایا جائے کہ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے اور مسلم ہند میں اُسے کس طرح تہ بہ تہ پردوں میں چھپا کر اسلام کی روح کو مسخ کر دیا گیا۔ اب فوری طور پر ان پردوں کو ہٹانے کی ضرروت ہے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل وصورت سے آگاہ ہو کر اپنے ضمیر کا اظہار قدرتی آزادی کے ساتھ کر سکیں۔ ایسا شعبہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ اسلام اگر ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے کار فرما رہا ہے تو اس نے بنی نوع انسان کے ذہنی اور مذہبی ارتقا میں بھی بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری تجویز کو

وزیر اعلیٰ پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر ورسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔ تاہم میں ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوزّہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔ ۵۶

سر سکندر حیات، اقبال کی خواہش کیونکر پوری کر سکتے تھے، اوّل تو انہیں اسلام یا اُس کے تمدن میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور دوم وہ ایک ایسی علاقائی سیاسی تنظیم کے مسلم لیڈر تھے جو غیر فرقہ وارانہ تھی۔ پس اقبال کے جوابی بیان نے انہیں لاجواب کر دیا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز تک دنیا کے حالات میں اس قدر تغیر آ چکا تھا کہ ایک بار پھر عالمگیر جنگ چھڑ جانے کے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔ ادارۂ جمعیت اقوام نو آبادیاتی طاقتوں کی حمایت یا برطانیہ اور فرانس کے مفادات کے تحفظ کے لیے مخصوص ہو چکا تھا اور چونکہ اسے جرمنی یا اٹلی جیسی یورپی طاقتیں اور جاپان کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، اس لیے آئندہ کسی جنگ کو روکنا اس کے بس میں نہ رہا تھا، بلکہ غالب امکان تھا کہ مستقبل قریب میں یہ ادارہ ٹوٹ جائے گا۔ ۵۷ پسماندہ اقوام بھی اس ادارے سے بدگمان اور برگشتہ تھیں، کیونکہ یہ ادارہ انہیں نو آبادیاتی طاقتوں کے استعمار اور استحصال سے کسی قسم کا تحفظ فراہم کرنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ کی قائم کردہ پیل کمیشن کی تقسیم فلسطین کے متعلق رپورٹ کے بارے میں عرب اس ادارے کے ذریعے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے اور بے بس تھے۔

جرمنی میں ہٹلر کی آمرانہ حکومت قائم تھی، نازی اسٹیٹ کا اوّلین مقصد جرمنوں کے اتحاد کو وجود میں لانا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں نازی جرمنی ادارہ جمعیت اقوام سے علیحدہ ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں فرانس کا ہتھیایا ہوا سارلینڈ کا جرمن علاقہ جرمنی میں دوبارہ شامل کر لیا گیا۔ اسی سال جرمنی نے عسکری طور پر اپنے آپ کو مضبوط بنانے کا حق برطانیہ اور فرانس سے تسلیم کروایا۔ ۱۹۳۶ء میں جرمنی اور اٹلی کے درمیان عسکری معاہدہ وجود میں آیا اور بعد ازاں جرمنی اور اٹلی نے اسی قسم کا معاہدہ جاپان کے ساتھ بھی کیا۔ ۱۹۳۷ء میں ہٹلر نے مستقبل میں اپنی عسکری پالیسی کا خاکہ تیار کیا اور فروری

۱۹۳۸ء میں جرمن فوجیں آسٹریا پر قابض ہوگئیں۔ بعد ازاں چیکوسلواکیا بھی نازی جرمنی کا حصہ بنا دیا گیا۔

اٹلی میں فاشی پارٹی کے لیڈر مسولینی نے اپنی آمرانہ حکومت قائم کر رکھی تھی۔ مسولینی بھی پسماندہ ممالک پر قبضے کی پالیسی پر کار بند تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اطالوی فوجیں ایبے سینیا پر قابض ہوگئیں۔ اور ادارۂ جمعیت اقوام اٹلی کو نہ روک سکا۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں ہسپانوی خانہ جنگی میں اٹلی نے جنرل فرانکو کا ساتھ دیا اور اسے عسکری امداد فراہم کی۔ اسی سال جرمنی اور جاپان سے عسکری معاہدے کیے گئے۔

۳۰-۱۹۲۹ء کے شدید معاشی بدحالی کے دور میں جاپانیوں میں اس نظریے کو تقویت حاصل ہوئی کہ عسکری فتوحات کے بغیر جاپان اپنے معاشی مسائل حل نہیں کر سکتا۔ جمعیت اقوام کے اجلاسوں میں چین اور جاپان دونوں نے کوشش کی تھی کہ ادارے کے چارٹر میں نسلی برابری کی شق کا اضافہ کر دیا جائے، لیکن مغربی سیاستدانوں کی مخالفت کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ جاپان کی معاشی ابتری اور سیاست دانوں کی پے درپے ناکامیوں کی وجہ سے عوام کی نگاہیں فوج کی طرف اٹھنے لگیں چنانچہ فوج پر سیاسی لیڈروں کا کنٹرول نہ رہا۔ ۱۹۳۱ء میں جاپانی فوج از خود مانچوریا پر قابض ہوگئی اور سولین حکومت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ ۱۹۳۳ء میں فوج ہی کے زیر اثر جاپان ادارۂ جمعیت اقوام سے علیحدہ ہو گیا۔ بعد ازاں مشرقی ایشیا میں جاپان نے ایک نئے نظام کے قیام کے لیے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ ۱۹۳۴ء میں جاپان کی طرف سے وضاحت کی گئی کہ چین کے متعلق اس کی پالیسی پر وہ کسی کی مداخلت برداشت نہ کرے گا۔ ۱۹۳۶ء میں جاپان نے جرمنی اور اٹلی کے ساتھ عسکری معاہدے کیے۔ ۱۹۳۷ء میں جاپانی فوجوں نے چین پر حملہ کر دیا اور نانکنگ، ہانکاؤ اور کانٹن پر قابض ہوگئیں۔ بعد ازاں جرمنی اور اٹلی نے جاپان کو ایشیا کے

نئے نظام کا لیڈر تسلیم کر لیا اور کسی بھی طاقت کے ساتھ جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی عسکری امداد کا عہد کیا۔

اقبال کو یقین تھا کہ روحانی عقائد اور اخلاقی اقدار سے عاری سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر قائم مادیت پرست جدید مغربی تہذیب بالآخر اپنے خنجر سے (یعنی اپنی ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ) آپ ہی خودکشی کرے گی۔ ایسی خودکشی کے لیے کتنی عالمی جنگیں درکار تھیں! اس کے متعلق تو انہوں نے کوئی پیش گوئی نہ کی تھی۔ بہرحال ایک عالمی جنگ اقبال کی زندگی میں گزر چکی تھی اور دوسری کے وہ منتظر تھے۔ روز پوچھا کرتے کہ جنگ شروع ہوئی ہے کہ نہیں۔ اقبال جدیدیت سے نہیں مغربیت سے برگشتہ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کی بقا کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اسی پس منظر میں انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو نئے سال کا پیغام دیا جو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

عہد حاضر علم و دانش اور سیاسی اختراعات میں اپنی بے مثال ترقی پر بجا طور پر متفخر ہے۔ آج زمان و مکاں کی تمام وسعتیں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے راز افشا کر کے اسکی قوتوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے، لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے ڈیماکریسی، (جمہوریت)، نیشنلزم (قوم پرستی)، کمیونزم (اشتراکیت)، فاشیزم (فسطائیت) اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا کے کونے کونے میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک ورق بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ نام نہاد سیاستدان جنہیں قیادت عوام اور انتظام حکومت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، قتل و غارت اور ظلم و استبداد کے شیاطین ثابت ہوئے ہیں اور ان حاکموں نے جن کا فرض ایسی اقدار کی سربلندی اور تحفظ تھا، جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل و تعمیر کا سبب بنتی

ہیں...... اپنے اپنے مخصوص گروہوں کے طمع اور حرص کی خاطر لاکھوں انسانوں کا خون بہایا ہے اور کروڑوں کو اپنا محکوم بنالیا ہے۔ پسماندہ اقوام کے ممالک پر قابض ہو کر انہوں نے ان سے ان کا مذہب، اخلاقی اقدار، تمدنی روایات اور ادب سب کچھ چھین لیا ہے...... سال نو کی آمد کی خوشیوں میں جب میری نگاہ دنیا پر پڑتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ خواہ ایبے سینیا ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین، انسان کے ہر ارضی گھر پر غم واندوہ کے بادل چھائے ہیں اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں انسان روز بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ سائنس کی تیار کی ہوئی تباہی کی مشینیں انسانی تمدن کے حاصل کردہ عظیم شاہکاروں کو نیست ونابود کرتی چلی جارہی ہیں۔ وہ حکومتیں جو بجائے خود اس آگ اور خون کے ڈرامے میں ملوث نہیں، معاشی طور پر کمزور اقوام کا خون چوس رہی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا قیامت آگئی ہے، جس میں ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے اور افراتفری کے عالم میں انسانی ہمدردی یا اخوت کی کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مفکرین عالم حیرت سے انگشت بدنداں ہیں کہ کیا تہذیب حاضر کی ترقی وارتقا کے خاتمے کا وقت آن پہنچا ہے، جو باہمی نفرت کے سبب انسان، انسان کی تباہی وبربادی کے درپے ہے، اور بالآخر اس دنیا میں انسانی بودوباش کو ناممکن بنادیا جائے گا۔ یادرکھو، اس دنیا میں انسان کی بقا انسانیت کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھنے ہی سے ممکن ہے...... سو صرف ایک ہی قسم کا اتحاد قابل اعتماد ہے اور اس اتحاد کی بنا ہے اخوتِ انسانی، جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان سے بالاتر ہو۔ جب تک اس نام نہاد ڈیما کریسی، لعنتی نیشنلزم اور ذلت آمیز امپیریلزم کا قلع قمع نہیں کیا جاتا، جب تک انسان اپنے اعمال کے ذریعے یہ مظاہرہ نہیں کرتے کہ ان کے عقیدے کے مطابق ساری دنیا خداوند تعالیٰ کا ایک واحد خاندان ہے، جب تک نسل، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے، اس دنیا میں انسانوں کو کبھی بھی خوشی،

مسرّت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوگی اور آزادی، مساوات اور اخوّت کے حسین تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا، پس ہمیں نئے سال کی ابتداء اس دعا سے کرنا چاہیے کہ خداوند کریم دنیا کے حاکموں کو انسانیت اور نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔۵۸

۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام مینارڈ ہال، لاہور میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یوم اقبال منایا گیا۔ برصغیر کے دیگر بڑے شہروں میں بھی ایسی تقریبات منعقد ہوئیں اور مختلف اخباروں یا رسالوں نے اقبال نمبر شائع کیے۔ لاہور کی تقریب میں جہاں راقم بھی موجود تھا، اقبال کے فکر و شاعری پر کئی مقالات پڑھے گئے اور ہجوم اس قدر تھا کہ ہال سے باہر برآمدوں میں بھی لوگ کھڑے تھے۔ راقم خواجہ غلام السیدین کے ہمراہ موٹر کار میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن میں ان کے بعض عزیزوں یا دوستوں کو ملنے چلا گیا۔ گھر میں کسی کو خبر نہ تھی۔ شام کو واپسی ہوئی تو اقبال کو شدید پریشانی میں مبتلا پایا۔ انہیں گمان تھا کہ راقم کہیں کھو گیا ہے یا اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ بہر حال راقم کو خواجہ غلام السیدین کی معیت میں زندہ و سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ اقبال اپنی حیات میں یوم اقبال کی تقریبات منائے جانے پر خاصے مطمئن تھے۔ چنانچہ ایک خط میں انہوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

وہ تقریب جسے یوم اقبال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں میرے لیے صرف یہ خیال باعث طمانیت قلب ہے کہ جس زمین میں مَیں نے اپنا بیج پھینکا تھا وہ زمین شور نہیں۔۵۹

۱۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کو نظام حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سر اکبر حیدری نے غالباً سر سکندر حیات کے گذشتہ بیان سے متاثر ہو کر، ایک ہزار روپے کا چیک اقبال کو ارسال کیا اور ساتھ تحریر کیا کہ یہ رقم شاہی توشہ خانے سے، جس کا انتظام ان کے

ذ تے ہے، بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔ اس پر اقبال سخت برہم ہوئے۔ چیک لوٹا دیا گیا اور سر اکبر حیدری کے نام درج ذیل اشعار بھی لکھے جو ارمغان حجاز میں شامل ہیں:

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز!
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

شروع شروع میں سر فضل حسین اور سر عبدالقادر کی طرح سر اکبر حیدری سے بھی اقبال کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے، لیکن گول میز کانفرنسوں کے دوران میں، سیاسی اختلافات کی بنا پر ان تعلقات نے محض رسمی صورت اختیار کر لی تھی۔ بہر حال اقبال کے نقطۂ نظر سے اس تکلیف دہ واقعہ نے تعلقات کی رسمی عمارت کو بھی منہدم کر دیا۔ نظر حیدر آبادی کی تحقیق کے مطابق اس حادثے کے پس منظر میں شاہی توشہ خانے کے ایک ہندو منتظم کی نا اہلی اور غلط کاری کے سوا کچھ نہیں تھا، جس نے عمداً یا ناواقفیت کی بنا پر چیک کے ساتھ دفتری زبان میں ایک خشک اور سپاٹ سا مراسلہ بھی سر اکبر حیدری کی جانب سے اقبال کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

بقول ان کے:

لیکن اس نا اہلی اور غلط کاری نے اکبر حیدری کے متعلق اقبال سے ایک ایسا غیر فانی قطعہ کہلوا دیا، جس کی وجہ سے اکبر حیدری کی شخصیت ملک میں مشتبہ ہو کر رہ گئی۔ ۶۰

جنوری ۱۹۳۸ء کی ایک شام لارڈ لوتھیان اقبال سے ملنے آئے۔ وہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے اور برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کے متعلق اقبال کی تجویز کو ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا مناسب حل خیال کرتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۳۴ء میں اقبال کے انگریزی خطبات کا دوسرا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا اور انہی کی وساطت سے اقبال کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں روڈز لیکچروں کی دعوت دی گئی تھی۔ اقبال نے اپنے لیکچروں کے لیے مسلم فکر میں زمان و مکاں کا تصوّر موضوع چنا تھا، مگر اپنی مسلسل علالت کے سبب وہ اس ارادے کی تکمیل نہ کر سکے۔ ۱۹۳۸ء میں لارڈ لوتھیان ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے اور اسی دوران میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن سے بھی خطاب کیا۔

۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا حسین احمد مدنی نے دہلی کے ایک جلسے میں اپنی تقریر میں فرمایا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں اور یہ کہ انگلستان میں بسنے والے سب ایک قوم سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی، پروٹسٹینٹ بھی اور کیتھولک بھی۔ نیز امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ میں بھی یہی حال ہے [61]۔ اس تقریر کی تفصیل دہلی اور لاہور کے اخباروں میں شائع ہوئی اور اقبال کی نظروں سے بھی گزری۔ اقبال ایک عرصے سے مغرب کے اس غیر اسلامی نظریۂ وطنیت کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے، اس لیے انہیں مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالم دین کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بے حد صدمہ پہنچا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو سید نذیر نیازی سے کہا کہ درج ذیل تین شعر درج بیاض کر دیں:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد عربی است
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونرسیدی تمام بولہبی است ۶۲

اس قطعہ اشعار کے متعلق سیّدنذیر نیازی بیان کرتے ہیں:

اس کی (اخباروں میں) اشاعت پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا...... معترضین نے اس قطعہ پر قطعے لکھے۔ اخباروں میں مضامین شائع ہوئے۔ پمفلٹ چھاپے گئے، لیکن آج یہ سب باتیں یاد سے محو ہوچکی ہیں، نہ کسی کو قطعات کا علم ہے نہ مضامین اور پمفلٹوں کا۔ ان قطعوں اور پمفلٹوں میں کوئی جان تھی نہ روح۔ برعکس اس کے حضرت علاّمہ نے ایک حق بات کہی تھی۔ اور حق اپنی جگہ پر آج بھی قائم ہے۔ مخالفین سمجھتے تھے کہ حضرت علاّمہ نے ایک ایسے عالم دین، پابند کتاب وسنت اور پیشوائے مذہب کی شان میں گستاخی کی ہے جس کے درس کتاب وسنت سے مدرسہ دیوبند فیض یاب ہورہا ہے، لیکن یہی تو امر تھا جس کی طرف حضرت علاّمہ اشارہ کررہے تھے کہ کیا غضب ہے جغرافی قومیت کے اس تصوّر کو جو مادّیت پرستی پرمبنی اور مغرب سے آیا ہے، مولانا کی حمایت حاصل ہے۔ حالانکہ کتاب وسنت میں اس کی کوئی سند ہے نہ عالم اسلام نے کبھی اسے تسلیم کیا۔ حضرت علاّمہ کو مولانا کا احترام تھا اور احتراماً ہی انہوں نے شکایت بھی کی۔ انہیں تعجب تھا، مولانا نے ایک ایسی بات کیسے کہہ دی جس سے اسلام کے نظام اجتماع وعمران کی نفی ہوتی ہے۔ ۶۳

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو پنجاب ہائی کورٹ نے مسجد شہید گنج کے متعلق مسلمانوں کی اپیل خارج کردی۔ فل بنچ کے دو ججوں ینگ اور بھڈے نے تو ڈسٹرکٹ جج کے موقف سے اتفاق کیا لیکن تیسرے جج دین محمد نے ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا فیصلہ علیٰحدہ دیا۔ قانونی طور پر اقبال، دین محمد کے اختلافی فیصلے کو درست

سمجھتے تھے، لیکن بقول ان کے قانون کے پردے میں حکومت پنجاب ایک سیاسی کھیل کھیل رہی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کو مضبوط کرنا تھا۔۶۴

ہائی کورٹ کے فیصلے سے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیلا اور لاہور میں احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ سر سکندر حیات کو خوف تھا کہ کہیں حالات بے قابو نہ ہو جائیں۔ وہ خود تو مصلحتاً مسلم عوام کے سامنے نہ آنا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اقبال سے ایک اخباری بیان جاری کرا دیا جائے کہ ابھی پریوی کونسل میں اپیل کا مرحلہ باقی ہے، لہٰذا مسلمانوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے نواب مظفر علی خان کی قیادت میں اپنے چند معتمد رفقائے کار اقبال کی طرف بھیجے۔ راقم کی یادداشت کے مطابق یہ حضرات اقبال سے ملاقات کی خاطر گول کمرے میں داخل ہوئے اور جب انہوں نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا، تو اقبال نے ان کی مرضی کے مطابق اخباری بیان جاری کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ غصے میں اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے اور اندر سے دروازہ مقفل کر لیا۔ وہ اتنی دیر خواب گاہ میں بند رہے جب تک کہ نواب مظفر علی خان اور ان کے ساتھی رخصت نہ ہو گئے ۶۵۔ اس کے باوجود ان یونینسٹ لیڈروں نے اخباروں میں خبر شائع کرا دی کہ اقبال کے ہاں ان کے اجتماع میں پریوی کونسل میں اپیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس پر اقبال کو اپنا تردیدی بیان جاری کرنا پڑا۔۶۶

۳۰ رجنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس دہلی میں فیصلہ کیا گیا کہ یکم فروری ۱۹۳۸ء کو سارے ہندوستان میں یوم مسجد شہید گنج منایا جائے۔ نیز اس مسئلے کے حل کے لیے آئندہ کے طرز عمل پر غور کرنے کی خاطر لیگ کے ایک خصوصی اجلاس کا انعقاد کیا جائے۔ اقبال کو چونکہ یقین تھا کہ قانون کی رو سے مسجد بارہ سال کے بعد بھی قبضہ مخالفانہ میں رہ کر اپنا تقدس نہیں کھوتی، انہوں

نے تنہا مسلم لیگی ممبر ملک برکت علی سے کہا کہ پنجاب اسمبلی میں تحفظ مساجد کا مسودہ قانون پیش کریں جس کا مقصد یہ ہو کہ مساجد کو رائج الوقت قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور اس کا اطلاق ماضی پر بھی ہو۔ بقول عاشق حسین بٹالوی اس مسودہ قانون کا پورا خاکہ اقبال نے تجویز کیا تھا۔ البتہ عبارت ملک برکت علی کی تھی ٦٧ لیکن سر سکندر حیات کے مشورے پر گورنر پنجاب نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال میں لاتے ہوئے اس بل کو اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔ پس یہ بل اسمبلی میں پیش نہ کیا جا سکا۔ ٦٨

جنوری ۱۹۳۸ء کے آخری حصے میں ایک دن پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اقبال سے ملنے جاوید منزل میں تشریف لائے۔ وہ ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کے مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی برخلاف ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' وغیرہ میں شہادت دینے کی خاطر بطور گواہ لاہور آئے تھے اور میاں افتخار الدین کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت تک ہندو اور مسلم قائدین کے درمیان خلیج اسقدر وسیع ہو چکی تھی کہ اس ملاقات کے مختلف پہلوؤں کو بھی متنازعہ فیہ بنا دیا گیا۔ مثلاً پہلا اہم سوال یہ اٹھایا گیا کہ اقبال نے انہیں پیغام بھیج کر بلوایا تھا یا وہ خود اقبال سے ملاقات کے لیے آئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی انگریزی تصیف ''ہندوستان کی دریافت'' میں اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے:

رحلت سے چند ماہ قبل جب کہ وہ صاحب فراش تھے انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور میں نہایت خوشی سے ارشاد کی تعمیل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ان جیسی شخصیت کیساتھ کام کرنا کتنا آسان ہے۔ وہ اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے، اور گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ جس میں میں نے خود بہت کم حصہ لیا اور زیادہ تر انہی کی باتیں سنتا رہا۔ میں ان کی شاعری کا مداح

ہوں اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے ہیں اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ۶۹

اس سلسلے میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

میں نے اقبال سے موقع پا کر عرض کیا: پنڈت جی سے ملاقات کیسی رہی؟ فرمایا ایک روز ڈاکٹر چکرورتی آئے تھے۔ کہنے لگے، پنڈت جی سے جب کبھی ذکر آیا انہوں نے آپ سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ وہ آج لاہور آ رہے ہیں میرا جی چاہتا ہے ان کی آپ سے ملاقات ہو جائے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا۔ میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ آپ کو جب موقع ملے انہیں یہاں لے آیئے۔ لیکن دو مسئلے ہیں: ایک ہندوستان کی آزادی، دوسرا آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، پنڈت جی ان دونوں مسئلوں پر غور کر کے آئیں...... ڈاکٹر صاحب اس روز شام کو پھر آئے، کہنے لگے پنڈت جی کو آج فرصت ہے ہم لوگ آٹھ بجے حاضر ہو جائیں گے۔ میں نے کہا بسر و چشم تشریف لایئے۔ ۷۰

بہر حال پنڈت جواہر لعل نہرو کے استقبال کے لیے اقبال نے راقم اور میاں محمد شفیع کو برآمدے میں منتظر کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو تقریباً آٹھ بجے شام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے اور شاید دو ایک خواتین اور ان کے میزبان میاں اور بیگم افتخار الدین، پنڈت جواہر لعل نہرو راقم سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کمر میں ہاتھ ڈالے اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ اقبال اپنی خواب گاہ میں بستر پر نیم دراز تھے۔ کمرے میں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھ دی گئی تھیں لیکن پنڈت جواہر لعل نہرو اور اُن کے ساتھی کرسیوں پر نہ بیٹھے بلکہ تعظیماً فرش پر بچھے ہوئے غالیچے پر بیٹھے۔

اس ملاقات کے متعلق دوسرا اہم سوال یہ اٹھایا گیا کہ دونوں کی آپس میں کیا گفتگو ہوئی۔ اس ضمن میں راجہ حسن اختر اور میاں فیروز الدین کے حوالے سے

عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں پنڈت جواہر لعل نہرو سمجھتے تھے، ہندوستان کے تمام مصائب کا حل سوشلزم ہے، لیکن کانگرس کے دیگر لیڈروں میں کوئی بھی ان کا ہم خیال نہ تھا۔ اقبال نے ان سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے لیڈران کے ہم خیال تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے جواب دیا کہ تقریباً چھ۔ اس پر اقبال نے کہا کہ اگر ان کے ہم خیالوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے تو وہ دس کروڑ مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہو جانے کا مشورہ کیونکر دے سکتے ہیں۔ بعد ازاں ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر چھڑا تو اقبال نے ان پر واضح کیا کہ مغربی ایشیا دراصل مسلم ایشیا ہے اور آئندہ سیاسیات عالم میں اس خطے کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی، لہٰذا اگر برصغیر میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے اچھا سلوک نہ کیا یا انہیں ناراض کر لیا تو مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ پس ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں:

ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکا یک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ: ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے: اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات

نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ا ۷

اس ملاقات کے متعلق سیّد نذیر نیازی، عاشق حسین بٹالوی کی تحریر کردہ تفصیل کو کلی طور پر درست نہیں سمجھتے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تصنیف ''اقبال کے حضور میں'' میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی اس ملاقات کو صرف اقبال کے ارشادات تک محدود رکھا ہے۔ یعنی اس گفتگو تک جو اقبال نے خود ان سے فرمائی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ملاقات کے وقت اقبال کے احباب میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ میاں محمد شفیع بھی جن کا قیام جاوید منزل میں تھا، اس وقت کمرے میں موجود نہ تھے۔ اسی طرح سید نذیر نیازی ان ایام میں سیالکوٹ گئے ہوئے تھے، پس ان میں سے کوئی بھی شریک گفتگو نہ ہوا اور میاں فیروز الدین کے وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے چلے جانے کے بعد چودھری محمد حسین، راجہ حسن اختر اور حکیم محمد حسن قرشی بمطابق معمول تشریف لائے اور میاں محمد شفیع کے ساتھ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے ملاقات کی تفصیل سنتے رہے۔ سید نذیر نیازی نے ۲۴ جنوری ۱۹۳۸ء کے اندراج میں ملاقات کے متعلق اقبال کے ارشادات قلم بند کیے ہیں۔ بقول ان کے دونوں سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کا موقف تھا کہ اگر مسلمان بلا قید شرائط کانگرس کا ساتھ دیں گے تو آزادی کی منزل جلد طے ہو جائے گی۔ لیکن اقبال کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی تحریک کامیابی سے چل سکتی ہے تو جب ہی کہ اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد ہو اور تصفیہ حقوق کا مسئلہ طے ہو جائے، یعنی مسلمانوں کے مطالبات مان لیے جائیں اور کانگرس ان سے مفاہمت کر لے۔ ۷۲

بہر حال اقبال کی اس بات کا پنڈت جواہر لعل نہرو نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ

خاموش سنا کیے۔ اقبال کی رائے میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو یقین تھا کہ حکومت برطانیہ اور کانگریس میں چونکہ بالآخر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا اس لیے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے ان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کے بغیر چارہ نہیں اور یہ کہ مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح انگریزوں کے اقتدار سے نالاں ہیں اور شہنشاہیت دشمنی میں ممکن ہے ہندوؤں سے کچھ آگے ہی ہوں۔ اس مرحلے پر میاں افتخار الدین کہنے لگے:

بات ہے بھی یہی جو آپ کہتے ہیں۔ مسلمان بھی آزادیٔ وطن کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے ہندو۔ وہ بھی شہنشاہیت کے ایسے ہی دشمن ہیں جیسے کوئی اور۔ آپ حق کی بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ مسلمانوں پر آپ ہی کا اثر ہے۔ جناح کی کون سنتا ہے۔۷۳

سید نذیر نیازی کی تحریر کے مطابق اقبال نے انہیں جواب دیا:

میاں صاحب! اس امر سے تو شاید آپ کو بھی انکار نہیں ہو گا کہ مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے...... پھر جب اتحاد ایک امر ضروری ہے اور جناح کی قیادت سے تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہو گیا ہے تو اسے کیا اس لیے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے مسلمان بحیثیت ایک قوم کے متحد ہو جائیں۔ معاف کیجیے میں اس کے لیے تیار نہیں۔۷۴

بقول سید نذیر نیازی اس پر میاں افتخار الدین نے بات آگے نہ بڑھائی اور چند لمحوں کی مزید نشست کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

لاہور میں اس ملاقات کا خاصا چرچا تھا اور یہ بھی سننے میں آیا کہ اقبال نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو محب وطن اور محمد علی جناح کو سیاستدان کہا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی انگریزی تصنیف ''ہندوستان کی دریافت'' میں اقبال کے ان الفاظ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ محمد علی جناح پر ان کی برتری کا پہلو نکلے۔۷۵

بقول سید نذیر نیازی، اقبال نے تو یہ الفاظ پنڈت جواہر لعل نہرو پر محمد علی جناح کی برتری ثابت کرنے کے لیے استعمال کیے تھے۔اسی تاریخ کے اندراج میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

شام ہو رہی تھی۔ میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) آ گئے۔ حضرت علامہ کا مزاج پوچھا اور بات چیت کرنے لگے۔انہوں نے کہا: میں نے سنا ہے، آپ نے پنڈت جی سے فرمایا تھا کہ پنڈت جی بات اصل میں یہ ہے کہ آپ تو محبّ وطن ہیں، لیکن جناح قانون دان یا شاید جناح سیاستدان ہیں آپ محبّ وطن...... حضرت علامہ نے فرمایا...... میں نے تو ایک سیدھی سادی بات کہی تھی اور وہ یہ کہ جناح سیاست دان ہیں لیکن پنڈت جی محبّ وطن۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جناح میں حب الوطنی کی کمی ہے، یا یہ کہ پنڈت نہرو بہت بڑے سیاست دان ہیں۔ میرا کہنا تو یہ تھا کہ پنڈت نہرو کی نظر حقائق پر نہیں جیسا کہ ایک سیاستدان کی ہونی چاہیے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں، گو بسبب حب الوطنی۔ لیکن یہ امر سیاست کے منافی ہے۔ برعکس اس کے جناح سیاستدان ہیں، ان کا مزاج قانونی ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کا مسئلہ کیا ہے۔ یہ بھی کہ ہندوؤں اور انگریزوں میں جو کشمکش جاری ہے اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ حبّ الوطنی کے جوش میں واقعات سے آنکھیں بند کر لیں وہی تو حقیقت میں محبّ الوطن ہیں۔[76]

پنڈت جواہر لعل نہرو کی اقبال سے ملاقات کا مقصد ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں کوئی بات چیت کرنا قطعی نہ تھا۔ اقبال نے سیاسی اختلافات کے باوجود پنڈت جواہر لعل نہرو کو ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ویسے بھی اقبال مدت سے علیل تھے اور پنڈت جواہر لعل نہرو لاہور میں موجود ہونے کے سبب ان کی مزاج پرسی کے لیے آ سکتے تھے۔ اس لیے یہ بحث بیکار ہے کہ ملاقات میں پہل کس کی طرف سے ہوئی۔ راقم کے خیال میں تو ان کو آپس میں ملانے کی تحریک شاید ڈاکٹر

چکرورتی نے کی تھی۔ عین ممکن ہے کہ جس طرح انہوں نے اقبال کو پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات کرنے پر رضامند کیا، اسی طرح انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے بھی ذکر کیا ہو کہ اقبال ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ بہر حال ملاقات کے دوران میں جو باتیں ہوئیں وہ بھی مختلف موضوعات پر سرسری نوعیت کی تھیں اور انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ البتہ عاشق حسین بٹالوی اور سید نذیر نیازی جیسے مورخین نے راجہ حسن اختر یا اقبال کے حوالے سے اس ملاقات میں اقبال اور محمد علی جناح کے متعلق جو باتیں میاں افتخار الدین سے منسوب کی ہیں، ان کی بیگم افتخار الدین سختی سے تردید کر چکی ہیں۔ بیگم افتخار الدین اس موقع پر خود موجود تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ اقبال کی علالت کے پیش نظر پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے سب ساتھی خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے اور میاں افتخار الدین نے گفتگو میں کوئی حصہ لیا نہ وہ باتیں کیس جوان سے منسوب کی گئی ہیں۔ ۷۷

ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد شہید گنج کا مسئلہ حل کرنے کی خاطر آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس دہلی میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ مستقبل کے طرز عمل پر غور کرنے کے لیے لیگ کا ایک خصوصی اجلاس بلوایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آل انڈیا مسلم لیگ کی کوشش تھی کہ نئے آئین کے تحت کونسل کے اراکین اور مندوبین کے انتخابات ۳۱ / مارچ ۱۹۳۸ء تک عمل میں لائے جائیں تاکہ صوبائی لیگیں مجوزّہ خصوصی اجلاس میں شریک ہو سکیں۔ سو فروری ۱۹۳۸ء میں اسی مقصد کے لیے پنجاب مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست طلب کی گئی، لیکن پنجاب مسلم لیگ نے ۳۱ / مارچ ۱۹۳۸ء کو بہت قریب خیال کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ آئین جدید کا نفاذ خصوصی اجلاس کے بعد کیا جائے۔ ۷۸

اقبال اپنی علالت کے سبب صوبائی مسلم لیگ کی کارروائیوں میں عملی طور پر کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے۔ وہ تو صرف مشورہ ہی دے سکتے تھے۔ عملی طور پر صوبائی

لیگ کی صدارت کے فرائض زمان مہدی خان انجام دیتے رہے، مگر فروری ۱۹۳۸ء میں صوبائی لیگ کی مالی مشکلات کے پیش نظر نواب شاہ نواز خان ممدوٹ کو صدر بنا لیا گیا۔ خصوصی اجلاس کے مقام اور تاریخ کا تعین ابھی باقی تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بہار کی تعطیلات میں لاہور میں ہوتا کہ پنجاب کے مسلم عوام سے رابطہ کی تحریک کا آغاز پورے شدومد کے ساتھ کیا جا سکے، لیکن نواب شاہ نواز خان ممدوٹ نے بحیثیت صدر صوبائی مسلم لیگ محمد علی جناح کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ اور تحریک شہید گنج کے بہترین مفاد میں لیگ کا خصوصی اجلاس لاہور میں نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ لیگ کونسل نے اپنے اجلاس میں طے کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس کلکتے میں ۱۸ر اور ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء کو منعقد کیا جائے۔

مسجد شہید گنج کے قضیئے کا حل اب ممکن نہ تھا۔ سر سکندر حیات اور ان کے ساتھی معاملے کو لٹکانے کے لیے پریوی کونسل میں اپیل کے حامی تھے، مگر عام مسلمانوں کو اس میں دلچسپی نہ تھی صوبائی مسلم لیگ کی قیادت پر اب زیادہ تر سر سکندر حیات کے آدمی یا یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین قبضہ کے لیے پر تول رہے تھے۔ البتہ ملک برکت علی اور ان کا گروپ ان کے خلاف تھے۔ اقبال کی کوششوں کے باوجود سر سکندر حیات اور یونینسٹ پارٹی کے کسی بھی مسلم ممبر نے اب تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہ کیے تھے، ان کا موقف یہ تھا کہ سکندر جناح پیکٹ کے تحت وہ یونینسٹ پارٹی کی سیاسی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے صوبائی مسلم لیگ کی قیادت حاصل کرنے کے مجاز تھے۔ اقبال جب ان سے قطعی مایوس ہو گئے تو انہوں نے سوچا کہ پنجاب کے مسلم عوام کو حقیقی پوزیشن سے آگاہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک بیان تحریر کروایا اور اس کی ایک نقل محمد علی جناح کو ارسال کی لیکن محمد علی جناح نے مشورہ دیا کہ سر سکندر حیات اور اُس کی پارٹی سے اس مرحلے پر ٹکر لینا درست نہیں، اس لیے یہ بیان شائع

نہ کیا جائے۔ اقبال نے محمد علی جناح کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ بیان جاری نہ کیا۔ یہ اقبال کے پارٹی ڈسپلن کے احترام کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ وہ سمجھتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم لیڈروں کے منافقت آمیز رویے کی قلعی کھول دینا چاہیے، انہوں نے صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے حکم کی تعمیل میں ایسا نہ کیا۔ اقبال کا یہ معرکتہ الآرا بیان جس کی اشاعت محمد علی جناح کے کہنے پر روک دی گئی، اقبال کی آخری سیاسی تحریر ہے۔ اصل بیان انگریزی میں تحریر کیا گیا۔ اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آنریبل سر سکندر حیات خان نے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے قائد کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں یہ اعلان کیا تھا کہ پنجاب واپس جانے کے بعد وہ اپنی جماعت کا ایک خصوصی اجلاس بلوائیں گے اور اس میں اپنی جماعت کے مسلم ممبران کو، جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہ ہوں، لیگ کے دستور پر دستخط کرنے اور اس میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔ یہ ارکان لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد وضوابط کے پابند رہیں گے اور اسمبلی کے وہ مسلم ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے، اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی قائم کریں گے اور یہ مسلم لیگ پارٹی لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرنے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھنے کی مجاز ہوگی۔ نام نہاد سکندر جناح پیکٹ کا اہم حصہ صرف یہی ہے اور اس پیکٹ کی باقی شقوں سے ہمیں فی الحال کوئی واسطہ نہیں۔ جب مذکورہ بیان اخباروں میں شائع ہوا تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا، وہ اب دور ہو جائے گا اور مسلمان ایک متحد قوم بن جائیں گے۔ لہٰذا میں نے غلام رسول کو ہدایت کی کہ سر سکندر کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے تقریباً نوے رکنیت کے فارم ارسال

کر دیں تا کہ وہ ان پر یونینسٹ پارٹی کے مسلم ممبروں سے دستخط کروالیں۔ چنانچہ یہ فارم اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں انہیں بھجوادیے گئے، لیکن ہمیں ان کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ یاددہانی کرائی گئی۔ مگر اس کا جواب نہ آیا۔ تا حال سر سکندر حیات نے ایک فارم بھی دستخط کروا کے واپس نہیں بھیجا۔ مجھے ملک برکت علی ایم ایل اے نے اطلاع دی ہے کہ یہ مسئلہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں زیر بحث آیا تھا اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن نے بیان کیا تھا کہ رکنیت کے فارموں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کر لیے گئے ہیں اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ سکندر جناح معاہدے کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔ یہاں اصل صورت حال کے متعلق یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ جس کا اہم حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے، ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔ یہ امر لیگ کونسل کے اجلاس میں بحث کے دوران مسٹر ایم اے جناح کے نوٹس میں بھی لایا گیا اور ملک برکت علی ایم ایل اے نے مجھے بتایا ہے کہ مسٹر ایم اے جناح نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سکندر جناح معاہدے کی تحریری شقوں کے علاوہ کسی بھی زبانی معاہدے کا وجود نہیں۔ اس معاہدے کی مختلف تاویلوں کے سبب عوام میں مسلم لیگ کی طرف یونینسٹ پارٹی کے روّیے کے متعلق سخت تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ تذبذب کی یہ کیفیت تقریباً چار ماہ سے طاری ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم عوام کو حقیقی صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ لکھنؤ میں عہد کرنے کے باوجود اب تک معاہدہ لکھنؤ کی شرائط کو عملی جامعہ پہنانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ سو پنجاب کے مسلم عوام کی آگاہی کی خاطر میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور اب یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد یونینسٹ

پر اٹی کے مسلم ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ کا دروازہ ہر اس مسلمان کے لیے کھلا ہے جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہو اور میں نہایت مسرّت سے اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلم ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیے ہیں۔ ۷۹

پنجاب پروونشل مسلم لیگ نے اپنے الحاق کی درخواست بھیج رکھی تھی لیکن ۵ر اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے اطلاع موصول ہوئی کہ بعض تکنیکل وجوہ کے پیش نظر اس کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر اقبال سے مشورے کے بعد غلام رسول خان نے ۱۲ر اپریل ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلوا کر آل انڈیا مسلم لیگ کے اعتراضات رفع کیے اور الحاق کی نئی درخواست دہلی روانہ کر دی گئی۔ بالآخر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بتاریخ ۱۸ر اور ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء میں شرکت کے لیے پنجاب کا مسلم لیگی گروپ کلکتہ پہنچا اور اپنے الحاق کی نئی درخواست کی منظوری کے لیے تگ و دو کرنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی یہی تھی کہ سر سکندر حیات اور ان کے آدمیوں کو لیگ کونسل میں داخل کیا جائے اور وہی پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخیں چاہیں قائم کریں۔ الحاق کی نئی درخواست کی منظوری یا نامنظوری کے متعلق تو کوئی ہدایت جاری نہ کی گئی، البتہ محمد علی جناح کے حکم کے مطابق پنجاب میں ایک نئی صوبائی مسلم لیگ قائم کی گئی جسے مرتب کرنے کے لیے انہوں نے سر سکندر حیات کی زیر قیادت ان کے سمیت پینتیس افراد پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں شامل پچیس افراد کا تعلق تو یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھا اور اقبال سمیت دس افراد مسلم لیگی گروپ سے لیے گئے۔ مسلم لیگی گروپ اس فیصلے سے مطمئن نہ تھا۔ یہ لوگ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح نو بجے کلکتہ سے لاہور پہنچے اور ریلوے اسٹیشن پر ہی انہوں نے خبر سن لی کہ اقبال فوت ہو گئے۔ ۸۰

عاشق حسین بٹالوی کی تصنیف ''اقبال کے آخری دو سال'' کے مطالعے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پنجاب میں سر سکندر حیات کی یونینسٹ پارٹی کی صوبائی مسلم لیگ کے ساتھ تصادم کے سلسلے میں محمد علی جناح کی پالیسی پر اقبال کو اعتراض تھا اور اگر اقبال زندہ رہتے تو عین ممکن ہے کہ ان کے محمد علی جناح کے ساتھ اختلافات زیادہ نمایاں صورت اختیار کر جاتے[۸۱]۔ عاشق حسین بٹالوی کی رائے میں نوابزادہ لیاقت علی خان پنجاب میں سر سکندر حیات اور ان کی یونینسٹ پارٹی کی ہمیشہ امداد کرتے تھے اور ان کے بڑے بھائی نواب زادہ سجاد علی خان پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ پس آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں پنجاب مسلم لیگ کے الحاق کی نئی درخواست پر اسی سبب غور نہ کیا گیا، بلکہ محمد علی جناح نے ایک نئی صوبائی مسلم لیگ کو وجود میں لانے کی ہدایت کی، جس میں سر سکندر حیات کی زیر قیادت چونتیس افراد پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی قائم ہوئی اور اس کمیٹی میں مسلم لیگی گروپ کے صرف دس افراد شامل کیے گئے، باقی تمام افراد کا تعلق یونینسٹ پارٹی سے تھا۔

محمد احمد خان، عاشق حسین بٹالوی ہی کی تصنیف پر انحصار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

یہ تھی مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی آویزش کی داستان، جس میں اقبال نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک بھرپور حصہ لیا، غور سے دیکھیے تو یہ آویزش دو سیاسی جماعتوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ یہ وسیع النظری کا تنگ نظری کے خلاف جہاد تھا۔ یہ ملت کی وہ جنگ تھی، جو علاقائیت کے خلاف پنجاب میں لڑی گئی تھی اور جس کی کمان اقبال جیسے بے سروساماں مردِ قلندر نے سر فضل حسین اور سر سکندر حیات خان جیسے مقتدر چوگان بازانِ سیاست کے مقابلے میں کی تھی، اب یہ بھی سن لیجیے کہ پنجاب میں اس طرح مسلم لیگ کے محاذ کو یونینسٹ پارٹی جیسی بااختیار جماعت کے مقابلے

میں مضبوط اور مستحکم کرنے اور اس معاہدے میں اپنی جان لڑا دینے کا اقبال کو کیا صلہ ملا...... اسی صوبائی مسلم لیگ کے صدر ابھی کچھ ہی دن قبل تک خود حضرت علامہ تھے اور اس کے عہدہ دار اور کارکن ان کے وہ معتمد علیہ رفقاء کار تھے، جنہوں نے نہایت کٹھن اور صبر آزما حالات میں اس ننھے اور کمزور پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کو ایک تناور درخت بنا دیا تھا اور اب بھی وہ ان ہی کی سرپرستی، ہدایات و رہنمائی میں اس کو بار آور بنانے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ لیکن اس صوبائی لیگ کو کالعدم قرار دے دیا گیا تھا اور وجہ اس کی یہ بتائی گئی تھی کہ اس کے اندر چند دستوری اسقام پائے جاتے تھے۔ علامہ مرحوم کو اس اطلاع سے بے حد رنج ہوا، پھر بھی وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے، لیکن بستر مرگ پر لیٹے لیٹے انہوں نے ۱۴؍ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے رفقاء کو حکم دیا کہ کلکتہ جا کر اپنی جنگ خود لڑو۔ یہاں گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ان کے اس حکم کی تعمیل میں ایک وفد کلکتے جانے کے لیے تیار ہو گیا، جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۸؍۱۹؍ اور ۲۰؍ اپریل کو ہو رہا تھا۔ روانگی سے قبل اس وفد کے اراکین ایک مرتبہ پھر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو علامہ نے ان سے فرمایا: ضرور جاؤ اور اپنے حق کے لیے آخر تک لڑو۔ ملک برکت علی رکن وفد نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ نئی درخواست الحاق بھی نامنظور ہو جائے گی، تو علامہ قدرے جوش میں آ گئے اور فرمایا: کچھ فکر نہیں۔ درخواست منظور ہو یا نامنظور، جس اصول پر ہم نے اب تک کام کیا آئندہ بھی جاری رہے گا۔ الغرض اس طرح ہمت و جرأت دلا کر انہوں نے اس وفد کو کلکتے روانہ کیا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس وفد نے شرکت کی اور وہاں ایک ناکام جنگ لڑنے کے بعد جب ۲۱؍ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ وفد لاہور لوٹا تو اقبال اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ۸۲

یہ حقیقت ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف جو قدم اقبال ۱۹۳۸ء میں اٹھانا

چاہتے تھے، وہ محمد علی جناح کو بالآخر چھ سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء میں اٹھانا پڑا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اقبال کے فروری ۱۹۳۸ء کے بیان کی اشاعت کے ذریعے پنجاب میں مسلم لیگ کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ جنگ چھ برس قبل یعنی ۱۹۳۸ء ہی میں ہو جاتی تو اس کے کیا نتائج نکلتے؟ کیا اس مرحلے پر یونینسٹ پارٹی تنہا یا کانگرس کے ساتھ مل کر سیاسی طور پر کمزور صوبائی مسلم لیگ کا خاتمہ کر دیتی! یا کیا یہ کہنا درست ہے کہ اس صورت میں ممکن ہے صوبائی لیگ زیادہ مستحکم ہو جاتی اور پنجاب کی تقسیم اس طرح نہ ہوتی جس طرح فی الواقع ہوئی؟ ان سوالات کے جواب کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنے کے لیے دراصل جس مواد پر انحصار کرنے کی ضرورت ہے، وہ ہے محمد علی جناح کے خطوط اقبال کے نام جو محفوظ نہ رکھے گئے اور صوبائی مسلم لیگ کی کارروائیوں کا ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کا مکمل ریکارڈ، جس تک راقم کی رسائی نہیں ہو سکی۔ بہر حال یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ کی باگ ڈور ایسی پیشہ ور شخصیات کے ہاتھوں میں تھی، جو زیادہ تر شہری مسلمان تھے اور جن کے پاس وسائل یا وقت کی کمی تھی۔ انہوں نے اس ابتدائی دور میں بلاشبہ اپنی بساط کے مطابق صوبائی لیگ کی خدمت بڑی جاں فشانی سے کی، لیکن ان کا دائرہ اثر محدود تھا۔ اسی بنا پر آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کو صوبائی لیگ سے وابستہ کر دیا جائے، کیونکہ ان میں سے بیشتر زمیندار تھے، دیہات میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے، دولت مند تھے اور ان کے وسائل کو استعمال میں لا کر کارکنان لیگ پنجاب کے شہریوں اور دیہاتیوں میں یکساں طور پر مسلم لیگ کو مقبول بنا سکتے تھے۔ سو اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ ابھی پنجاب کے مسلمانوں میں صحیح معنوں میں عوامی جماعت نہ بنی تھی۔ لہٰذا اس مرحلے پر سیاسی مصلحت کے تحت یونینسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کے ہاتھوں میں صوبائی لیگ کی باگ ڈور دینا ایک دانشمندانہ فیصلہ

تھا، اگر چہ یوں پرانے لیگیوں کی حق تلفی ہوئی یا انہیں قربانی دینا پڑی۔ محمد علی جناح کا نصب العین یہی رہا ہے کہ پنجاب میں جب مسلم لیگ عوامی جماعت بن جائے گی تو اس وقت یونینسٹ پارٹی سے ٹکر لے کر اسے پچھاڑنا آسان ہوگا اور اقبال کی وفات کے چھ سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء میں یہی ہوا۔ یونینسٹ پارٹی کی مسلم لیگ کے ساتھ جنگ میں یونینسٹ پارٹی کا نام ونشان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گیا، لیکن ان سالوں کی سیاسی کشمکش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ پنجاب کی سیاست کے متعلق اقبال اور محمد علی جناح کے آپس میں اختلافات تھے، یا ان کے راستے جدا جدا ہو چکے تھے، درست نہیں۔ اقبال کو محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت اور اخلاقی دیانت داری پر پورا اعتماد تھا اور اسی اعتماد کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ان کا معمولی سپاہی تصور کرتے تھے۔ نیز ان کے حکم کی تکمیل میں انہوں نے سر سکندر حیات کے خلاف اپنا فروری ۱۹۳۸ء کا بیان جاری نہ کیا تھا اور محمد علی جناح بھی ہر مرحلے پر اقبال کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ البتہ ان دونوں کے سیاسی انداز فکر میں وقت کے تعین کا فرق ضرور رہا۔ میاں محمد شفیع جو بقول ان کے اقبال کے دور صدرات میں پنجاب مسلم لیگ کے پبلٹی سیکرٹری تھے، فرماتے ہیں:

مجھے اب تک یاد ہے کہ قائداعظم نے حضرت علامہ کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا: آپ کا سیاسیات ہند کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ میں آپ سے لفظاً لفظاً متفق ہوں ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر آپ کے فرمودات کے مطابق مسلمانانِ ہند کے لیے ان کے سیاسی چارٹر کا مطالبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جائے گا۔ وقت کا تعین آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کو قطعاً مایوس نہ کروں گا۔۸۳

میاں محمد شفیع کے بیان کی تصدیق محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب مطلوب الحسن سید کی تحریر سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی انگریزی تصنیف ''محمد علی جناح

"(ایک سیاسی مطالعہ) میں ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کے منظور کیے جانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ محمد علی جناح نے ان سے فرمایا:

اقبال اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ معلوم کرکے خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہٖ وہی کیا جو وہ ہم سے کروانا چاہتے تھے۔۸۴

فروری ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق لکھے ہوئے اقبال کے قطعے پر ہنگامہ جاری رہا۔ اخباروں میں مضامین پر مضامین چھپ رہے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے طرف داروں نے اقبال پر دیگر الزامات کے ساتھ یہ الزام بھی لگایا تھا کہ انہوں نے اپنی سیاسی اغراض کے حصول یا آل انڈیا مسلم لیگ کے پراپیگنڈے کی خاطر مولانا حسین احمد مدنی کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اسی اثنا میں ایک صاحب طالوت نے خط و کتابت کے ذریعے اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان اختلافات یا غلط فہمی دور کرانے کی کوشش کی۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۳۸ء میں تحریر کیا:

جو اقتباسات آپ نے ان (مولانا حسین احمد مدنی) کے خط سے درج کیے ہیں، اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا، کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی ان نظریے کو قبول کرلیں، تو پھر بحث کی گنجائش رہ جاتی ہے، کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی۔ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصود ان الفاظ سے کیا تھا۔ ان کا جو جواب آئے وہ آپ مجھے روانہ کردیجیے۔ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ میں ان کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں

ہوں۔ البتہ اگر مذکورہ بالا ارشاد سے ان کا مقصد وہی ہے جو میں نے اوپر لکھا ہے تو ان کے مشورے کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں۔ میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایان شان نہیں اور وہ مسلمانان ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے تو انہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرہ عظیم محسوس ہوتا تھا، کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا نہ آج مقصود ہے۔ بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔ ۸۵

لیکن پیشتر اس کے کہ اختلاف یا غلط فہمی دور ہو سکے، مولانا حسین احمد مدنی نے اس بحث کے سلسلے میں اپنا ایک خط بیان کی صورت میں اخبار ''انصاری'' میں شائع کرا دیا۔ اس بیان میں مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی گذشتہ تقریر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ انہوں نے کہا تھا موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ انہوں نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ مذہب و ملت کا دارومدار وطنیت پر ہے۔ بالفاظ دیگر مولانا حسین مدنی نے قوم اور ملت کی لفظی بحث چھیڑ دی اور بیان کیا کہ ''قوم'' تو وطن ہی سے بنتی ہے، البتہ ''ملت'' وطن سے نہیں بنتی۔ لہٰذا ان کا فرمان کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، قابل اعتراض نہ تھا۔ ۸۶

اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے جواب میں ایک مدلل مضمون تحریر کیا جو اخبار ''احسان'' مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں اقبال شدید طور پر علیل تھے اور خود لکھنے پڑھنے سے معذور تھے۔ سو یہ بیان کیسے لکھا

گیا؟ سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

دم کشی، احتباس صوت، ضعف اور نقاہت کیسے کیسے عوارض تھے۔ اس حالت میں بیان لکھوانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آخر طے پایا کہ حضرت علاّمہ دو ایک نشستوں میں سارا مضمون چوہدری صاحب (چوہدری محمد حسین) کو سمجھا دیں۔ چودھری صاحب اسے قلم بند کر کے لے آئیں اور ہم سب جمع ہو جائیں۔ حضرت علامہ مضمون سنیں اور ہم بھی سنتے جائیں۔ جہاں کہیں ضروری ہو، مناسب ترمیم ہو جائے۔ البتہ اس امر کا بالخصوص التزام رہے کہ حضرت علامہ جن الفاظ میں اظہار مطلب فرما رہے ہیں، حتیٰ الوسع انہی کا استعمال کیا جائے تا کہ بیان اپنی آخری شکل میں مرتب ہو جائے۔ ۸۷

اقبال نے اپنے جوابی مضمون میں واضح کیا کہ حال کی عربی فارسی اور ترکی زبانوں میں لفظ ''ملت'' قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے اور انہوں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے۔ اقبال نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض کی گنجائش اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ہندی مسلمانوں کو قومیّت کا جدید فرنگی نظریہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے۔ اقبال کے نزدیک یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی تھیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہ تھا کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ قومیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ یورپی سیاست دانوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی۔ اقبال کے ہاں اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں، بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ پس ان کا اصل مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ اقبال نے تحریر کیا:

مولانا حسین احمد مدنی عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، امت محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ قوم استعمال کیا یا لفظ ملت، ہر اس لفظ سے اس جماعت کی تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امت محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے...... آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور۔ دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں، اس لیے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہونا چاہیے...... یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیوٹ سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ...... مولانا نے یہ فرض کر کے کہ مجھے قوم اور ملت کے معنی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی، وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا، مجھے عربی زبان سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ یہ طعنہ سر آنکھوں پر، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گزر کر قرآن حکیم کی طرف رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریے کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی استشہاد فرماتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں، نہ عربی زبان کا ادیب:

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کون سی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفا کی۔ کیا قرآن

پاک میں سیکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا؟ کیا قرآن میں ملت کا لفظ متعدد بار نہیں آیا! آیات قرآن میں قوم وملت سے کیا مراد ہے اور کیا جماعت محمدیہ کے لیے ان الفاظ کے علاوہ لفظ امت بھی آیا ہے یا نہیں! کیا ان الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم اس اختلاف معانی کی بنا پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی یا شرعی اعتبار سے تو وہ نوامیس الٰہیہ کی پابند ہو، اور ملکی و وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی پابند ہو جو ملّی دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے...... قرآن کریم میں مسلمانوں کے لیے امت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا...... قوم رجال کی جماعت کا نام ہے (بقول مولانا حسین احمد مدنی) لغوی اعتبار سے عورتیں قوم میں شامل نہیں لیکن بقول اقبال قرآن حکیم میں جہاں قوم موسیٰ اور قوم عاد کے الفاظ آئے ہیں وہاں ظاہر ہے کہ عورتیں اس کے مفہوم میں شامل ہیں اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے، لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی۔ گویا ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی، خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی...... امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام دین قیم ہے۔ دین قیم کے الفاظ میں ایک عجیب وغریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے، اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے اس گروہ کے امور معاشی و معاوی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دین اسلام سے ہی تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامقبول و مردود ہے۔ ایک اور لطیفہ بھی مسلمانوں کے لیے قابل غور ہے کہ اگر ''وطنیت'' کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو

محض ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابو جہل اور ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے؟ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ رشتۂ قومیت وطنی قائم رکھا! اگر اسلام سے مطلق، مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا۔ مگر افسوس آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبر خدا کے نزدیک اسلام سے دین قیم اور امت مسلمہ کی آزادی مقصود تھی ان کو چھوڑنا، ان کو کسی دوسری ہیت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا...... محمدؐ (فداہ امی وابی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہؐ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا...... حضورؐ رسالت مآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابو جہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو تمہارے ہمارے درمیان موجود ہے، ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ، نعوذ باللہ، یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، لیکن نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں اُنھی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیِ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار

الکفر ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔۸۸

اس پُر مغز مقالے کے ذریعے اقبال نے اپنے سیاسی فکر کے مرکز یعنی "مسلم قومیت" کے اصول کی وضاحت کی اور ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلمانان عالم کی عملی سیاست کا محور یہی اصول ہونا چاہیے۔ اسی دوران میں جناب طالوت نے اقبال کی ہدایت کے بموجب مولانا حسین احمد مدنی سے استفسار کیا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" سے ان کی مراد ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے یا مشورہ دینا ہے۔ اس پر مولانا حسین احمد مدنی نے انہیں جواب دیا کہ یہ موجودہ زمانے کی جاری ہونے والی ذہنیت کی خبر ہے۔ انشا نہیں ہے، اور اس فقرے کو مشورہ سمجھ لینا غلطی ہے۔ طالوت صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی کے اس خط کی نقل اقبال کو بھجوائی اور اقبال نے اسے پڑھنے کے بعد "روزنامہ احسان" مورخہ ۲۸/مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک بیان جاری کیا جس میں مولانا حسین احمد مدنی کے خط کے اقتباس کے حوالے سے تحریر فرمایا:

مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سائے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدا تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔۸۹

یہ اقبال کی طرف سے بحث کے اختتام کا اعلان تھا، جسے مولانا حسین احمد

مدنی کے معتقدین نے اقبال کا معافی نامہ قرار دیا۹۰۔ بعض مورخ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب بحث ختم ہو چکی تھی تو ''ارمغان حجاز'' کی اشاعت کے وقت مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق قطعۂ اشعار کو اس میں کیوں شامل کیا گیا؟ ان کے نزدیک اگر اقبال ''ارمغان حجاز'' کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے، جن میں مولانا حسین احمد مدنی پر چوٹ کی گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی وفات کے چند ماہ بعد مولانا حسین احمد مدنی نے ''متحدہ قومیّت اور اسلام'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا، جس میں اقبال کو ''ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا'' قرار دیا اور انہیں ''کودک نادان'' کے لقب سے نوازا۔ نیز اس کتابچے میں انہوں نے اپنے سابقہ موقف سے انحراف کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ میں شریک ہونے کا مشورہ دینے کو وہ خلاف دیانت یا ناجائز نہیں سمجھتے یہاں تک کہ انہوں نے اس مشورے کو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز ثابت کرنے کے لیے اپنی علمیت کا پورا زور صرف کیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اقبال کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں ''ارمغان حجاز'' کی ترتیب دیتے وقت چوہدری محمد حسین نے مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق اشعار اس میں شامل کرنا ضروری خیال کیا اور وہ اشعار آج تک شائع ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس ضمن میں محمد احمد خان تحریر فرماتے ہیں:

اگر حضرت علامہ نے ان کے اخراج کی ہدایت نہ فرمائی اور ان کے انتقال کے بعد یہ اشعار شائع ہوتے رہے تو یہ کوئی غلط کاری نہ تھی۔ کیونکہ، مولانا مدنی آخر دم تک متحدہ قومیت کا دم بھرتے رہے اور اپنے اسی موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' نامی کتابچہ تحریر فرمایا تھا۔ اگر علامہ اقبال مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے افکار و نظریات کا مطالعہ فرماتے جو مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات اور اس کتابچے میں ظاہر کیے ہیں تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان اشعار کو واپس لینا تو کجا ان سے زیادہ سخت الفاظ میں اپنے جذبات و احساسات کا

اظہار فرماتے۔۹۱

جب مولانا حسین احمد مدنی نے اقبال کی رحلت کے بعد انہیں اپنے کتابچے میں طنز، تعریض اور تضحیک کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا تو ان کے معتقدین کیونکر چُپ بیٹھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے مرنے کے بعد بھی اقبال کو نہ بخشا۔ مثال کے طور پر مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی) جلد سوم میں اقبال کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالتے ہوئے ارشاد کرتے ہیں:

ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں، کیونکہ ہم نے ان کے کلام کو بغور پڑھا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ مرحوم کے جہاں سیکڑوں اور ہزاروں اشعار مفید ہیں وہیں ان کے کتنے اشعار ایسے ہیں، جن میں کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفہ پر ان کی زد پڑتی ہے...... پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکر اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے، کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم ہی کے فلسفے کا دوسرا نام ہے۔۹۲

مولانا نجم الدین اصلاحی کا یہ فقرہ کہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے، وہ اقبال ہی کے فلسفے کا دوسرا نام ہے، غور طلب ہے۔ آخر اقبال کا تصور اسلام کیا ہے؟ مختصراً یہی کہ ایک نیا مسلم معاشرہ وجود میں لایا جائے جو اجتہادی نقطۂ نظر سے قرآن وسنت کی روشنی میں وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے تمام مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ علمائے پاک و ہند نے ہمیشہ اس قسم کی اجتہادی آزادی کو شبہے کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مگر یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس ضمن میں علماء کا نقطۂ نظر درست ہے یا غلط۔ بات جو واقعی عجیب و غریب ہے، یہ ہے کہ ایسے علماء مسلمانوں کے قومیّت متحدہ میں جذب ہو جانے اور یوں ہندوستان کی سیکولر یا لادین ریاست قبول کر لینے کو تو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز سمجھتے ہیں ،مگر پاکستان میں وہ ایسا روایتی نظام اسلام نافذ کرنے کے درپے ہیں جس کا آج

کے متغیر زمانے میں نفاذ مشکل ہے۔ ممکن ہے وہ ایسے نظام کے نفاذ کی پاکستان میں ناکامی سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنی کا موقف درست تھا اور اقبال کا غلط۔

اس مرحلے پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ برصغیر میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد تجدید دین کی خاطر سید احمد بریلوی کی تحریک جسے بعض اوقات ''وہابی'' تحریک بھی کہا جاتا ہے اور یورپی کلچر کے فروغ کے سبب نئے نظریات کی یلغار کی روک تھام کے لیے سرسید کی ''علی گڑھ'' تحریک کے زمانے سے مسلمانوں میں اسلام کے بارے میں تین مختلف زاویہ ہائے نگاہ موجود ہیں۔ روایتی، اصلاحی اور عوامی۔ اسلام کے بارے میں سرسید کا اندازِ فکر اصلاحی تھا اور اقبال چونکہ سرسید کے مکتبہ فکر سے متاثر تھے اس لیے وہ بھی اصلاحی اسلام کے داعی تھے، یعنی برصغیر میں اپنی تجویز کردہ آزاد مسلم ریاست میں ایسے اسلامی قوانین کے نفاذ کے حامی تھے، جن کی تعبیر سیاسی، معاشی، معاشرتی یا تمدنی اعتبار سے وقت کے جدید تقاضوں اور قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق کی گئی ہو۔ مگر برصغیر کے اکثر و بیشتر علماء قومیّت متحدہ پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی صرف روایتی تعبیر ہی کو قابل قبول سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک اصلاحی اندازِ فکر بدعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اقبال نے ایسے علماء کے متعلق نہایت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً ''پاکستان ٹائمز'' میگزین سیکشن، مورّخہ ۷ ستمبر ۱۹۸۱ء میں نواب بہاولپور کے نام ان کے ستمبر ۱۹۳۷ء میں تحریر کردہ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ تیس برس اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس کے تمدن کی صحیح وضاحت کرنے میں صرف کیے ہیں، لیکن اب جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری استعدادیں تھک گئی ہیں تو مجھے اس دردناک حقیقت کا احساس ہو رہا ہے کہ سیاسیات ہند میں بعض ایسی نئی قوتیں برسرِ عمل ہیں، جو ہندوستان میں

اسلام اور اس کے تمدن کے مستقبل پر بری طرح سے اثر انداز ہوں گی...... جن علمائے اسلام نے سیاسیات ہند میں حصہ لیا ہے ان کے کردار سے عیاں ہے کہ انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کا قطعی تصور نہیں ہے، بلکہ وہ علماء جو دوسروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں حقیقت میں ان سے کہیں زیادہ احمق ثابت ہوئے ہیں۔

جہاں تک غریب مسلم عوام کا تعلق ہے ان میں بھاری اکثریت آج بھی ان پڑھ اور ضعیف الاعتقاد ہے۔ وہ نہ تو عربی زبان جانتے ہیں اور نہ قرآن مجید پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ مگر جن کے اعتقاد کے مطابق دراصل زندہ یا مردہ پیران کی شفاعت کا باعث ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں پیری مریدی یا قبر پرستی مقبول ہے اور صوفیہ کرام یا پیروں فقیروں کے مزاروں پر چادریں چڑھانا یا خانقاہوں پر منتیں ماننا ان کا معمول ہے۔ ایک مسلم نیشنلسٹ مصلح کی حیثیت سے اقبال نے اپنی شعری تخلیقات اور نثری تحریروں میں بار بار روایتی اسلام کے داعی، "ملا" اور عوامی اسلام کے حامی پیر کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ معترض اس حد تک تو کہنے میں شاید حق بجانب ہوں کہ اقبال نے اصلاحی طریق فکر کو اہمیت دے کر جس اجتہادی آزادی کی راہ دکھلائی ہے، اس پر ان کے بعد آنے والے شتر بے مہار کی طرح ان کی اپنی مقرر کردہ حدود سے بھی بہت آگے نکل سکتے ہیں۔ ممکن ہے اسی سبب اصلاحی انداز فکر کو روایتی اسلام طرح طرح کے خوف دلا کر تقلید کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا چاہتا ہے۔

بہر حال بعض ایسے مخصوص حلقوں میں اقبال پر دشنام طرازی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اقبال کے کاغذات میں پائے گئے دو ایک گمنام خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نظریاتی مخالف آخری دم تک ان پر کیچڑ اچھالتے اور انہیں مختلف قسم کے القاب سے نوازتے رہے۔ اگر آج بھی اقبال کے کسی ایسے نظریاتی دشمن کو کرید کر دیکھا جائے تو اس کی کھال کے نیچے سے وہی کانگرسی ذہنیت رکھنے والا ضدی عالم دین، متفرق لبادے اوڑھ کر سامنے آنے والا پرانا نیشنلسٹ مسلمان،

دہریہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ، علاقائی یا فرقہ وارانہ تعصب کا مریض یا احمدی نکلے گا۔

اقبال کے ہاں زندگی کی بہت اہمیت تھی۔ سید نذیر نیازی کا مشاہدہ درست ہے کہ وہ ایک زندہ انسان تھے اور ان کا فکری ارتقاء تا دم مرگ جاری رہا[۹۳]۔ وہ زندہ رہنے کی زبردست خواہش اس لیے رکھتے تھے کہ احیائے اسلام کے ضمن میں اپنا وہ کام مکمل کر سکیں جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ صرف وہی اُسے انجام دے سکتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے بارے میں فرما گئے ہیں کہ ایک زندہ سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ تبدیل کر لے اور بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے[۹۴]۔ ایسے مفکرین کی دنیا میں مثالیں موجود ہیں جن کی ارضی زندگی کے اختتام پر ہی فیصلہ کیا جا سکا کہ ان کے افکار و نظریات کی حتمی شکل کیا تھی۔ اقبال اپنی حیات کے مختلف ادوار میں سے گزرتے وقت اپنے نظریات بھی بدلتے چلے گئے گویا جس طرح ان کی جسمانی زندگی نے تغیر و تبدل کی منازل طے کیں، اسی طرح ان کی ذہنی زندگی بھی ارتقائی کیفیات میں سے گزرتی رہی۔ اسی بنا پر بعض محقق ان کے خیالات میں تناقض یا تضاد پاتے ہیں، لیکن اقبال کے افکار میں تضادات یا تو ان کے فکری ارتقاء کے مراحل کے حوالے سے دور کیے جا سکتے ہیں یا وہ حیات ہی کے متضاد حقائق کی عکاسی کرتے ہیں اور اس قسم کے تناقض کا جذباتی طور پر احساس تو ممکن ہے گو عقلی طور پر اس کا ادراک شاید مشکل ہو۔

اس سے قبل کہ اس امر کی طرف توجہ مبذول کی جائے کہ رحلت کے وقت اقبال کے افکار و نظریات کی حتمی صورت کیا تھی، اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ کیا اقبال شاعر تھے، فلسفی تھے، ماہر دینیات تھے۔ آخر وہ اپنی نظر میں کیا تھے؟

اقبال نے اپنے آپ کو کبھی حقیقی معنوں میں شاعر نہیں سمجھا۔ ان کے پاس فن شاعری کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ وہ شاعری کو اظہار خیال کا محض ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنی شاعری کے متعلق فرمایا

ہے:

مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔۹۵

اقبال صحیح معنوں میں فلسفی بھی نہ تھے، کیونکہ انہوں نے کوئی مربوط فلسفیانہ نظام پیچھے نہیں چھوڑا، بلکہ فلسفے کو زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کے مطالعہ کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

میری کوئی فلسفیانہ تعلیمات نہیں ہیں۔ بلکہ میں تو نظام ہائے فلسفہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں، نہ مجھے ان اصولوں اور نتائج پر اعتماد ہے جو فلسفے نے پیش کر رکھے ہیں۔ خالص روحانی حقائق کی تفہیم کے سلسلہ میں انسانی عقل کو جتنا معتوب میں نے گردانا ہے، شاید ہی کسی نے گردانا ہو۔ بلاشبہ میں ان باتوں کو ذکر کرتا ہوں، جن میں عموماً فلسفی دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن میرے یہاں ان کا تعلق زندگی کے عملی مشاہدے اور تجربے سے ہے۔ فکری یا فلسفیانہ استدلال سے نہیں۔۹۶

اسی طرح اسلام میں گہری دلچسپی رکھنے کے باوجود اقبال نے کبھی عالم دین ہونے کا دعویٰ بھی نہ کیا۔ احمدیوں کے عقائد پر تبصرے کے سلسلے میں انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو تحریر کیا کہ وہ دینیات کے موضوع میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ البتہ احمدیوں کے ساتھ ان کے اپنے اکھاڑے میں نبرد آزما ہونے کے لیے انہوں نے اس موضوع سے تھوڑی سی شناسائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۹۷۔ مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ وطنی قومیت یا اسلامی قومیت کی بحث کے دوران بھی انہوں نے اپنے جوابی مضمون میں واضح کر دیا:

مجھے تسلیم ہے کہ میں عالم دین نہیں، نہ عربی زبان کا ادیب:

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا ۹۸

پس اگر بقول خود ان کے وہ شاعر تھے، نہ فلسفی، نہ عالم دین، تو آخر کیا تھے! انہیں ان کے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا خاتمہ ایک عاشق رسول کی حیثیت سے ہوا، جس نے اسی عشق کی نسبت سے امت محمدیہ یا ملت اسلامیہ کے تحفظ اور احیاء کے عمل کو جاری و ساری رکھنے کی کوشش میں اپنی تمام عمر صرف کر دی۔ شاعری، فلسفہ، دینیات، تصوف وغیرہ تو ان کے نزدیک نصب العین کی وضاحت کی خاطر محض ذرائع تھے، مگر ان سب باتوں کے باوجود اقبال مظاہر الٰہی میں سے تھے۔ ایسے نوابغ روزگار خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہدیے کے طور پر ہی انسانوں میں نمودار ہوتے ہیں اور آرڈر دے کر نہیں بنوائے جاسکتے۔

اقبال کے تصوّرِ اسلام کا اہم ترین پہلو کیا تھا؟ انہوں نے مذاہب عالم کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب اپنے اوائلی دور میں قومی تھا۔ جیسے کہ ہندوؤں، قدیم یونانیوں یا مصریوں کے مذاہب سے ظاہر ہے۔ بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے کہ یہودیوں کے مذہب سے واضح ہے۔ عیسائیت نے تعلیم دی کہ مذہب نجی، ذاتی یا انفرادی معاملہ ہے۔ بالآخر اسلام ہی نے اس حقیقت کو آشکار کیا کہ مذہب قومی ہے، نہ نسلی نہ ذاتی بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اسلام اصطلاح کے مفہوم قدیم کے مطابق ایک مذہب نہیں، بلکہ یہ تو ایک روّیہ ہے۔ ایسی آزادی کا روّیہ جو کائنات کے ساتھ حریفانہ کشاکش کی ترغیب دیتا ہے۔ دراصل یہ دنیائے قدیم کے تمام تصوّرات کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ مختصراً اسلام انسان کا حقیقی انکشاف ہے۔ ۹۹

پس اقبال اسلام کو ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول یا انسانی اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے ایک عملی تحریک تصور کرتے تھے۔ اور ''مسلم'' سے ان کی مراد تھی

وہ مردِ مومن جو "لا اکراہ فی الدین" کی روشنی میں اپنی مثالی شخصیت اور بلند کرداری کے ذریعے ساری انسانیت کو مرعوب کر کے اپنے عقیدے کی طرف لے آئے۔ اقبال نے ایسے ہی یکتا افراد پر مشتمل ایک نئے مسلم معاشرے کا خواب دیکھا تھا اور ان کی تمام شعری تخلیقات یا نثری کاوشیں اسی نئے معاشرے کو حقیقی طور پر وجود میں لانے کی خاطر عملی تجاویز قرار دی جاسکتی ہیں۔

فکرِ اقبال میں کئی موضوع ایسے ہیں جن پر دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ مگر اس مرحلے پر ان کے افکار و نظریات کی حتمی صورت یا خدوخال کا تعین کرتے وقت انتہائی اختصار سے کام لیا جائے گا۔ اقبال کے ہاں دین اسلام تمدن اسلام سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ان کے نزدیک تجدید دین، احیائے تمدن کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے خیال میں دینیات کے شعبے میں روایتی علم الکلام چونکہ یونانی فلسفے کی بنیادوں پر ترتیب دیا گیا تھا، اس اعتبار سے فرسودہ تھا اور مسلمانوں کی جدید نسل اس سے استفادہ نہ کرسکتی تھی۔ پس ضروری تھا کہ جدید سائنس کی تحقیقات کی بنیاد پر ایک نئے علم الکلام کو تشکیل دیا جائے، کیونکہ ان کے نزدیک جدید سائنس کے دریافت شدہ اصولوں کو آیات قرآنی سے ہر لحاظ سے مطابقت تھی اور مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے ایسا ترتیب دیا ہوا علم الکلام ان کے قلوب میں ایمان کی جڑیں زیادہ مضبوط کرسکتا تھا ۱۰۰۔ اس ضمن میں سرسید کی کوشش اس لیے کامیاب نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے معتزلی طریق کار اختیار کیا جو بجائے خود یونان کے فرسودہ نظام عقلیت کی پیداوار تھا، لیکن سرسید پر تبصرہ کرنے کے باوجود اقبال ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ اپنے ایک خط مورخہ ۲۷ رفروری ۱۹۳۶ء بنام ڈاکٹر ظفر الحسن میں تحریر کرتے ہیں:

اگرچہ ہمارے عظیم شاعر حالی نے سرسید احمد خان کے سوانح حیات بڑی تفصیل سے تحریر کیے ہیں لیکن مسلمانانِ ایشیا ابھی تک ان کی ذہنی کاوش کو پوری طرح سمجھنے کے

قابل نہیں ہو سکے۔ اس حقیقت کا مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ سر سید کی نگاہ ایسے وسیع و عریض امور پر جمی ہوئی تھی جن کا تعلق مسلمانان ایشیا کے مذہب اور سیاست سے تھا۔ پس مسلم ایشیا نے ابھی تک ان کی شخصیت کی حقیقی عظمت کا اندازہ نہیں کیا۔ ۱۰۱

بہر حال اقبال کی منشا کے مطابق خصوصاً دینیات کے شعبے میں اس نئے انداز فکر کو عملی طور پر بروئے کار لانے کے سلسلے میں کسی بھی مسلم ملک میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

اسی طرح باوجود اس کے کہ محکومی کے دور میں اقبال اجتہاد سے گریزاں تھے، انہیں مسلمانوں کے مستقبل میں آنے والے سیاسی آزادی کے دور میں فقہ اسلامی کی تدوین نو کی ضرورت کا احساس تھا۔ اس ضمن میں ۱۹۰۴ء سے لے کر وفات تک اجتہاد ان کی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ اجتہاد کے معاملے میں انہوں نے اس قسم کی وسعت نظر کا مظاہرہ کیا ہے اور فقہ میں قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے ایسی انقلابی تعبیریں ان کے ذہن میں تھیں، جنہیں قبول کرنے کے لیے اب تک نہ تو تقلید پسند اور تنگ نظر علماء تیار ہیں، نہ مسلم قوم۔ اقبال کا موقف تھا کہ ارکان دین میں تغیر و تبدل ممکن نہیں، لیکن بیشتر فروعی فقہی مسائل میں فقہ کے قدیم مکاتب فکر کی اندھا دھند تقلید کے بجائے اجتہاد کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ اشد ضرورت ہے۔ اسلام میں مرد اور عورت کی قانونی مساوات کے سلسلے میں ان کے نظریات بھی اچھوتے تھے۔ اس بارے میں حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈز لندن میں محفوظ ان کی ایک انگریزی تحریر راقم کی نظر سے گزری ہے، جس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک مسلم عورت جس کا کسی مخصوص اسلامی فرقے سے تعلق ہو، محض کسی مسلم مرد کے عقد میں آنے سے اپنے خاوند کے فرقے کے قانون کی تابع نہیں ہوسکتی۔ اگر بیوی کو یوں اپنی شخصیت خاوند کی شخصیت میں جذب کرنے کو کہا جائے تو یہ ایک لطیف قسم کا اکراہ (مجبوری) ہوگا، جسے اسلامی قانون کسی صورت یا شکل میں

تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ ایسا فعل قرآن مجید کے واضح حکم ''لا اکراہ فی الدین'' کے خلاف ہوگا۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایک یہودی یا عیسائی عورت بھی اگر کسی مسلم شوہر سے شادی کرے (جو شرعاً جائز ہے) تو اسلامی قانون کے مطابق محض اس کے عقد میں آنے کے سبب وہ خاوند کے مذہبی قانون کی تابع نہیں ہو جاتی ۱۰۲۔ اقبال اپنی تحریروں میں یہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی ہر نسل گذشتہ نسلوں کی فقہی تعبیر یا اجماع کی پابندی نہیں۔ بالفاظ دیگر وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ہر نئی نسل فقہی مسائل کا حل وقت کے جدید تقاضوں اور اپنی بدلتی ہوئی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کرے۔ اقبال یہ حق جدید جورس پروڈنس کے ماہر اور اسلامی فقہ کے اصولوں سے شناسا وکلا اور ججوں (یا قاضیوں) کو دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ جس جرأت فکر یا تحریک پر اصرار کرتے ہیں یا جس لبرل ازم کی طرف مسلمانانِ جدید کو لے جانا چاہتے ہیں، اسے ابھی تک کوئی بھی قبول کرنے پر رضامند نہیں ہوا۔ دراصل وہ خود اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ کام ان کی رحلت کے سبب ادھورا رہ گیا۔

احیائے تمدن اسلام کے لیے جس طرح دینیات کے شعبے میں نئے علم الکلام اور قانون کے شعبے میں نئی فقہ کی تشکیل کی ضرورت تھی، اسی طرح تعلیم کے شعبے میں بھی انقلابی تبدیلیاں درکار تھیں۔ اس میدان میں اقبال قدیم اور جدید کا امتزاج چاہتے تھے۔ وہ برصغیر کے مفکروں میں پہلی شخصیت تھے جس نے جدیدیت اور مغربیت میں امتیاز واضح کیا۔ وہ بنیادی طور پر مغربیت کے مخالف تھے، لیکن جدیدیت یا تجدید کے ہمیشہ قائل رہے۔ ان کے نزدیک علم کی تحصیل کے لیے خداوند تعالیٰ نے انسان کو تین ذرائع سے نوازا ہے۔ عقل، حواس خمسہ اور عرفان۔ عقل سے حاصل کردہ علم کی نوعیت فکری ہے اور اس کا ماہر عالم کہلاتا ہے۔ حواس خمسہ سے حاصل کردہ علم کا انحصار مشاہدے یا تجربے پر ہے اور اس کا دوسرا نام حکمت یا سائنس

ہے۔ حکمت یا سائنس کے ماہر کو روایتی انداز میں حکیم کہا جاتا ہے۔ عرفان کے ذریعے سے حاصل کردہ علم دراصل معرفت کہلاتا ہے اور اس کے ماہر کو لوگ عارف کہہ کر پکارتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں محض دینی علوم کی تجدید سے مسلمانوں کے تمدنی احیا کا امکان نہ تھا۔ اس لیے وہ ایسے دارالعلوم کے قیام کے خواہشمند تھے، جہاں مسلم طلبہ کو قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم بھی دی جائے۔ اقبال کی رائے میں مسلمان جدید سائنس کے موجد تھے اور اس میدان میں ترقی کرنا ان کے لیے اشد ضروری تھا تا کہ دنیائے اسلام میں تحقیق، تخلیق، اختراع اور ایجاد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا جا سکے۔ تربیت کے معاملے میں اقبال جدید مسلم یونیورسٹیوں کے اخلاقی معیار کو کچھ اس طرح متعین کرنا چاہتے تھے کہ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے کو ایک نظر دیکھتے ہی کہا جا سکے کہ وہ اسلامی شخصیت اور کردار کا مالک ہے۔ اقبال ائمہ مساجد اور واعظین سے بھی توقع رکھتے تھے کہ دینی علوم سے شناسا ہونے کے علاوہ وہ ادبیات اور جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ اقبال نے اپنی تحریروں کے ذریعے شعر و ادب کی خصوصیتوں کے بارے میں تنقید کا ایک اسلامی معیار متعین کیا نیز اسلامی آرٹ (فن) کے متعلق بھی اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

کسی قوم کی روحانی صحت کا انحصار اس امر پر موقوف ہے کہ اس کے شاعروں اور فنکاروں کو کس قسم کی آمد ہوتی ہے...... جہاں تک تاریخ تمدن اسلامی کا تعلق ہے، میری دانست میں ماسوا فن تعمیر کے اسلامی آرٹ (موسیقی، مصوری اور شاعری تک) نے ابھی وجود میں آنا ہے۔[۱۰۳]

اقبال نے اسلام کی اقتصادی یا معاشی تعلیمات کے متعلق بھی ذاتی اجتہاد کے ذریعے ایک رائے قائم کر رکھی تھی، جس کا اظہار وقتاً فوقتاً وہ اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں فرماتے رہے۔ اگر اقبال کے معاشی نظریات کا احاطہ کیا جائے تو

معلوم ہوگا کہ وہ کارل مارکس کی تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو سراسر غلط تصوّر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بالشویک کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بھی مخالف تھے اور ایسی اجارہ داریوں کو تعلیمات قرآنی کے برعکس سمجھتے تھے۔ ان کے تصور ریاست سے عیاں ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی نظام جمہوریت میں کسی ایک مخصوص طبقے کی حکمرانی کی، خواہ وہ جاگیرداروں یا سرمایہ داروں پر مشتمل ہو، خواہ مزدوروں یا کاشتکاروں پر گنجائش نہ تھی۔ ان کی رائے میں اسلام کا مقصد ایک ایسے متوازن معاشی نظام کا انعقاد تھا جس میں کوئی ایک دوسرے کے استحصال کا باعث نہ بن سکے۔ اسی بنا پر اسلام کیپٹلزم (سرمایہ داری) اور سوشلزم (اشتراکیت) دونوں کو انسانی فکر کی انتہا پسندی کے مظاہر سمجھتے ہوئے انہیں انسانی زندگی کے لیے ناقص و فاسد قرار دیتا ہے اور انسانی مساوات و اخوّت کے نصب العین کے حصول کی خاطر اپنا معاشی نظام "اقتصاد" کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے، جس سے مراد ہے اعتدال کے ذریعے سرمایہ اور محنت کا صحیح توازن برقرار رکھنا۔ اقبال ذاتی ملکیت کے بنیادی انسانی حق کو وقف کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کسی فرد کو اس قدر مال اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حقیقی پیداکاروں کو مغلوب کر لے۔ پس اگرچہ اقبال سرمایہ داری کے مخالف تھے، وہ معاشی نظام سے سرمائے کی قوت کو قطعی طور پر خارج کرنے کے حق میں نہ تھے، بلکہ ان کے نزدیک اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قرآنی تجاویز پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اس ضمن میں وہ ایسے قوانین کا نفاذ چاہتے تھے۔ جن سے اجتماعی حقوق نظر انداز کر کے دولت خزانہ کرنا (اکتناز) ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا (احتکار) سود لینا (ربا) یا سٹہ لگانا (قمار) حرام و ممنوع قرار دیے جا سکیں۔ نیز ان کے نزدیک قانون وراثت کا نفاذ اور زکوٰۃ، صدقہ اور عشر کی وصولی کا اہتمام کرنا

ضروری تھا۔ اقبال کی رائے میں زمین کا اصل مالک خدا ہے اور انسان ایک امین کی حیثیت میں اس سے رزق حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اراضی کی ذاتی ملکیت کی اجازت صرف اس حد تک دی جا سکتی ہے جو زمیندار بجائے خود زیر کاشت لا سکے۔ اسی طرح حکومت کی تحویل میں اراضی میں سے نصف کاشت کاروں میں اقساط کی صورت میں فروخت کر دینے کے حق میں تھے۔ مزید برآں زرعی آمدنی پر اسی تناسب سے ٹیکس وصول کرنے کے حامی تھے، جس طرح انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جس طرح ایک متعین حد تک آمدنی والے انکم ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیے جاتے ہیں۔ اسی تناسب سے وہ چاہتے تھے کہ چھوٹے زمینداروں کو مالیہ یا لگان معاف کر دیا جائے۔ اقبال کو مزدوروں اور کاشت کاروں کی مشکلات کا پورا احساس تھا اور ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن انہو ں نے ہمیشہ یہی تلقین کی کہ بحیثیت مسلمانوں کے اپنی حقیقت اور مقام کو پہچانیں، قرآن کی اقتصادی تعلیمات پر نظر غائر ڈالیں اور کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو پس وہ کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ دونوں قسم کے استعمار کے تو مخالف تھے، لیکن ''مخلوط معیشت'' کے اصول پر مبنی اسلامی معاشی جمہوریت کے قیام کے خواہشمند تھے۔ یعنی ایسی معیشت جس میں مخصوص صنعتوں پر مشتمل پبلک سیکٹر میں سرمایہ لگانے کا اہتمام حکومت خود کرے۔ (بجائے قومیانے یا غصب کی پالیسی اختیار کرنے کے) اور ساتھ نجی کوشش کو بھی ایک متعین حد تک قبول کیا جائے۔ نیز اقتصادیا دولت کی مساویانہ تقسیم کے تصور کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کی خاطر اراضی کی حد ملکیت ''خود کاشت'' کے اصول پر مقرر کرنے کے حامی تھے۔[۱۰۴]

طرز حکومت کے متعلق بھی اقبال کے نظریات قابل توجہ ہیں۔ وہ ہر قسم کی موروثیت یا آمریت کے مخالف تھے، کیونکہ ان کے نزدیک ایسے نظام اللہ کی مطلق

حاکمیت کے تصوّر یا اسلامی تعلیمات کے منافی تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اموی دور کو عرب امپیریلزم یا آمریت کا عہد قرار دیا ہے۔ جمہوری طرز حکومت پر ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا اعتراض خالصتاً اخلاقی اور اصولی تھا، کیونکہ اس میں انتخاب کی بنیاد ووٹروں کی گنتی پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے سے کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے اس سقم کا اعتراف ہر سیاسی مفکر نے کیا ہے۔ اسی طرح وہ برصغیر میں ایسے جمہوری نظام کے انعقاد کے بھی خلاف تھے۔ جس سے مسلمان من حیث القوم ایک اقلیت میں منتقل کر دیے جائیں۔ پھر انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ کسی بھی پس ماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر ان پڑھ، غیر منظم اور فاقہ کش ہوں وہاں جمہوریت کا تعارف سیاسی ابتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے لیکن کسی بہتر طرز حکومت کی عدم موجودگی میں یا اس کے نعم البدل کی عدم موجوگی میں اقبال جمہوری طرز حکومت ہی کو موزوں طریق سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے صوبائی کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری اور صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور ۱۹۳۲ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے صدر رہے۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ان کی سیاسی زندگی میں بعض ایسے مراحل بھی آئے، جب انہوں نے محمد علی جناح سے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے منافقانہ کردار کے مسئلے پر اختلاف کیا، لیکن محمد علی جناح کے حکم بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی تعمیل کرتے ہوئے اس پارٹی کے خلاف اپنا بیان فروری ۱۹۳۸ء کو اشاعت عام سے روک لیا اور یوں پارٹی ڈسپلن کی ایک نادر مثال قائم کی۔ اس مرحلے پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اقبال نہ تو مغرب کے سیکولر جمہوری نظام کے حامی تھے، نہ آج کے دور میں اسلام کے روایتی تصور ریاست (یعنی

خلافت) کو کوئی اہمیت دیتے تھے ان کے ذہن میں جو دستوری خاکہ تھا اسے جمہوریت کی بنیاد پر ایک جدید اسلامی دستور کا خاکہ سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ سنی ممالک کے جمہوری دساتیر میں مجالس آئین ساز کے اندر "ولایت فقیہ" کے مستقل قیام کے حق میں نہ تھے۔ ان کے خیال میں مجالس آئین ساز سے باہر نامزدگی کے اصول پر علما کے بورڈ یا ان پر مشتمل کونسل کو وجود میں لایا جا سکتا ہے، جن کے اسلامی آئین سازی کے متعلق مشوروں سے منتخب اسمبلیوں کے اراکین استفادہ کر سکتے ہیں۔ مگر اقبال اس طریق کار کو بھی صرف عارضی طور پر اختیار کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں بہتر صورت یہی ہے کہ مجلس آئین ساز میں، جسے اقبال اجماعِ ملت کا اسٹیٹس دینا چاہتے تھے، ایسے وکلا منتخب ہو کر آئیں جو جدید جورس پروڈنس سے شناسائی کے ساتھ ساتھ فقۂ اسلامی کے اصولوں سے بھی واقفیت رکھتے ہوں تاکہ قانون سازی کا کام وقت کے جدید تقاضوں اور قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق انجام دیا جا سکے۔

اقبال کے ہاں اسلام کا تصور شوکت کے بغیر نامکمل ہے۔ اسی بنا پر وہ برصغیر میں اسلام کو صحیح معنوں میں آزاد اور مسلمانوں کو طاقت ور دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے برصغیر کے منتشر مسلمانوں کے سامنے مسلم قومیت کا اصول رکھا اور اسی اصول کی بنیاد پر ہی ان کے لیے شمال مغرب میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی، گویہ تجویز، مختلف فکری مراحل میں سے گزری ۱۰۵، لیکن جیسے کہ اقبال کے خطوط بنام محمد علی جناح سے ظاہر ہوتا ہے اس کی حتمی شکل یہی تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے وفاق پر مشتمل ایک ایسی آزاد و مقتدر معاشی جمہوریت قائم کی جائے۔ جسے شریعت اسلامیہ کی تائید حاصل ہو، بالفاظ دیگر اقبال برصغیر میں آزاد مقتدر مسلم ریاست کو ایک جدید اسلامی ریاست کی صورت میں قائم دیکھنا چاہتے تھے، کیونکہ ایسی ہی ریاست میں وہ نیا مسلم معاشرہ نشوونما پا سکتا تھا، جس کا خواب اقبال نے

دیکھا تھا اور جس کے افراد کو مستقبل میں مسلمانوں کی قیادت اور رہبری کے فرائض انجام دینا تھے۔

مگر اقبال کے نزدیک برصغیر میں آزاد مقتدر جدید اسلامی ریاست کا قیام بجائے خود آخری مقصد نہ تھا، بلکہ یہ بھی محض ایک ذریعہ تھا اسلامستان کو وجود میں لانے کا۔ اقبال کا خیال تھا کہ ہندی مسلمان مادی طور پر تو شاید عالم اسلام کی کوئی مدد کرنے کے قابل نہ ہوں۔ لیکن ذہنی طور پر یقیناً ان کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسی سبب اقبال ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ مسلم ممالک کے اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ اقبال سید جمال الدین افغانی کے بڑے مداح تھے اور انہیں زمانہ حال کا مجدد سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہے۔ زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔ ۱۰۶

سیّد جمال الدین افغانی کے تصوّر اتحاد ممالک اسلامیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کی رائے تھی کہ اولاً ہر مسلم ملک کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے، اور اپنے آپ کو انفرادی طور پر مستحکم اور مضبوط بنانا چاہیے۔ تاہم ہر ایک کا نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ بالآخر آزاد مسلم ریاستوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح سب متحد ہو جائیں، اقبال کے نزدیک اسلام نہ تو نیشنلزم ہے، نہ امپیریلزم، بلکہ ایک طرح کی جمعیت اقوام یا دول مشترکہ ہے۔ اقبال کے خیال میں مسلم ممالک کا اتحاد تین صوبوں میں وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ پہلی صورت تمام مسلم ممالک پر مشتمل

ایک عالمگیر اسلامی مملکت ہے جسے آج کے زمانے میں وجود میں لانا ممکن نہیں۔ دوسری صورت مسلم ممالک پر مشتمل فیڈ ریشن یا کنفیڈ ریشن ہے، اور اسے بھی وجود میں لانا شاید محال ہو۔ تیسری صورت انفرادی مسلم ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ تمدنی، اقتصادی اور عسکری معاہدوں میں منسلک ہونا ہے۔ یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے اور اسی اصول کی بنا پر رفتہ رفتہ تمام آزاد و مقتدر مسلم ریاستیں ایک دوسری کے قریب لائی جا سکتی ہیں۔ اقبال کی رائے میں مسلم ممالک کا اتحاد دو صورتوں میں ختم ہو سکتا ہے۔ اس خاتمے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی ملک کے مسلمان ہی اپنے ایمان سے منحرف ہو کر کوئی اور عقیدہ قبول کر لیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ جب ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک پر حملہ کر دے۔ اقبال کو یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ایسی صورت حالات پیدا ہو رہی ہے کہ عالم اسلام کا اتحاد کسی نہ کسی ہیئت میں بالآخر ایک سیاسی یا جغرافیائی حقیقت بن جائے گا۔ بہر حال اس اعتبار سے بھی اقبال آئندہ یا مستقبل کے مفکر تصور کیے جائیں گے، کیونکہ عالم اسلام کے اتحاد کی جو تصویر ان کی نگاہوں کے سامنے ابھری تھی، ابھی تک اس کے دھندلے سے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے اور سب کچھ گرد و غبار میں اٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہ سب تو فکر اقبال کے خالصتاً اسلامی پہلو تھے، لیکن چونکہ اقبال کے ہاں اسلام دراصل انسان کا انکشاف ہے، اس لیے ان کے فکر کے انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا پیغام خودی صرف مسلمانوں ہی کے لیے وقف نہ تھا، بلکہ ہندوؤں اور ان سب اقوام کے لیے بھی تھا جو پسماندہ تھیں یا مغربی نو آبادتی اور استعماری قوتوں کے سیاسی و اقتصادی استحصال کا شکار تھیں۔ اس ضمن میں ان کی تصانیف میں سے سب سے اہم "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے۔ اقبال نے پسماندہ اقوام کی جدوجہد آزادی کی ہر مرحلے پر حمایت کی۔ انہیں خود اعتمادی اور اپنی حقیقت کو پہچاننے کا سبق دیا۔ انہیں اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر مستحکم

ہونے، مغربی طاقتوں پر انحصار نہ کرنے اور آپس میں اتحاد قائم رکھنے یا ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات کی صورت میں جنگ وجدل کے بجائے پرامن گفت و شنید کے ذرائع اختیار کرکے اختلافات مٹانے کی تلقین کی۔ اقبال کا خیال تھا کہ متمول مغربی اقوام کے سیاسی واقتصادی استحصال سے محفوظ رہنے کی خاطر ممکن ہے پسماندہ اقوام کو کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی ایک علیٰحدہ ''جمعیت اقوام'' وجود میں لانے کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے تجویز کیا کہ جغرافیائی طور پر تہران کو ایسی مرکزیت حاصل ہے جہاں ایسا ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کیپٹلسٹ اور سوشل امپیریلزم دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں یورپی اقوام نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی مگر ان کا عمل چونکہ اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف تھا اس لیے غالب امکان تھا کہ یہ کلچر عالمی جنگوں میں بیکار ہوکر فنا ہوجائے گا[107]۔ اقبال نے اپنی شعری تخلیقات اور نثری تحریروں میں مغرب کی نوآبادتی اور استعماری اقوام کو بار بار متنبہ کیا کہ وہ احترام آدمیت کے اصول کو اپنائیں، ورنہ ان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ ان کی نگاہ میں مغرب کا جدید انسان معذوری کی کیفیت میں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

جدید انسان اپنے تنقیدی فلسفوں اور سائنسی علوم میں اختصاص کے سبب بڑی ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ اس کی نیچر پرستی نے تو بے شک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرے مگر اپنے مستقبل میں اس کے اعتماد کا جذبہ چھین کر...... پس اپنی ذہنی سرگرمیوں کے نتائج سے مغلوب ہونے کے سبب جدید انسان کی روح مردہ ہوچکی ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھوبیٹھا ہے، خیالات اور نظریات کی جہت میں اس کا وجود اپنی ذات سے متصادم ہے اور اقتصادی وسیاسی سطح پر وہ دوسروں سے مصروف پیکار ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کرسکے۔ اسی بنا پر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے

لیے اس کی جدو جہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے بیزار ہو چکا ہے۔ ۱۰۸

اسی سلسلے میں اقبال نے اپنے تصور شیطان میں چندا چھوتے خیالات کا اظہار کیا اور واضح کیا ہے کہ شیطان سیاسی و اقتصادی سطح پر عالمی قائدین یا سیاستدانوں سے کیا کام لیتا ہے اور کس طرح انہیں استعمال کر کے انسان کے ہاتھوں انسان کا خون بہاتا ہے ۱۰۹۔ اقبال نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر نئے سال کے لیے اپنے آخری پیغام میں واضح کر دیا تھا کہ اس دنیا میں انسان کی بقا انسانیت کے احترام کو ملحوظ رکھنے ہی سے ممکن ہے اور صرف وہی اتحاد قابل اعتماد ہے جس کی بنیاد اخوت انسانی پر رکھی گئی ہو۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ جب تک نسل، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے، اس دنیا میں انسانوں کو کبھی بھی خوشی مسرت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوگی اور آزادی، مساوات اور اخوت کے حسین تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا۔ انہوں نے یہ پیغام اس دعا پر ختم کیا تھا کہ خداوند کریم عالمی لیڈروں کو انسانیت اور نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔

عجیب بات ہے کہ اس ضمن میں اقبال کے خیالات کی بازگشت آج کی دنیا کے لبرل مفکروں کے ہاں بھی سنائی دینے لگی ہے۔ اقبال کی وفات سے لے کر اب تک دوسری عالمی جنگ سے گزرنے کے بعد نوآبادتی سلطنتوں کی جگہ نئی پسماندہ آزاد قومی ریاستوں نے لے لی ہے، جو ترقی کی تحصیل کے لیے کوشاں ہیں اور یہی سمجھتی ہیں کہ انسانی ترقی صرف عقلیت، سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام کو اپنانے ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ سو سائنس، ٹیکنالوجی، دولت اور قوت کے مغربی تصورات سے ساری دنیا نے اثر قبول کیا اور انہی مغربی تصورات کی تشہیر کے سبب پسماندہ معاشروں نے اپنے مستقبل کی شبیہ عصر حاضر کے ترقی یافتہ

معاشروں کی تصویر کے مطابق ترتیب دی۔ نیز یہ یقین کر لیا گیا کہ انسانی ترقی کی تحصیل کے لیے صرف دو ہی طریقے ہیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام۔

مگر رفتہ رفتہ ترقی پذیر ممالک بالخصوص تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ٹیکنالوجی کی آزادی یا معاشی خودمختاری کے لیے تحریک اور مغربی ممالک کی ترقی کے متعلق منافقانہ پالیسیوں (جن کے باعث ان کے اندر اور باہر ایک مشکل صورت حالات کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا) نے مغربی مفکروں کو مجبور کیا کہ وہ ترقی کے بارے میں اپنے نظریات کا ازسرنو جائزہ لیں۔ مغرب میں اس نئے اندازِ فکر کے فروغ کا سبب تیل کا بحران، عالمی افراطِ زر اور مختلف ٹیکنیکل اداروں کی رپورٹیں تھیں جن میں، ماہرین کی تحقیقات کے مطابق، دنیا بھر کے ذخائر قوت اکیسویں صدی کے اختتام سے پیشتر یقینی طور پر ختم ہو جانے کے احتمال کا اظہار کیا گیا تھا۔ ماہرین اس نتیجے پر بھی پہنچے تھے کہ اگر دنیا کی آبادی میں اضافے کی رفتار کا یہی عالم رہا تو آنے والی صدی کے اختتام تک وسائل خوراک کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے دنیا بھر کو فاقہ کشی کا سامنا کرنے کا امکان تھا۔ پس تیل کے بحران، عالمی افراطِ زر، آبادی کے بلاقید پھیلاؤ اور آئندہ صدی کے اختتام سے پیشتر دنیا کے ذخائر قوت اور وسائل خوراک کے خاتمے کے احتمال نے کئی مغربی مفکرین کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ترقی کی تحصیل کے جدید طریق، سرمایہ دارانہ نظام یا مارکسی نظام انسان کے اپنی تقدیر پر قادر ہونے کے رستے میں حائل ہیں۔ بعض اشتراکی مصنفین سوویٹ روس کی کارکردگی پر سخت برہم ہوئے کیونکہ ان کی نگاہ میں سوویٹ انقلاب نے بھی آج تک اپنی تمام تر توجہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے صرف مغرب کی صنعتی اور ٹیکنالوجی کی برتری کو توڑنے کی طرف مبذول کی، جس میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان مفکرین کو سوویٹ روس اور امریکہ ایک ہی عقیدے کے پابند نظر آتے ہیں جسے "صنعتیت" یا "ٹکنالوجیت" کا نام دیا

جاسکتا ہے۔ مارکسی مصنف ہربرٹ مارکوس کی رائے میں مشرق و مغرب دونوں میں سیاستدانوں کا ایک ایسا گروہ حکمران ہے جس کا منتہائے نظر لبرل یا سوشلسٹ انقلاب نہیں بلکہ اپنی اپنی سوپر اسٹیٹ کی طاقت میں اضافہ کرنا ہے۔ اشترا کی فلسفی میکسی ملین روبل کے نزدیک اگر مارکس آج دوبارہ زندہ ہو جائے اور دیکھے کہ مارکسی ممالک میں کیا ہو رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو مارکسی کہنا چھوڑ دے گا۔ ان آزاد خیال مفکرین کی رائے میں سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی نظام دونوں عالمی طور پر پسماندگی کو دور کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے خیال میں آج دنیا کی سیاسیات، قوت و اقتدار کی سیاسیات ہیں۔ انسانی ترقی کی سیاسیات نہیں اور نظم دنیا کا توازن اعتماد کے بجائے ایک دوسرے سے خوف و ہراس پر قائم ہے۔ ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ نے دنیا میں ہر جگہ ایسی صورت پیدا کر دی ہے، جس میں حیات کش ٹیکنالوجی کی تخلیق کو حیات بخش ٹیکنالوجی کی تخلیق پر ترجیح دی جاتی ہے اور ہر ملک اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اسی مقصد کے حصول کی خاطر صرف کرتا ہے۔ جنگی ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ کے پس منظر میں دنیا افراط زر، آبادی کے مسلسل پھیلاؤ اور پسماندگی کی نہایت دردناک تصویر بن کر رہ گئی ہے اور دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں اب کسی کے پاس بھی پیش کرنے کے لیے ایسی کوئی معاشی تنظیم نہیں رہی جو انسان میں اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے نیا عزم پیدا کر دے۔

حالیہ عالمی اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لیے بعض مغربی مفکرین نے اخلاقیات پر مبنی ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کی رائے میں نوعِ انسان کی جھوٹی تفریقوں سے شدید نقصان پہنچا ہے مثلاً گورے اور کالے کی تمیز، کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ کی تمیز یا ترقی یافتہ اور پسماندہ کی تمیز وغیرہ سراسر غلط اور انسانیت کے لیے مضر ثابت ہو چکی ہیں۔ پس آئندہ صدی میں انسانیت کو اقتصادی بحران اور تباہی سے بچانے کے لیے یا انسانیت کی بقا کی

خاطر ضروری ہے کہ ہر ملک اپنی آبادی کی منصوبہ بندی اپنے وسائل کے مطابق کرے اور اپنے وسائل کو پورے طور پر استعمال میں لائے۔ انسان میں اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی اہلیت ہے اور اسی طرح وہ تغیر سے پیدا شدہ نئے مسائل کو حل کرنے کی تخلیقی قوت بھی رکھتا ہے اور اگر وہ دنیا میں کھانے کے لیے ایک منہ کا اضافہ کرتا ہے تو اپنے ساتھ ذہن، ہاتھ اور پاؤں بھی لاتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر منفرد اور تخلیقی ہے اور اس کی صحیح تربیت ایجاد و اختراع کا سبب بنتی ہے، جس کے ذریعے مختلف قسم کے بحرانوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر ذہن کی تربیت کے لیے بھی ذرائع اور ان کی تنظیم کی ضرورت ہے۔

ان مفکرین کے نزدیک سب انسان اس اعتبار سے پسماندہ ہیں کہ اپنی اپنی بقا کی خاطر ان کو اقتصادی طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے آئندہ صدی میں انسانیت کا اتحاد یا یک جہتی ہی اس کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے، ورنہ تمام انسانیت کی تباہی یقینی ہے۔ اس سلسلے میں ٹافلر جیسے امریکی مفکر یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ عالمی اقتصادی بحرانوں پر نگاہ رکھنے اور ان کے مضر اثرات کو روکنے کے لیے فوری طور پر ایک بین الاقوامی تنظیم قائم کی جائے تا کہ دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک یکساں طور پر ایک دوسرے سے مشورے کے ذریعے منفی عالمی اقتصادی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

اقبال کی بصیرت کا کمال ہے کہ آج دنیا بھر کے آزاد خیال مفکرین اور اقتصادی ماہرین بھی اپنے تجربات کی روشنی میں انہی نتائج پر پہنچے ہیں جن کا ذکر اقبال کی شعری تخلیقات اور نثری کاوشوں میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔ انسانیت کی بقا کی خاطر انسانی اتحاد و یک جہتی کو وجود میں لانے کی ضرورت یا احترام آدمیت کے اخلاقی اصول پر مبنی ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کا احساس اقبال کو نہیں تھا تو اور کسے تھا؟ خیر یہ بحث تو بحیثیت مجموعی فکر اقبال کی دنیوی جہت سے متعلق

تھی، اب مختصراً ان کے آفاقی، الٰہیاتی اور اخلاقی افکار کی حتمی شکل کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اقبال کے تصوّر انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہی ان کے فکر کا محور ہے، لیکن اس مسئلے پر اقبال کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں، ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بیخودی'' میں ملتی ہے۔ اقبال کے ہاں طاقتور انسانی شخصیت کی بہت اہمیت ہے، بلکہ وہ انسان ہی کے متعلق سوچتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ فرماتے ہیں:

کمزور اپنے آپ کو خدا میں گم کرتے ہیں۔ طاقتور اسے اپنے اندر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ۱۱۰

اقبال کا مردِ مومن یا انسانِ کامل دراصل ایک طاقتور انسانی شخصیت ہی ہے اور ان کے عشقِ رسولؐ کا راز بھی یہی تھا کہ وہ آنحضورؐ کو انسانِ کامل تصور کرتے تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے: اقبال سے فلسفے کے کسی انگریز پروفیسر نے پوچھا کہ آپ کے پاس خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے کونسی دلیل ہے! جواب دیا: فقط یہی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے۔ اسی بنا پر اقبال اپنے تصورات کے عالم میں خدا سے تو گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ایسے گرفتار ہیں کہ ان کے منہ سے آنحضورؐ کی مدح وستایش اور احترام ہی کے الفاظ نکلتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک جو اخلاقی خصوصیات خودی کو مستحکم کرتی ہیں وہ ہیں عشق، حریت، جرأت اور فقر۔ بقول اقبال ایسی خصوصیات کی حامل شخصیت اپنے اندر نفسیاتی تناؤ اور بیداریِ شعور کی کیفیات کی بنا پر مسلسل بے چینی، بے تابی اور بے قراری کے عالم میں رہتی ہے اور اس عالم میں رہنے کے سبب تخلیقی عمل کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مستقبل کا مسلم معاشرہ ایسی ہی منفرد شخصیات پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ لیکن جو منفی صورت انسانی شخصیت کی تباہی کا باعث بنتی ہے وہ ہے جمود۔ جمود ہی سے کسی

معاشرے میں نفرت، خوف، بدعنوانی، بزدلی، گدائی، نقالی، بے ضمیری، خوشامد اور موقع پرستی فروغ پاتی ہیں۔ جو بالآخر قوموں کے زوال و انحطاط یا غلامی و محکومی کا باعث بنتی ہیں۔ مستحکم شخصیت کے لیے اقبال نے شاہین کی تشبیہ اس لیے استعمال کی ہے کہ بقول ان کے:

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں:

۱۔ خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔

۴۔ خلوت پسند ہے۔

۵۔ تیز نگاہ ہے۔۱۱۱

پس اقبال کا پیچ و تاب کھاتا ہوا بے تاب اور بے چین انسان دراصل ایک تخلیقی فعلیت ہے اور وہ اپنی قوتوں، اپنے گردونواح کی قوتوں اور ان کے ساتھ ہی کائنات کی تقدیر متشکل کر سکتا ہے۔ مزید برآں اس بتدریج تغیر پذیر سلسلۂ عمل میں وہ خدا کا معاون اور ہمکار بننے کی اہلیت رکھتا ہے اور چونکہ وہ ایک بہتر اور خوب تر عالم کا تصور کر سکتا ہے، اس لیے موجود کو مطلوب میں بدلنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اقبال کے ہاں خدا خودی مطلق ہے اور چونکہ وہ انسان سے خدا تک پہنچے ہیں۔ اس لیے خدا بھی ان کے نزدیک ایک شخصیت ہے جو کائنات و حیات کی طرح متحرک ہے۔ خودی مطلق اپنی تخلیقی فعلیت کے ممکنات میں جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے لامتناہی ہے، مگر اس کی لامحدودیت مادے کی طرح وسیع ہونے کے بجائے روح کی طرح عمیق ہے۱۱۲۔ اقبال کے نزدیک خودی مطلق کا تخلیقی عمل وحدتوں یا خودیوں کی تشکیل کی صورت میں ہوتا ہے۔ جن کی حقیقت فقط خودی مطلق

کا انکشاف ذات ہے۔ پس کائنات کا ہر جوہر خودی ہی کی پست و بالا صورت ہے، گو ذات انسانی میں وہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات بے حس و حرکت اور ناقابل تغیر و تبدل نہیں بلکہ اس میں مزید اضافے کے ذریعے وسعت کی گنجائش ہے۔ پس وہ ناتمام ہے۔

خدا، کائنات اور حیات سے متعلق اقبال کے نظریات ان کے انتقال تک کسی بنیادی تغیر سے نہیں گزرے، البتہ بعض اقبال شناس سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں اپنا نظریہ بدل لیا تھا اور وہ وحدت شہود کی منزل سے گزر کر پھر واپس وحدت وجود والی پوزیشن پر آ گئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد یہی رائے رکھتے ہیں اور تحریر کرتے ہیں کہ ۱۹۲۲ء کے بعد اقبال دوبارہ وحدت وجود کے قائل ہو گئے تھے اور اس کے کچھ اشارے ''پیام مشرق'' میں ملتے ہیں۔ نیز ''زبور عجم'' کی اکثر غزلوں میں اوّل سے آخر تک اور مثنوی ''گلشن راز جدید'' میں وحدت وجود کی تلقین کی گئی ہے ۱۱۳۔ یہی خیال مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن مدیر ''معارف'' کا ہے۔ سید نذیر نیازی اپنی تصنیف ''دانائے راز'' میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کبھی بھی وحدت وجود کے گرداب میں نہ پھنسے تھے اور نہ آخر الامر اس کے قائل ہوئے ۱۱۴۔ راقم کی رائے میں یہ دونوں نظریے درست نہیں۔ اقبال اپنی ابتدائی زندگی میں کچھ مدت تک وحدت وجود کے قائل ضرور رہے لیکن بعد میں اس مسلک کو چھوڑ کر تصوف کا وہ مسلک قبول کیا جو خالصتاً اسلامی ہے اور جس میں روحانی تربیت کے وقت ''من و تو'' کا امتیاز بہر صورت قائم رہتا ہے۔ اقبال کے ہاں عشق سے مراد ہے: اپنے اندر سمو لینے یا جذب کر لینے کی خواہش اور اس کی اعلیٰ ترین صورت کسی آئیڈیل کی تخلیق اور اس کی تحصیل کے لیے تگ و دو ہے۔ بقولِ اقبال عشق، عاشق اور معشوق دونوں کو انفرادیت کی خصوصیت بخشتا ہے۔ پس سب سے یکتا شخصیت کو حاصل کرنے کے لیے جستجو نہ صرف عبد کو یکتائیت عطا کرتی ہے، بلکہ

ساتھ ہی معبود کی یکتائیت کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک خط بنام ظفر احمد صدیقی مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیۂ اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔ ۱۱۵

بعض اہل نظر ابن العربی کے مسلکِ توحیدِ وجودی کو بھی اسلامی تصوّف کا نام دیتے ہیں، مگر اقبال کے آخری دور کے اشعار میں جو بظاہر وجودی تصوّرات نظر آتے ہیں تو یہ سب محض سطحی مشابہتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے وحدت وجود کو رد کرنے کے بعد نہ تو وحدتِ شہود کے مسلک کو اپنایا اور نہ وحدت وجود کے مسلک کی طرف لوٹے۔ وحدت وجود میں تو قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے اور وحدت الشہود میں خدا تک رسائی کا امکان ہی نہیں۔ مگر اقبال کے ہاں خودیِ مطلق اور خودی مقید میں ''من و تو'' کا امتیاز استغراقی کیفیت کے باوجود قائم رہتا ہے۔ جیسے آفتاب کی ضیا میں موم بتی کی روشنی یا سمندر کے پانی میں موتی۔ یہ کیفیت وحدت وجود کی نہیں۔ گو اس سے سطحی مشابہت رکھتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ اقبال اپنی تخلیقی زندگی کے آخری دور میں دوبارہ وحدت وجود کے قائل ہو گئے تھے، درست نہیں۔ ویسے بھی اقبال میں جب کبھی کوئی فکری تبدیلی رونما ہوئی وہ ارتقائی

صورت میں ایک منزل سے اگلی منزل کی طرف تو ضرور بڑھ گئے، مگر ان کی حرکت دائرے کی صورت میں کبھی نہ ہوئی۔ یعنی وہ رد کی ہوئی پوزیشن پر کبھی نہ لوٹے۔

عشق و عقل، جبر و اختیار، حیات بعد موت اور زمان و مکاں کے متعلق بھی اقبال کے نظریات کی حتمی صورت میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہ عشق یا عرفان کو عقل ہی کی ایک اعلیٰ شکل سمجھتے تھے۔ جبر و اختیار کے مسئلے کے بارے میں ان کا موقف ہمیشہ یہی رہا کہ جس حد تک انسان کو اختیار رہے وہ کلی ہے۔ یعنی اگر انسان کے سامنے دو راستے ہوں تو خدا بھی اس کے لیے ان میں سے ایک منتخب نہیں کر سکتا۔ حیات بعد موت کے متعلق انہوں نے اپنا موقف سیّد نذیر نیازی کے نام ایک خط مورخہ ۱۹/اگست ۱۹۳۱ء میں یوں واضح کیا ہے:

میرے نزدیک حیات بعد الممات انسانی کوشش اور فضل الٰہی پر منحصر ہے۔ بچوں کے لیے بعثت زیادہ آسان ہے کیونکہ بعثت کا مفہوم ہے ایک نئے نظام زمانی کے ساتھ توافق کرنے کا: بچوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہے، کیونکہ ہمارا نظام زمانی ان کی فطرت میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوتا۔ خودی کا نہایت گہرا تعلق نظام زمانی سے ہے۔ مرنے والوں سے اس زندگی میں اتحاد ممکن نہیں، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر یہ اتحاد زیادہ تر کملایا کامل انسانوں سے ہوتا ہے، کیونکہ خودی کی زندگی بعد از موت یقینی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گذشتہ تجربات کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ عوام سے یہ امر محال ہے، خواہ وہ بعد از مرگ زندہ بھی ہوں۔ بعثت ثانیہ مظہر حیات ہے۔ اس میں انسانی کوشش کو بھی ایک حد تک دخل ہے۔ اس کو انسانی کامرانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابدی موت اور زندگی خاص قسم کے اعمال سے متعین ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اگر کوئی شخص ابدی موت کا خواہش مند ہو تو وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوزخ اور جنت بھی زندگی کے مظاہر ہیں اور ان کی نوعیت کی تعیین اسی مرحلے پر منحصر ہے جو زندہ شے نے حاصل کیا ہو۔ اس زندہ

شے کے لیے دوزخ اور جنت ہے یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے بھی۔ مگر اس دوزخ و جنت کی نوعیت کی تعیین حیوانی زندگی اور نباتی زندگی کے اسٹیج پر منحصر ہے۔ یہی حال بچوں کی زندگی کا ہے۔ زندگی کے مدارج بے شمار ہیں۔ اس ضمن میں بہت سے امور عقل انسانی سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق بصیرت وایمان اور ذرائع سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ذرائع کا تعلق فلسفے سے نہیں ہے۔۱۱۶

انہیں زمان و مکاں کے موضوع سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی وفات تک قائم رہی۔ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی، اقبال کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ کیمبرج میں طالب علمی کے دور میں انہوں نے زمانے کی حقیقت پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو ان کے استاد میک ٹیگرٹ نے ناپسند کیا اور اقبال نے دل برداشتہ ہو کر اسے تلف کر دیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد جب برگساں نے اسی موضوع پر اسی قسم کا اظہار خیال کیا اور اس کے نظریے کی تشہیر ہونے لگی تو میک ٹیگرٹ کو بڑا دکھ ہوا، اس لیے کہ برگساں نے بھی کم و بیش وہی نظریہ قائم کیا تھا، جسے پہلے اقبال اپنے مقالے میں پیش کر چکے تھے۔۱۱۷ اقبال کے نزدیک زمان و مکان کے بارے میں آئن سٹائن اور برگساں کے نظریات اہل یورپ کے لیے تو ممکن ہے نئے ہوں لیکن عالم اسلام کے لیے یہ نیا مسئلہ نہ تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی الٰہیات، حدیث و قرآن اور فلسفے کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

بہر حال اقبال اس مسئلے پر جس تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اس کا انہیں موقع نہ ملا۔ زمان و مکاں کے مسئلے کو وہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ کیوں سمجھتے تھے، اس کی وضاحت بھی انہوں نے کہیں نہیں فرمائی اور اس ضمن میں محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔۱۱۸

مارچ ۱۹۳۸ء کے دوسرے ہفتے میں راقم نے سنٹرل ماڈل اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان دیا اور اقبال کی رحلت سے قبل نتیجہ نکل آیا۔ راقم امتحان

میں کامیاب ہوا اور سائنس کے موضوع میں اوّل آیا۔ اقبال بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ اگر راقم نے اگلی جماعتوں میں سائنس میں اپنی دلچسپی قائم رکھتے ہوئے میڈیکل ڈاکٹر بننے کا قصد کیا تو اسے اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر دی آنا (آسٹریا) بھیجیں گے۔ اقبال نے ایک وصیت نامہ تو ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا جو رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر کرایا گیا، لیکن اس کے چار یوم بعد یعنی ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک اور تحریر اپنی یادداشت کی کتاب میں درج کی جس میں خصوصی طور پر راقم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے بڑی ہے، ان کا احترام کرے اور اگر ان کی طرف سے کبھی سختی بھی ہو تو برداشت کرے۔ دیگر رشتے داروں کو اگر اس سے مدد کی ضرورت ہو اور اس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔ باقی دینی معاملات میں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین میں سے نہیں ہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اس راہ پر گامزن رہے اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لیے ہیں، ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے۔ غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے اور ائمہ اہل

بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے۔۱۱۹

وسط مارچ ۱۹۳۸ء سے اقبال کی حالت تشویش انگیز ہوتی چلی گئی۔ وہ ایلو پیتھک دوائیں پسند نہ کرتے تھے اور ان سے انہیں کوئی فائدہ بھی نہ ہوتا تھا۔ دمے کے دورے پڑتے تھے۔شانے اور کمر کا درد بدستور تھا۔قلب، گردے اور جگر سب ماؤف ہو چکے تھے۔نیند آتی نہ تھی اور مسلسل بے خوابی کا عالم طاری تھا۔وقت کاٹنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔پاس بیٹھے احباب سے کہتے کہ باتیں کیے جائیں۔کبھی دیوان علی سے بلھے شاہ کی کوئی کافی، ہدایت اللہ کی سی حرفی یا یوسف زلیخا سنتے اور کبھی سید نذیر نیازی کو تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ بیان کرنے یا کوئی ایسا افسانہ سنانے کی ہدایت کرتے جس میں بغداد، قاہرہ، غرناطہ یا قرطبہ کا ذکر آتا ہو۔ افسانہ سنتے سنتے سو جاتے۔مگر پھر اچانک بے چینی سے جاگ اٹھتے۔فرماتے نیند نہیں آتی۔وقت کیوں نہیں گزرتا۔کھانسی کا دورہ پڑتا۔بعض اوقات کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ انہی ایام میں دمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بیہوشی کے عالم میں راقم نے انہیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسداللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ میرزا غالب (یا مولانا رومی) ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے اور علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا۔چلو ٹھیک ہے۔

چند ہفتے گزرنے کے بعد پاؤں متورم ہو گئے۔ یہ سب علامتیں اچھی نہ تھیں۔۱۹ر اپریل، ۱۹۳۸ء کو بلغم میں خون آنے لگا تھا اور نبض خفیف ہو گئی تھی۔حکیم محمد حسن قرشی اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے انہیں دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا۔تاہم ان کے حواس بالکل صحیح و سالم تھے اور بظاہر حالت میں کوئی خاص تغیر معلوم نہ ہوتا تھا۔ان کی اب بھی یہی خواہش تھی کہ پنجابی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے کسی نہ کسی

طرح علمائے ہند میں سے چند ایک کو پنجاب میں بود وباش اختیار کرنے پر رضامند کیا جائے۔ غالباً اسی بنا پر ۱۸/اپریل ۱۹۳۸ء کو درج ذیل خط سیّد نذیر نیازی نے مولانا مودودی کے نام تحریر کیا:

کچھ دن ہوئے سید محمد شاہ صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ جمال پور تشریف لے آئے ہیں اور عنقریب لاہور بھی آئیں گے۔ اس وقت سے برابر آپ کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر آپ کا ارادہ فی الواقع لاہور آنے کا ہے تو جلدی تشریف لائیے تاکہ ملاقات ہو جائے۔ میری اپنی طرف سے یہ گزارش ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی حالت نہایت تشویشناک ہے۔ ایک لمحے کا بھی بھروسا نہیں (مگر اس بات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھیے گا کسی سے ذکر نہ کیجیے گا) لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ جس قدر ہو سکے جلدی تشریف لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت کے لیے دعا فرمائیے۔ ۱۲۰

مگر یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے غالباً اپنا آخری خط سر راس مسعود کے سیکرٹری ممنوں حسن خان کے نام تحریر کروایا جس میں فرمایا کہ دمے کے متواتر دوروں نے انہیں زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا ہے اور یہ کہ آنکھوں کا آپریشن مارچ ۱۹۳۸ء میں ہونے والا تھا، مگر دمے کی وجہ سے اسے ستمبر ۱۹۳۸ء تک ملتوی کرنا پڑا۔ ۱۲۱

۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ انہوں نے معمول کے مطابق دلیے کے ساتھ چائے کی پیالی پی۔ میاں محمد شفیع سے اخبار پڑھوا کر سنے اور رشید حجام سے شیو بنوائی۔ دوپہر کو ڈاک میں جنوبی افریقہ کے کسی اخبار میں تراشے وصول ہوئے، خبر یہ تھی کہ وہاں کے مسلمانوں نے نماز جمعہ کے بعد اقبال، مصطفیٰ کمال اور محمد علی جناح کی صحت اور عمر درازی کے لیے دعا کی ہے۔ کوئی ساڑھے چار بجے بیرن فان والتھائیم انہیں ملنے کے لیے آ گئے۔ بیرن فان والتھائیم

نے جرمنی میں اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا اور اب وہ جرمنی کے نازی لیڈر ہٹلر کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان اور افغانستان کا سفر کر کے شاید ان ممالک کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہندوستان کا دورہ مکمل کر چکنے کے بعد وہ کابل جا رہے تھے۔ اقبال اور بیرن فان والتھائم دونوں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ہائیڈل برگ یا میونخ میں اپنی لینڈ لیڈی، احباب اور اساتذہ کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اقبال نے انہیں سفر افغانستان کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ جب بیرن فان والتھائم جانے لگے تو اقبال نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کر کے انہیں رخصت کیا۔ شام کی فضا میں موسم بہار کے سبب پھولوں کی مہک تھی اس لیے پلنگ خوابگاہ سے اٹھوا کر دالان میں بچھوایا اور گھنٹہ بھر کے لیے وہیں لیٹے رہے پھر جب خنکی بڑھ گئی تو پلنگ گول کمرے میں لانے کا حکم دیا۔ گول کمرے میں ساڑھے سات سالہ منیرہ آپا جان کے ساتھ ان کے پاس گئی۔ منیرہ ان کے بستر میں گھس کر ان سے لپٹ گئی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگی۔ منیرہ عموماً دن میں تین بار اقبال کے کمرے میں جاتی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے، دوپہر کو اسکول سے واپس آنے پر اور شام کو سونے سے قبل۔ لیکن اس شام وہ ان کے پہلو سے نہ اٹھتی تھی۔ دو تین بار آپا جان نے اسے چلنے کے لیے کہا، مگر وہ نہ مانی۔ یہی کہتی رہی۔ بس تھوڑی دیر اور۔ اس پر اقبال نے مسکراتے ہوئے آپا جان سے انگریزی میں کہا، اسے اس کی حس آگاہ کر رہی ہے کہ شاید باپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔ منیرہ اور آپا جان کے اندر چلے جانے کے بعد فاطمہ بیگم، پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے آ بیٹھیں اور ان سے کالج میں درس قرآن کے انتظامات کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔

رات کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے چوہدری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر آ گئے۔ ان ایام میں میاں محمد

شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم تو جاوید منزل میں ہی مقیم تھے۔ اقبال کے بلغم میں ابھی تک خون آ رہا تھا اور اسی بنا پر چوہدری محمد حسین نے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی میٹنگ کا انتظام جاوید منزل میں کیا تھا۔ اس زمانے کے معروف ڈاکٹر کرنل امیر چند، الٰہی بخش، محمد یوسف، یار محمد، جمعیت سنگھ وغیرہ سبھی موجود تھے اور انہوں نے مل کر اقبال کا معائنہ کیا۔ گھر میں ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا، کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو اگلے روز نیا طریق علاج شروع کیا جائے گا۔ کوٹھی کے صحن میں مختلف جگہوں پر اقبال کے اصحاب دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اقبال سے ڈاکٹروں کی رائے مخفی رکھی گئی، لیکن وہ بڑے تیز فہم تھے۔ احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ چند یوم پیشتر جب کسی نے ان کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا تو فرمایا: میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بعد ازاں اپنا یہ شعر پڑھا تھا:

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

پس اس رات وہ ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ راقم کوئی نو بجے کے قریب گول کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا: کون ہے؟ راقم نے جواب دیا: جاوید۔ ہنس پڑے، فرمایا: جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا: چوہدری صاحب! اسے ''جاوید نامہ'' کے آخر میں وہ دعا ''خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجیے گا۔ اتنے میں علی بخش اندر داخل ہوا۔ اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ علی بخش نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ چوہدری محمد حسین نے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کی۔ فرمایا آخر چالیس برس کی رفاقت ہے، اسے رو لینے دیں۔ رات کے گیارہ بجے اقبال کو

نیند آ گئی۔ چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، سید نذیر نیازی اور سید سلامت اللہ شاہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم کے علاوہ راجہ حسن اختر نے اس رات جاوید منزل ہی میں قیام کیا اور باہر دالان میں چارپائی بچھا کر لیٹ گئے۔ راقم بھی حسب معمول اپنے کمرے میں جا کر سو رہا۔

اقبال کوئی گھنٹے بھر کے لیے سوئے ہوں گے کہ شانوں میں شدید درد کے باعث بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع نے خواب آور دوا دینے کی کوشش کی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ فرمایا: دوا میں افیون کے اجزا ہیں اور میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔ علی بخش اور میاں محمد شفیع ان کے شانے اور کمر دبانے لگے تاکہ درد کی شدت کم ہو، لیکن تین بجے رات تک ان کی حالت غیر ہو گئی۔ میاں محمد شفیع، حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے ان کے گھر گئے، مگر ان تک رسائی نہ ہو سکی اور ناکام واپس آ گئے۔ اقبال درد سے نڈھال تھے۔ میاں محمد شفیع کو دیکھ کر فرمایا: افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ تقریباً پونے پانچ بجے راجہ حسن اختر اٹھ کر اندر آئے۔ انہیں بھی حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ بولے: حکیم صاحب رات بہت دیر سے گئے تھے اور اس وقت انہیں بیدار کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ اسی پر اقبال نے یہ قطعہ پڑھا:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ حسن اختر قطعہ کا مطلب سمجھتے ہی حکیم محمد حسن قرشی کو لانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اقبال کے کہنے پر ان کا پلنگ گول کمرے سے ان کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ انہوں نے فروٹ سالٹ کا گلاس پیا۔ صبح کے پانچ بجنے میں کچھ منٹ باقی

تھے۔ اذانیں ہو رہی تھیں سب کا خیال تھا کہ فکر کی رات کٹ گئی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع صبح کی نماز ادا کرنے کی خاطر قریب کی مسجد میں پہنچ گئے تھے اور صرف علی بخش ہی اقبال کے پاس رہ گیا تھا۔ اسی اثناء میں اچانک اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھے اور ان کے منہ سے "ہائے" کا لفظ نکلا۔ علی بخش نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں شانوں سے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ فرمایا: دل میں شدید درد ہے اور قبل اس کے کہ علی بخش کچھ کر سکے، انہوں نے "اللہ" کہا اور ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو پانچ بجکر چودہ منٹ صبح کی اذانوں کی گونج میں اقبال نے اپنے دیرینہ ملازم کی گود میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ طلوعِ آفتاب کے بعد جب راقم اور منیرہ نے ان کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو خواب گاہ میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ پلنگ پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا، جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی طرف تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر راقم کے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔

چوہدری محمد حسین اور اقبال کے دیگر احباب صبح ہی آ گئے اور اقبال کی تجہیز و تکفین سے متعلق مسائل پر غور کرنے لگے۔ سب سے اوّل مسئلہ یہ تھا کہ تدفین کہاں ہو۔ چوہدری محمد حسین کی تجویز تھی کہ انہیں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ وہ اور میاں نظام الدین، میاں امیر الدین، سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خان، مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک شاہی مسجد گئے اور حجروں کے معائنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے زیر سایہ سیڑھیاں کی بائیں جانب کے خالی قطعۂ زمین کو مدفن کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کے لیے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ (جس کا صدر دفتر دہلی میں

تھا) کی منظوری لینا ضروری تھا۔ سو اس ضمن میں پنجاب کے وزیر سر سکندر حیات سے رابطہ قائم کیا گیا جو ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے کلکتے گئے ہوئے تھے۔ سر سکندر حیات نے مجوّزہ مقام تدفین سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ کی متبادل تجویز پیش کی۔ مجوّزہ مقام تدفین پر یونینسٹ پارٹی کے ہندو اور سکھ وزرا بھی معترض تھے۔ البتہ مسلم وزراء نے سر سکندر حیات کی تجویز کی تائید کی۔ بعض حلقوں کی طرف سے مسجد نیلا گنبد کے سامنے خالی پلاٹ کو مدفن بنانے کی تجویز بھی پیش کی گئی، مگر اقبال کے احباب نے ان تجاویز کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ بعد ازاں ان میں سے پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد نے پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک سے ملاقات کی، جس نے دوپہر تک مجوزہ قطعۂ زمین کے لیے دہلی سے اجازت دلا دی اور اس سلسلے میں چار بجے تک تمام کاغذی کارروائی بھی مکمل کر لی گئی۔

اقبال کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ اخباروں کے ضمیمے چھپے۔ سرکاری دفاتر، اسکول، کالج، عدالتیں، اسلامی ادارے سب بند ہو گئے اور لوگ ہجوم در ہجوم جاوید منزل کا رُخ کرنے لگے۔ ہزاروں لوگوں نے باری باری اقبال کے چہرے کی آخری زیارت کی اور گزرتے چلے گئے۔ وہ سامنے گول کمرے میں سے ان کی خواب گاہ میں داخل ہو کر بغلی غسل خانے سے باہر نکلتے تھے۔ یہ تانتا شام تک بندھا رہا۔

پانچ بجے شام جاوید منزل سے جنازہ اٹھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان کندھا دے سکیں۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں پنجاب کے ہر شعبۂ زندگی کے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت شامل تھے۔ وزرائے حکومت، حکام، اعلیٰ عدالتوں کے جج، وکلا، کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ، شعرا، ادبا صحافی، مشائخ، علماء، تجار صناع

غرضیکہ عام فرزندان اسلام باچشم گریاں کلمۂ شہادت کا ورد کرتے جا رہے تھے۔ جنازے پر کئی پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں اور پیدل اور سوار پولیس، سرخ پوش رضا کار، نیلی پوش والنٹیئر، خاکساروں کے جیش، کامریڈ مسلم جیش، الہلال پارٹی اور کئی جیوش اپنی اپنی وردیاں پہنے جنازے کے ہمراہ تھے راقم کو اب تک یاد ہے، وہ جنازے کے جلوس میں سب سے آخر میں تھا۔ جنازہ قلعہ گوجر سنگھ اور فلیمنگ روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں پہنچا، جہاں نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے تقریباً بیس ہزار مسلمان موجود تھے۔ اتنے میں شور ہوا کہ نماز جنازہ بادشاہی مسجد میں پڑھی جائے گی تاکہ شہر کے لوگ بھی شریک ہوسکیں۔ لوگوں نے افراتفری میں جنازہ اٹھایا اور مجمع بدحواسی کے عالم میں ریلوے روڈ کی طرف بڑھا۔ عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب ''چند یادیں، چند تاثرات'' میں فرماتے ہیں کہ جسٹس دین محمد نے سخت غصے میں کہا کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ وہاں نماز دوبارہ بھی تو پڑھی جا سکتی ہے، لیکن ہنگامے میں اُن کی کسی نے نہ سنی۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

بخشی سر ٹیک چند...... اقبال کی عظمت پہچاننے میں کسی مسلمان سے پیچھے نہ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ تمہیں تو اقبال کو دفن کرنا بھی نہیں آتا۔ تم اس کی قدر کیا پہچانو گے ۱۲۲۔

بعدازاں جب جنازہ برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے تک پہنچا تو اس کے ساتھ سوگواروں کی تعداد کوئی پچاس ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ سات بجے کے بعد جنازہ شاہی مسجد پہنچا۔ آٹھ بجے شب شاہی مسجد کے صحن میں مولانا غلام مرشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعدازاں میّت کو مقام تدفین کے قریب لاکر رکھ دیا گیا، کیونکہ اقبال کے برادرِ اکبر شیخ عطا محمد اور چند دیگر اعزہ نے ابھی سیالکوٹ سے پہنچنا تھا۔ وہ لوگ تقریباً ساڑھے نو بجے رات وہاں پہنچے اور شیخ عطا محمد نے آخری بار اقبال کے چہرے کا دیدار کیا۔ پونے دس بجے کی قریب اس عاشق رسولؐ اور داعی احیائے

اسلام کے جسم کو تابوت میں رکھ کر سپردخاک کر دیا گیا۔

مزار اقبال کی تعمیر کے لیے ۱۹۳۸ء ہی سے چوہدری محمد حسین کی زیر صدارت مرکزی مجلس اقبال قائم ہوگئی تھی، مگر آٹھ سال تک تعمیر مزار کا کام شروع نہ ہو سکا اور اس مدت میں کچی قبر پر ایک پختہ تعویذ ہی اقبال کا مدفن تھا۔ بہر حال مزار کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء کے اواخر میں ہوا۔ اور چار سال بعد ۱۹۵۰ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس پر خرچ آنے والی رقم خاصانِ بارگاہ اقبال نے فراہم کی اور عطیات کے لیے اپیل نہ کی گئی۔ خاکہ تعمیر مزار حکومت افغانستان نے اپنے اطالوی ماہر سے بنوا کر بھیجا، جو مرکزی مجلس اقبال نے اس لیے نامنظور کر دیا کہ نہ صرف انداز تعمیر غیر اسلامی نوعیت کا تھا بلکہ اطالوی کیتھولک روایت کے مطابق تربت پر اقبال کے مجسمے کو ہاتھ باندھے ہوئے لٹایا گیا۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن کے نواب زین یار جنگ نے خاکہ تیار کیا، مگر اس خاکے میں نسوانی حد تک نفاست تھی اور مزار کے اندر تربت یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی منقش سنہری پنجرے میں بلبل قید کر دی گئی ہو۔ چوہدری محمد حسین نے نواب زین یار جنگ کو لاہور بلوایا اور انہیں ساتھ لے کر موقع پر گئے۔ پھر شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر فرمایا: دیکھیے! نواب صاحب ایک طرف مسجد ہے جو مسلمانوں کی دینی طاقت کی مظہر ہے اور دوسری طرف قلعہ ہے جو ان کی دنیوی قوت کا مظہر ہے۔

ان تعمیرات کے درمیان مزار اقبال تبھی بھلا لگے گا جب وہ سادگی اور مضبوطی کی خصوصیات کا حامل ہو۔ نیز اقبال کی شخصیت میں بھی تو یہی خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس پر نواب زین یار جنگ نے موجودہ مزار کا خاکہ تیار کیا۔ تعمیر کا ٹھیکہ چوہدری فتح محمد نے لیا۔ محمد سلیمان چیف انجینئر اور میاں بشیر احمد اوورسیر نے بلا معاوضہ رہنمائی اور نگرانی کی خدمات انجام دیں۔ تعمیر میں استعمال ہونے والا سنگ سرخ اور سنگ مرمر ریاست دھولپور (انڈیا) سے حاصل کیا گیا اور اس پتھر کو

دہلی، آگرہ اور مکرانہ کے کاریگروں نے تراشا۔ مزار کے اندر کندہ قرآنی آیات اور اشعار اقبال چوہدری محمد حسین کا انتخاب ہیں۔ آیات الٰہی کی خطاطی حافظ محمد یوسف سدیدی (اب مرحوم) نے کی ہے اور اشعار اقبال کی محمد اقبال ابن پروین رقم نے۔ لوح مزار پر، چبوترے اور تعویذ کے لیے سنگ لاجورد حکومت افغانستان کی طرف سے ہدیہ ہے۔ لوح مزار کی عبارتیں افغانستان ہی سے کندہ شدہ آئی تھیں۔

خیر یہ تو ذکر تھا اس نشان کا جہاں اقبال کا جسم دفن کیا گیا، لیکن اُس کی روح کی بیتابی، بے چینی اور بے قراری آج بھی اقبال کے رازداروں کے سینوں میں شعلہ کی طرح لپکتی ہے۔

مآخذ

باب ۲۱

۱۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحات ۳۶۵، ۳۶۶

۲۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۴۸

۳۔ ''مکتوبات اقبال''، صفحات ۳۶۸، ۳۷۲

۴۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۷۰

۵۔ ''اقبال چوہدری محمد حسین کی نظر میں'' مرتبہ محمد حنیف شاہد، صفحات ۲۱۹ تا ۲۲۲۔

۶۔ ''مکتوبات اقبال'' مرتبہ سید نذیر نیازی، صفحات ۳۶۰، ۳۶۱

۷۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۶۰۷

۸۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۲۲۲، ۲۲۳

۹۔ ایضاً، صفحہ ۲۱۶

۱۰۔ محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم کونشن اپریل ۱۹۴۶ء میں دہلی میں منعقد کی۔

۱۱۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۱۱ تا ۱۳

۱۲۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۱۳، ۱۴

۱۳۔ ''اقبال کے آخری دو سال''، صفحات ۴۱۴ تا ۴۱۶

۱۴۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۶۰۸

۱۵۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۱۴ تا ۱۸

۱۶۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۷۲۔۷۳

۱۷۔ ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحات ۲۷۶ تا ۲۷۸۔ اصل خط کا انگریزی متن بھی ساتھ موجود ہے۔

۱۸۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ، شیخ عطا اللہ، حصہ دوم، صفحات ۳۴۰، ۳۴۱

۱۹۔ بالآخر لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۲۳ ر مارچ ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا،

جس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔

۲۰۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''۔ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۱۸تا۲۳۔

۲۱۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطااللہ، حصہ اوّل، صفحہ ۲۲۳۔

۲۲۔ ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی'' از اسعد گیلانی، صفحات ۱۳۸تا۱۴۰۔اس سلسلے میں راقم نے رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق سے استفادہ کیا ہے جس کے لیے وہ ان کا شکر گزار ہے۔

۲۳۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطااللہ، حصہ اوّل، صفحات ۲۴۹، ۲۵۰۔

۲۴۔ ''خطوط اقبال' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، صفحات ۶۸۴، ۶۸۶۔

۲۵۔ ایضاً، اصل خط کا عربی متن مع اردو ترجمہ، صفحات ۲۴۹، ۲۵۰۔

۲۶۔ ''صحیفہ'' اقبال نمبر (حصہ اوّل) مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، صفحات ۲۲۹، ۲۳۰۔سید نور محمد قادری کی رائے میں اقبال کی زندگی میں مولانا مودودی سے ملاقات نہ ہوئی۔ خط بنام راقم۔لیکن دیکھیے مولانا مودودی کا مکتوب بنام ڈاکٹر سید ظفر الحسن، مورخہ ۲۲ جون ۱۹۳۸ء جسے رسالہ ''المعارف'' خصوصی شمارہ (۲) اپریل مئی ۱۹۸۵ء ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ لاہور نے نقل کیا ہے، صفحہ ۲۴۹۔مولانا مودودی تحریر کرتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں وہ اقبال سے لاہور میں ملے تھے اور مسلمانوں کے مسائل کے متعلق ان سے مفصل گفتگو ہوئی تھی۔

۲۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۰

۲۸۔ اقبال کے ذہن میں جمعیت اقوام مشرق کا تصور پہلے ہی سے موجود تھا۔ دیکھیے ''ضرب کلیم'' میں شامل اشعار جو بھوپال میں قیام کے دوران میں تحریر کیے گئے۔

پانی بھی مسخر ہے، ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینیوا!
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

۲۹۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۴۱۷ تا ۴۲۳۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے مطابق اقبال کے بیان کا انگریزی متن صرف اخبار ''نیو ٹائمز'' میں شائع ہوا تھا۔ نیز دیکھیے ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطا اللہ، حصہ اوّل، صفحات ۴۵۱ تا ۴۵۶۔ بیان کے اصل انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۴۵ تا ۲۴۷۔

۳۰۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۸۔

۳۱۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحہ ۲۰۹۔ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' از محمد حنیف شاہد، صفحات ۱۴۲، ۱۴۳۔

۳۲۔ ''اقبال، جیسے کہ میں انہیں جانتی تھی'' از مسز ڈورس احمد (انگریزی) مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۱ء، انہوں نے تحریر کیا ہے کہ وہ مئی ۱۹۳۷ء کی ایک تپتی ہوئی صبح لاہور پہنچی تھیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر، بھوپال، صفحہ ۹۷۔

۳۵۔ ایضاً، صفحہ ۹۷۔

۳۶۔ ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۰۹، ۲۱۰۔

۳۷۔ ''اقبال جیسے کہ میں انہیں جانتی تھی'' از مسز ڈورس احمد (انگریزی)، مطبوعہ

، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۱ء۔

۳۸۔ ''گفتارِ اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل، صفحات ۲۱۰ تا ۲۱۱۔

۳۹۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۸۶ تا ۹۳۔ ۱۹۳۳ء کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح ۱۹۳۵ء ہے۔

۴۰۔ ''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۲۱۴۔

۴۱۔ ان میں بیشتر یادیں راقم کے مضمون ''اقبال، ایک باپ کی حیثیت سے'' میں قلم بند کر دی گئی تھیں۔ دیکھئے ''مئے لالہ فام'' از جاوید اقبال، صفحات ۱۶۳ تا ۱۸۹۔

۴۲۔ اب یہ مسودات اور کاغذات علّامہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہیں۔

۴۳۔ ''اقبال جیسے کہ میں انہیں جانتی تھی''۔ (انگریزی) مطبوعہ، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۱ء۔

۴۴۔ اقبال کی خواہش کے مطابق محمد علی جناح نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسئلہ فلسطین کا ذکر خوب زوردار الفاظ میں کیا۔ دیکھیے ''جناح کی تقریریں'' مرتبہ جمیل الدین احمد، جلد اوّل (انگریزی)، صفحہ ۳۸۔

۴۵۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''۔ ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۲۴ تا ۲۶۔

۴۶۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۵۱۵، ۵۱۶۔

۴۷۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''۔ ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۲۷، ۲۸۔

۴۸۔ ایضاً، صفحات ۲۸، ۲۹

۴۹۔ ''لاہور کا جو ذکر کیا'' از گوپال متل ناشر مکتبہ تحریک انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۱۹۷۱ء صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۳۔ اس تصنیف کی طرف راقم کی توجہ رفیع الدین ہاشمی نے مبذول کرائی۔ محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کے سبب آخری

ایام میں اقبال کے تعلقات عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور مولانا ظفر علی خان سے بھی ختم ہو گئے تھے۔

۵۰۔ ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''۔ناشر شیخ محمد اشرف (انگریزی)، صفحات ۲۹ تا ۳۱۔

۵۱۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحہ ۵۳۱۔

۵۲۔ ایضاً، صفحہ ۵۲۹۔

۵۳۔ ایضاً، صفحہ ۵۳۱ تا ۵۴۰۔

۵۴۔ ''روزگارِ فقیر'' از فقیر سید وحید الدین، جلد دوم، صفحات ۲۰۳ تا ۲۰۵۔

۵۵۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۵۴۱، ۵۴۲

۵۶۔ اصل بیان کے انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات، مرتبہ، لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۴۸، ۲۴۹، اسی مقصد یعنی مسلمانوں کے تمدنی احیاء کے سلسلہ میں ۱۹۱۱ء میں اقبال نے اپنے ترانہ ملّی کے گراموفون ریکارڈوں کی فروخت سے رائلٹی کا ایک مخصوص حصہ پانچ سال کی مدت تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں فی ریکارڈ قیمت تین روپے تھی۔ دیکھیے مضمون اقبال سے متعلق دو نادر مسودات از ریاض حسین (انگریزی) ''اقبال ریویو'' اپریل ۱۹۸۴ء صفحات ۶۳ تا ۷۵۔

۵۷۔ غالباً، اس طرف اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں اپنی نظم جمیعت اقوام میں اشارہ کیا ہے:

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

۵۸۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی)، صفحات ۲۴۹ تا ۲۵۱۔

۵۹۔ ''سرگزشتِ اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۵۲۸۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے نام مکتوب کا اقتباس۔

۶۰۔ ''اقبال اور حیدر آباد'' صفحات ۲۱۲، ۲۱۳۔

۶۱۔ ''متحدہ قومیت اور اسلام'' از مولانا حسین احمد مدنی، صفحہ ۴۔ نیز دیکھیے ''مفکر پاکستان'' از محمد حنیف شاہد، صفحہ ۳۶۵۔

۶۲۔ ''اقبال کے حضور''، صفحات ۱۲۵، ۱۲۶۔ اقبال نے اس سلسلے میں مزید اشعار بھی کہے دیکھیے اسی کتاب کے صفحات ۱۶۶، ۱۷۴:

ندانی نکتۂ دینِ عرب را
کہ گوئی صبحِ روشن تیرہ شب را
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ
ندادے دعوتِ دیں بولہب را

اور

حق را بفریبد کہ نبی رابفریبد
آں شیخ ...... کہ خود را مدنی خواند

۶۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۶۔

۶۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۳۔

۶۵۔ راقم خود اس واقعہ کا شاہد ہے۔ تائید کے لیے ملاحظہ ہو ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۵۸۳، ۵۸۴۔

۶۶۔ ''سرگزشت اقبال'' از عبدالسلام خورشید، صفحہ ۵۰۹۔

۶۷۔ ''اقبال کے آخری دو سال،'' صفحہ ۵۹۰۔

۶۸۔ ایضاً، صفحہ ۵۹۶۔

۶۹۔ کتاب ہذا کا ۱۹۵۶ء ایڈیشن، صفحہ ۳۵۵۔

۷۰۔ ''اقبال کے حضور''، صفحہ ۹۵۔

۷۱۔ ''اقبال کے آخری دو سال''، صفحات ۵۴۸ تا ۵۵۰۔

۷۲۔ ایضاً، صفحات ۹۵ تا ۱۰۷۔

۷۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۲۔

۷۴۔ ایضا، صفحہ ۱۰۲۔

۷۵۔ کتاب ہذا کا ۱۹۵۶ء ایڈیشن، صفحہ ۳۵۵۔

۷۶۔ ''اقبال کے حضور''، صفحہ ۱۰۳۔

۷۷۔ اس بارے میں بیگم افتخار الدین تردیدی بیان اخباروں میں شائع کرا چکی ہیں اور انہوں نے راقم کو زبانی بھی یہی بتایا ہے۔

۷۸۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۶۰۵، ۶۰۹۔

۷۹۔ ''اقبال کے خطوط اور تحریریں'' مرتبہ بی۔اے۔ڈار (انگریزی)، صفحات ۱۱۲ تا ۱۱۴۔ نیز دیکھیے ''اقبال کے آخری دو سال'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، صفحات ۵۹۲ تا ۵۹۶، ۶۱۰ تا ۶۲۳۔

۸۰۔ ایضاً، صفحات ۶۲۳ تا ۶۴۵۔

۸۱۔ ایضاً، صفحات ۶۱۷ تا ۶۴۵۔

۸۲۔ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، صفحات ۵۶۱، ۵۶۲۔

۸۳۔ مضمون ''پاکستان، علامہ اقبال اور قائد اعظم''، ''نوائے وقت'' لاہور مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء

۸۴۔ صفحہ ۳۲۹ کتاب ہذا۔

۸۵۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۱۶۷، ۱۶۸۔

۸۶۔ ''مکتوبات شیخ الاسلام'' جلد سوم مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی، صفحات ۱۲۴، ۱۲۵، نظریہ قومیت مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال، مرتبہ طالوت، صفحات ۲۱، ۲۲۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خان، صفحات ۵۷۲، ۵۷۳۔

۸۷۔ ''اقبال کے حضور''، صفحہ ۲۱۵۔

۸۸۔ اقتباسات مضمون ''جغرافیائی حدود اور مسلمان''۔ ''مقالات اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی، صفحات ۲۲۱ تا ۲۳۸۔

۸۹۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحات ۱۶۸ تا ۱۷۰۔

۹۰۔ ''اقبال کے دینی اور سیاسی افکار از سید نور محمد قادری، صفحہ ۱۲۷۔

۹۱۔ ''اقبال کے سیاسی کارنامہ'' صفحات ۶۰۲، ۶۰۳۔

۹۲۔ کتاب ہذا کا ایڈیشن جون ۱۹۶۶ء مکتبہ دینیہ دیوبند ضلع سہارنپور، صفحہ ۱۴۱۔

۹۳۔ ''مکتوبات اقبال'' صفحہ ۳۶۴۔

۹۴۔ ''اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات'' مرتبہ اے۔ آر۔ طارق (انگریزی)، صفحہ ۱۰۲۔

۹۵۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل، صفحہ ۱۰۸۔

۹۶۔ ''مقالات اقبال کانگریس'' ۱۹۸۳ء جلد دوم (انگریزی) مضمون ''اقبال کا فلسفہ حیات'' از جگن ناتھ آزاد میں حوالہ تصنیف ''نامور مسلمان'' (انگریزی) مدراس ۱۹۳۶ء، صفحہ ۹۸۔

۹۷۔ ''اقبال کے خیالات وافکار'' مرتبہ سید عبدالواحد (انگریزی)، صفحہ ۳۰۶۔

۹۸۔ ''مقالاتِ اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی (انگریزی)، صفحہ ۲۲۸۔

۹۹۔ ''اقبال ریویو'' ۔مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، شمارہ اپریل ۱۹۸۳ء مضمون

''اقبال کی ایک نایاب تحریر'' (انگریزی) جو لاہور کے رسالہ اورینٹ'' کے شمارہ جون اگست ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی، صفحہ ۴۰۔ اقبال نے ایک تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ مسلمانوں میں ایمان کی دو شقیں ہیں۔ اول، اعتقاد فی التوحید و رسالت اور دوسرا ان کی اپنی معاشرت، تمدن، سیاست وغیرہ کا علم۔ ان دونوں کی موجودگی میں ایک آدمی مسلمان بن سکتا ہے۔ اگر چہ شق اوّل اصل اصول اسلام ہے، مگر دوسری کی نفی یا عدم موجودگی اگر نقصِ ایمان نہ بھی مانی جائے تو بھی اس میں کلام نہیں کہ اس کے بغیر کامل مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ سو وہ اسلام اور اس کے تمدن کو ایک سمجھتے تھے اور لازم و ملزوم۔ دیکھیے اقبال کی تقریر مجوزہ علی گڑھ محمڈن یونیورسٹی کے موضوع پر جلسہ بزم اردو ۱۹ر فروری ۱۹۱۱ء ''اقبال سے متعلق دو نادر مسودات'' از ریاض حسین (انگریزی و اردو) ''اقبال ریویو'' اپریل ۱۹۸۴ء صفحہ ۶۹۔

۱۰۰۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو ایک کتاب ''اقبال کا علم کلام'' از سید علی عباس جلالپوری۔ کتاب غلطیوں سے بھر پور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے نہ تو اقبال کے نظریات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ مسلم فلاسفہ و صوفیہ کے افکار کو۔

۱۰۱۔ فوٹو کاپی راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۰۲۔ فوٹو کاپی مسوّدہ انگریزی نمبر آر/۱/۲۹/۰۳۲/۱ خط مورخہ، اپریل ۱۹۳۷ء بنام میوائیل برائے حقوق دلانے نازلی رفیقہ بیگم جنجیرہ۔

۱۰۳۔ ''اقبال کے خطاب'' مرتبہ شاہد حسین رزاقی (انگریزی)، صفحات ۲۸۳، ۲۸۴۔

۱۰۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ''اقبال کے معاشی تصورات'' ''مئے لالہ فام'' ایڈیشن ۱۹۷۲ء صفحات ۲۶۰ تا ۳۰۰۔ اقبال انشورنس کے حق میں تھے اور مسلمانوں میں اسے عام کرنے کی خاطر انہوں نے مسلم انشورنس کمپنی سے وابستگی پیدا کی۔

۱۰۵۔ ۱۹۳۳ء میں تقسیم ہند کے سلسلے میں خیری برادران کی تجویز کی حمایت کی۔ ایک خط مورخہ ۱۹/ مارچ ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر ظفر الحسن کو تحریر کیا۔ خیری صاحب تو اس تجویز کو فراموش کر چکے ہیں، مگر اقبال کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں سے خاصی تعداد اسے قبول کرے گی، نیز وہ اپنے خاص احباب کو ہم خیال بنانے کی کوشش ترک نہ کریں اور مایوس نہ ہوں۔ خط کی فوٹو کاپی راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۰۶۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، صفحات ۲۳۱، ۲۳۲۔

۱۰۷۔ ایضاً صفحات ۳۴۸، ۳۴۹۔

۱۰۸۔ ''اقبال کی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' ترجمہ اردو از سید نذیر نیازی، صفحات، ۲۸۷ تا ۲۹۰۔

۱۰۹۔ مزید مطالعے کے لیے دیکھیے راقم کے دو مضمون ''اقبال کا تصور شیطان''، ''مے لالہ فام'' ایڈیشن ۱۹۷۲ء، صفحات ۱۴۱ تا ۱۸۷۔ اس موضوع پر ڈاکٹر این میری شمل اور پروفیسر بوسانی کے مضامین بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ نیز راقم کا مضمون ''اقبال اور رومی کا تصور شیطان''، (انگریزی) جو قونیہ (ترکی) میں مولانا جلال الدین رومی کے جشن ولادت پر پڑھا گیا۔

۱۱۰۔ ''اقبال ریویو'' اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اپریل ۱۹۸۳ء مضمون ''اقبال کی ایک نایاب تحریر'' (انگریزی) جو لاہور کے رسالہ ''اورینٹ'' کے شمارہ جون اگست ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا، صفحہ ۴۰۔

۱۱۱۔ ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار ۲۱۹، ۲۲۰۔

۱۱۲۔ اس بحث کے سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے دیکھیے کتاب ''اقبال کا تصور خدا'' از ایس۔ ایم۔ رشید، لندن ۱۹۸۱ء (انگریزی) مصنف اقبال کو ایک مذہبی مفکر کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی رائے میں اقبال کے ہاں خدا مقید اور محدود ہے اور انہوں نے مغربی سائنس اور فلسفے کا مطالعہ کر کے اپنی طرف سے جو نتائج نکالے

ہیں، وہ غلط ہیں۔ مصنف کے خیال میں اقبال نے مغربی سائنس اور فلسفے کا محض سطحی مطالعہ کیا تھا اور اس کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے تھے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے محدود خدا کے تصور کو قرآن مجید کے خدا اور مسلم فلاسفہ کے نظریات سے منسلک کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کوشش میں وہ ناکام رہے، مصنف کے خیال میں اقبال کا خدا دراصل وہی پرانا وجودی صوفیہ کا ہمہ اوستی خدا ہے۔

۱۱۳۔ ''اقبال اور تصوف'' مرتبہ آل احمد سرور۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر، صفحات ۷۸، ۸۹، ۸۱۔

۱۱۴۔ دیکھیے کتاب ہذا کے صفحات ۴۲۸، ۴۵۱۔

۱۱۵۔ ''انوار اقبال''، مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۲۱۸۔

۱۱۶۔ ''مکتوبات اقبال''، صفحات ۴۳، ۴۷۔ بقول سید نذیر نیازی اقبال نے انہیں بتایا کہ ان کی اہلیہ مرحومہ سردار بیگم بعثت ثانیہ حاصل کر چکی ہیں۔ دیکھیے ''اقبال کے حضور''، صفحہ ۲۰۲۔

۱۱۷۔ ''اقبال کے حضور''، صفحات ٦٦، ٦٧

۱۱۸۔ اس مسئلے پر مزید مطالعے کے لیے دیکھیے ''اقبال کا تصور زمان و مکاں اور دوسرے مضامین'' از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ایڈیشن ۱۹۷۳ء۔ مقالہ ''اقبال کا تصور زماں (تدریجی ارتقا)'' از مولانا شبیر احمد خان غوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مقالہ ''آئن سٹائن اور برگساں کے نظریات زماں اور اقبال'' از جگن ناتھ آزاد۔ ''اقبال اور مغرب'' مرتبہ آل احمد سرور۔ سری نگر۔ مقالہ ''محمد اقبال کے فکر میں زماں اور ابدیت'' از این میری شمل (انگریزی)۔ کارروائی بین الاقوامی کانگرس برائے مذاہب، ماربرگ ۱۹۶۱ء ''بال جبریل'' از این میری شمل (انگریزی)۔ ''اقبال کے نظام فلسفہ میں خدا انسان اور کائنات کا مقام'' از جمیلہ خاتون (انگریزی)، مقالہ ''محمد اقبال کے مذہبی فلسفے میں زمان کا تصور'' از بوسانی

(انگریزی) رسالہ ''ڈی ولٹ ڈیس اسلام'' جلد سوم، لیڈن ۱۹۵۴ء مقالہ ''اقبال کے ہاں زماں کی نوعیت'' از ایم۔ایم۔شریف (انگریزی) ''اقبال ریویو'' اکتوبر ۱۹۶۰ء مقالہ ''زماں کے متفرق تصورات پر اقبال کا تبصرہ اور ان کا اپنا تصورِ زماں از رفعت حسن (انگریزی) ''اقبال ریویو'' اپریل ۱۹۸۴ء۔

۱۱۹۔ یہ تحریر راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۲۰۔ راقم کو اس خط کی فوٹو کاپی رفیع الدین ہاشمی سے ملی۔اب اس خط کا عکس ''وثائق مودودی'' (صفحہ ۹۵) میں بھی شامل ہے۔

۱۲۱۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل، صفحہ ۳۲۵۔

۱۲۲۔ صفحہ ۵۵۵۔

The End----ختم شد-اختتام-----------